
اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ

بیشک اس میں ان لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں جو فکر سے کام لیتے ہیں۔ (سورہ روم رکوع ۳)

تاریخ

ہندی قرونِ وسطیٰ

جلد دوم

از عہد

سلطان محمد غوری تا سلطان قطب الدین مبارک شاہ خلجی

یعنی

سنہ ۱۱۸۶ء تا سنہ ۱۳۲۰ء

مرتبہ

قاری محمد بشیر الدین پنڈت (بدایونی)

ایم۔اے۔(علیگ)

مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ

اگست سنہ ۱۹۴۹ء

قیمت ۱۰ روپے علاوہ محصول ڈاک

چند قیمتی رائیں

کی اشاعت ضروری ہے۔ میں تاریخ کی اشاعت میں خدمت کے واسطے ... نقد و قلم دونوں حاضر۔

... گڑھ ۔ مئی ۱۹۴۸ء

... ڈٹ ایم۔ اے (علیگ) نے

... کا درجہ رکھتی ہے۔ اِس

... یات

... ۱۹۴۸ء

... جون ۱۹۴۸ء

... لیکن اب اس اہم ذمہ داری

... عہدہ برآ ہونیکی سعی فرمائی

... مہارت تامہ رکھنے کے باعث

... اس کام کے لئے موزوں

... وستان کی تمام تاریخوں

... ۱۹۴۸ء

... علاوہ اسکولوں اور

محمود الرحمٰن قدوائی - پرنسپل

گاندھی فیض عام کالج شاہجہانپور - فروری ۱۹۴۸ء



فہرست مضامین

تاریخ ہندی قرونِ وسطیٰ (جلد دوم)

انتساب

جب تاریخ کا مطلع تاریک تھا اور زندگی کے افق پر گھنگھور گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ کچھ من چلے اہل قلم اُٹھے اور جابجا تحقیق کے چراغ جلا دئے۔ جن کی روشنی میں چل کر بعد کے آنے والوں کو تیرہ و تار گلیوں میں ٹھیکنے سے نجات اور شاہ راہ مقصود کا نشان ملا۔ اسی فضل کے اعتراف اور اسی احسان کی منّت گذاری کے طور پر میں اپنی ناچیز تالیف اُن نامور مورخین کے نام منسوب کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ کہ الفضل للمتقدم۔

خاکسار موٴلف

شکر و دعا

الحمد للہ کہ سالہا سال کی محنت کے بعد اُسی کی مدد سے ہندوستان کے قرونِ وسطیٰ کی تاریخ تین جلدوں میں تیار ہوگئی اور اسی کی مہربانی سے آج دوسری جلد شائع ہورہی ہے۔

میرے بچپن کے جذبات و تاثرات کیا تھے؟ اور انھوں نے کیونکر میرے احساسات کو بیدار کیا؟ اور احساسات نے کسطرح علمی جدو جہد کیطرف متوجہ کیا؟ اسکی داستان طویل ہے لیکن جذبات و تاثرات، احساسات و اقدامات کا خالق بھی وہی ہے۔ اور سعی کو عمل کی شکل دینے والا بھی وہی ہے ؎

نیاوردم از خانہ چیزے نخست ۔۔۔ تو دادی ہمہ چیز من چیز تست

۱۲ سال سے زائد مدت تک ایک ہی کام میں لگے رہنا کتنا مشکل ہے؟ پھر اس مشکل کو کس نے آسان کیا؟ میرا تجربہ مجھے یاد دلاتا ہے کہ بسا اوقات دو سطر میں لکھنے کے لئے گھنٹوں سر پکڑے بیٹھا رہا اور ایک حرف بھی نہ لکھ سکا۔ پھر میں کیا ناز کروں کہ یہ کام میں نے کیا مجھے اپنی کمزوریوں، جلد بازیوں، ناتجربہ کاریوں، خامیوں اور بے علمیوں کا خوب علم ہے۔ میں معترفِ عجز و قصور ہوں اور جس کارساز نے اس کام کو پورا کرادیا در اصل اُس کا شکر ادا کرنے سے بالکل قاصر ہوں ؎

بندہ ہماں بہ کہ ز تقصیرِ خویش ۔۔۔ عذر بدرگاہ خدا آورد
ورنہ سزاوار خداوندیش ۔۔۔ کس نتواند کہ بجا آورد

جس کو کام کا تجربہ ہے وہ جانتا ہے کہ عمل کی پرخار وادی میں ہمت افزائی اور امداد فرمائی کیسی کام آتی ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ میرے بزرگوں اور دوستوں کو کس نے مجھ نااہل پر مہربان کردیا تو شکر کے لئے الفاظ نہیں ملتے اور خود اُن کرمفرما، ہمت افزا اور دل نواز ہستیوں کے شکرے سے بھی اپنے کو عاجز پاتا ہوں۔ بس اللہ تعالیٰ ہی انکو جزائے خیر دارین عطا فرمائیں۔

میں اس موقع پر اُن دوستوں، مربیوں اور محسنوں میں سے چند حضرات کا مختصر ذکر کئے بغیر نہیں رہ سکتا جن کے مجھ پر بے حد و بے شمار احسانات ہیں۔ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن خانصاحب شروانیؒ (نواب صدر یار جنگ بہادر) نے مدعو فرماکر نہ صرف اپنے بیش بہا کتبخانہ سے مستفید ہونیکا موقع دیا بلکہ ایک حد تک مالی مشکلات کی رکاوٹوں کو دور کرنے میں بھی میری مدد فرمائی۔ اسیطرح جناب احسن اللہ خانصاحب اور جناب معشوق علیخانصاحب نے اپنے ذاتی کتبخانے میرے لئے وقف کردئے۔ میں ان تمام حضرات

کا ممنون کرم ہوں۔ مخدومی جناب مولوی احمد زماں خانصاحب نیز جناب محمد احمد خانصاحب وکیل (شاہجہانپور) نے تالیف ہذا کی اشاعت کیلئے جو عملی جدوجہد فرمائی ہے اس کا شکریہ ادا کرنے سے زبان قاصر ہے۔ جناب راجہ خلیل احمد خانصاحب، جناب خان بہادر خادم حسن خانصاحب جناب عبداللطیف خانصاحب، جناب مدعلی خانصاحب اور جناب سید عبدالرب صاحب صوفی کا مجھ پر جو خصوصی کرم رہا ہے اس کا میں تہ دل سے مشکور ہوں۔ کتاب کی طباعت کے سلسلہ میں پریس کی جملہ مشکلات کو جس خوبی کیساتھ میرے شفیق مکرم جناب سید الطاف علی صاحب (اڈیٹر رسالہ مصنف و مہتمم مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ) نے حل فرمایا ہے اس کا میں از حد شکر گذار ہوں۔ میرے عزیز و ہونہار طلباء سید شہود حسین بریلوی، سید انوار حسین الہ آبادی، اور اطفال احمد خاں شاہجہانپوری اور برادر عزیز سید مولوی خلیل احمد صاحب شاہجہانپوری نے کتاب کے مسودات کو ترتیب دینے اور انکے نقل کرنے میں جو محنت و کاوش کی ہے خدا اسکی انھیں جزائے خیر دے۔

بہرصورت جب اللہ تعالی نے تالیف و تصنیف کے اس اہم کام کو مکمل کرا دیا تو کیا کہوں کہ میری کیا حالت تھی؛ خوشی سے یا خجالت سے؟ واقعی دونوں ہی جذبات تھے لیکن جب طباعت و اشاعت کے خیال سے علم و فضیلت کی مسندوں کیطرف اس پشتارہ کو لیکر چلا ہوں تو شرمندگی سے ایک ایک قدم سو سو من کا ہو گیا تھا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا میدان فضل و کمال اور میں! جس کیطرف نظر اٹھتی اپنی بے بساطی کا خیال آتا اور قدم رک جاتا۔ مسودہ بغل میں دبا کر اپنے محترم استادوں میں سے کسی کے سامنے جاتے ہوئے میری وہی حالت ہوتی تھی جو جوہریوں کے بازار میں آبگینہ لیکر جانیوالے کی ہوتی ہے۔ آخر ہمت کر کے میں اپنے استاد محترم جناب شیخ عبدالرشید صاحب صدر شعبہ تاریخ کی خدمت میں حاضر ہوا لیکن استاد زمانہ محقق یگانہ پروفیسر محمد حبیب صاحب صدر شعبہ سیاسیات کی خدمت میں حاضر ہونیکی پھر بھی کسی طرح ہمت نہ پڑی اسکے ساتھ ہی یہ ڈر تھا کہ اگر انھوں نے غائبانہ سن لیا تو کیا کہیں گے لیکن شیخ صاحب موصوف ہی نے میری ہمت افزائی کی اور نہایت خوشگوار تعارف کا واسطہ بنیگئے اب بھی ڈر رہا تھا کہ دیکھئے وہ کیا کہتے ہیں لیکن جو کچھ انھوں نے کہا میری عقیدت کے آنسو اور مسرت کا جذبہ تو اسکا ترجمان بن سکتا ہے مگر میری زبان خود اپنے متعلق ان ارشادات کو دہرا بھی نہیں سکتی جس کا ثبوت خود جناب موصوف کا ۴۲ فلسکیپ صفحات کا .... (مقدمہ) ہے میرا یقین ہے کہ اگر کسی خوش نصیب کو ممدوح کے قلم کی پانچ سطریں بھی نصیب ہو جائیں تو اسکا گوشہ کلاہ آسمان تک پہنچ جائے لیکن میرے معاملہ میں جس ذرہ نوازی اور دریا دلی سے ممدوح نے کام لیا ہے اسکا بیان میری تاب و تواں اور قلب و زبان کی حدود سے باہر ہے۔ اسکے بعد ہمارے حضرت اقدس مولانا ضیاء احمد صاحب بدایونی استاد شعبہ فارسی نے تعاون میں جس اہتمام اور جس شان فضل و کمال سے صرف توجہ فرمائی ہے میرا دل رہین منت و نیاز ہے۔ ان حضرات کے شکریہ میں مجھ سے جو کمی رہ جائے اس سے ایک گونہ یوں اطمینان ہے کہ میں ان سب حضرات کا چھوٹا ہوں اور از خورداں خطا و بزرگاں عطا مشہور ہے۔

[illegible] (ناچیز مؤلف)

فٹ نوٹ: ع ۲۹ تا ۳۱ شاہجہانپور کی معزز و ممتاز ہستیاں ہیں۔ ع ۱۰ موصوف رائے بریلی کے ایک نہایت متدین اور باکمال بزرگ ہیں

مقدمہ

از

(عالیجناب پروفیسر محمد حبیب صاحب
بی ۔ اے (آکسن) بار۔ایٹ۔لا
صدر شعبۂ سیاسیات، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

سالہا سال کے مسلسل و وسیع مطالعہ نیز تحقیق و تدقیق کے بعد قاری محمد بشیر الدین پنڈت ایم۔ اے (علیگ) نے جو گاندھی فیض عام کالج شاہجہانپور کے ادارہ سے تعلق رکھتے ہیں ہندوستان کے ازمنۂ وسطیٰ پر ایک تاریخ ترتیب دی ہے جو اپنے مضمون پر قولِ فیصل کا درجہ رکھتی ہے۔

تالیف مذکور کی ترتیب و تدوین کے لئے مؤلف کے اندر بعض وہ اہم خصوصیات ہیں جن میں وہ آپ منفرد ہیں۔ ان کو فارسی، ہندی و سنسکرت مآخذات پر عبور حاصل ہے نیز تاریخ کے موجودہ انگریزی لٹریچر سے بھی بخوبی واقف ہیں۔ علاوہ ازیں اُن کا دماغ فرقہ وارانہ نیز سماجی و طبقاتی تاثرات سے پاک و صاف ہے۔ ساتھ ہی ساتھ جہاں تک شواہد و دلائل کا تعلق ہے انھوں نے تاریخ کے مروجہ آئین و ضوابط کا پورا پورا لحاظ رکھا ہے اور اس پر ان کو اعتماد حاصل ہے۔

شہاب الدین محمد غوری سے لیکر خاندانِ علائی کے اختتام تک کا زمانہ چونکہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے تاریخ میں نہایت اہم ہے اسلئے قاری صاحب موصوف نے یہ طے کیا ہے کہ اس کو جلد دوم میں جلد اول و سوم سے پہلے شائع کیا جائے پہلی و تیسری جلدیں قلمی صورت میں تیار ہیں اور اُمید ہے کہ جلد دوم کی طرح فاضل مؤلف انہیں بھی جلد از جلد شائع کر کے علمی دنیا کو مستفید ہونے کا موقع دیں گے۔ پنڈت جی صاحب میری استدعا کو عملی جامہ پہنانے کے لئے جلد ہذا کا ہندی ایڈیشن تیار کرنے میں مصروف ہیں جو زبان و بیان کے اعتبار سے صاف و سادہ اور غیر برہمن جنتا (پبلک) کے لئے قابلِ فہم ہوگا۔

قرونِ وسطیٰ کی تاریخ اب تک بالعموم اس نہج پر ترتیب دیجاتی رہی ہے کہ گویا اس میں شاہی خاندانوں اور ان کے جنگ و جدل کے واقعات کے سوا اور کچھ نہیں۔ یہ چیز آپ

پنڈت بشیر الدین صاحب کی تالیف میں نہیں پائیں گے۔ بلاشبہ تاریخی کتابوں میں سلاطین اور ان کے رزمیہ کارناموں کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا اور اس لحاظ سے پنڈت جی صاحب موصوف نے فارسی ماخذات کے وسیع مطالعہ کے بعد ان کو یکجا جمع کردیا ہے لیکن اسی شدّ ومد کے ساتھ انھوں نے قرونِ وسطیٰ کی معاشرتی، تہذیبی نیز ذہنی ارتقاء کی تاریخ پر بھی اپنا زورِ بیان صرف کیا ہے اور کم وبیش نصف جلد انہیں مضامین پر مشتمل ہے کہ جن کے فہم و ادراک کے بغیر ہندی قرونِ وسطیٰ کی سیاسی تاریخ ایک لاینحل معانی رہتی ہے۔

قاری محمد بشیر الدین پنڈت ایم۔ اے کی مؤلفہ جلد اوّل ۷۱۲ء سے لیکر ۱۱۸۶ء تک واقعات پر مشتمل ہے۔ تیسری جلد میں شاہانِ تغلق سے لیکر لودی سلاطین (یعنی ۱۳۲۰ء تا ۱۵۲۶ء) کے عہد حکومت تک کے واقعات درج ہیں۔ مؤلف کا ارادہ ہے کہ قرونِ وسطیٰ پر ایک چوتھی جلد کا اضافہ کیا جائے کہ جس میں عہد ندکور کے طریقِ جنگ، پیشہ ور جماعتوں کی حالت وکیفیت نیز مسلمانوں کے دینی رجحانات وغیرہ کا ذکر ہو کہ جن کے اظہار کا مناسب موقع گذشتہ جلدوں میں نہیں مل سکا۔

تالیف زیرِ بحث کا طرزِ تحریر نہایت صاف وسادہ، غیر مبہم (اور ایک حد تک سہلِ ممتنع) ہے۔ مؤلف نے قرونِ وسطیٰ کے نامور مورخین کی روایاتِ قدیمہ کی اتباع نہ کرتے ہوئے (بعید القیاس و دور فہم) تشبیہات واستعارات نیز کنایات سے احتراز برتا ہے کہ جن کو ہمارے درباری مورخین اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے لئے ضروری سمجھتے تھے۔ مشرقی روایات کے بموجب تاریخ تو درحقیقت ایک ایسا مضمون ہے جس کا ایک عامی کو بھی وقوف ہونا چاہیے اسلئے اس کو ایسے انداز سے لکھا جانا چاہیے کہ جس کو وہ سمجھ سکے۔

تاریخ ہند کی ترتیب وتدوین میں پنڈت بشیر الدین صاحب کو اس امر میں اوّلیت کا شرف حاصل ہے کہ انھوں نے عربی، فارسی اور سنسکرت ماخذات کی روشنی میں ہندوؤں کے ذہنی رجحانات نیز آئین ورسوم کو اسلامی تصورات وتہذیب کے پہلو

بہ پہلو رکھ کر دونوں کا نہایت جامعیت کے ساتھ جائزہ لیا ہے۔ اس مہتم بالشان کارنامہ کے لئے ان کی جتنی بھی ستائش کی جائے کم ہے۔ بدقسمتی سے قرونِ وسطیٰ کے لئے سنسکرت کے مستند مآخذات کی ضرورت سے زائد کمی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہرش وردھن کی وفات سے لیکر البیرونی کے آغاز تک جو درمیانی چار صدیاں گذری ہیں ان کے معاشرتی و سیاسی دساتیر و قوانین پر تاریکی کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ چنانچہ البیرونی جب زمانۂ گذشتہ کے ہندی تخیلات کی کامرانیوں کو پیشِ نظر رکھ کر زمانہ مابعد کے حقیر و کم مایہ سرمایہ پر نظر ڈالتا ہے تو اُسے بے ساختہ کہنا پڑتا ہے کہ "ہندوستانی ترقی پسند نہیں ہیں"۔ اور وہ خواہش کرتا ہے کہ "کاش کوئی ایسا ہندوستانی سقراط پیدا ہو جو عزم و استقلال سے کام لیکر اور اپنی جان کی بازی لگا کر قدیم ہندی تخیلات کے مستند اصول موضوعات کو ایسے (مزخرفات) لٹریچر سے الگ کر دے کہ جس نے عوام الناس کو ان کی جہالت کی بنا پر اپنا شکار بنا رکھا ہے"۔ لہٰذا اُس وقت تک جب تک کہ مذکورۂ بالا چار صدیوں کے متعلق مزید انکشافات ہوں اور صحیح مسالہ بہم پہونچے ایک حقیقی مورخ کے لئے بجز اِس کے اور کوئی چارۂ کار نہیں کہ وہ منو اسمرتی اور یجناولکیہ کے وضع کردہ اصولِ موضوعات کے مطابق ہندوستان کے معاشرتی رسوم و رواج نیز آئین زندگی کو جانچے اُوپر کھے .... منو اسمرتی کے دور میں ہندوستان کے اندر ذات پات کے قوانین کو یقیناً بطور اصولِ موضوعہ تسلیم کر لیا گیا لیکن یہ دوسری بات ہے کہ اِن (قوانین) کے عملی نفاذ کی شکل واضع قوانین کے منشاء کے بقدر خراب و ناقص نہ رہی ہو۔ البتہ البیرونی کے زمانہ میں ہم ذات پات کے نظام کو حیرت انگیز لیکن وحشت خیز طریقہ پر جاری و ساری پاتے ہیں۔

البیرونی لکھتا ہے "ہندوؤں میں (ایران کی پانچ ذاتوں کی طرح) بکثرت ذاتیں ہیں۔ ہم مسلمانوں کا مسلک عام مساوات نیز اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقَاکُمْ کے مطابق ان سے بالکل جداگانہ ہے اور یہی وہ سب سے بڑی رکاوٹ ہے جو ہندوؤں

اور مسلمانوں کے درمیان (ایک دوسرے کو سمجھنے اور دیکھنے میں) حائل ہے"۔

ہندوؤں کے مشہور چار ورنوں (ذاتوں) کا مختصر سا تذکرہ کرنے کے بعد البیرونی آگے بڑھتا ہے اور لکھتا ہے کہ "شودروں کے بعد انتجوں کا درجہ ہے جن سے مختلف خدمات لی جاتی ہیں۔ ان کا کسی ذات میں شمار نہیں۔ وہ دستکار و پیشہ ور جماعتوں کے ممبر ہیں۔ اور آٹھ طبقوں میں منقسم ہیں۔ اور دھوبی، موچی، جولاہہ کے علاوہ جن کو وہ اپنے میں سے نہیں سمجھتے آپس میں شادی بیاہ کرتے ہیں۔ ان پیشہ ور جماعتوں کے آٹھ طبقات یہ ہیں۔ دھوبی، موچی (چمار)، بازی گر (نٹ)، کنجڑ، ملّاح، دھیور (مچھیرے)، چڑیمار اور جولاہے۔ ہندوؤں کی چاروں ذاتوں کے افراد ان کے قریب آباد ہونا پسند نہیں کرتے یہی وجہ ہے کہ ان کی آبادی گانوں یا شہر کے بالکل باہر ہوتی ہے"

"انتجوں سے بھی گیا گزرا درجہ ڈوم اور چنڈالوں وغیرہ کا ہے..... حقیقتاً انھیں ناجائز اولاد کی طرح (حقیر) سمجھا جاتا ہے کیونکہ ان کے متعلق عام خیال یہ ہے کہ وہ غیر شادی شدہ زانی شودر باپ اور غیر شادی شدہ زانیہ ماں کے اتصال سے پیدا ہوئے ہیں......"

ایک دوسری جگہ البیرونی کا بیان یہ ہے "ہر وہ کام جس کے کرنے کا استحقاق برہمنوں اور صرف برہمنوں کو حاصل ہے مثلاً عبادت کرنا، ویدوں کا پڑھنا، ہون کرنا وغیرہ دوسروں کے لئے اِس حد تک ممنوع ہے کہ ایک شودر یا ویش کے متعلق جب یہ معلوم ہو جائے کہ اس نے وید منتر کا "اچارنڑ" کیا ہے (یعنی زبان سے ادا کیا ہے) تو اس کو برہمن بحیثیت مجرم کے حاکم کے سامنے پیش کرتے ہیں اور حاکم حکم جاری کرتا ہے کہ اس کی زبان قطع کر لی جائے"۔

ذات پات کے نظام کی مذہبی بنیاد چھوت چھات کے بھیانک اصول پر قائم تھی جس کی بنا پر ہندوستان کے حکمراں طبقے کے دماغ میں یہ خوف مستقل طور پر جاں گزیں ہو چکا

تھا کہ اگر انھوں نے نظامِ مذکور کے کسی آئین کی خلاف ورزی کی اور بالخصوص اپنے سے نیچے ورن والے کی آگ یا پانی کو (استعمال کرنا تو کجا) چھو بھی لیا تو وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مردود قرار دیدئے جائیں گے۔ مسلمان قیدی تو زرِ فدیہ ادا کرنے کے بعد اسلامی سوسائٹی میں اپنی سابقہ حالت پر واپس آسکتا تھا لیکن ...... ہندو قیدی کو اپنی شجاعت و ایثار کا اپنے سماج کی طرف سے یہ صلہ ملتا تھا کہ وہ ہمیشہ کے لئے چنڈال قرار دیدیا جائے۔ اس کے بیوی و بچے اس سے منحرف ہو جائیں۔ احباب اس کا ساتھ چھوڑ دیں اور پوری سوسائٹی اس کی دشمن بن جائے۔

زمانۂ مابعد میں اِس مذہبی نجاست (چھوت چھات) سے پاک ہونے کے کچھ طریقے (مثلاً گنگا اشنان اور بلدان وغیرہ) ایجاد کئے گئے لیکن ترکی حملوں کے آغاز کے وقت اِس قسم کی تلافی غیر ممکن تھی۔ اِس ضمن میں البیرونی کے اشارات نہایت معنی خیز ہیں۔ لکھتا ہے.....

"مجھے بتایا گیا کہ ہندو قیدی رہا ہو کر بھاگ کر جب اپنے ملک یا مذہب میں واپس آتے ہیں تو ہندو حکم دیتے ہیں کہ انھیں اَز راہِ کفارہ پہلے برت رکھنا چاہئے اس کے بعد انھیں گائے کے گوبر، پیشاب، اور دودھ میں دفن کر دیتے ہیں یہانتک کہ اُن پر عملِ تخمیر مکمل ہو جائے بعد کو اسی قسم کی چیزیں (مثلاً گائے کا گوبر، پیشاب، دودھ وغیرہ) انھیں کھانے کو دی جاتی ہیں؛ میں نے اپنے برہمن دوستوں سے اس کی تصدیق کرنا چاہی تو انھوں نے انکار کیا۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ اِس قسم کے کفّارہ کی کوئی گنجائش نہیں کیونکہ فوجی قیدی اپنی سابقہ حالت پر کسی صورت سے واپس نہیں لوٹایا جا سکتا......"

بلاشبہ ایک وہ زمانہ تھا جبکہ تہذیب وتمدّن کے فروغ ونشوونما کے لئے "انسانی غلامی" کو ضروری خیال کیا جاتا تھا۔ چنانچہ میسوپوٹامیہ، کریٹ، مصر اور یونان کی ابتدائی تہذیب و معاشرت کی بنیادیں "بے رحمانہ جبریہ غلامی" پر استوار کی گئیں لیکن تیرھویں صدی عیسوی میں ضروریاتِ زندگی کے لئے ترقی یافتہ ذرائع پیداوار کو مدِّنظر رکھتے ہوئے اِس قسم کا

سماجی نظام (جیسا کہ منو نے مرتب کیا ہے) نہ صرف غیر ضروری بلکہ (انسانیت کے لئے) تباہ کن تھا۔ البیرونی نے کتاب الہند میں اپنے عہد کی ہندو تہذیب و معاشرت کو جس انداز پر دیکھا ہے بلا کم و کاست بیان کر دیا ہے لیکن منو کا قانون (منو اسمرتی) محض خارجی بیان پر مشتمل نہیں ہے یہ ایک قانون کی کتاب ہے اور مصنف کا منشا غالباً قانون کی دفعات کو بطور اصولِ موضوعہ تسلیم کرا لینے کے اور کچھ نہیں پھر بھی منو اسمرتی میں ذات پات کی تصریحات، برہمنوں کی دوسروں پر فوقیت، اور شودروں کی مظلومانہ محکومیت نہایت معنی خیز ہیں[۱]۔ مثلاً

"کائنات عالم کی ہر چھوٹی بڑی چیز برہمنوں کی ملکیت میں ہے (اور انھیں کو مالک و حاکم ہونے کا حق پہونچتا ہے) کیونکہ وہ برہما کے منہ سے پیدا ہوئے ہیں اور وید صرف انھیں کے لئے مخصوص ہیں، وہ دنیا میں بلحاظ پیدائش سب سے اعلیٰ ہیں......" (منو ادھیائے پہلا اشلوک ۹۳ تا ۱۰۰)

"برہمن کو ایسے ملک میں نہیں رہنا چاہئے جہاں کے حکمراں شودر یا چنڈال یا پاکھنڈی (بدطینت) یا مرتد لوگ ہو" (منو ادھیائے تیسرا اشلوک ۶۱)

"عظمت و عزت، عبادت و ریاضت، پاکی و صفائی اور پیدائش کے لحاظ سے برہمن (ذات) تمام دیگر ذاتوں کی آقا و مالک ہے" (منو ادھیائے ۱۰۔ اشلوک ۳)

"متبرک رسوم (غالباً یگیہ، ہون وغیرہ) کو ادا نہ کرنے کی وجہ سے نیز برہمنوں کی عظمت کو تسلیم نہ کرنے کے باعث مندرجہ ذیل اقوام رفتہ رفتہ اچھوت بن گئیں:-

پونڈرک، دراوڑ، کمبوج، یَوَن، اشک، پہلوی، کِرات وغیرہ وغیرہ" (منو ادھیائے ۱۰۔ اشلوک ۴۳، ۴۴)

---

[۱]:- صاحبِ مقدمہ نے کم و بیش پانچ فلسکیپ صفحات پر منو اسمرتی کے مختلف ابواب سے شہادتیں فراہم کر کے اپنے بیان کی تصدیق کی ہے۔ راقم الحروف نے انمیں سے صرف چند مثالیں پیش کی ہیں بقیہ کے لئے مقدمہ کا اصل متن ملاحظہ ہو جو تالیف ہذا کے ساتھ منسلک ہے (مولف)۔

"دنیا کی تمام وہ اقوام جن کا شمار چار وَرنوں میں نہیں ہے داس (غلام) ہیں خواہ وہ زبان آریوں ہی کی کیوں نہ بولتے ہوں" (منوادھیائے ۱۰۔ اشلوک ۴۵)۔

"چنڈالوں اور اُن جیسے دیگر لوگوں کو آبادی کے باہر بسنا چاہیئے اور اُن کی دولت کتوں اور گدھوں کے سوا اور کچھ نہ ہونا چاہیئے۔ لباس مُردوں کی اُترن ہو۔ کھانا ٹوٹی رکابیوں میں کھائیں۔ ان کے زیورات لوہے کے بنے ہوئے ہونا چاہئیں۔ اور زندگی خانہ بدوشوں کی طرح بسر کرنا چاہیئے۔ رات کے وقت وہ گانوں اور قصبوں میں نہ چلیں پھریں۔ دن کے وقت انھیں راجہ کے مقرر کردہ نشانوں کو لگا کر آبادی میں داخل ہونے کی اجازت ہے۔ وہ اپنے متعلقہ فرائض انجام دیں اور لاوارث لاشوں کو اٹھائیں۔ یہ طے شدہ قانون ہے" (منوادھیائے ۱۰۔ اشلوک ۵۱ تا ۵۵)

بلاشبہ ہر زمانہ میں اعلیٰ قسم کا ہندوازم بھی پایا جاتا رہا ہے جو مسلک کے اعتبار سے موحد، بت پرستی کا مخالف اور مساوات کا حامی رہا۔ البیرونی نے اپنا زیادہ وقت اِسی قسم کے ہندوازم کے مطالعہ میں صرف کیا ہے۔ اِس سلسلے میں اس کے بعض اشارات قابلِ تذکرہ ہیں۔ لکھتا ہے "موکش (نجات) کے بارے میں ہندوؤں میں آپس میں اختلاف ہے بعض کا خیال ہے کہ موکش (نجات) پانے کے مستحق صرف برہمن اور کشتری ہیں کیونکہ دوسری ذاتیں وید نہیں پڑھ سکتیں۔ لیکن ہندو فلاسفروں کے نزدیک نجات کا استحقاق تمام ذاتوں اور عام بنی نوع انسان کو حاصل ہے بشرطیکہ اس کے حصول کے لئے صحیح کوشش کی گئی ہو چنانچہ ویاس منی کا کہنا ہے کہ ۲۵ باتیں یاد کر لو اس کے بعد کوئی مذہب بھی اختیار کرو تم نجات پا جاؤ گے۔" ویاس جی شُودر گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ انھوں نے توحید کی تعلیم پیش کی ہے[1]۔

اِس قسم کے اقتباسات (ہندوؤں کی) مذہبی کتب نیز کتاب الہند سے بکثرت پیش

---

[1]:۔ ویاس جی کی تعلیم کیلئے مقدمہ کا اصل متن ملاحظہ فرمائیے (مولف)

کئے جا سکتے ہیں۔ لیکن یاد رہے کسی قوم کے وجود کو قائم و دائم رکھنے کے لیے مذہبی کتب کے مقدس اصول ناکافی ہیں اگر ان پر عمل نہ کیا جائے کیونکہ دنیا کی بین الاقوامی کشمکش میں قومیں ایک دوسرے کے اعمال ہی کا جائزہ لیا کرتی ہیں۔ اور اس کے اچھے یا بُرے ہونے کا فیصلہ صادر کرتی ہیں۔

آج تاریخ کا کوئی بھی طالب علم محمدؐ غوری اور اس کے افسروں کی فوجی مہارت کا قائل نہیں۔ بیشک وہ لائق منتظم ضرور تھے اور جیوٹ دار آدمی کی طرح اپنے مقصد پر قائم رہنا بھی جانتے تھے لیکن اُن کی فوجی تدبیروں یا چالوں میں تخلیقی یا اختراعی قوت کارفرما نظر نہیں آتی پھر بھی ان کی فتوحات نہایت سریع و پائدار تھیں اور یہ دونوں حیرت انگیز باتیں تشریح طلب ہیں۔

تمام مسلم مورخین کا اس امر پر اتفاق ہے کہ قرونِ وسطیٰ میں مسلم ایشیائی سوسائٹی کا اخلاقی انضباط بگڑا ہوا تھا۔ اس کا اندازہ یوں لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۲۰۵ء میں شمالی ہند کے فاتحین (شنسبانیہ) کو اندخود کے مقام پر خوارزمشاہیوں کے ہاتھ سے ایسی زک اُٹھانی پڑی کہ جس سے وہ پھر دوبارہ نہیں پنپ سکے۔ اس کے کچھ ہی عرصہ کے بعد یعنی ۱۲۱۸ء میں چنگیزی طوفان اُٹھا جس نے وسط ایشیاء کی ہر چھوٹی بڑی سلطنت کو بیخ و بن سے اُکھاڑ پھینکا۔ اس طرح ترکی و عجمی سب کے سب منگلوں کے محکوم بن گئے اسلیے علاء الدین عطا ملک جوینی کی یہ تشخیص کہ ان لوگوں کا فوجی و سیاسی مزاج فاسد ہو چکا تھا اپنی جگہ پر بالکل صحیح ہے۔ اس سلسلہ میں مورخ مذکور نے ایک نہایت دلچسپ مثال پیش کی ہے جو اس عہد کے بگڑے ہوئے فوجی نظام کی عکاسی کرتی ہے۔ شہنشاہ خوارزم کے ایک انسپکٹر کو بوقت معائنہ داروغہ اصطبل جواب دیتا ہے "بیشک، شاہی گھوڑوں کا اندراج رجسٹر میں تو ہے لیکن کیا ضرور کہ وہ اصطبل میں بھی موجود ہوں"

یہ تھے وہ حالات جبکہ شمالی ہند کی تسخیر عمل میں آئی۔ اس صورت میں کیا اِسے

ترکوں کا فوجی کارنامہ سمجھا جا سکتا ہے؟ نہیں اور یقیناً نہیں بلکہ ترکی تسخیر و تعمیر کا اصل سبب ہندی سوسائٹی کی شکستگی و زبوں حالی ہے۔ ہندوستانی مزدور پیشہ جماعتوں کو حکمراں طبقے نے اتنی سقیم و پست حالت میں ڈال رکھا تھا اور جس کی وجہ سے وہ اپنے آقاؤں سے اس قدر نالاں تھے کہ انھوں نے غنیم کے مقابلہ میں نہ صرف لڑنے سے انکار کر دیا بلکہ اسے دل کھول کر مدد دی۔ اس طرح ایسا وسیع و عریض اور خوشحال ملک جیسا کہ ہندوستان ہے سماج کی انتہائی حماقت کا شکار بن گیا۔ غرضکہ وہ اسباب جن کی وجہ سے ترکوں کو ہندوستان میں فتوحات حاصل ہوئیں وہی اُن کے استقرار کا موجب بن گئے۔ شری بشیر الدین پنڈت نے (دیباچہ میں) بتایا ہے کہ پانچ چھ صدیوں تک ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کوئی بلوہ رونما نہیں ہوا تو اس میں ہمارے لئے تعجب کی کونسی بات ہے۔ شہری و قصباتی آبادی کا اکثر و بیشتر حصہ مزدور پیشہ طبقوں پر مشتمل تھا جو ہندو حاکم کے مقابلہ میں مسلمان حاکم کو ترجیح دیتے تھے کیونکہ اس کے زیر سایہ وہ اپنی پوزیشن کو محفوظ و مستحکم اور بہتر حالت میں پاتے تھے۔

تیرھویں صدی کے ترکی حکمرانوں نے مقامی باشندوں کے مذہبی و معاشرتی اُمور میں قطعی کوئی دخل نہیں دیا۔ کیونکہ انھیں اپنے اصلی وطن (وسط ایشیا) میں مغلوں کے غلبہ و اقتدار کی وجہ سے ہندوستان کو اپنا وطن بنا کر یہیں مرنا اور یہیں جینا تھا۔ اور اس کے لئے یہ لابدی امر تھا کہ لوگوں کے قلوب کو مسخر کیا جائے۔ چنانچہ شعبانی حکومت کا دائرۂ اثر جہاں تک پہونچا لوگوں نے اپنے کو پہلے سے بہتر حالت میں محسوس کیا کیونکہ اب نہ وہ ذات پات کے بندھن اور اونچ نیچ کے جھگڑے تھے اور نہ چھوت کا بھوت ان کی راہ میں حائل تھا۔ وہ شہروں میں آباد ہو سکتے تھے اور آزادی کے ساتھ اپنا کام کاج کر سکتے تھے (اس لئے خوش تھے اور ترکوں کے معین و مددگار)

ترکی حکام کی آمد کے ساتھ ہی ساتھ قوانین شریعت بھی آئے اور قاضی بھی۔ گو انہوں

علامہ تاریخی شہادتوں کے لئے مقدمہ کا اصل متن ملاحظہ ہو۔

نے غیر مسلموں کے مذہبی و معاشرتی آئین و رسوم کو اُن کے حال پر جیوں کا تیوں رہنے دیا لیکن ان کو متاثر کئے بغیر نہیں رہ سکے۔ عبادات سے قطع نظر "معاملات" کے اندر وہاں ذمّی و غیر ذمّی ایک سطح پر نظر آتے ہیں اور یہ چیز ذات پات کے امتیازی قوانین کے مقابلہ میں ہندوستانیوں کے لئے بالکل نئی اور انوکھی سی بات تھی (اِس نے بھی ہندوؤں کو اپنانے میں بڑی مدد دی)۔

میری ان گذارشات سے کہیں یہ نتیجہ نہ نکالا جائے کہ مسلمانوں نے کسانوں اور پیشہ ور جماعتوں سے استحصال و منفعت کے طریقوں کو خیر باد کہدیا تھا نہیں ایسا ہرگز نہیں تھا۔ بلکہ قرونِ وسطیٰ میں بھی اجرت و محنت کے مسائل کو حل کرنا پڑا ہے[۱] لیکن اس حل کی نوعیت دوسری تھی۔ اسلام سے پیشتر دُنیا میں استحصال کے لئے تین مختلف طریقوں پر عمل ہوتا تھا یعنی یونان کی "زرعی غلامی" یا مصر و کریٹ کی "محکومانہ جبریہ غلامی" یا ہندوستان کی (مسئلہ چھوت کی بنا پر) "طبقاتی غلامی"۔ اسلامی شریعت نے ان تینوں طریقوں کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا اور حصول منفعت کے لئے "آزاد اُجرت اور انتقال پذیر محنت" پر عمل کیا۔ اِس سے مزدور بھی خوش ہو گیا اور پیداوار میں بھی اضافہ ہو گیا۔ ترکی سلاطین نے اپنے عہد حکومت میں اس سے پورا پورا فائدہ اُٹھایا اور ملک مالا مال ہو گیا۔[۲]

شمسباتی ترکوں کی کامیابی کے راز کو اگر معلوم کرنا ہے تو تاریخ عالم کے سیاق و سباق کو پیشِ نظر رکھئے۔ انھوں نے "ذات پات" کی تصوری دُنیا اور معاشرتی اصولوں کو خیر باد کہکر "آزاد و انتقال پذیر محنت" کی طرف توجہ دی۔ شہر کی اُن مزدور پیشہ جماعتوں کو جو اپنی ذاتی کوشش سے "ذات پات کی غلامی" سے نجات حاصل نہیں کر سکتی تھیں آزاد کرایا اور اس کا اچھا صلہ پایا۔ ہر قسم کے اہلِ حرفہ و ماہرینِ فن (جن کو اب تک

---

۱ و ۲:۔ تفصیل کے لئے اصل متن ملاحظہ فرمائیے۔

ذلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، جوق در جوق شہروں میں جمع ہو گئے۔ ترکوں نے انکو خوش آمدید کہا اور ان کی ہر طرح سے ہمت افزائی کی۔ اس کا فوری نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ گھریلو صنعتوں کو ترقی ہوئی اور پیداوار کی مقدار و ماہیت دونوں میں اضافہ ہو گیا۔ اسی نسبت سے تجارت کو بھی ترقی ہوئی جس سے راعی و رعایا دونوں نے فائدہ اٹھایا تجارت کی ترقی کے لئے سڑکوں کی حفاظت ضروری تھی۔ سلاطینِ دہلی بھی اس کی اہمیت کو خوب سمجھتے تھے چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ تختِ دہلی کے ایک خاندان سے دوسرے خاندان میں بار بار منتقل ہونے کے باوجود تجارتی شاہراہیں کھلی رہیں۔ اور "آزاد اجرت اور آزاد محنت" کے اصول پر عمل ہوتا رہا۔

ایک عرصۂ دراز تک حکمراں رہنے کے باوجود مشرقی بنگال، سندھ اور پنجاب کے دیہی علاقوں کے علاوہ مسلمانوں کو عددی اعتبار سے ملک کے دوسرے حصوں میں شاندار کامیابی حاصل نہیں ہو سکی اور آج ہندیونین میں ان کی تعداد ۱۲ فی صدی سے زائد نہیں اور دیہی علاقے میں تو وہ صرف ۳ فیصدی ہیں۔ اس سے دو باتوں کا پتہ چلتا ہے (۱) یا تو وہ دیہی علاقوں میں مذہب کی تبلیغ و اشاعت سے غافل رہے یا (۲) مقامی جتھوں کی مخالفت اتنی سخت تھی کہ جس کی وجہ سے وہ ناکامیاب رہے لیکن جہاں تک شہری و قصباتی آبادی کا تعلق ہے اسلام نے معتد بہ ترقی کی چنانچہ قرونِ وسطیٰ کی تاریخی شہادتوں کا استقصاء کرنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ علاء الدین خلجی کے دورِ حکومت تک شمالی ہند کی تمام شہری آبادیوں میں نصف کے بقدر تعداد اسلام پر ایمان لا چکی تھی جو زیادہ تر مزدور پیشہ طبقوں پر مشتمل ہے جن کے اندر خالص ہندوستانی خون رواں دواں ہے۔

ہندوستان کے ماقبل ہندو حکمراں طبقے نے (دہلی سلطنت کے اندر بھی اور باہر

---

(۱): مقدمہ کا اصل متن ملاحظہ ہو۔

بھی، تلخ تجربوں کے باوجود اپنی پرانی ذہنیت کو کیوں باقی رکھا اور اسمیں تبدیلی پیدا نہیں کی تو اس کا جواب دینے سے ہم قاصر ہیں۔ قرونِ وسطیٰ میں بڑے بڑے ہندو فلاسفر اور ریفارمر پیدا ہوئے جنھوں نے البیرونی کی طرح خذ ما صفا دع ما کدر کا پرچار کیا لیکن ہمیں کسی ہندو راجہ کا نام دکھائی نہیں دیتا جس نے سوسائٹی کی اصلاح کا بیڑہ اٹھایا ہو بلکہ اس کے برخلاف ہر خودمختار ہندو راجہ نے اپنے پیشرو راجہ داہر، پرتھوی راج اور جے چند کے المناک نقشِ قدم پر چلنا اپنا فرض سمجھا اور دستکار و مزدور پیشہ طبقوں کو بدستور اسی انداز پر دبایا جاتا رہا کہ جس کے لئے منو کے قوانین کو ترتیب دیا گیا تھا اور جو آریوں کے معاشرتی نظام کی جان تھے۔

بہرحال اگر ہم یہ ذہن نشین رکھنا چاہتے ہیں کہ دہلی سلطنت کی حکمراں جماعتوں کی زندگی کسانوں اور مزدوروں کی پیدا کردہ فاضل قدر (Surplus value) سے وابستہ تھی نیز یہ کہ حکومتوں کا بقا و استحکام بغیر پیشہ ور جماعتوں کے اشتراک و امداد کے غیر ممکن ہے تو آئیے قاری محمد بشیر الدین پنڈت کی تالیف کردہ تاریخ کے واقعات کو پڑھئے جو نہایت سبق آموز ہیں۔ اور قرونِ وسطیٰ کے مستند تاریخی مآخذات پر مبنی ہیں۔

قاری صاحب موصوف سے پوری توقع ہے کہ وہ اپنی اس قابل قدر تصنیف کو جو اتنے اچھے انداز پر ترتیب دی گئی ہے (طلباء و پبلک دونوں کے استفادہ کے لئے) اردو و ہندی دونوں میں زیورِ طباعت سے آراستہ فرمائیں گے۔

محمد حبیب
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
۲۱ جولائی سنہ ۱۹۴۹ء

(مترجمہ مولف)

تقریب

از

(عالیجناب شیخ عبدالرشید صاحب

ایم۔اے، ایل ایل۔بی

صدر شعبۂ تاریخ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

ہندوستان میں اسلامی دورِ حکومت کی تاریخ اب تک تشنۂ تحریر و ترتیب رہی ہے لیکن اب اس اہم ذمہ دارانہ کام کو قاری محمد بشیر الدین پنڈت نے تین جلدوں میں ترتیب دیکر عہدہ برآ ہونے کی سعی فرمائی ہے۔ یہ مہتمم بالشان کام اُردو زبان میں ہے جس کی دوسری جلد منظرِ عام پر لائی جارہی ہے مخصوص عالمانہ صفات سے متصف ہونے نیز عربی، فارسی، سنسکرت اور ہندی میں مہارت تامّہ رکھنے کے باعث کہ جن میں ہندی قرون وسطیٰ کے نہایت اہم دور کا سرمایہ محفوظ ہے قاری صاحب موصوف حقیقتاً اس کام کے لئے موزوں ترین شخصیت کے مالک ہیں۔

تالیفِ پیشِ نظر مرّوجہ درسی کتب کی نہ صرف تصحیح کرتی ہے بلکہ ہندوستان پر اسلامی حملوں کی ماہیت و اہمیت کا اندازہ بھی کراتی ہے کہ جو محمد بن قاسم کے عہد سے شروع ہوکر ایک عرصہ تک جاری رہے۔ ہندوستان کی تمام تاریخوں میں (بلا استثنیٰ) جو بنیادی غلطی اب تک ہوتی چلی آئی ہے وہ یہ ہے کہ ہم نے اپنے ملک کی تاریخ کو تاریخِ عالم اور اس کے مسلّمہ اصولوں سے غیر متعلق ہوکر ترتیب دیا ہے۔ اسلئے ہمارا مطالعہ یکطرفہ، قومیت کے تنگ دائرہ میں محدود اور مجرمانہ حد تک فرقہ وارانہ رہا ہے۔ پنڈت جی صاحب موصوف ان تمام باتوں سے محفوظ رہے۔ انھوں نے ہندوستان کے معاشرتی ماحول نیز عہدِ وسطیٰ کے مسلمانوں کے عمرانی، سیاسی اور تہذیبی پس منظر کی نہایت واضح، روشن

اور دلکش تصویر کھینچی ہے کہ جس میں رہکر مسلم فاتحین کو اپنی فتوحات اور اُن کے انضمام و استحکام کا کام انجام دینا پڑا۔

تالیف مذکور تاریخی شواہد و دلائل سے پُر ہے اور اس میں ہمعصر نامور مورخین کی کتب کے اقتباسات کو نہایت خوبی کے ساتھ سمویا گیا ہے۔ اسلئے عام درسی کتب کی عبارات مستند تواریخ کے عمدہ و بیش قیمت اقتباسات پڑھنے کے ذوق و شوق کو جتنا زائل کرتی ہیں اتنا ہی ہندی قرونِ وسطیٰ پر یہ تازہ تالیف قدیم مآخذات سے نہ صرف روشناس کراتی ہے بلکہ اس ذوق و شوق میں اور اضافہ کرتی ہے۔ علاوہ ازیں کتاب کی دلآویزی و دلکشی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ اس میں تاریخی واقعات کی نہایت منصفانہ و غیر متعصبانہ نیز دل نشین انداز سے تنقیح و توضیح کی گئی ہے۔ نتائج کے استنباط میں توازن کو برقرار رکھا گیا ہے اور مختلف فیہ مسائل میں تلخی پیدا نہ ہونے کا خاص طور سے لحاظ رکھا گیا ہے۔ مؤلف کو چونکہ اپنے مضمون پر قدرت حاصل ہے۔ اسلئے جو کچھ لکھا گیا ہے وہ نہایت متانت سنجیدگی اور خلوص کے ساتھ۔ اور اس کو ہمعصر تاریخی دستاویزات کے حوالہ جات سے موقر بنایا گیا ہے۔

ٹریولین کا کہنا ہے "کون ایسا ہے جو تاریخ پڑھنے سے گریز کرے بشرطیکہ وہ مسحور کرنے کی اہلیت رکھتی ہو۔ اسلئے ہمارا فرض ہے کہ ہم اسے حتی الامکان دلکش بنائیں اور اس کی دلکشی کو قابلیت کی قربان گاہ پر ثقیل وغیرہ مانوس الفاظ کے ذریعہ بھینٹ نہ چڑھائیں۔ قاری محمد بشیر الدین پنڈت ایم۔ اے (علیگ) کی یہ تازہ تالیف اس معیار پر پوری اُترتی ہے۔ اِس کے مطالعہ سے مؤلف کی تبحر علمی اور وقتِ نظر کا پتہ چلتا ہے۔ زبان نہایت سلیس و سادہ اور طرز بیان پیچیدگیوں سے پاک و صاف اور موثر ہے...

قاری محمد بشیر الدین صاحب پنڈت نے مغربی مورخین کے برخلاف کہ جنھوں نے بعض سیاسی اغراض و مقاصد کی تکمیل کی خاطر اسلامی عہد حکومت کے واقعات

کی غلط تاویلات پیش کی ہیں قرونِ وسطیٰ کے صحیح تناظر کو مدِنظر رکھ کر نہایت وسعتِ قلب اور ذہانت وذکاوت کے ساتھ تاریخی واقعات کا جائزہ لیا ہے۔ تالیف مذکور کی اشاعت کے لئے موقع بھی نہایت مناسب ہے جبکہ قومی حکومتیں برسرِ اقتدار ہیں۔ اُمید ہے کہ کتاب قدر کی نگاہ سے دیکھی جائیگی۔

تالیف میں کتابت وطباعت نیز واقعات کی چند نہایت معمولی غلطیاں ہیں جو مثال کے طور پر اضافی نوٹ ص ۴۲۸ اور صحت نامہ کے ساتھ منسلک ہیں۔ اُمید ہے کہ دوسری اشاعت میں ان کی تصحیح کردی جائیگی۔

(مترجمہ مؤلف)

شیخ عبدالرشید
مُسلم یونیورسٹی علی گڑھ
۲۲ راگست ۱۹۴۹ء

تعارف

از

(عالیجناب پروفیسر مولانا ضیاء احمد صاحب بدایونی (ایم اے)

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

کسی نے سچ کہا ہے کہ تاریخ انسانیت کا حافظہ ہے۔ یعنی جس طرح ایک فرد حافظے کی بدولت اپنے گذشتہ تجربوں کو محفوظ رکھتا اور اُن سے آئندہ زندگی میں کام لیتا ہے۔ اسی طرح اقوام بھی تاریخ کی مدد سے سابق کارناموں کو یاد رکھتی اور اُن کو راس المال قرار دے کر کاروبار حیات میں مصروف ہوتی ہیں۔ دُنیا میں ہمیشہ چراغ سے چراغ جلتا آیا ہے۔ اور متاخرین نے متقدمین کے تجربوں سے فائدہ اُٹھایا ہے۔ غور تو کیجئے اگر ہماری زندگی کا رشتہ ماضی سے بالکل منقطع ہو جائے۔ اور ہم اگلوں کے کارناموں سے مستفید ہونے۔ اور اُن کی غلطیوں سے عبرت حاصل کرنے سے محروم ہو جائیں تو زندگی کس قدر کھٹن اور دُنیا کتنی بھیانک ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ مہذب قوموں نے ہمیشہ سے تاریخ کو درخورِ اعتناء سمجھا ہے۔

جب ہم تاریخ کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو اکثر علوم و فنون کی طرح تاریخ میں بھی یونان ہی کو شرف تقدم کا حامل پاتے ہیں۔ چنانچہ ہیروڈوٹس[1] یونانی جو حضرت مسیحؑ سے ۴۸۴ سال قبل پیدا ہوا تھا تاریخ کا موجد اور اِس فن کا ابو الآبار مانا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اُس کی تاریخ حقیقت اور خرافات (دیو مالا) کی معجون مرکب تھی۔ تاہم اُس نے اپنے نزدیک جن اُمور کو صحیح سمجھا بے کم و کاست بیان کر دیا۔ غرض اُس نے اور اُس کے معاصرین نے اِسی معیار پر زور دیا ہے۔ زینوفن (۴۴۴-۳۵۹ ق-م) کے عہد میں حقیقت نگاری ادبیت اور صناعی کے پردوں میں روپوش ہو گئی۔ یہاں تک کہ رومیوں

---

[1] انسائی کلوپیڈیا برٹانیکا۔

کا دور آگیا۔ جس نے ڈایونی سی اس۔ اور سمرو جیسے نامور مورخ پیدا کئے۔ مسیحیت کے عروج اور چرچ کی فتح سے تاریخ میں مسیحی دور کا آغاز ہوتا ہے۔ اور اس عہد کی تاریخی تصانیف قدرۃً مذہب کے رنگ میں رنگی نظر آتی ہیں۔ اور تحقیق کی جگہ تقلید اور صداقت کی جگہ تعصّب کارفرما ہے۔

پندرھویں اور سولھویں صدی عیسوی کا زمانہ یوروپ میں نشأۃ ثانیہ کا زمانہ تھا جب کہ فرانس اور انگلستان وغیرہ میں ادب اور فنون لطیفہ کے نصب العین میں اصلاح و تجدید عمل میں آئی اور تاریخ کا مطمح نظر بھی بلند ہوا۔ انیسویں صدی تاریخ کی سائنس میں نمایاں انقلاب کا پیش خیمہ بن کر آئی۔ اگر ہیگل جس نے تصوریت اور عقلیت پر اپنے فلسفہ کی اساس رکھی ہے تاریخ کو تصوری نقطۂ نظر سے جانچتا ہے۔ تو کارلایل تاریخ کو صرف ابطال عالم کے سوانح کی حیثیت دیتا ہے۔ اُسی زمانے میں یہ خیال پیدا ہوا کہ تاریخ ماحول اور خارجی محرکات کے نتائج کا نام ہے۔ اور ماحول سے مجرّد کرکے اُس کا مطالعہ گمراہ کن ہے۔ اِسی خیال کو کارل مارکس نے زیادہ قوت سے پیش کیا۔ اور تاریخ کے مادی اور معاشی تصور پر زور دیا۔ جدید ترین تھیوری کے مطابق تاریخ کے تصور میں اور وسعت پیدا ہوئی اور اہل علم نے تسلیم کیا کہ تاریخ کی کوئی ایک شاخ حیاتِ انسانی کے عظیم ۔ ۔ ۔ ـــــــ مجموعے کی ایک جھلک سے زیادہ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل ہر شعبے میں تخصص کو پسند کیا جاتا ہے۔ ہر چہ گیرید مختصر گیرید۔ علمی حق پوشی ہوگی اگر اِس سلسلے میں مسلمانوں خصوصاً عربوں کے اہم کارناموں کا تذکرہ نظرانداز کر دیا جائے اُنھوں نے اِس فن شریف کو مذہبی فریضے کی حیثیت سے شروع کیا۔ اور جلد ایک مستقل علم بنا دیا۔ در اصل فن حدیث کی تدوین (جو بجائے خود اتنا بڑا شاہ کار ہے کہ کسی قوم کے علمی آثار میں اُس کی نظیر مفقود ہے) نے ان کو تاریخ کی ضرورت کی جانب متوجہ کیا۔ اور سیر و مغازی کے شوق نے تراجم و سوانح رجال کا ذخیرہ فراہم کر دیا۔ ہجرت کی ابتدائی

صدیوں میں جو ممتاز مورخ گذرے ہیں اُنھوں نے تاریخ میں صحت و دیانت کا سختی سے لحاظ رکھا ہے۔ چنانچہ وہ کسی واقعے کو اُس وقت تک نقل نہیں کرتے جب تک کہ وہ معتبر اور مسلسل اسناد کے سلسلے سے واقعے کے چشم دید گواہ تک منتہی نہ ہو۔ وہ حقیقت کو جوں کا توں نقل کر دینا اپنا فرض سمجھتے ہیں اور اُس کے محرکات و اسباب پر رائے قائم کرنے کا حق قاری کے لئے چھوڑ دیتے ہیں۔ عہد اسلام[1] کے ابتدائی زمانے کے مورخوں میں ابن اسحٰق۔ طبری۔ کلبی۔ واقدی۔ اسدی۔ مسعودی کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں لیکن شروع میں درایت سے زیادہ روایت۔ اور استدلال و استنباط سے زیادہ جرح و تعدیل کی گرم بازاری رہی۔ یہاں تک کہ ایک ایسا بالغ نظر مورخ پیدا ہوا جس نے تاریخ کے نظریات میں انقلاب پیدا کر دیا جس نے اِس فن کو ایک علم کی حیثیت عطا کی۔ اور جس کو مشرق و مغرب دونوں نے تاریخ کا امام تسلیم کیا۔ یہ ابن[2] خلدون (المتوفی ۸۰۸ھ ہجری) تھا۔ اُس کی تاریخ خصوصاً مقدمہ اُس کے عہد سے لیکر اب تک ہر صاحب فن کے لئے شمع راہ کا حکم رکھتا ہے۔ فاضل موصوف نے اپنی کتاب میں جو تمام عربی علوم و تمدن پر حاوی ہے جس ژرف نگاہی۔ اصابت رائے اور سلاست بیان کا ثبوت دیا ہے اُس نے کتاب مذکور کی قدر و قیمت میں چار چاند لگا دئے ہیں۔ اور یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ اُس کی نظیر اسلامی تصانیف میں۔ بلکہ اُس عہد کی تمام تصانیف میں نہیں ملتی۔ ایک مورخ کے فرائض کیا ہیں۔ اِس کا جواب خود ابن خلدون کی زبانی سنئے۔ وہ مقدمہ[3] میں لکھتا ہے۔
"مورخ کے لئے نہایت ضروری ہے کہ وہ موجودات عالم کی طبیعت اور سیاست کے قواعد و اصول اچھی طرح جانتا ہو۔ اور واقف ہو کہ سیرت و اخلاق۔ مذہب و ملت وغیرہ میں زمان و مکان۔ ملک و قوم کے بدلنے سے کیا کیا تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ اور قدرت رکھتا ہو کہ حاضر کو غائب کے ساتھ مماثل یا مغائر قرار دینے کے لئے وجہ توفیق و تفریق

---

[1] دائرۃ المعارف بستانی [2] انسائی کلوپیڈیا آف اسلام [3] ترجمہ مقدمہ ابن خلدون

پیدا کر سکے۔ اور سلطنت وملت کے اصول اور اُن کے ظہور وحدوث کی علتوں اور ملک کے رہنے والوں کے احوال واخبار سے آگاہ ہو۔ تاکہ ہر حادثہ کی لِم اور ہر طرح کی خبروں کے اسباب کو سمجھ سکے اور پھر خبر منقول کو اُس کے اصول وقوانین پر جانچے۔ اگر ان کے موافق اور مقتضائے وقت پائے تو اُس کی تصدیق کرے۔ ورنہ تکذیب وتردید"

دوسری جگہ روایت پر درایت کو ترجیح دیتے ہوئے رقم طراز ہے۔" اس قسم کی بہت سی باتیں ہیں جن کا صدق وکذب طبیعتِ عمران کے جاننے ہی سے دریافت کیا جاسکتا ہے۔ اور یہ طریقہ اخبار کی تحقیق وتنقید اور صدق وکذب میں تمیز کرنے کیلئے سب طریقوں سے بہتر اور بھروسے کے قابل ہے۔ اور راویوں کی تعدیل پر مقدم۔ کیوں کہ راویوں کی تعدیل کی ضرورت تو اُس وقت ہے کہ پہلے معلوم ہوجائے کہ خبرِ مسموع ممکن بھی ہے یا نہیں اگر ممکن ہی نہیں ہے تو پھر اُن کے حال میں جرح وتعدیل کرنے سے کیا فائدہ" اقتباسات طویل ہوگئے لیکن مورخ علام کا نقطۂ نظر واضح کرنے کے لئے اِن کی ضرورت تھی۔ اُس نے اپنی تاریخ میں اقوام کے طبعی وجغرافیائی ماحول اور اُس کے آثار ونتائج سے فلسفیانہ بحث کی ہے۔ اور اُس کی روشنی میں عام تاریخی بیانات کے صدق و کذب کی وجوہ تلاش کی ہیں

فارسی میں بھی تاریخ کا ذخیرہ کافی ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ فارسی مورخین نے ابن خلدون کے قائم کردہ معیار پر زیادہ توجہ نہ کی۔ البتہ اہل مغرب نے ابن خلدون کے نصب العین کو مشعل ہدایت بنایا۔ بلکہ اُس کی رہنمائی میں اِس فن کو اور زیادہ ترقی دی۔ تاہم یہ ماننا پڑے گا کہ یوروپ والوں کی اکثر تاریخوں پر تاریخ سے زیادہ سیاست کا رنگ چھایا ہے اور اُن سے صداقت کی بجائے۔ پروپاگنڈا مقصود ہوتا ہے۔ ہمارے ہندوستان ہی کو کیوں نہ دیکھ لیجئے۔ یہاں جو تاریخیں انگریزوں کے قلم سے یا اُن کے اثر سے لکھی گئیں تقریباً سب میں تصویر کا صرف تاریک رخ

دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ جیسا کہ بعض[1] انصاف پسند انگریز اہل قلم نے اعتراف کیا ہے اِن تاریخوں کا مقصود یہ تھا کہ "لڑاؤ اور حکومت کرو" کے اصول کے ماتحت ہندو مسلمان ایک دوسرے سے نفرت کرنے لگیں۔ ہندو لوگ مسلمان حکم رانوں کو ظالم سمجھ کر انگریزی حکومت کو اپنے حق میں سایۂ رحمت سمجھیں اور ہندوستان میں سلطنت برطانیہ کو استحکام حاصل ہو۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ جو طلبہ اِن تاریخوں کو پڑھ کر نکلے اُن کے ذریعے سے باہمی منافرت کا تخم سرسبز ہوا۔ اور اُس کا پھل آج ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ کسی تخم کے پھلنے کے واسطے ضرورت ہے کہ زمین اُس کے قبول کرنے کیلئے پہلے سے تیار اور موزوں ہو۔ تاہم اُن تواریخ کے اثر کو جھٹلانا ممکن نہیں جنھوں نے اُس زمین میں آبیاری کا کام دیا۔

مسلمان حکم رانوں کا ذکر آگیا ہے تو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے بارے میں چند جملے عرض کر دیئے جائیں۔ سندھ کو چھوڑ کر ہند میں جو مسلمان فاتح آئے (خواہ وہ نام نہاد پٹھان[2] ہوں یا مغل) وہ نسلاً عرب نہ تھے۔ اور عموماً صحیح اسلامی روایات سے بیگانہ تھے۔ کہنا چاہئے کہ اُن کا اسلام سیکنڈ ہینڈ اسلام تھا۔ اِس لئے اُن سے خلفائے راشدین کے طرز عمل کی توقع عبث ہے۔ اِن فاتحین اور سلاطین میں بیشتر معدلت شعار تھے۔ اور جو ظالم اور نفس پرور تھے ان میں بھی کچھ اچھے پہلو تھے۔ لیکن یوروپین مورخین۔ اور اُن کی تقلید میں دوسرے غیر مسلم اہل قلم نے سب اچھے بروں کو ایک ہی لکڑی سے ہانکا اور ان کی تمام برائیوں کا ذمہ دار اسلام کو ٹھہرایا ہے۔ بے شبہ عام طور پر دنیا کی یہی روش رہی ہے۔ جیسا کہ مشہور ہے کہ کسی مسلمان نے حضرت بایزید بسطامیؒ کے عہد میں کسی

---

[2] ہندوستان کے مسلمان بادشاہ پٹھان اور مغل کے لقب سے مشہور ہیں۔ حالانکہ لفظ پٹھان کا مختلف خالو ادوں مثلاً غلام وخلجی (ترک)۔ تغلق (ولایتی اور نومسلم کی آمیزش) سید (عرب) اور لودی و سوری (پٹھان) پر آزادانہ اطلاق کیا گیا ہے۔ مغل بھی در اصل ترک تھے۔ ۱ع۔ ایلیٹ

مجوسی کو اسلام کی تلقین کی۔ اُس نے جواب دیا۔ کہ اگر تمھاری مراد اُس اسلام سے ہے جو بایزید کا ہے تو مجھے اس کی قدرت نہیں۔ اور اگر اُس اسلام سے ہے جو تمہارا ہے تو مجھ کو ضرورت نہیں۔ جیسا کہ رومی کہتے ہیں۔

ہست ایمانِ شما زرق و مجاز   راہ زن مانند آں بانگِ نماز

مگر سچ پوچھئے تو یہ روش تحقیق حق کی راہ سے دور ہے۔

ایک[1] یوروپین مُصنّف نے سچ لکھا ہے کہ افراد و اقوام کی طرح ہر مذہب کا بھی ایک مزاج ہوتا ہے جو اُس کے تمام اشغال و اعمال میں کارفرما ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ جس طرح یہودیت کی اساس فرض، مسیحیت کی محبّت۔ بدھ مت کی ضبط ہے۔ اسی طرح اسلام کی اساس عدل ہے بیشک قرآن و حدیث کی تعلیمات اوّل سے آخر تک عدل پر مبنی ہیں۔ انفرادی علائق میں ضرور احسان کو ترجیح دی گئی ہے۔ لیکن اجتماعی معاملات میں عدل ہی اسلام کا طغرائے امتیاز رہا ہے۔ دوست تو دوست، مذہبِ اسلام دشمن کے ساتھ بھی (خواہ حالت جنگ کیوں نہ ہو) عدل کا حکم دیتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ لایجرمنکم شنأن قوم علیٰ ان لا تعدلوا۔ کسی قوم کی عداوت تمھیں اِس جرم کا مرتکب نہ بنا دے کہ تم جادۂ عدل سے ہٹ جاؤ۔ غرض اسلامی شریعت کا صریح اور قطعی حکم ہے کہ مسلمان اگر حاکم ہے تو اچھا حاکم بن کر رہے۔ اور اگر بدقسمتی سے حالات نے اُس کو محکوم بنا دیا ہے تو اچھا محکوم ثابت ہو۔ اِس کو اِس نظر سے دیکھئے کہ مسلم کی غیر مسلم کے ساتھ تین حیثیتیں ہو سکتی ہیں۔ برتر۔ برابر۔ اور کمتر۔ پہلی صورت کے متعلق ہادیٔ اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کا صاف فرمان ہے کہ اگر کوئی مسلمان کسی ماتحت (ذمّی) غیر مسلم کو ستائے گا تو میں قیامت کے دن اُس مسلمان کے مقابل مدّعی ہوں گا۔ اللہ اکبر جس کے مقابل سرورِ عالمؐ خود مدّعی ہوں اُس کا کہاں ٹھکانا۔ نعوذ باللہ من غضبہٖ و غضب رسولہٖ۔ بلاخوف

---

[1] برٹانیکا۔

تردید کہا جاسکتا ہے کہ دنیا کے کسی مذہب نے دوسرے مذہب کے پیروؤں کو اتنا عظیم الشان چارٹر نہیں بخشا۔ دوسری صورت جب کہ دو مسلم یا غیر مسلم افراد یا حکومتوں میں برابر کا معاہدہ ہو ایسی حالت میں اسلام سختی کے ساتھ وفائے عہد کی تاکید کرتا ہے۔ واوفوا بالعھد۔ اِنّ العھد کان مسئولا اور عہد کو پورا کرو کیونکہ عہد کی ضرور باز پرس ہوگی یہاں تک کہ اُس غیر مسلم معاہد کے خلاف کسی مسلمان کو مدد دینا۔ یا بغیر کافی نوٹس دئے ہوئے معاہدے کا ختم کردینا حرام ہے۔ رہی تیسری صورت سو اُس میں بھی کوآپریشن یعنی تعاون[1] کا حکم ہے۔ بشرطیکہ یہ تعاون بِر و تقویٰ پر مبنی ہو۔ اِثم و عُدوان پر نہ ہو۔ کیونکہ لاطاعۃ المخلوق فی معصیۃ الخالق۔ کوئی انصاف پسند بتائے کہ اس سے بڑھ کر عادلانہ اور متوازن قانون کونسا ہوسکتا ہے۔ اور یہ صرف قول نہیں۔ عہد سعادت و خلافت راشدہ میں اس کے عملی مثالیں بکثرت ہیں۔ جو واقفان آثار سے مخفی نہیں۔

اسی بنا پر میرا خیال ہے کہ ہندوستان کے مسلم سلاطین اگرچہ اسلامی تعلیم کا صحیح نمونہ نہ تھے اور ان میں بعض جفا پیشہ بھی تھے تاہم وہ مجموعی طور پر اصول معدلت پر کاربند تھے۔ اور کلیتہً مطلق العنان نہ تھے۔ کیونکہ وہ اِس حقیقت سے آگاہ تھے کہ الملک یبقیٰ مع الکفر و لا یبقیٰ مع الظلم۔ حکومت کفر کے ساتھ تو باقی رہتی ہے مگر ظلم کے ساتھ باقی نہیں رہتی۔ ہندوستان کی اکثر تاریخوں میں خصوصاً جو ہمارے اسکولوں اور کالجوں میں رائج ہیں ایک عیب یہ بھی ہے کہ اُن میں سلاطین کے کیرکٹر۔ فتوحات۔ اور ملکی انتظامات کے دائرے سے نکل کر عام اہل ملک کی تہذیب و تمدن۔ علوم و فنون صنعت و حرفت سے کم اعتنا کی گئی ہے۔ ہم بادشاہوں۔ اُن کے دربار و اہل دربار سے تو روشناس ہوجاتے ہیں۔ مگر ملک کے ذہنی و ثقافی کارناموں کے آئینے میں اہل ملک کی جیتی جاگتی

---

[1] نہ صرف تعاون بلکہ مسلمانوں کو ان حالات میں وفاداری کی تعلیم ملتی ہے جیسے کہ صحابہؓ نے حبش میں نجاشی کے ساتھ برتی۔ البتہ خدا کے ساتھ وفاداری مقدم ہے۔

چلتی پھرتی شکلیں نظر نہیں آتیں۔ مثلاً ہمارے طلبہ جب غزنوی یا غوری کا حال پڑھتے ہیں تو زیادہ سے زیادہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ وہ فاتح تھے (لٹیرے نہ سہی) جنھوں نے اپنے زور بازو سے ہند کو فتح کیا۔ اور عسکری قوت کے ذریعے سے اس کو ایک گونہ وحدت نظام بخشی۔ لیکن وہ اس سے بالکل نابلد ہوتے ہیں کہ مسلمانوں نے اگر ہندوستان کو کیسا پایا۔ کیا لے کر آئے اور اُس کو کیا دیا۔

یہ صحیح ہے کہ ہندوستان کی تہذیب قدیم ہے۔ یہاں کی ویدانت، فلسفہ، ہیئت، جوتش صدیوں سے مشہور ہیں۔ اور یہاں کے رشی اور مُنی اپنی راہبانہ اور حکیمانہ تعلیمات کے لئے خاص امتیاز رکھتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود مسلمانوں نے اگر ہندوستان سے کچھ لیا تو اُس سے زیادہ دے بھی دیا۔ توحید کا تصور۔ دختر کُشی اور ستی کی روک تھام عقد بیوگان اور مساوات کی تعلیم مسلمانوں ہی کی آمد کے نتائج و برکات ہیں۔ اس کے علاوہ اُنھوں نے رہنے سہنے۔ کھانے پینے۔ اور تہذیب کے دوسرے پہلوؤں میں تکلف وتجمل و آسائش کی نئی نئی ایجادوں کی بدولت یہاں کے تمدن کی سادہ تصویریں نہایت دلکش اور دیرپا رنگ بھرے پادشاہ بابر کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ جب وہ ہند میں آیا ہے تو یہاں روزمرہ کی ضروریات کی بیسیوں چیزیں ناپید تھیں تزک بابری کے الفاظ[1] ملاحظہ ہوں " اسپ خوب نے، گوشت خوب نے، انگور و خربزہ و میوہائے خوب نے یخ و آب سرد نے، حمام و مدرسہ نے، شمع و مشعل نے، شمعدان نے، بجائے شمع و مشعل . . . چرکینے می باشد کہ ڈیوٹ می گویند . . . . در باغ و عمارت ہا آب ہائے رواں نے، در عمارات صفا و ہوا و اندام و سیاق نے، رعیت و مردم وغیرہ عام، پائے برہنہ می گردند، لنگوتہ گفتہ یک چیز می بندند" آج کل[2] کلچر کی وحدت کا صو

---

[1] ترجمہ فارسی از تزک

[2] اس مبحث پر بعض اسلامی جرائد مثلاً معارف۔ صدق۔ جمعیت۔ مدینہ وغیرہ میں حال میں نہایت مدلل اور بلند پایہ آرٹیکل نکلے ہیں۔ جو پڑھنے کے قابل ہیں۔

بڑی بلند آہنگی سے پھونکا جارہا ہے اور مسلمانوں کو اُس وحدت کی طرف نہایت تحکّم کے ساتھ بلایا جارہا ہے۔ لیکن سچ پوچھئے تو اِس دعوت میں کئی مغالطے پوشیدہ ہیں جن کو صاف کئے بغیر آگے بڑھ جانا ایک غلط اقدام ہوگا۔ مثلاً کیا ہندوستان کے طویل وعریض بّرِعظیم میں واقعی ایک ہی کلچر ہے یا مختلف۔ اگر مختلف ہیں تو کون اجزا مشترک ہیں کون متباین۔ اجزائے متبانیہ میں کون کون پہلو کسی جماعت کی انفرادیت کی بقا کے لئے ضروری ہیں۔ اور کن میں مفاہمت ممکن ہے۔ کیا یہ مفاہمت یک طرفہ ہونی چاہیے یا طرفین کی جانب سے۔ اور بالجبر ہو یا بالرضا۔ کیا وحدت کے داعی خود اُردو زبان کو جو مشترک کلچر کی زندہ نشانی ہے مٹانے پر نہیں تُلے ہوئے ہیں۔ ایسا تو نہیں کہ اِس دعوت کی تہ میں ایک جماعت کی انفرادی حیثیت کو مٹانا مقصود ہو۔ کیا یہ غیر ممکن ہے کہ ایک جماعت اپنی انفرادی حیثیت سے دست بردار ہوئے بغیر دوسری جماعتوں کے ساتھ سیاسی اور ملکی مفاد کی خاطر جدوجہد کرسکے۔ اور کیا اقوام کی تاریخ میں اس کی متعدد مثالیں موجود نہیں یہ اور ایسے ہی متعدد سوالات ہیں جن کا جواب دینا داعیانِ وحدت کا فرض ہے۔

الغرض کہنا یہ ہے کہ جس طرح انگریزوں نے ہمارے ملک کے تمدّن پر اپنے گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ مسلمانوں نے بھی زبردست اثر ڈالا ہے۔ فرق یہ ہے کہ انگریز یہاں اجنبی کی طرح آئے اِسی طرح رہے۔ اور اسی طرح چلے گئے۔ اِس کے برخلاف مسلمان یہاں رہنے بسنے کی غرض سے آئے تھے۔ اُن کے اسلاف و اخلاف نے مرنے جینے کے لئے اِسی سرزمین کو پسند کیا۔ اور اُن کو یہاں قیام کا ایسا ہی حق ہے جیسا دوسروں کو۔ اگر ایک ہزار سال کے قیام کے باوصف وہ اجنبی اور بدیشی ہیں تو خطا معاف بات دور تک پہونچتی ہے۔ باز آمدم۔ بات کہاں سے کہاں پہونچ گئی ؎ شب آبِ خرگشتہ و افسانہ از افسانہ می خیزد ٭ دگر از سر گرفتم قصۂ زلفِ پریشاں را

اس تمام تفصیل سے یہ مقصود تھا کہ متداول تاریخوں میں اس طرح کی متعدد کوتاہیاں پائی جاتی ہیں۔ ضرورت ہے کہ اب جو تاریخیں مرتب کی جائیں وہ اپنے موضوع کے ہر پہلو کو روشنی میں لائیں۔ جس سے حقائق تاریخی کے ساتھ اُن کا اصلی پس منظر بھی اپنے تمام آثار و نتائج کے ساتھ پیش نظر ہو جائے۔ یہ امر موجب مسرت ہے کہ ہمارے کرم فرما قاری محمد بشیر الدین صاحب پنڈت ایم اے نے اسلامی ہند کی جو تاریخ مرتب کی ہے وہ بڑی حد تک اس ضرورت کو پورا کرتی ہے۔ قاری صاحب موصوف ایم اے اور ہندی و سنسکرت کے عالم ہیں۔ اُنھوں نے اپنے موضوع پر انگریزی فارسی اور ہندی کے متعلقہ مواد سے پورا فائدہ اٹھایا ہے۔ اور ہر اچین بھارت کے متعلق ایک علمی (LAY-MAN) کی طرح نہیں۔ بلکہ ماہر فن کی حیثیت سے بحث کی ہے۔ اسی کے ساتھ عبارت کا زور چستی سلاست و دلکشی اس درجہ ہے کہ کتاب زیر نظر میں تاریخ کی حقیقت نگاری کے دوش بدوش افسانے کی سی دلچسپی پیدا ہو گئی ہے۔ کتاب واقعات کی کھتونی نہیں۔ بلکہ منطقی نتائج کی مدلل بحث ہے۔ جس میں مختلف قوموں اور حکومتوں کے بننے بگڑنے۔ عروج و زوال محاسن و معائب کی مکمل داستان پیش کی گئی ہے۔ اور رفتار زمانہ پر ماحول کے طبعی محرکات کی کارفرمائی دکھائی گئی ہے۔

فاضل مولف نے اصل کتاب کو تین جلدوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلی جلد محمود غزنوی کی آمد سے قبل ہندوستان کی حالت۔ محمود کے حملوں۔ فتوحات اور دیگر سوانح پر مشتمل ہے۔ دوسری جلد میں محمد غوری۔ غلاموں۔ اور خلجیوں کا تذکرہ ہے۔ اور تیسری سلطنت مغلیہ کے آغاز پر منتہی ہوتی ہے۔

اس وقت کتاب مذکور کی دوسری جلد ہمارے پیش نظر ہے جو "ہندی قرون وسطیٰ" کے نام سے موسوم ہے۔ کتاب کے آغاز میں ایک طویل محققانہ دیباچہ ہے جس کو کتاب کا عطر یا خلاصہ کہنا چاہئے۔ اس مقدمے میں مولف نے کامل دیانت و متانت کے

ساتھ نکتہ سنجانہ اور محققانہ انداز میں وہ مبادیات یا اصول متعارفہ پیش کئے ہیں جن کے بغیر اسلامی ہند کی تاریخ کا مطالعہ نہ صرف ناقص۔ بلکہ گمراہ کن ہوسکتا ہے۔ اُنھوں نے دکھایا ہے کہ کیونکر مسلمان ہندوستان میں ہندوستانی بن کر رہے۔ کیونکر اُنھوں نے یہاں کی تہذیب پر اثر ڈال کر اور خود اُس کا اثر قبول کر کے ایک مشترک تمدن کی بنیاد ڈالی۔ اور کس طرح تفرقوں کو مٹا کر ایک وحدت سیاسی قائم کی۔ اور یہ بتایا ہے کہ اُس عہد کی تاریخ کے مطالعہ کرنے والے کے لئے عہد مذکور کے مقتضیات۔۔ اور دوسری قوموں کے تقابلی حالات کا پیش نظر رکھنا کس قدر ضروری ہے۔ اِس کے بعد "اسلامی جہاد کی حقیقت"[1] پر بحث کی ہے اور متکلم اسلام حضرت مولٰنا ابو الاعلیٰ مودودی کی مشہور تصنیف الجہاد فی الاسلام سے متعدد اقتباسات دئے ہیں۔ وقت نہیں کہ مسئلہ جہاد کی جس کو ہمیشہ اغیار نے بدنما صورت میں پیش کیا ہے شرعی حیثیت یہاں تفصیلاً نہ سہی اجمالاً ہی واضح کی جا سکے۔ البتہ ذیلی عنوانات سے مسئلے کی اہمیت کا کسی قدر اندازہ ممکن ہے۔ عنوانات یہ ہیں۔ حرمت نفس۔ قصاص۔ مقصد جنگ۔ مجاہدین کا درجہ۔ مدافعانہ جنگ۔ مصلحانہ جنگ۔ مقدمے کے آخر میں مؤلف نے اسلامی نظام حکومت کے بنیادی اصول، کے عنوان سے یہ واضح کیا ہے کہ حکومت کا تصور اسلام میں کیا ہے۔ اور دوسرے مذاہب و اقوام میں کیا ہے۔ یہاں سے اصل کتاب کی ابتدا ہوتی ہے جس کے باب اوّل کا موضوع ہندوستان میں آمد کے وقت اسلامی سوسائٹی کا رنگ" ہے۔ اِس باب کا مقصد یہ ہے کہ بقول مؤلف "اِس کی روشنی میں ہندوستان کے مسلم سلاطین کے اعمال و کردار کا جائزہ لیکر ہندوستان کی تاریخ میں اُن کا صحیح درجہ متعین کیا جا سکے"۔ نیز اسلامی سوسائٹی سے ہندوستانی زندگی پر جو اثرات مرتب ہوئے اُن کی افادی

---

[1] تاریخ مذکور صفحہ ۱۴ و مابعد۔

حیثیت متحقق ہو سکے۔ اس میں موٗلف نے تحریک اسلامی کے متعدد فروعی نقش ونگار جن کا ارتقاء صدیوں کا رہین منّت ہے پوری جامعیت مگر اختصار کے ساتھ اُجاگر کر کے دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ تصوّف[1] کے عنوان کے تحت اُنھوں نے فقہ باطنی (تصوف) اور فقہ ظاہری (شریعت) کی تقسیم کرنے کے بعد دونوں کے مجموعے کو تفسیر شریعت کے نام سے تعبیر کیا ہے اور دونوں میں کُل وجزو کا رشتہ قرار دیا ہے۔ مگر ہمارے نزدیک یہ تقسیم "متراکب" ہے۔ اور دونوں میں کُل وجزو کی بجائے باہم قسیم کا رشتہ ہے۔ لیکن لامشاحۃ فی الاصطلاح۔ ہاں اس میں شک نہیں کہ دونوں ایک دوسری کی متمم ہیں۔ اور شریعت، طریقت (یا تصوف) سے جدا "لفظِ بے معنی" اور طریقت شریعت سے الگ "معنیٗ بے لفظ" سے زیادہ نہیں۔ اور اسلام بیک وقت دونوں حیثیتوں کا جامع ہے۔ اِسی[2] طرح اِحداث فی الدین۔ اور اِحداث للدین میں جو فرق دکھایا گیا ہے ہمارے خیال میں جمہور اہل سُنّت اُس کے موٗید نہیں۔

بہر حال یہ جزوی اُمور ہیں۔ جن سے کتاب کی افادیت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ اِس باب کی وہ فصل جس میں ہندوستان میں آنے سے پہلے مسلمانوں کی علمی ترقیاں گنائی گئی ہیں۔ بجائے خود نہایت قیمتی، اور قابلِ قدر ہے۔ تیسری فصل سیاسی کشمکش بھی کچھ کم اہم نہیں۔ اور پوری توجہ سے پڑھنے کے لائق ہے۔

باب دوم یعنی "ہندوستان عہدِ یمینی سے پہلے" نہایت اہم اور مفید معلومات پر مشتمل ہے جس میں ہندوستان کے مذہبوں۔ فرقوں۔ رسم۔ رواج۔ اعتقادات اور توہمات کی نہایت صاف تصویر کھینچی گئی ہے۔ درحقیقت مقدمے کے بعد کتاب کا پہلا اور دوسرا باب کتاب کی جان ہیں۔ اور فاضل موٗلف مستحق مبارکباد ہیں کہ اُنھوں نے پوری جانفشانی اور جگر کاوی سے اِن حقائق کو ڈھونڈھ کر حوالوں سمیت بے کم وکاست۔ اور بے غلو وتعصب

---

[1] ایضاً صفحہ ۴۲ و مابعد۔ [2] ایضاً ص ۵۲۔

قلم بند کر دیا اور تاریخ کے طلبہ کے لئے بڑی سہولت بہم پہونچا دی۔

غرض یہ دونوں باب درحقیقت پس منظر کا حکم رکھتے ہیں۔ اصل تصویر یعنی ہندوستان کی سیاسی تاریخ کا آغاز باب سوم سے ہوتا ہے۔ اس باب اور ابواب مابعد میں مولف نے شمالی ہند اور جنوبی ہند کی مختلف مشہور و غیر مشہور حکومتوں کا بیان کرنے کے بعد خاندان غور کی اصل۔ محمد غوری کے کارناموں۔ فتوحات اور وفات پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ اور پھر غلام خاندان اور دوسرے خاندانوں کے مفصل حالات قلم بند کئے ہیں۔ اور جیسا کہ اوپر کہا گیا واقعات کے ذکر میں اُن کے اسباب و عواقب۔ مالہٗ وماعلیہ کا بیان کامل دقتِ نظر کے ساتھ کیا ہے۔ ممکن ہے کہ قارئین میں سے بعض کو مولف کی رایوں سے کہیں کہیں اختلاف ہو۔ لیکن اُن کی مورخانہ بصیرت۔ اور علمی دیانت سے شاید کسی کو انکار نہ ہو۔

اِن اوراق کو پڑھنے کے بعد ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ اسلام نے غلاموں کا مرتبہ حیوانیت کی پستی سے اُٹھا کر انسانیت کی کس بلندی پر پہونچا دیا تھا کہ اب غلامی اُن کو سوسائٹی میں بڑے سے بڑے درجے تک پہونچنے میں بھی مانع نہ ہو سکتی تھی۔ اِسلامی تاریخ پر جن کی نظر ہے وہ جانتے ہیں کہ اِنھیں غلاموں میں سیکڑوں مقتدایان عظام۔ صوفیہ کرام۔ شاہان باقتدار اور امیران ذی وقار ہو گذرے ہیں۔ خود ہندوستان کا غلام خاندان ہمارے دعوے کا شاہد عدل ہے۔ اِن غلاموں نے اپنی محنت و لیاقت سے چھوٹے درجے سے ترقی کر کے حکومت ہند کی باگ سنبھالی اور بڑے بڑے سادات اور شیوخ نے خوشی سے اُن کی اطاعت قبول کی۔ قطب الدین شمس الدین۔ ناصر الدین اور غیاث الدین جیسے جوہر قابل تھے اُن کے کارناموں سے ظاہر ہے۔ قاری صاحب نے اسلامی ہند کے ابتدائی عہد میں صوفیہ کرام کی خدمات کا بھی ضمناً تذکرہ کیا ہے۔ دراصل یہ موضوع مستقل باب کا محتاج تھا۔ اِسمیں کوئی شبہ نہیں کہ اسلام کی اشاعت میں بادشاہوں کی قوت سے

زیادہ درویشوں کی ہمت اور تاجروں کی استقامت کو دخل ہے جسکی تصدیق چین وجاوا وغیرہ کی اسلامی آبادیوں سے ہوتی ہے۔ ہندوستان کے بھی بعید ترین گوشوں میں آفتاب اسلام کی شعاعیں انھیں بوریانشین خرقہ پوشوں کے ذریعے سے پہونچیں حضرت نظام الدین محبوب الٰہی بدایونی اور دوسرے صوفیۂ کبار اور اُنکے خلفائے نامدار کی خدمات کون نہیں جانتا۔

مُسلم ہند کی تاریخ کے ضمن میں یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ مسلم حکمرانوں نے اگر ہند پر قبضہ کیا تو عموماً اپنے امکان بھر اُس کا حق بھی ادا کیا۔ انھوں نے ہند کے سیاسی انتشار کو دور کرکے ملکی وحدت قائم کی۔ تمدن کے سادہ خاکے میں نئے نئے رنگ بھر کر دیس کا تہذیبی معیار بلند کیا۔ ایک طرف ملک کو ڈاکوؤں اور چوروں سے پاک کیا اور دوسری طرف بیرونی حملہ آوروں (مثلاً منگولوں) کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو پتھر کی چٹان بن کر روکا۔ اور مظلوموں کی دادرسی اور ظالموں کی سرکوبی میں کبھی ملت ومذہب کا امتیاز روا نہ رکھا۔ اُن کی ذمہ دارانہ خوش انتظامی اور فرض شناسی کی بین دلیل یہ ہے کہ "ایک ہزار سال[1] کی طویل مدت میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان صرف دو بلوے ہوئے۔ اور وہ بھی مغلیہ حکومت کے آخری دور میں"۔

بیشک مسلمان بادشاہوں میں بعض ناانصاف اور خود غرض افراد بھی گذرے ہیں لیکن "سیاہ بھیڑیں" کس گلے میں نہیں ہوتیں۔ اُن کی وجہ سے اسلام اور مسلمانوں کی تمام خوبیوں سے اغماض کرنا یقیناً ناانصافی ہوگی۔

المختصر قادری صاحب موصوف نے زیرنظر تاریخ لکھ کر ایک مفید خدمت انجام دی ہے اور ہمیں توقع ہے کہ علم دوست بے تعصب حلقوں میں اُنکی یہ علمی سعی مشکور ہوگی۔

ضیاء احمد ایم اے بدایونی
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ ۵ اگست ۱۹۴۹ء

---

[1] ایضاً۔ صفحہ ۱۔

ی

اصل متن

تاریخ

ہندی قرونِ وسطیٰ

جلد دوم

از عہد

سلطان محمد غوری تا سلطان قطب الدین مبارک شاہ خلجی

یعنی

۱۱۸۶ء تا ۱۳۲۰ء

مرتبہ

قاری محمد بشیر الدین پنڈت (بدایونی)

ایم ۔ اے (علیگ)

مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ

اگست ۱۹۴۹ء

قیمت ۶ علاوہ محصول ڈاک

بسم اللہ الرحمن الرحیم

لمحۂ فکریہ

انگریز کے زرگرانہ افسانوں پر — یکسر خطِ تنسیخ یہ دیباچہ ہے
للہ ذرا غور سے پڑھیئے اس کو — روشن گرِ تاریخ یہ دیباچہ ہے

۱۔ ہندوستان میں اسلامی دورِ حکومت ۷۱۲ء سے لیکر ۱۸۵۷ء تک سمجھا جاتا ہے یعنی مسلمان ایک ہزار برس سے زیادہ ہندوستان پر قابض رہے۔ اس طویل عرصہ میں نسلِ انسانی کی بیسیوں پشتیں گزر چکی ہیں جنھوں نے مسلمان حکمرانوں کے زیر سایہ اپنی عمریں گزاریں اور زندگی کے ہر شعبہ میں ترقی کے تدریجی مدارج طے کئے جن کا انکار کرنا کفرانِ نعمت ہے۔

۲۔ انگریزوں کے برخلاف مسلمانوں نے ہندوستان کو فتح کرکے اس کو اپنا وطن بنایا اور اپنی بہتر و برتر تہذیب و تمدن سے ہندو سبھیتا اور ہندو سنسکرتی کو کچھ اس طرح متاثر کیا کہ معاندین کی اُن تمام کوششوں کے باوجود جو انگریزی عہد حکومت میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کرنے کے لئے کی گئیں یہ مشترکہ تہذیب مٹائی نہیں جا سکی۔ آپس میں ارتباط سے محبت و اخوت کی جو کیفیت رہی اس کا اندازہ یوں لگایا جا سکتا ہے کہ ایک ہزار سال کی طویل مدت میں "ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان صرف دو بلوے ہوئے"[1]

---

[1]: یہ بلوے مغلیہ حکومت کے آخری دور میں ہوئے جبکہ فرخ سیر برسرِ اقتدار تھا۔

۳۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمان انگریزی تہذیب کے فروغ پانے سے پہلے یہاں کے لئے غیر نہ تھے اور نہ اُن کو غیر سمجھا جاتا تھا۔ ان کی تہذیب ہندوستانی تہذیب تھی ان کا تمدن ہندوستانی تمدن تھا اور ان کی حکومت ہندوستانی حکومت تھی جس کو اگر کسی غیر کے ہاتھوں صدمہ پہونچتا تو اس سے جتنی تکلیف ایک مسلمان کو ہوتی تھی اتنی ہی ایک ہندو کو بھی چنانچہ جس وقت نادر شاہ نے ہندوستان پر حملہ کیا اس وقت پیشوا نے سندھیا کو جو خط لکھا ہے وہ قابلِ غور ہے۔ لکھا ہے "اس ملک میں دو دشمن نمودار ہوئے ہیں ایک پرتگالی اور دوسرا نادر۔ اگر ہم نے مِل کر مقابلہ نہ کیا تو خوف ہے کہ مغلوں کی حکومت (جو اپنی حکومت ہے) کہیں برباد نہ ہو جائے"[1] اور پھر کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ غدر تک ہندوؤں نے مسلمانوں کی طرح ہی سہی مغلیہ حکومت کو اپنی حکومت سمجھا اور ۱۸۵۷ء میں آخری مرتبہ بدیسی انگریز کو ہندوستان سے نکالنے اور مغلیہ حکومت کو از سرِ نو زندہ کرنے کے لئے جنگِ آزادی لڑی اور اس میں اپنے خون کا آخری قطرہ تک بہانے سے گریز نہ کیا اور پھر غدر فرو ہونے کے بعد جب ان سے انتقام لیا گیا تو دونوں نے پھانسی کے پھندے کو خوشی خوشی قبول کیا؟

۴۔ غدر کے بعد حالات یکسر بدل گئے۔ انگریز نے اپنی حکومت کے استحکام و بقا کے لئے ہندوؤں اور مسلمانوں کے ان گہرے دوستانہ تعلقات کو خطرناک سمجھتے ہوئے "لڑاؤ اور حکومت کرو" کی پالیسی پر عمل کیا۔ گو اس کی ابتدا فورٹ ولیم کالج کے افتتاح کے وقت پڑ چکی تھی جبکہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان لسانی افتراق پیدا کیا گیا لیکن اس پر شدت کے ساتھ عمل غدر کے بعد ہی ہوا۔ اس کام کے لئے تاریخ کے مضمون کو منتخب کیا گیا یہی ایک مضمون ایسا تھا جس کے غلط سلط اور بے بنیاد واقعات کو تاریخی حقیقت بنا کر پیش کرتے

---

[1] روزنامہ انجام دہلی صفحہ ۲ مورخہ ۲۴ نومبر ۱۹۴۸ء

سے اسکولوں اور کالجوں میں پڑھنے والے طالبِ علموں کے دل و دماغ کو زہر آلود کیا جاسکتا تھا چنانچہ آج یہ کتنی تکلیف دہ اور افسوسناک حقیقت ہے کہ ان اداروں کے فارغ التحصیل طلباء میں سے اکثر و بیشتر اگر وہ ہندو ہیں تو اپنے کو فرضی رانا پرتاب سنگھ اور سیواجی سمجھتے ہیں اور مسلمان اپنے کو محمود غزنوی اور اورنگ زیب، حالانکہ نہ ان کو رانا پرتاب سنگھ اور سیواجی جیسی بلند حوصلہ ہستیوں سے کوئی تعلق ہے اور نہ ان کو محمود غزنوی اور اورنگ زیب جیسی مایۂ ناز شخصیتوں سے۔ دونوں اپنی جگہ پر فرضی ہیں۔ اصلی کوئی بھی نہیں انگریز کا اس میں دوہرا فائدہ تھا۔ سلاطین ماضیہ کی صورت مسخ ہو جانے سے اگر مسلمان اپنے ماضی سے بیزار ہوجائیں یا ہندوؤں کے دل میں مسلمانوں کی طرف سے نفرت پیدا ہو جائے دونوں صورتوں میں انگریز کا بھلا تھا کیونکہ اس طرح انگریزی عہدِ حکومت کے برکات کو سراہنے یا بہ الفاظِ دیگر غلامی کا طوق زیبِ گلو کرنے میں دونوں پس و پیش نہ کرتے[1]۔ انگریز کو اپنے مقصد میں پوری پوری کامیابی ہوئی اس کا ادنیٰ ثبوت بہار و پنجاب کا وہ خونی ڈرامہ ہے جو ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء سے پہلے اور بعد کو کھیلا گیا اور جس میں اخلاق و شرافت کے تمام بندھن توڑ ڈالے گئے۔ انسانیت اس پر جتنا بھی ماتم کرے کم ہے۔

۵۔ اس میں شبہ نہیں کہ تاریخ ایک کچی دھات کے مانند ہے اس کو مختلف سانچوں سے جوڑ کر جیسی شکل آپ چاہیں بنا سکتے ہیں انگریز ہندوستان کو چونکہ اپنے سامراجی بندھن میں جکڑنا چاہتے تھے اس لئے اُن کے ایماء سے جو تاریخیں انگریزوں اور ان کے اتباع میں ہندوؤں اور مسلمانوں نے لکھیں ان سب نے اس مقصد کو بدرجۂ اتم پورا کیا۔ سر ایچ، ایم، الیٹ کی صدارت

---

[1] :— ان سرفروشوں اور جانبازوں کی جماعت کو اس سے مستثنیٰ سمجھنا چاہیئے جنھوں نے غدر کے بعد بھی آزادیٔ ہند کی جدوجہد کو جاری رکھا (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو کالا پانی، اسیر مالٹا، تاریخ کانگریس، ہمارے ہندوستانی مسلمان)

لایق صد ستایش ہے کہ اس نے انگریز کے اس مقصد کو چھپایا نہیں بلکہ اپنی کتاب کے شروع میں اس کو صاف طور سے ظاہر کر دیا کہ "اس کے پیش نظر یہ ہے کہ اگلے پیشرو اور حاکموں کے غیر منصفانہ عہد کی تاریکی کو دکھا کر اپنی (انگریز) قوم کے عہد حکومت کی روشنی دکھائے تاکہ ہندوستان کے رہنے والے اس کو سایۂ رحمت سمجھ کر ہمیشہ اطاعت مندانہ اخلاص کا خراج پیش کیا کریں"[سلہ] سر ہنری الیٹ شروع انگریزی عہد کا ایک نیم سرکاری نامور مؤرخ ہے اس کا یہ احسان ناقابلِ فراموش ہے کہ اس نے اسلامی عہدِ حکومت کی کمیاب و نادر تاریخ و جغرافیہ کی عربی و فارسی کتابوں کے ترجمے اور اقتباسات اپنی کتاب میں محفوظ کر دیئے جس سے ہر محقق نے فائدہ اٹھایا ہے مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ اس نے جن جن کتابوں کے ترجمے اور اقتباسات اپنی کتاب میں شامل کئے ان میں اگرچہ جا بجا علمی، تمدنی، اور غیر سیاسی تفصیلات کچھ نہ کچھ ضرور موجود ہیں لیکن ان کو اس نے جان بوجھ کر حذف کر دیا جس کی وجہ سے اس کو اپنا رہنما بنانے والا ایک محقق اسلامی عہد حکومت کو صرف خون آلود اور خون آشام پاتا ہے۔

۶۔ قصہ مختصر یہ کہ تاریخ ہند کی جس طرح صورت مسخ کی گئی ہے اور ابتدائی اسکولوں سے لیکر کالجوں تک میں تعلیم پائے ہوئے طلباء کو گمراہ ہونے کا جو موقع ملا ہے اس کی نظیر غالباً دنیا کا کوئی ملک پیش نہیں کر سکتا۔ بات یہیں تک محدود ہوتی تو خیر صبر کیا جاتا لیکن مشکل یہ آپڑی کہ مغربی طرز جمہوریت اور طرز فکر نے ہندوستان میں قومیت و وطنیت کا بیج بویا جس کا پودا قومی عصبیت کی صورت میں نمودار ہوا اس لئے کچھ تو انگریز کی "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کی پالیسی کی وجہ سے اور کچھ قومی عصبیت کی بنا پر ہندوؤں کے اندر ایک ایسی جماعت پیدا ہو گئی ہے جو مسلمانوں پر اپنے عددی تفوق کے ساتھ ساتھ ان پر سیاسی اثر قایم رکھنے کے لئے ہر اس اثر کو مٹا دینا ضروری سمجھتی ہے جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے ایک ہزار سال کے میل ملاپ

سلہ :- دیباچہ صفحہ ۲۴، معارف نمبر ۲ جلد ۵۶۔

سے ہندوستان میں پیدا ہوا ہے۔ یہ صورت حال تا دیر قائم نہیں رہنا چاہیئے۔ زمانہ بدل چکا ہے ہم آزاد ہیں اور غلامی کے چکّر سے نجات پا چکے ہیں اس لئے آزادی کی فضا میں سانس لیتے ہوئے یہ ہمارے لئے نہایت شرمناک بات ہے کہ ہم اپنے پیشرو انگریز کے عطا کردہ طرز فکر اور نظریات سے تاریخ ہند کو لکھنے اور جانچنے کا شغل جاری رکھیں۔

۷۔ طریق کار اب تک یہ رہا ہے کہ اسلام کو مورد الزام بنانے کے لئے بعض نام کے مسلمان سلاطین کی بد اعمالیوں کا تذکرہ نہایت بلند آہنگی کے ساتھ بطور ثبوت پیش کیا جاتا ہے حالانکہ دنیا کا کوئی مذہب ایسا نہیں بتایا جا سکتا جس سے منسوب ہونے والا کوئی شخص اس مذہب کی خلاف ورزی پر قادر نہ ہو سکے احکام مذہبی کی پابندی میں سب سے زیادہ سست پادشاہوں اور امیروں کا گروہ ہوا کرتا ہے دنیا کے تمام مذاہب میں صرف اسلام ہی کو یہ شرف حاصل ہے کہ اُس نے اِن فرمانرواؤں کے طبقہ کی بھی اصلاح کر کے مطلق العنانی کا خاتمہ کیا۔ اور شاہ و گدا دونوں کو ایک ہی صف میں کھڑا کر دیا۔ کسی قوم یا ملک کے مزاج اور مجموعی اخلاق کا اندازہ اس قوم یا ملک کے صرف قلیل ترین حصّہ کے مطالعہ سے نہیں بلکہ کثیر حصہ کے مطالعہ سے کیا جاتا ہے تاریخ ہند میں دو چار نفس پرست پادشاہوں کی زندگی کا مطالعہ کرتے وقت ان بے شمار نیک نفس سلاطین کے کارناموں کو فراموش نہیں کرنا چاہیئے جنھوں نے ہندوستان کی اخلاقی و سیاسی حالت کو بلند کرنے کی انتھک کوششیں کی ہیں۔

۸۔ اسی سلسلہ میں اس فریب سے بھی آگاہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اکثر چالاک مؤرخین کسی مسلمان بادشاہ کی تعریف و توصیف کرتے وقت اپنی بے تعصبی کا یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن پھر اس کے عیوب گِناتے وقت آخر میں یہ فقرہ تحریر کر دیتے ہیں کہ یہ تمام غلطیاں اس بادشاہ سے صرف اس لئے سرزد ہوئیں کہ وہ اسلام کا زیادہ پابند تھا گویا ان کے نزدیک اسلام کی پابندی نام ہے ظلم و عصیاں و بے راہ روی کا۔ کسی پادشاہ

کی بے راہ روی کو بھلا اسلام کے اٹل قوانین سے کیا واسطہ اس کے اعمال و افعال کی ذمہ داری خود اس کی ذات سے متعلق ہے اس کے غیر شرعی افعال کو اسلام سے وابستہ کرنا کھلی ہوئی ہٹ دھرمی ہے۔ آج بھی مہذب دنیا کے عیسائی سلاطین انجیل کی تعلیمات کے خلاف عمل درآمد کر رہی ہیں اور ایک گال پہ طمانچہ کھاکر دوسرا گال سامنے نہیں کرتے بلکہ رات دن نوعِ انسانی کے قتل و غارت کے لئے مختلف قسم کے آلاتِ حرب و اسلحہ ایجاد کرنے میں مصروف ہیں لیکن عیسائی پادریوں نے یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی عیسائی مذہب کا ناقص و نادرست ہونا تسلیم نہیں کیا اور نہ کرنا چاہیئے کسی کی نیت پہ حملہ کئے بغیر اتنا میں ضرور عرض کروں گا کہ اس قبیل کے مورخین نے یا تو اسلام کی حقیقت کو سمجھا نہیں یا سمجھنے کی کوشش نہیں کی اگر وہ اسلامی تعلیمات کا بنظر غائر مطالعہ کر لیتے اور اسلامی طرزِ حکومت کو سمجھ لیتے تو پھر شاید اس قسم کی غلطیاں نہ کرتے۔

۹- قابل غور ایک چیز اور بھی ہے جس کی طرف اب تک بہت کم توجہ کی گئی ہے اور وہ یہ کہ پیش نظر اسلامی عہدِ حکومت کا کم از کم اوّلین دور بڑی حد تک مجاہدانہ و سپاہیانہ جدوجہد کا زمانہ ہے۔ اس "عہد سپہ گری" کے معاصر اہل قلم نے جو فارسی تاریخیں لکھیں وہ بالعموم ایرانی مذاق کے مطابق لکھیں اس لئے اول تو ان کی تاریخیں زمانہ کے ذوق کے مطابق جنگ و جدل اور معرکہ آرائی کا مرقع ہیں دوسرے چونکہ ان کا تعلق کسی نہ کسی حد تک شاہی دربار سے ہوتا تھا اس لئے انھوں نے اپنے مربّیوں کو خوش کرنے کے لئے ان کی جنگوں کا مقصد مذہب و تہذیب کی اشاعت بتایا اور یہ صحیح نہیں۔ آج یہ تماشا ہم اپنے زمانہ میں بھی دیکھ رہے ہیں کہ ترقی یافتہ ممالک پسماندہ اقوام کو محکوم بناتے وقت اپنا مقصد تہذیب و تمدن کی اشاعت بتلاتے ہیں حالانکہ ان کا مقصد اپنی حکومت و تجارت کی توسیع و ترقی ہوتا ہے ٹھیک اسی طرح زمانہ وسطیٰ کی لڑائیوں میں بھی اشاعت مذہب و تہذیب کے جذبہ کے مقابلہ میں شان و شوکت اور طاقت کے اظہار کا جذبہ بالعموم زیادہ ہوتا تھا اور یہ چیز اس زمانہ کے ہندوؤں اور مسلمانوں میں یکساں طور پر پائی جاتی ہے۔

۱۰- اس خصوصیت کے علاوہ اس عہد کے طرز تحریر پر بھی نظر رکھنے کی ضرورت ہے مبالغہ اور لفاظی فارسی نثر نویسوں بلکہ عام مشرقیوں کی گھٹی میں پڑا ہوا ہے۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ اگر اتفاق سے کسی بادشاہ نے ایک یا دو مندر مسمار کر کے ان کی جگہ مسجدیں تعمیر کر دیں تو یہ مورخین تحقیق کئے بغیر اس واقعہ کا ذکر یوں کرتے ہیں کہ گویا ہزارہا بت خانے توڑے گئے اور ان کی جگہ مسجدیں تعمیر کی گئیں حالانکہ یہ سراسر مبالغہ اور لفاظی ہے۔ مثال کے طور پر قطب الدین ایبک کے نہایت قلیل عہد حکومت پر نظر ڈالئے اس کے متعلق ایک فارسی مورخ لکھتا ہے کہ اس نے دہلی میں ایک ہزار بت خانے گرا کر ایک ہزار دار العلوم قائم کئے۔ اس بیان کو اگر سنجیدگی کے ساتھ پرکھا جائے تو قطعی ناقابل تسلیم معلوم ہوتا ہے کہ جس بادشاہ نے ایک شہر میں چار سال سے زیادہ حکومت نہیں کی اور یہ چار سال بھی بیشتر لڑائیوں اور دوسری الجھنوں کی نذر ہوئے وہ اس قلیل مدت میں کس طرح ایک ہزار مدرسے قائم کر سکا۔ چنانچہ ڈاکٹر ٹائی ٹس اور ڈاکٹر حبیب اللہ[۱] وغیرہ نے اس تعداد کو مشکوک قرار دیا ہے۔ بہر حال ان مورخوں کی تحریروں کو زمانۂ حال کے تنقیدی اصولوں پر جانچے اور پرکھے بغیر لفظاً و معناً صحیح سمجھ لینا سخت غلطی ہے۔

۱۱- یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ مورد الزام مسلمان بادشاہ کے عہد حکومت کا ذکر کرتے وقت بُعد زمانی اور اس کے متعلقات کو بالکل فراموش کر دیا جاتا ہے۔ لکھنے والے اس کے زمانہ کے ہندوستان کو آج کا ہندوستان، اس زمانہ کی دنیا کو آج کی دُنیا اور اس زمانہ کے تمدن و معاشرت کو آج کا تمدن و معاشرت فرض کر لیتے ہیں اور اسی مفروضہ کی بنا پر لوگوں کو یقین دلاتے ہیں اور اس حقیقت کو بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں کہ مسلمانوں کی آمد سے پیشتر اس ملک کے باشندوں کی معاشرتی و تمدنی حالت کیا تھی اور پھر مسلمانوں نے اس ملک

---

[۱] فاونڈیشن آف دی مسلم رول اِن انڈیا از ڈاکٹر حبیب اللہ صفحہ ۲۹۵۔

میں داخل ہو کر اہل ہند کو کس قدر فوائد پہونچائے اور ان میں کیسی روشن خیالی پیدا کی۔ آج کل ہماری آنکھیں یورپ کی تہذیب و ترقی کے آگے خیرہ ہو رہی ہیں اس بات کے تحقیق کرنے کی فرصت کہاں کہ یورپ کی یہ تمام ترقیات اسلامی تعلیمات اور مسلمانوں کے اخلاق اور ترقی کا نتیجہ ہیں لیکن کم از کم اتنا تو ضرور یاد رکھنا چاہیے کہ جس زمانہ میں یہاں مسلمان حکمراں صاحب تخت و تاج تھے اس زمانہ میں دنیا کے دیگر گوشوں میں غیر مسلم فرمانرواؤں کا طرز عمل اپنی رعایا کے ساتھ کیسا تھا۔ تفصیل کی گنجائش نہیں، صرف چند تاریخی واقعات مثال کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں:۔

(۱) روم کے پوپ انوسینٹ نے حکم دیا تھا کہ غیر کیتھلک دنیا میں زندہ رہنے کے حقدار نہیں۔

(۲) علم و عقل کی باتیں جو اندلس کی اسلامی درسگاہوں کے ذریعہ یورپ میں شائع ہو رہی تھیں اُن کو روکنے اور تاریکی و جہالت کو باقی رکھنے کے لئے جاسوسی کا ایک محکمہ قایم کیا تھا کہ کوئی کتاب پوپ کی اجازت کے بغیر شائع نہ ہو سکے چنانچہ اس محکمہ کے ذریعہ ۱۴۸۱ء تا ۱۴۹۱ء یعنی دس سال کے اندر ایک لاکھ چودہ ہزار ۲ سو ۹۰ آدمی محض اس لئے مجرم قرار دیئے گئے کہ وہ علم و حکمت کی باتوں کو زبان تک کیوں لائے۔ ان میں سے ایک ہزار تیئیس کو زندہ آگ میں ڈال کر جلا دیا گیا اور سولہ ہزار آٹھ سو آٹھ کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ باقی کو دوسری سخت سزائیں دی گئیں۔

(۳) اسی زمانہ کے لگ بھگ انگلستان کے اندر یہ عجیب و غریب قانون جاری تھا کہ جس عورت پر ساحرہ ہونے کا الزام لگایا جائے اُسے امتحان کی غرض سے کسی دریا یا تالاب یا سمندر میں ڈالا جائے اگر وہ عورت پانی میں ڈوب کر مر جائے تو ساحرہ نہیں تھی اور اگر ڈوبنے سے بچ گئی تو اس کا ساحرہ ہونا ثابت ہو گیا لہذا وہ قتل کر دی جاتی تھی۔ اس طرح ہزارہا بے گناہ عورتیں لقمۂ اجل بنیں کبھی ان

بیگناہ عورتوں کے ناخنوں میں کیلیں ٹھونکی جاتی تھیں اور لوہا گرم کرکے داغا جاتا تھا اور اس طرح ان سے پہلے اقرار جرم کرایا جاتا تھا اور جب وہ اذیتوں کی وجہ سے جرم کا اقرار کرلیتی تھیں تو فوراً اُن کے قتل کا حکم دیدیا جاتا تھا کیا اس عجیب و غریب طرز حکومت کے مقابل اس زمانہ میں ہندوستان میں عدل و انصاف کے دریا نہیں بہہ رہے تھے؟ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ ہندوستان میں سلاطین لودھی اہل ہند کو بڑے بڑے عہدے تفویض کررہے تھے۔ اور کبیر داس اپنے خیالات کی آزادانہ نشر و اشاعت اور کبیر پنتھی فرقہ کی بنیاد رکھنے میں مصروف تھے جبکہ یورپ کے اندر اختلاف عقائد کی بنا پر ایک فرقہ دوسرے فرقہ کے افراد کو آگ میں زندہ جلانا ثواب کا کام سمجھتا تھا۔

(۴) سولھویں صدی کے نصف اوّل میں جبکہ شیر شاہ سوری ایک ادنیٰ طبقہ کے ہندو کی شکایت پر اپنے عزیز بیٹے اور ولیعہد سلطنت کو سزا کا حکم دیکر عدل و انصاف کی پوری پوری داد دیچکا تھا تہذیب کے علمبردار اور عدل و انصاف کے دعویدار یورپ کے بعض سپہ سالاروں نے یہ عزم کرلیا تھا کہ میکسیکو کی مفتوح باشندوں کی نسل ختم کرکے وہاں اپنی ایک نو آبادی قائم کریں اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے ہزارہا بندگان خدا کو آگ میں جلانے کے علاوہ پہاڑوں اور جنگلوں میں پناہ لینے والوں کو شکاری کتوں سے پھڑوایا گیا۔

(۵) لاس کیمس جو ایک ہسپانوی تعلیم یافتہ شخص تھا ان مظالم کے چشم دید حالات بیان کرتا ہے جن سے امریکہ والوں کو صفحۂ ہستی سے نابود کیا گیا۔ ان حالات کو پڑھکر آنکھوں میں خون اُتر آتا ہے اور بدن کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں وہ لکھتا ہے۔ اہل یورپ کی آمد سے قبل ”ہسپانیولا میں

تیس لاکھ آدمی آباد تھے اور اب تین سو سے بھی کم رہ گئے ہیں۔ کیوبا کے جزیرہ میں ایک بھی دیسی نہیں رہا۔ سینٹ جان اور جمیکا کے جزیروں کا بھی یہی حال ہے حالانکہ یہ جزیرے پہلے زرخیز اور آباد تھے۔ سینٹ جان کے قریب تیس جزیرے غیر آباد ہو گئے ہیں برّاعظم میں بھی یہی نوبت پہونچی ہے۔ دس سلطنتیں جو بلحاظ رقبہ اسپین سے بڑی تھیں اُن میں ایک آدمی بھی اہل اسپین کے ظلم سے زندہ نہیں بچا۔ بچّوں۔ عورتوں مردوں سب کو انھوں نے موت کے گھاٹ اُتار دیا دیسی سرداروں کو دھیمی دھیمی آگ جلا کر فنا کیا گیا۔ بعض کو کتّوں سے پھڑوا دیا گیا۔ ایک ایک شخص بعض اوقات اپنے کتّوں سے بیس بیس دیسیوں کا آن واحد میں شکار کر لیتا ہے.... (غرضکہ) نئی دنیا کے لئے اہل یورپ قہر خدا یا آتش دوزخ تھے۔ ان نام نہاد مہذب لوگوں کے مقابلہ میں مردم خور وحشی بھی ہیچ ہیں۔ اٹیلا اور چنگیز خاں ان انسانی شکل کے بھیڑیوں کے پاسنگ بھی نہ تھے۔ انھوں نے صرف اپنے دشمنوں کو قتل کیا مگر ان لوگوں نے مطیع وفرماں بردار رعایا کو بلا امتیاز مرد و عورت بے دریغ تہ تیغ کیا۔"[1]

(۹) اسی طرح جنوبی امریکہ کے ملک پیرو میں اٹلی کے ایک سپہ سالار نے وہاں کے قدیم باشندوں کو فنا کیا۔ اہل بلجیم نے افریقہ کے ملک کانگو میں وہاں کے باشندوں کو صرف چند تولہ ربڑ کی چوری کے الزام میں جس طرح ستایا اور قتل وغارتگری کے ہنگامے برپا کئے اس کی مثالیں چنگیز اور ہلاکو کے کارناموں میں بھی تلاش نہیں کی جا سکتیں۔

---

[1] تاریخ امریکہ صفحہ ۱۰۵-۱۰۰ بحوالہ علماء ہند کا شاندار ماضی صفحہ ۸۳-۸۴

(۷) آسٹریلیا اور تسمانیہ کے باشندوں کو جس طرح صفحۂ ہستی سے معدوم ہونا پڑا وہ بھی کچھ کم حسرت انگیز نہیں ہے۔

(۸) خود ہندوستان میں آریوں نے غیر آریوں کے ساتھ جیسا برتاؤ کیا وہ سب پر روز روشن کی طرح عیاں ہے اچھوت و سچھوت ہندوؤں کی درمیان اس روشنی کے زمانہ میں بھی جھگڑے جاری ہیں۔ اعلیٰ ذات کے ہندو اپنے سے کمتر ہندوؤں کو سوسائٹی میں برابر کا درجہ اب بھی نہیں دیسکتے "ہمالیہ پہاڑ کے علاقہ میں اچھوت و سچھوت ہندوؤں کے درمیان" ڈولہ اور پالکی "کا تنازعہ اب بھی جاری ہے۔ چنانچہ ہریجنوں کی ایک برات کو جس میں دلہن کو پالکی پر بٹھاکر کوٹ دوار[۱] سے جمار گڈھی واقع ضلع بجنور کی طرف لیجایا جارہا تھا راستہ میں اعلیٰ ذات کے ۶۰ ہندوؤں نے گھیر کر مارا کوٹا اور رات بھر جنگل میں محصور رکھا دوسرے دن جب اس حلقہ کا پٹواری آیا تو برات دولہا کے گھر پہونچ سکی۔ اسی طرح ہریجنوں کی ایک دوسری برات پر ڈولہ پالکی کی وجہ سے تشدد کیا گیا یہ برات دہرہ دون سے بھوگ پور کو جارہی تھی ڈولہ پالکی کمیٹی کے سکریٹری سری بلدیو سنگھ کے درمیان میں پڑنے سے شادی کے مراسم گاؤں سے دور ایک میل کے فاصلہ پر ٹہکر پورے کیے گئے۔ اعلیٰ ذات کے ہندو وہاں بھی جمع ہوگئے لیکن دور کھڑے رہے اور پھر کوئی فساد برپا نہیں کیا[۲]"

۱۲۔ آٹھویں صدی عیسوی میں جبکہ مسلمانوں نے سندھ کے ساحل پر

ع۱۔ کوٹ دوار ہمالیہ پہاڑ کی تہٹی میں واقع ہے نجیب آباد و کوٹ دوار برانچ لائن کا آخری اسٹیشن ہے یہاں سے لینڈاؤن کے لئے موٹر سروس جاری ہے (مؤلف)

ع۲۔ ماخوذ از "ہندوستان ٹائمز" مورخہ یکم مئی ۱۹۴۳ء صفحہ ۲ کالم ۴۔

قدم رکھا مملکت سندھ میں اچھوتوں کے لئے نہایت سخت قوانین جاری تھے۔ بقول ڈاکٹر تاراچند سندھ کا برہمن راجہ چچ بڑا متعصب تھا۔ اس نے اپنی رعایا میں بعض فرقوں کے لئے بہت سخت اور جابرانہ قوانین جاری کئے ان کو ہتھیار باندھکر چلنے کی، ریشمین پوشاک پہننے کی، زین لگاکر گھوڑے پر بیٹھنے کی قطعاً ممانعت تھی ان کو حکم تھا کہ وہ کتّوں کو ساتھ لیکر ننگے سر اور ننگے پاؤں چلیں[1]"

۱۳۔ مسلمانوں کے آنے سے پہلے اختلاف عقائد کی بنا پر بھی ہندوستان کے اندر کافی کشت وخون ہوا ہے چنانچہ تاریخی صفحات شاہد ہیں کہ (ا) مہر گل نے جو شِو کا پرستار تھا بودھ راہبوں کو تہ تیغ کرادیا۔ اور ان کی خانقاہوں اور معبدوں کو زمین دوز کرادیا" (ب) "برہمنوں نے ۶۴۴ء میں راجہ ہرش کی جان لینے کی کوشش کی کیونکہ اس نے قنوج میں ایک تیوہار کے موقع پر بودھوں کے ساتھ غیر معمولی مراعات روا رکھی تھیں (ج) مغربی بنگال کے راجہ ساسانکا نے بدھ گیا کے متبرک برگد کے درخت (Bo-tee) کو جڑ سے اکھڑواکر پھکوادیا۔ اور بودھوں کی خانقاہوں کو اُجاڑ دیا۔ (د) سین خاندان کے راجہ برہمنوں کے بڑے طرفدار تھے انھوں نے اپنے عہد حکومت میں بودھوں پر بڑے سخت مظالم ڈھائے[2]"

(ہ) "ہرمن گویز (HERMANGOES) ایک فرینچ مورخ اپنی کتاب ایکس آف انڈین کلچر مطبوعہ ۱۹۲۹ء کے صفحہ ۱۸۱ پر تحریر کرتا ہے کہ سونگا یا سنگا خاندان کے بانی راجہ پشتیہ متر کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ وہ پہلا راجہ ہے جس نے ہندو دھرم کا نام لیکر ہندو دھرم کی خاطر بودھوں پر

---

[1] ماخوذ از اہل ہند کی مختصر تاریخ، صفحہ ۱۲۸ مصنفہ ڈاکٹر تاراچند

[2] " " " اورنگ زیب اینڈ ہز ٹائمز، صفحہ ۱۰۹ تا ۱۱۱ مصنفہ مسٹر ظہیر الدین فاروقی۔

قتل وغارتگری کے ہنگامے برپا کئے (۹) کشمیر کے ایک ہندو راجہ کی رانی کا ایک بودھ نے اغوا کیا جس پر راجہ کو اتنا غصہ آیا کہ اس نے بودھوں کے صدہا مندروں کو توڑ ڈالا اور ان کی متعلقہ جائداد برہمنوں کو بخشدی[1]" (۱۰) "شہر سرادستی جو اب" سہیت مہیت" کہلاتا ہے اور جس کے کھنڈرات اب بھی ضلع بہرائچ میں پائے جاتے ہیں مہاتما بودھ کے زمانہ میں راجہ" پرسنجیت" کا دارالحکومت تھا۔ اس راجہ نی بودھ دھرم قبول کرلیا تھا اور مہاتما بودھ کا بڑا ہمدرد وسرپرست تھا۔ لیکن اس کا لڑکا" درودھک" ساکیہ[2] قبیلہ کا دشمن تھا۔ اس نے گدّی نشین ہوکر ساکیہ قبیلہ کی ۵۰۰ عورتوں کو جو اس کے حرم کے لئے منتخب کی گئی تھیں قتل کرادیا۔ اس پر مہاتما بودھ نے پیشنگوئی کی تھی کہ راجہ سات دن کے اندر آگ سے جل کر مرجائے گا چنانچہ یہ پیشنگوئی پوری ہوئی[3]۔ (۱۱) ۷۸۱ء کے قریب ختن میں اور ۸۴۰ء میں تبت میں بودھوں پر مظالم کئے گئے اسی طرح جنوبی دکن اور گجرات میں جینیوں پر بڑے بڑے ظلم[4] ڈھائے گئے۔"

۱۴۔ غرضکہ دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں بتائی جاسکتی جس نے فتحمند ہوکر مفتوحوں کے ساتھ اس مسالمت رواداری، نرمی، رعایت ومساوات اور عدل وانصاف کا سلوک کیا ہو جیساکہ مسلمانوں نے عام طور پر اپنے مفتوحین کے ساتھ کیا۔ تاریخ ہند میں اسلامی عہد حکومت کے حالات پڑھتے وقت مذکورہ بالا

عہ۱ ماخوذ از" اورنگ زیب اینڈ ہز ٹائمز" صفحہ ۱۰۹ تا ۱۱۱ مصنفہ مسٹر ظہیر الدین فاروقی" اور" گارڈن آف انڈیا" صفحہ ۱۴۶ مصنفہ ایچ۔ سی اردن۔

عہ۲ مہاتما بودھ کے والد سدھودن ساکیہ قبیلہ کے سردار تھے۔ (مؤلف)

عہ۳ ماخوذ از" اورنگ زیب اینڈ ہز ٹائمز" صفحہ ۱۰۹ تا ۱۱۱ مصنفہ مسٹر ظہیر الدین فاروقی

عہ۴ " " " " " " " " " " "

تمام صحیح لیکن تلخ حقیقتوں کو مدّنظر رکھنا چاہیئے۔

اِسلامی جہاد کی حقیقت

ساتھ ہی ساتھ اسلام کے قوانین صلح و جنگ اور طرز حکومت پر بھی نظر رکھنا چاہیئے تاکہ مسلمانوں کی حکومت و بادشاہت کا صحیح درجہ دُنیا کی تمام دیگر غیر مسلم حکومتوں کے مقابل متعین ہو سکے۔

اس مختصر باب میں یہ ممکن نہیں ہے کہ جنگ کے متعلق دُنیا کے تمام چھوٹے بڑے مذاہب کی تعلیمات کا احصار کیا جائے۔ تقابل ادیان کی بحثیں صرف ان مذاہب تک محدود رہتی ہیں جو اپنے پیروؤں کی کثرت اپنے اثرات کی وسعت اور اپنی گذشتہ و موجودہ عظمت کے اعتبار سے دُنیا کے بڑے مذہب شمار کیئے جاتے ہیں یہ مذاہب چار ہیں ہندو مذہب، بودھ مذہب، یہودیت اور مسیحیت مسئلۂ جنگ کے لحاظ سے ان کی دو قسمیں ہیں ایک قسم وہ ہے جس نے جنگ کو جائز رکھا ہے اسمیں ہندو مذہب اور یہودیت شامل ہیں دوسری قسم وہ ہے جس نے جنگ کو جائز نہیں رکھا پھر بھی بعض قوانین جنگ پر ان کا عمل ہے۔ راقم الحروف نے یہاں صرف اسلامی نقطۂ نظر پیش کیا ہے بقیہ مذاہب کا نقطۂ نظر اگر معلوم کرنا ہے تو الجہاد فی الاسلام کے صفحات ۲۶۴ تا ۳۶۸ کا مطالعہ کرنا چاہیئے جس کا خلاصہ یہ ہے :-

مقدم الذکر دونوں مذہب انسان کو ان تمام اغراض کی خاطر لڑنے کی اجازت دیتے ہیں جن کے لئے اُن کا نفس خواہشمند ہو وہ لڑنے کے لئے انسان کے سامنے کوئی بلند نصب العین پیش نہیں کرتے اس کے علاوہ انھوں نے انسانیت کو جغرافی و نسلی و لونی اصول پر تقسیم کیا ہے اور کسی خاص

نسل کے لوگوں کو کچھ ایسی رعایات دی ہیں جن سے باقی تمام ابنائے نوع محروم ہیں۔ دوسری طرف موخر الذکر دو مذہب یہ تو محسوس کرتے ہیں کہ انسان کو خود انسان کا تسکار کرنے کی اجازت دینا درست نہیں ہے لیکن اس احساس کی وجہ سے وہ خود انسانی فطرت ہی سے جنگ کرنے لگتے ہیں کیونکہ اللہ نے انسان کی زندگی میں اعتدال قایم رکھنے کے لئے جو مختلف قوتیں ودیعت کی ہیں وہ ان میں سے بعض کو بالکل فنا کر دینا چاہتے ہیں اور بعض کو پوری انسانی سیرت پر حاوی کرنے کی کوشش کرتے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو لوگ ان کی ہدایات پر عمل کرتے ہیں وہ تنزل، انحطاط اور مغلوبی و مقہوری کی انتہائی پستیوں میں گر جاتے ہیں ان کو عملی زندگی کے کسی شعبہ میں ہدایت کی روشنی نہیں ملتی۔ اور وہ ناچار اپنے اہواء و امیال کی پیروی اختیار کر کے کبھی اِدھر اور کبھی اُدھر بھٹکتے پھرتے ہیں۔ افراط و تفریط کے ان دو انتہائی نقطوں کے درمیان اسلام نے توسط و اعتدال کی ایک درمیانی راہ پیدا کی ہے وہ انسانیت کی اصلاح کے مقصد کو پیش نظر رکھ کر جنگ کو دو حصّوں میں تقسیم کرتا ہے ایک وہ جنگ جو ملک و مال، جاہ و اقتدار اور نفسانی اغراض کے حصول کے لئے کی جاتی ہے اور دوسری جنگ جو حق کی حفاظت اور ظلم وجور کو دفع کرنے کے لئے کی جاتی ہے۔ پہلی جنگ کو وہ فتنہ وفساد اور ایک بڑی معصیت قرار دیکر کامل اجتناب کا حکم دیتا ہے دوسری جنگ میں اگر نفسانی غرض شامل نہ ہو اور انسانیت کے معیار کو بلند کرنے کے لئے لڑی جائے تو وہ جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ اس کی تشریح اگلی سطور میں کی جائے گی۔

حرمتِ نفس

یورپی ممالک کی مختلف عیسائی اقوام نے جب مشرقی ممالک کو اپنی حرص
وآز کا شکار بنانا شروع کیا تو چونکہ ان کے مدمقابل زیادہ تر مسلمان ہی تھے
اس لئے مسلمانوں کو بدنام کرنے کی خاطر اور اپنے عیوب پر پردہ ڈالنے کے
لئے مفتوحین سے یہ کہنا شروع کیا کہ مسلمان تو تلوار کے شیدائی ہیں ان کو امن
و امان کے قیام سے کیا غرض ہم تمہارے نجات دہندہ اور ایک اعلیٰ تہذیب
وتمدن کے علم بردار ہیں لیکن حقیقت پھر حقیقت ہے اس پر پردہ ڈالنا سعی
لاحاصل کے مترادف ہے ان کو شاید اس کا علم نہیں کہ آج دُنیا کے مہذّب
قوانین میں حرمتِ نفس کو جو درجہ حاصل ہوا ہے وہ اس انقلاب کے نتائج میں
سے ایک شاندار نتیجہ ہے جو اِسلامی تعلیم نے دُنیا کے اخلاقی ماحول میں یہ
بتا کر برپا کیا تھا کہ "اس جان کو جسے اللہ نے محترم قرار دیا ہے ہلاک نہ کرو مگر یہ
کہ حق کا تقاضا ہو" (پارہ ١٩ ارکوع ٦) ورنہ جس تاریک دور میں یہ تعلیم اُتری
تھی اس میں انسانی جان کی فی الحقیقت کوئی قیمت نہ تھی۔ روم کے کولیسیم
(Colosseum) کے افسانے اب تک تاریخ کے صفحات پر
محفوظ ہیں جس میں ہزارہا انسان شمشیر زنی کے کمالات اور رومی امراء کی شوق
تماشا کی نذر ہو گئے۔ انسانوں کو درندوں سے پھڑوانا۔ یا جانوروں کی طرح
ذبح کرا دینا۔ یا ان کے زندہ جلنے کا تماشا دیکھنا معمولی بات تھی۔ یونان و روما
میں باپ کو اپنی اولاد کے قتل کا پورا حق حاصل تھا۔ شوہر کا بیوی کو قتل کر دینا
بھی ایسا ہی تھا جیسے کسی پالتو جانور کو ذبح کر دینا۔ ہندوستان بھی اس معاملہ
میں کسی سے پیچھے نہ تھا یہاں مرد کی لاش پر عورت کو زندہ جلا دینا مذہباً جائز

تھا۔ شودر کی جان کوئی قیمت نہ رکھتی تھی اس کا خون برہمن کے لئے حلال تھا۔ وید کی آواز سن لینا شودر کے لئے اتنا بڑا گناہ تھا کہ اس کے کان میں پگھلا ہوا سیسہ ڈالنا نہ صرف جائز بلکہ ضروری تھا۔ جل پرواہ کی رسم عام تھی جس کے مطابق پہلوٹھی کا بچہ گنگا کے نذر کیا جاتا تھا۔ خودکشی ایک فعل مستحسن تھا۔

قصاص

اسلام کی یہ تعلیم کہ جان کو اللہ نے حرام قرار دیا ہے اس کو قتل نہ کرو بجز اُس صورت کے کہ حق اس کے قتل کا مطالبہ کرے" بالکل ادھوری اور ناقص رہجاتی اگر صرف یہ حکم ہوتا کہ کسی حال میں قتل نہ کرو کیونکہ اس سے دُنیا میں بجائے امن و امان کے فساد کی تخم ریزی ہوتی اس لئے یہ صاف طور سے بتادیا کہ انسان کو زندہ رہنے کا حق جائز حدود کے اندر دیا جائے۔ مگر جب وہ ان حدود سے تجاوز کر کے فتنہ و فساد پھیلائے اور دوسرے کی جان پر ناحق حملہ کرے تو وہ ایسا کرنے سے اپنے حقِ زندگی کو خود بخود کھودیتا ہے اور پھر اس کی موت ہی انسانیت کے لئے حیات ہوتی ہے۔

یہ قصاص کا قانون جس طرح افراد کے لئے ہے اسی طرح جماعتوں کے لئے بھی ہے جس طرح افراد سرکش ہوتے ہیں۔ اسی طرح جماعتیں بھی سرکش ہوتی ہیں۔ افراد کا فتنہ محدود ہوتا ہے لیکن جماعتوں کا فتنہ ایک غیر محدود مصیبت ہوتا ہے۔ بعض جماعتیں دھن دولت کی لالچی ہوتی ہیں، وہ غریب قوموں پر ڈاکے ڈالتی ہیں ان کی تجارت اور صنعت و حرفت پر قبضہ کرتی ہیں اپنی خواہشوں پر کمزوروں کے حقوق قربان کردیتی ہیں ان کے ناپاک اثر سے مغلوب قوموں کے اخلاق تباہ ہوجاتے ہیں۔ اپنی خواہش اقتدار کو پورا کرنے کے لئے زمین

میں فساد پھیلاتی ہیں اور خدا کے بیگناہ بندوں کا خون بہاتی ہیں۔ ایسی صورت میں جنگ جائز ہی نہیں بلکہ فرض ہو جاتی ہے اس وقت انسانیت کی سب سے بڑی خدمت یہی ہوتی ہے کہ ان ظالموں کے خون سے زمین کو سُرخ کر دیا جائے۔ اور ان کے شر سے اللہ کے مظلوم اور بے بس بندوں کو نجات دلائی جائے۔ کوئی سچا اخلاقی مصلح تلوار اور قلم میں سے ایک چیز کو اختیار کرنے اور ایک ہی کے ذریعہ سے فریضہٴ اصلاح کو انجام دینے کا فیصلہ نہیں کر سکتا۔ اس کو اپنا کام پورا کرنے کے لئے دونوں چیزوں کی یکساں ضرورت ہے۔

مقصد جنگ

جب تک تبلیغ و تلقین سے شورہ پشت جماعتیں اخلاق و انسانیت کے حدود کے اندر ہیں اس وقت تک ان کے خلاف تلوار اُٹھانا حرام ہے۔ لیکن جب وہ انسانیت کے حدود کو توڑ ڈالیں اور انسانی شرف و مجد کو پامال کر دیں تو اُس وقت ہر سچے بہی خواہ انسان کا یہی فرض ہے کہ ان کے خلاف تلوار اُٹھائے۔ اور اس وقت تک آرام نہ لے جب تک خدا کی مخلوق کو اس کے کھوئے ہوئے حقوق واپس نہ مل جائیں اسی کو جہاد فی سبیل اللہ کہتے ہیں کیونکہ یہ جنگ بندوں کی ذاتی اغراض کی تکمیل کی خاطر نہیں بلکہ خدا کی خوشنودی کے لئے لڑی جاتی ہے۔ دُنیا کی تمام دیگر اقوام کا مقصدِ جنگ یا تو حصول دولت ہے یا پھر ان کی جوع الارض کی تسکین کا تقاضا۔ مسلمانوں کو قتال فی سبیل اللہ کی جانب یہ کہکر کہیں بھی رغبت نہیں دلائی گئی کہ اُس کے عوض انھیں دولت یا حکومت ملے گی بلکہ اس کے برخلاف صرف خدا کی خوشنودی حاصل کرنا اور عذاب آخرت سے محفوظ رہنا اُن کا مقصود زندگی قرار دیا گیا۔ نیز زبردستی دین قبول کرانے کے لئے تلوار اُٹھانا

تو درکنار ادنیٰ درجہ کی سختی کی بھی ممانعت کر دی گئی ہے[1]۔

مجاہدین کا درجہ

اللہ جب یہ نہیں چاہتا کہ اس کی زمین پر فتنہ و فساد پھیلایا جائے اور اس کے بندوں کو بے قصور ستایا اور تباہ و برباد کیا جائے۔ اسے جب یہ منظور نہیں کہ دُنیا میں سیہ کاری، بداعمالی اور قتل و غارتگری جاری رہے اور انسان جو کہ واقعتہً اسی کی غلامی اور بندگی کے لئے ہیں ان کو مخلوق کا غلام بنا کر ان کی انسانی شرافت پر ذلّت کا داغ لگایا جائے تو جو گروہ بغیر کسی معاوضہ کی خواہش بغیر کسی دھن دولت کے لالچ اور بغیر کسی ذاتی نفع کی تمنّا کے محض خدا کی رضامندی و رضا جوئی کے لئے دُنیا کو اس فتنہ سے پاک کرے اور ظلم کی جگہ عدل قائم کرنے کے لئے کھڑا ہو جائے اور اس نیک کام میں اپنی جان و مال، اپنی تجارت کے فوائد اپنے اہل و عیال کی محبت اور اپنے گھر بار کے عیش و آرام سب کو قربان کردے اس سے زیادہ اللہ کی محبت اور اس کی رضامندی کا کون مستحق ہوسکتا ہے؟

انسان کی یہ اسپرٹ کہ وہ بدی کو کسی حال میں انگیز نہ کرے اور اسے دفع کرنے کے لئے ہر قسم کی قربانی دینے کو تیار ہو جائے انسانی شرافت کا سب سے اعلیٰ معیار ہے اور عملی زندگی کی کامیابی کا راز اسی اسپرٹ میں مضمر ہے جو شخص دوسروں کے لئے بدی کو برداشت کرتا ہے اس کی یہ اخلاقی کمزوری اسے بہت جلد اس پر بھی آمادہ کر دیتی ہے کہ وہ خود اپنے لئے بدی کو برداشت کرے۔ اور جب اس میں برداشت کا یہ مادّہ بھی پیدا ہو جاتا ہے تو اس پر ذلّت کا وہ درجہ آتا ہے جہاں اس کے اندر شرافت و انسانیت کا کوئی احساس باقی نہیں رہتا وہ

---

[1] :- چنانچہ لا اکراہ فی الدین قد تبین الرشد من الغی اس کی روشن دلیل ہے (پارہ ۳ رکوع اوّل)

جسمانی و مادّی غلامی ہی میں نہیں بلکہ ذہنی روحانی غلامی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس کے برخلاف جس شخص میں یہ اخلاقی قوت موجود ہو کہ وہ بدی کو محض بدی ہونے کے باعث برا سمجھے اور انسانی برادری کو اس سے نجات دلانے کے لئے انتھک جدوجہد کرتا رہے۔ وہ ایک سچا اور اعلیٰ درجہ کا انسان ہوتا ہے۔ اور اس کا وجود عالم انسانی کے لئے باعث رحمت ہوتا ہے۔

اسی بنا پر مجاہدین کی وہ جماعت یا گروہ جو بدی کے مقابلہ میں اپنے عیش وآرام اپنی دولت وثروت، اپنی نفسانی لذّات اور اپنی جان کی محبت غرض کسی چیز کو عزیز نہیں رکھتا دنیا کے لئے باعث رحمت ہے۔ ایسی جماعت یا قوم کبھی ذلیل وخوار ہو کر نہیں رہ سکتی اور اس کی عزّت کو کوئی قوت پامال نہیں کر سکتی۔ حق کے آگے سر جھکانا۔ اور ناحق کے آگے سر جھکانے پر موت کو ترجیح دینا ایک شریف و زندہ قوم کا خاصّہ ہونا چاہیئے اور اگر وہ اعلائے حق اور نصرت حق کی قوت نہ رکھتی ہو تو اسے کم از کم تحفظ حق پر سختی کے ساتھ ضرور قائم رہنا چاہئے جو شرافت کا کم سے کم درجہ ہے۔ لیکن اس درجہ سے گر کر جو قوم حق کی حفاظت بھی نہ کر سکے اور اس میں ایثار و قربانی کا فقدان اس قدر ہو جائے کہ بدی و شرارت جب اس پر چڑھ کر آئے تو وہ اسے مٹانے یا خود مٹ جانے کے بجائے اس کی ماتحت زندہ رہنے کو قبول کرے تو ایسی قوم کے لئے دُنیا میں کوئی عزّت نہیں اور اس کی زندگی یقیناً موت سے بدتر ہے۔

مدافعانہ جنگ

سطور بالا کے پڑھ لینے سے یہ بات تو صاف ہو جاتی ہے کہ مسلمانوں کا مقصد جنگ کیا ہے اور انھیں جنگ کرنے کا کیوں حکم دیا گیا ہے سطور ذیل

میں اس امر کی وضاحت مقصود ہے کہ یہ جنگ کب اور کن صورتوں میں کس کس سے کی جائے مسلمانوں کے خدائی قانون یعنی کلام پاک میں اس پر نہایت تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے جس کے بیان کرنے کی ان صفحات میں گنجائش نہیں پھر بھی اجمالاً اتنا سمجھ لینا چاہیئے کہ مدافعانہ جنگ کی بعض ناگزیر صورتیں حسب ذیل ہیں:۔

(۱) جب مسلمانوں سے بلا وجہ جنگ کی جائے اور ان پر مظالم ڈھائے جائیں تو مدافعانہ جنگ کی اجازت ہے۔

(۲) جو لوگ مسلمانوں کے گھر بار چھنیں ان کے ساتھ جنگ کرنا چاہیئے۔

(۳) جب مسلمانوں پر محض اس لئے ظلم کیا جائے کہ وہ مسلمان ہیں تو مذہبی آزادی کی خاطر جنگ کرنا جائز ہے۔

(۴) اگر دشمن غلبہ کر کے کسی سرزمین سے مسلمانوں کو نکال دے تو مسلمانوں کو جب کبھی بھی طاقت حاصل ہو تو انھیں (دشمنوں کو) اس سرزمین سے نکالنے کے لئے جنگ کریں۔ (سورہ بقر آیۃ ۲۴)

(۵) اسلام کی ترقی کو تلوار یا اقتصادی یا سیاسی قوت سے یا ان کو مذہبی فرائض ادا کرنے اور مذہبی احکام کی تعمیل کرنے سے روکا جائے تو ان تمام صورتوں میں جنگ کرنے کی اجازت ہے۔ (سورہ ۴۷ آیۃ ۱تا۴)

(۶) سورۂ انفال و سورۂ توبہ میں نہایت صراحت کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ (ا) جو لوگ مسلمانوں سے عہد کر کے توڑیں ان سے جنگ کرنی چاہیئے۔

(ب) جو لوگ بار بار بد عہدی اور دغا بازی کریں اور جن کے عہد و پیمان کا کوئی اعتبار نہ رہے اور جو مسلمانوں کو نقصان پہونچانے میں اخلاق و انسانیت کے کسی آئین کا لحاظ نہ رکھیں ان سے دائمی جنگ کا حکم ہے۔ تاوقتیکہ ان کے فتنہ کا آئندہ کے لئے سدّباب نہ ہو جائے۔

(۷) اسی طرح منافقین کے ساتھ بھی جنگ کرنے کا حکم ہے یہ گروہ جو زبان سے بدستور اِسلام کا اقرار کرتا ہے لیکن خفیہ طور سے دشمنوں سے سازباز رکھتا ہے یہ گروہ اِسلام کے لئے ان کے بیرونی دشمنوں سے زیادہ خطرناک ہے اس لئے جب ان سے بھی ان جرائم کا صدور ہو تو جسم اسلامی کے ان پھوڑوں پر سختی کے ساتھ اِصلاح کا نشتر استعمال کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ (سورہ ۹ آیۃ ۱) (سورہ ۴ آیۃ ۱۲)

مسلمانوں پر یہ فرض بھی عاید کیا گیا ہے کہ وہ دوسری جگہ کے مظلوم مسلمانوں کی مدد کو پہونچیں بشرطیکہ جس دشمن کے خلاف مدد مانگی گئی ہو۔ اس سے ان مدد کرنے والے مسلمانوں کا پہلے سے معاہدہ نہ ہو۔ کیونکہ معاہدہ ہونے کی حالت میں مسلمانوں کے لئے عہد کی پابندی اپنے مسلمان بھائیوں کی مدد سے زیادہ ضروری ہے۔ اس لئے ان کے لئے یہ جائز نہیں کہ معاہدہ کی مدّت ختم ہونے سے پہلے مظلوم مسلمانوں کی مدد کریں۔ (سورۃ ۴ آیۃ ۱۰) (سورۃ ۸ آیۃ ۱۰)

دفاعی جنگ کی ان تمام صورتوں پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ ان سب کے اندر ایک ہی جذبہ کام کر رہا ہے اور وہ یہ ہے کہ مسلمان اپنے دین اور اپنے ملّی وجود کو کسی حال میں بدی و شرارت سے مغلوب نہ ہونے دیں۔ اور یہ بدی جس راہ سے بھی خروج کرے خواہ باہر سے یا اندر سے اس کا سر کچلنے کے لئے ہر وقت مستعد رہیں کیونکہ اگر ان کے اندر سیاسی و دینی یکجہتی نہ رہے اور وہ فتنوں اور خرخشوں سے اپنے کو محفوظ نہ رکھ سکیں تو خدا نے انھیں انسانیت کی جس خدمت کے لئے مامور کیا ہے وہ اچھی طرح سرانجام نہیں پا سکتی اور ایسا ہونا نہ صرف ان پر بلکہ تمام عالم انسانی پر ظلم ہوگا۔

ع۱ ع۲ ع۳ کے لئے ملاحظہ ہو سورۂ حج آیۃ ۶

مصلحانہ جنگ

انسانیت کی وہ کونسی خدمت ہے جس پر مسلمانوں کو مامور کیا گیا ہے اور اس خدمت کو کس طرح انجام دینے کا حکم ہے۔ اس کو سمجھنے کے لئے انسانوں کے اجتماعی فرائض کو سامنے رکھنا چاہئے۔ علم الاخلاق میں انسان کے فرائض کو دو حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے ایک وہ فرائض ہیں جن کے کرنے کا اس سے مطالبہ کیا جا سکتا ہے اور دوسرے وہ فرائض ہیں جن کا کرنا نہ کرنا خود انسان کی مرضی پر موقوف ہے۔ دوسرے کے حقوق نہ چھیننا۔ دوسروں پر ظلم نہ کرنا اور ان کے امن و امان میں خلل نہ ڈالنا۔ اسی طرح ان تمام دیگر اعمال سے پرہیز کرنا جن سے سوسائٹی کو نقصان پہونچتا ہو۔ یہ وہ تمام فرائض ہیں جن کے ادا کرنے کے لئے سوسائٹی اپنے ہر رکن کو مجبور کرتی ہے۔ اور اگر وہ انھیں ادا نہ کرے تو سوسائٹی کے لئے ضروری ہوجاتا ہے کہ وہ اسے ان کے ادا کرنے پر مجبور کرے۔ فرائض کی دوسری قسم وہ ہے جس کو سوسائٹی کا ہر فرد ایک معزز اور اعلیٰ رکن بننے کے لئے ادا کرتا ہے یہ فرائض اس قسم کے ہیں۔ مثلاً خدا اور بندوں کے حقوق کو پہچاننا اور انھیں ادا کرنا۔ خود نیک بننا اور دوسروں کو نیک بنانا' اپنے خاندان، اپنی قوم، اپنے ابنائے نوع کی خدمت کرنا اور حق کی حمایت وحفاظت کرنا وغیرہ وغیرہ۔ ان دوسرے قسم کے فرائض کو ادا کرنے کے لئے انسانی شعور کی تکمیل ضروری ہے۔ اور کوئی شخص انھیں اس وقت تک ادا نہیں کر سکتا جب تک ان کی حقیقت کو اچھی طرح سمجھ نہ لے۔ ہم آسانی کی غرض سے پہلے قسم کے فرائض کو مذہبی اصطلاح میں نہی عن المنکر اور دوسری قسم کے فرائض کو امر بالمعروف کے تحت میں لا سکتے ہیں نہی عن المنکر

کا کام اگر آدمی کو حیوانیت سے نکال کر انسانیت کے درجہ میں لانا اور اسے سوسائٹی کا ایک غیر مفید اور نقصان وہ رکن بننے سے روکنا ہے تو امر بالمعروف کا کام اس کو انسانیت کی سطح سے اُٹھا کر انسانیت کاملہ کے درجہ میں لیجانا اور اسے سوسائٹی کا ایک مفید اور معزز رکن بنانا ہے۔

(۱) تبلیغ کا منشاء:۔ غرضکہ مصلحانہ جنگ کا پہلا اہم جزو تبلیغ ہے۔ اسلام ہر شخص کو معروف کی طرف دعوت دیتا ہے اور اس کی خوبیاں دکھا کر اسے اختیار کرنے پر آمادہ کرتا ہے لیکن منکر ایک پردہ ہے۔ جو اس کو معروف کا جمال دیکھنے سے باز رکھتا ہے۔ اس لئے منکر کے پردہ کو چاک کرنا اور اس کے زنگ کو ہر ممکن طریقہ سے کھرچ دینا سب سے پہلی اور ضروری تدبیر ہے۔ لیکن اگر زنگ چھوٹ جانے کے بعد اور یہ پردہ اُٹھ جانے کے بعد بھی کوئی آنکھ معروف کا جمال نہ دیکھے اور کوئی قلب اس کا پرتو قبول نہ کرے تو اسلام اسے صرف منکر سے روکنے پر اکتفا کرتا ہے۔

نہی عن المنکر اور امر بالمعروف ایک دوسری طرح خود اسلام کی دو مختلف حیثیتوں سے متعلق ہیں اسلام ایک حیثیت میں تو دعوت ہے نیکی اور تقویٰ کی جانب اور دوسری حیثیت میں وہ اللہ کا قانون ہے تمام دنیا کے لئے جب کوئی شخص اسلام قبول کر لیتا ہے تو اس کے لئے یہ دونوں حیثیتیں یکجا جمع ہو جاتی ہیں اور دعوت کی دفعات بھی اس کے حق میں قانون کی دفعات بن جاتی ہیں مگر اسلام قبول نہ کرنے کی صورت میں دعوت الگ رہتی ہے اور قانون الگ۔ دعوت کا منشاء یہ ہے کہ انسان اس منصب خلافت کا اہل بن جائے جو اللہ نے اسے سپرد کیا ہے۔ اور ان ذمہ داریوں کو پورا کرے جو خلیفۃ اللہ ہونے کی حیثیت سے اس پر عائد ہوتی ہیں قانون کا منشاء یہ ہے کہ اگر

منصب خلافت کی خدمات کو انجام نہ دے تو کم از کم اللہ کی زمین پر فساد و خونریزی تو نہ کرے۔ اگر اشرف المخلوقات نہ بنے تو ارذل المخلوقات تو نہ بن جائے۔ اگر دنیا کو نیکی و تقویٰ سے روشن نہ کرے تو کم از کم بدی و شرارت سے اس کے امن و سکون کو غارت تو نہ کرے پہلی چیز باطن کی روشنی اور طبیعت کی صلاحیت پر منحصر ہے جو ظاہر ہے کہ مارنے کوٹنے سے پیدا نہیں ہوتی لیکن دوسری چیز حدود کی تعین اور نگہداشت سے تعلق رکھتی ہے جس کا پاس و لحاظ کرنے پر اس کی سرکش طبیعت کو صرف وعظ و تلقین ہی سے آمادہ نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ بعض حالات میں اسے سرکشی سے باز رکھنے کے لئے قوت کا استعمال بھی ضروری ہو جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ اسلام نے غیر مسلم دنیا کو معروف سے متعارف کرانے کے لئے تو صرف دعوت و تبلیغ کا طریقہ بتایا ہے لیکن منکر سے روکنے کے لئے اس کی قید نہیں رکھی بلکہ اس کی مختلف انواع کے لئے مختلف طریقے تجویز کئے مثلاً قلب و ذہن کی گندگی اور خیال و رائے کی ناپاکی کو وعظ و تلقین کے ذریعہ سے دور کرنے کی ہدایت کی لیکن فعل و عمل کی برائی کو قوت و طاقت کے زور سے روکنے کا حکم دیا۔ منکر کے روکنے میں اگر زبان ناکام رہے تو پھر اس کو بزور رد کر دینے کا حکم ہے۔ اسلام چونکہ عین فطرت انسانی کے مطابق ہے لہٰذا اس کی اشاعت اسی وقت زیادہ ہو سکتی ہے جبکہ ہر قسم کا امن و امان دنیا میں قائم ہو تا کہ اسلام کے سمجھنے اور اس سے واقف ہونے کا موقع لوگوں کو میسّر آئے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام سب سے زیادہ فتنہ و فساد اور بدامنی کا دشمن اور امن و امان کا خواہاں ہے۔ امن و امان قائم کرنے کی غرض سے اور لوگوں کو بدی و شرارت سے باز رکھنے کے لئے وہ تلوار سے کام لینے کو بھی جائز بلکہ ضروری سمجھتا ہے۔

دعوت و تبلیغ کی ضرورت و طریق کار کو سمجھنے کے لئے اتنی بات اور یاد

رکھنا چاہئے کہ جس طرح ایک آدمی کی زندگی کا نصب العین اگر تن پروری اور لذّتِ نفس کے سوا اور کچھ نہ ہو تو وہ ایک ذی عقل حیوان سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ اسی طرح ایک ایسی انسانی جماعت بھی متمدن جانوروں سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی جس کی کوششوں کا دائرہ صرف اپنی فلاح وبہبود تک محدود ہو اور عام انسانی فلاح سے اس کو کچھ مطلب نہ ہو۔ جو اپنے گھر کی آگ بجھانے میں تو خوب مستعد ہو لیکن دوسروں کا گھر جلتا دیکھ کر ٹس سے مس نہ ہو اس کو ایک اچھا آدمی کہنا تو درکنار ہم اسے آدمی سمجھنے میں بھی تامل کرتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح ہم ایسی جماعت کو ایک شریف قوم کیونکر کہہ سکتے ہیں جو اپنی حفاظت کو تو سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہو جائے لیکن جب دوسری قوموں پر بدی کا غلبہ ہو اور وہ شیطانی قوتوں کی سرکشی سے تباہ ہو رہی ہوں تو ان کی نجات و آزادی کے لئے کوشش کرنے سے انکار کردے۔ اپنی آزادی کو محفوظ رکھنا اور اپنے آپ کو شرارت کے تسلّط سے بچانا بلاشبہ ایک قوم کا پہلا فریضہ ہے لیکن صرف یہی ایک فرض نہیں ہے جسے ادا کر کے مطمئن ہو جانا چاہئے بلکہ اس کا اصل فرض یہ ہے کہ وہ اپنی حاصل کی ہوئی طاقت سے تمام بنی نوع انسان کی نجات کے لئے کوشش کرے اور انسانیت کی راہ سے ان تمام رکاوٹوں کو دور کرے جو اس کی اخلاقی، روحانی اور مادّی ترقی میں حائل ہوں۔

افسوس کہ دُنیا کے کم نظر گیانیوں نے اجتماعی شرافت کے اس بلند معیار اور اجتماعی زندگی کے اس اعلیٰ نصب العین کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی جس کی اسلام تعلیم دیتا ہے۔ انھوں نے اجتماعی فرائض کو قومیت یا وطنیت کے ایک محدود دائرے میں سمیٹ کر اس قوم پرستی یا وطن پرستی کی بنیاد ڈالی جو تھوڑے سے تغیر کے بعد آسانی کے ساتھ قومی و وطنی عصبیت کی

صورت اختیار کرلیتی ہے۔ اور یہ تنگ نظری ہی در اصل انسانیت کی اس غیر طبعی تقسیم کی ذمہ وار ہے جس کی بدولت ایک نسل یا ایک زبان یا ایک قومیت رکھنے والے انسان دوسرے ابنائے نوع کو دائرۂ انسانیت سے خارج سمجھتے ہیں۔ اور ان کے حقوق کو سمجھنا اور ادا کرنا تو درکنار انھیں ان کے پامال کرنے میں بھی اخلاق و شرافت کا کچھ ٹوٹا نظر نہیں آتا۔ اسلام نے اس غیر طبعی تقسیم کو منسوخ کرکے اور اجتماعی شرافت کے اس بلند معیار کو پیش کرکے عالمگیر خدمتِ انسانی کے اس اعلیٰ نصب العین کی طرف اُمّت مسلمہ کی رہنمائی کی ہے۔ جو ہر قسم کے امتیازات سے بالاتر ہے جس میں رنگ، نسل، زبان قومیت اور وطنیت کو دخل نہیں اور جس میں کوئی چھوت چھات اور ورن آشرم کی قید نہیں رکھی گئی۔ غرض کہ مسلمان صرف اپنی ذات کی خدمت ہی کے لئے پیدا نہیں ہوئے ہیں بلکہ ان کی زندگی کا مقصد تمام عالم انسانی کی خدمت بھی ہے جس کا ایک ذریعہ دعوت و تبلیغ ہے۔

(ب) **جزیہ**:- مصلحانہ جنگ کا حکم فتنہ و فساد مٹانے اور مفسدوں سے فساد کی قوت چھین کر انھیں نیکی کا تابع بنانے کیلئے ہے اور مفسدوں سے یہاں تک لڑنے کا حکم ہے کہ وہ ہاتھ سے جزیہ دیں۔ اور عاجزی و محکومی پر راضی ہوں۔ کلام پاک میں آیۂ شریفہ حتّٰی یعطوا الجزیۃ (۹- ۲۹) کے اندر قتال کی غایت کو صاف طور سے بیان کردیا گیا ہے اگر حتی یسلموا کہا جاتا تو غایت قتال یہ ہوسکتی تھی کہ انھیں تلوار کے زور سے مسلمان بنایا جائے لیکن حتّٰی یعطوا الجزیۃ نے بتلادیا کہ ان کا جزیہ ادا کرنے پر راضی ہوجانا قتال کی آخری حد ہے۔ لیکن اس سے کہیں یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ حکم قتال کا مقصد محض جزیہ حاصل کرنا ہے۔ چند درہم سالانہ کے عوض اتنی بڑی ذمہ داری اپنے سر لینا کہ ذمیوں

کی حفاظت کے لئے ہر دشمن کے سامنے اپنے کو سینہ سپر کردیا جائے کسی طرح پر مبنی نہیں ہوسکتا۔ یہ بات کسی کی سمجھ میں نہیں آسکتی کہ ایک ذمّی جزیہ دیکر اطمینان کے ساتھ اپنی تجارت اپنے کاروبار اپنے عیش وآرام اور اپنے اہل وعیال کی معیت سے مستفید ہو۔ اور مسلمان زکوٰۃ وصدقات کی بھاری رقوم ادا کرنے کے بعد بھی ملک کی حفاظت کے لئے میدان جنگ کی مصیبتیں اٹھائے اور اپنی جان جوکھوں میں ڈالے۔ دراں حالیکہ اس کو یہ قدرت حاصل ہو کہ اس ذمّی کو ادائے جزیہ کے باوجود جنگی خدمت پر مجبور کرے اور خود لطف ومسرت کی زندگی بسر کرے۔ پس عطائے جزیہ پر قتال کی اباحت ختم کردینے اور قبول جزیہ کے بعد قیام عدل وامن کی ذمہ داریاں اپنے اوپر لے لینے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جنگ کا مقصد ان لوگوں کو فتنہ وفساد سے روکنا اور امن و آئین کا پابند بنانا ہے۔ اس کے لئے ان پر جزیہ کے نام سے ٹیکس عاید کرنا صرف اس لئے ہے کہ وہ اس حفاظت وصیانت کے مصارف میں شرکت کریں جو انھیں بہم پہونچائی جاتی ہے۔ اور اطاعت پر قائم رہیں۔

جزیہ کے قیام کی غرض یہ بھی ہے کہ ذمیوں کو اپنے عہد کا پابند بنایا جائے کیونکہ اس کا ادا نہ کرنا نقض عہد کا مترادف ہے یہی وجہ ہے کہ جزیہ صرف اہل قتال پر عائد کیا گیا ہے اور عورتیں، نابالغ بچے اور بہت بوڑھے لوگ نیز اندھے اور اپاہج اس سے مستثنیٰ ہیں اور پھر چونکہ قتال کا مقصد امن وامان قائم رکھنا ہے اس لئے جزیہ کی رقم نہایت قلیل رکھی گئی ہے تاکہ اسے نہایت آسانی کے ساتھ لوگ ادا کرسکیں اور ساتھ ہی ساتھ اس امر کی بھی سخت تاکید ہے کہ جزیہ کے وصول کرنے میں تشدد کو کام میں نہ لایا جائے بلکہ جہاں تک ہوسکے نرمی وملائمت برتی جائے۔ اس کے متعلق بکثرت احکام

موجود ہیں جن پر سختی سے عمل کیا گیا ہے چنانچہ ایک مرتبہ خلیفۂ دوم حضرت عمرؓ کے پاس جزیہ کی رقم لائی گئی آپ نے اسے غیر معمولی دیکھ کر فرمایا "مجھے گمان ہے کہ تم نے لوگوں کو برباد کر دیا" محصّلین نے جواب دیا "خدا کی قسم ہم نے بہت نرمی کے ساتھ وصول کیا ہے" آپ نے پھر پوچھا بلا سوطٍ بلا نوطٍ یعنی بغیر مارے باندھے[1]۔ انھوں نے عرض کیا کہ ہاں بغیر مارے باندھے تب آپ نے اس مال کو خزانہ میں داخل کرنے کی اجازت دی[2]۔ اسی طرح حضرت علیؓ نے ایک موقع پر ایک عامل کا تقرر کرتے وقت اس کو یہ ہدایت کی۔

"ان کے (یعنی ذمیوں کے) جاڑے گرمی کے کپڑے اور اُن کے کھانے کا سامان اور اُن کے جانور جن سے وہ کھیتی باڑی کرتے ہیں خراج وصول کرنے کی خاطر ہرگز نہ بیچنا۔ نہ کسی کو درہم وصول کرنے کے لئے کوڑے مارنا۔ نہ کسی کو کھڑا رکھنے کی سزا دینا۔ نہ خراج کے عوض کسی چیز کا نیلام کرنا کیونکہ ہم جو اُن کے حاکم بنائے گئے ہیں تو ہمارا کام نرمی سے وصول کرنا ہے۔ اگر تم نے میرے حکم کے خلاف کیا تو اللہ میرے بجائے تم کو پکڑے گا اور اگر مجھے تمہاری خلاف ورزی کی خبر پہونچی تو میں تمہیں معزول کر دوں گا"[3]

بہر صورت جزیہ کا عائد کیا جانا سزا دینے کے خیال سے نہیں ہے۔ بلکہ اس کا مدعا صرف یہ ہے کہ ذمی امن و آئین کے پابند ہوں، خوشی کے ساتھ عدل و قانون کی اطاعت کریں اور اپنی استطاعت کے مطابق اس حکومت کے

ع۱:۔ فقہاء اسلام نے نادہندوں کے حق میں صرف اتنی اجازت دی ہے کہ انھیں تادیباً قید بے مشقت کی سزا دی جاسکتی ہے (ملاحظہ ہو کتاب الخراج ص۷۰ ابو داؤد)

ع۲:۔ الجہاد فی الاسلام ص۱۰۴ بحوالہ فتح البیان۔

ع۳:۔ کتاب الخراج ص۹، فتح البیان ج۴ ص۹۳

مصارف ادا کریں جو انھیں ہر طرح سے امن وآسائش کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا موقع دیتی ہے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے ایک موقع پر جبکہ ان کا ہم نسل قبیلہ بنو تغلب جو مذہباً عیسائی تھا محروسۂ خلافت میں داخل ہوا تو قبیلہ کی منشاء کے مطابق جزیہ و خراج کی رقم عشر وزکوٰۃ کے نام سے وصول کی کیونکہ اہل قبیلہ کو یہ گوارا نہ تھا کہ ان کے ہم نسل قبائل زکوٰۃ دیں اور وہ جزیہ ادا کریں اس لئے رفع شر کی غرض سے نیز بنو تغلب کو امن وآئین کا پابند بنانے کے لئے حضرت عمرؓ نے ان کی بات مان لی۔[1]

حریفانِ زیرک نے مسلمانوں کو بدنام کرنے کیلئے جزیہ کو ایسی بھیانک صورت میں پیش کیا ہے گویا یہ سزا کے طور پر وصول کیا جاتا تھا جس سے بچنے کے لئے ہندوؤں کے بڑے بڑے گھرانوں نے اپنا مذہب تک تبدیل کر دیا۔ آج بھی قسم قسم کے ٹیکس لگائے جاتے ہیں اور عام باشندگان ملک کا افلاس بھی اس زمانہ کے مقابلہ میں آج کہیں زائد ہے مگر ٹیکسوں سے بچنے کے لئے کسی کو اپنا مذہب تبدیل کرتے نہیں سنا۔ فی زماننا ملک میں عیسائی مشنری بکثرت موجود ہیں جن پر کروڑوں روپیہ سالانہ خرچ کیا جاتا ہے جدید عیسائیوں کو خاص خاص رعائتیں بھی ملتی ہیں مگر کوئی شریف ہندو یا مسلمان روپیہ پیسہ کی خاطر ادھر متوجہ نہیں ہوتا۔ شاہانِ اسلام کی پوری تاریخ میں کبھی کوئی مشنری تو درکنار کسی تبلیغی ادارہ کا بھی پتہ نہیں چلتا۔ اور اگر بالفرض جزیہ سے بچنے کے لئے لاکھوں کروڑوں ہندو مسلمان ہو گئے تو انکی بزدلی، پست ہمتی واقعی اپنے قدیم مذہب کے لئے لعنت تھی ایسے بزدلوں پر اسلام بھی کوئی اعتماد نہیں کرتا بلکہ ان کے اسلام ہی کو درست نہیں سمجھتا جو صداقت کی بنا پر نہیں بلکہ لالچ اور خوف کی بنا پر اختیار کیا گیا ہو۔

اِسلامی قانون کی رُو سے ذمیوں کے تین درجے ہیں۔ (۱) ایک وہ جو کسی

---

[1] :۔ علماء ہند کا شاندار ماضی صفحہ؟؟ ماخوذ

صلحنامہ یا معاہدے کے ذریعہ سے عہد ذمہ کے حقدار ہوں (۲) دوسرے وہ جو لڑنے کے بعد شکست کھا کر مغلوب ہوئے ہوں (۳) تیسرے وہ جو جنگ و صلح دونوں کے سوا کسی اور صورت سے اسلامی ریاست میں شامل ہوئے ہوں۔ یہ تینوں اگرچہ ذمیوں کے عام حقوق میں یکساں شریک ہیں لیکن پہلے دونوں گروہوں کے احکام میں تھوڑا سا فرق ہے اور وہ یہ کہ پہلے گروہ سے جو بھی شرائط طے ہو جائیں گے انھیں کے مطابق اُن سے معاملہ کرنا پڑے گا۔ اُن سے تجاوز کرنا اسلام کے نزدیک نہ صرف ناجائز بلکہ حرام اور گناہ عظیم ہے۔ اِس بارے میں آنحضرت صلعم کا قول فیصل ہے۔

"خبردار! جو شخص کسی معاہد پر ظلم کرے گا یا اس کے حقوق میں کمی کرے گا یا اسکی طاقت سے زیادہ اس پر بار ڈالے گا یا اس سے کوئی چیز اس کی مرضی کے خلاف وصول کرے گا اس کے خلاف قیامت کے دن میں خود مستغیث بنوں گا"

(ابوداؤد۔ کتاب الجہاد)

چنانچہ اسی وجہ سے فقہاء اسلام نے گروہ ۱ کے متعلق کسی قسم کے قوانین مدوّن نہیں کئے اور صرف یہ عام قاعدہ وضع کر کے چھوڑ دیا ہے کہ ان کے ساتھ معاملہ بالکل شرائط صلح کے مطابق ہوگا۔

مفتوحین یعنی گروہ ۲ کے متعلق یہ ہے کہ جب امام (حاکم وقت) ان سے جزیہ قبول کرلے تو ہمیشہ کیلئے عقد ذمہ قائم ہو جائیگا۔ عقد ذمہ قائم ہو جانے کے بعد وہ بدستور اپنی زمینوں، مکانوں اور مذہبی عمارتوں کے مالک رہیں گے اور ان کی ملکیت ان کے ورثار کو منتقل ہوگی اُن کے پرسنل لا (قانون ملّت) کو اسلامی قانون کے تحت میں نہیں لایا جائیگا وہ اپنی بستیوں کے اندر اپنے مذہبی مراسم اور قومی شعائر (بشرطیکہ وہ کھلے ہوئے فواحش نہوں) کے اِعلان و اظہار میں آزاد ہوں گے البتہ خالص اسلامی بستیوں کے اندر حکومت کو اختیار ہوگا کہ اُن کو

آزادی دے یا کچھ پابندیاں عائد کردے[1] - جزیہ کی مقدار ان کی مالی حیثیت کے لحاظ سے متعین کی جائیگی - حضرت عمرؓ نے مالداروں پر ایک روپیہ ماہانہ، متوسط لوگوں پر آٹھ آنہ مہینہ اور مزدور پیشہ لوگوں پر چار آنہ مہینہ جزیہ مقرر کیا تھا۔ یہ بھی صرف اہل قتال پر ہے - بچے، عورتیں دیوانے، اپاہج، عبادت گاہوں کے خادم، بوڑھے اور بیمار جو سال کے اکثر حصّہ میں مریض رہے ہوں اس سے نہ صرف مستثنیٰ ہیں بلکہ ان کو تنگی معشیت کی بنا پر بیت المال سے گذارے کیلئے وظائف بھی دئے جائیں گے -

غرضکہ جان و مال کے تحفظ کے جملہ حقوق اُن کے وہی ہیں جو کہ فاتحین کے ہیں اور اسی لمحہ سے جبکہ وہ مسلمانوں کے زیر سایہ آجاتے ہیں اُن کا خون مسلمانوں پر حرام ہوجاتا ہے اور اُن کے جان و مال کی حفاظت مسلمانوں پر فرض ہوجاتی[2] ہے - اسلام کی پُرامن حکومت میں اُن کو پوری آزادی ہوتی ہے

ع۱:- بدائع جلد ہفتم صفہ ۱۱۲-۱۱۳، شرح السیر الکبیر جلد سوم صفہ ۲۵۱، ترجمان القرآن جلد ۳۱ عدد ۴ صفہ ۲۳۵-۲۱۴

ع۲:- مسلمانوں کو ذمیوں کی جان و مال کی حفاظت کا ہمیشہ اور ہر زمانہ میں خیال رہا انھوں نے جو نئے شہر اور نئی بستیاں بسائیں انہیں ذمیوں کو شہر کے وسط میں جگہ دی تاکہ وہ وہاں ہر طرح سے محفوظ رہیں چنانچہ ہمارے شہر شاہجہانپور کے بارے میں یہ روایت ابتک مشہور ہو کہ اسکو جب سترھویں صدی عیسوی میں شاہجہاں کے ایماء سے انکے ایک ہفت ہزاری سردار خاں بہادر خاں نے آباد کیا تو بادشاہ ذی شان نے رعایا کی حفاظت کے بارے میں سوال کیا کہ شہر کی چہار دیواری کو تمنے کسطرح مستحکم کیا ہو امیر بہادر خاں نے جواب دیا کہ حضور میں نے قلعہ کی چار دیواری کو افغانوں کے گوشت و پوست سے مضبوط کیا ہو یعنی شہر کی چار دیواری کو چونے اور گارے سے ترتیب نہیں دیا ہے بلکہ شہر کے چاروں طرف افغان قبائل کو آباد کر دیا ہے تاکہ غنیم کے حملہ آور ہونیکی صورت میں وہ اپنے گوشت و پوست سے رعایا کی حفاظت کرسکیں۔ (مؤلف)

کہ تمام جائز طریقوں سے اپنی دولت، اپنی صنعت و حرفت، علوم و آداب اور اپنی تہذیب و تمدن غرض اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی کے ہر شعبہ میں ترقی کریں۔ اور انسانیت کے بلند سے بلند معیار تک پہونچنے کے لئے جن وسائل کی ضرورت ہوتی ہے انھیں آزادی کے ساتھ استعمال کریں۔ پس اسلامی قانون ذمیوں کی انفرادی و اجتماعی آزادی کو سلب نہیں کرتا بلکہ ان کو وہ وسیع آزادی عطا کرتا ہے جس کی تلاش آج کل کی دُنیاوی حکومتوں میں سعی لاحاصل کے مترادف ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام اور ان حکومتوں کے قوانین کے نقطۂ نظر میں ایک بنیادی فرق ہے۔ اس بنیادی فرق کو سمجھ لینے پر اسلامی نظام حکومت کا ایک اجمالی خاکہ آسانی کے ساتھ ذہن میں آسکے گا۔

اسلامی نظام حکومت کے بنیادی اصول

دُنیاوی حکومتیں بالعموم جہانگیریت کے اصول پر قائم ہیں۔ قوانین جہانگیریت کے مطابق محکوم قوم حاکم جماعت کی ملکیت ہوتی ہے اور حاکم کے لئے محکوم کے وسائل حیات ایک جائداد کی حیثیت رکھتے ہیں، جسے اپنے فائدہ کے لئے استعمال کرنا اور محکوم کو اس کے فائدے سے محروم رکھنا اس کا قدرتی حق متصور ہوتا ہے۔ حاکم جماعت کا مفاد محکوم جماعت کے حقیقی مفاد سے کبھی متحد نہیں ہوسکتا اور لازمی طور پر کمزور کا مفاد طاقتور کے مفاد پر قربان کر دیا جاتا ہے۔ بخلاف اس کے اسلامی قوانین حکومت کی بنیاد خدمت نوع انسانی کے اعلیٰ اور شریف مقصد پر رکھی گئی ہے اس میں "حاکم و محکوم" کا تعلق صحیح معنوں میں خادم و مخدوم کا سا تعلق ہوتا ہے حاکم کا مفاد اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ وہ محکوم کے حقیقی و اصلی مفاد کے حصول کی کوشش کرے۔ یعنی وہ سوسائٹی کی اخلاقی و روحانی

و نیز مادّی زندگی کو تباہ کرنے والی چیزوں کو نہ اُبھرنے دے اور محکوم جماعت کے ہر ہر فرد کو ایک بلند پایہ انسان بننے میں پوری مدد دے۔

جہانگیریت کی اوّلین خصوصیت یہ ہے کہ وہ ایک خاص قوم اور ملک کے افراد کی حکومت کا نام ہے انگریزی جہانگیریت جزیرۂ انگلستان کے باشندوں سے مخصوص ہے۔ جرمن جہانگیریت جرمن قوم کے سوا کسی دوسرے کا حصہ نہیں، چونکہ دُنیا کی دوسری اقوام کا نسلاً انگریز یا جرمن ہونا محال ہے۔ اس لئے ان قوموں کی جہانگیریت میں دوسروں کا حصہ دار ہونا بھی محال ہے۔ اسی نظام جہانگیریت میں جب کبھی کوئی قوم دوسری قوم کو مغلوب کرتی ہے تو اس کو حکومت وسلطنت میں اس لئے شریک نہیں کرتی کہ محکوم فاتح قوم کی نسل سے نہیں ہے۔ پھر اسی چیز سے دوسری خرابیاں پیدا ہوتی ہیں محکوم قوم من حیث القوم ذلیل ہو جاتی ہے اور اس میں شرافت وخودداری کا احساس باقی نہیں رہتا بخلاف اس کے اسلام کسی نسل یا قوم یا وطن کا نام نہیں ہے بلکہ ایک قانون اور نظام حیات کا نام ہے۔ اس کے دروازے سب کے لئے کشادہ ہیں۔ عربی، عجمی، حبشی، چینی، ہندی، فرنگی سب اس کو اختیار کر سکتے ہیں وہ ان میں رنگ ونسل یا وطن کی وجہ سے امتیاز وفرق قائم نہیں کرتا وہ انسان کو بحیثیت انسان ہونے کے خطاب کرتا ہے۔ اور اس کے سامنے زندگی بسر کرنے کا ایک طریقہ اور نظام پیش کرتا ہے جو بھی اس طریقہ کو اختیار کرے وہ اسلامی حکومت میں برابر کا شریک ہے اور اس کی شخصی قابلیت اسے خلیفہ وامام کے درجہ تک پہونچا سکتی ہے اسلام میں نہ تو "حکومت قوم بر قوم دیگر" کا سوال ہے، اور نہ "حکومت قوم بر قوم خود"۔ کا وہ "حکومت صالح بر غیر صالح" کا قائل ہے اگر ایک حبشی غلام ہو تو کوئی چیز اسے شرفاء عرب پر حکومت کرنے سے

روک نہیں سکتی۔ اسلام نے ترکی خلفاء کی امامت کو بھی اسی طرح جائز سمجھا جس
طرح عباسی خلفاء کی امامت کو۔ اور آج اگر انگریزی قوم مسلمان ہو جائے اور
اپنی اہلیت کا ثبوت پیش کرے تو یقیناً اسلام کو فرمانروائے انگلستان کی
امامت تسلیم کرنے میں بھی تامل نہ ہوگا۔

یہ تو اسلامیت و جہانگیریت کا ظاہری فرق تھا۔ معنوی فرق اس سے بھی زیادہ روشن
ہے۔ اور وہ اس طرح کہ جہانگیریت دراصل ایک قوم کی خواہش وسیع مملکت و حصول مال و زر کا نام
ہے۔ جب کوئی قوم اس دولت و حکومت پر قانع نہیں ہوتی جو اس کو خود اپنے ملک میں حاصل ہوتی ہے
تو وہ دوسرے ملکوں پر حملہ کر کے ان کی دولت پر قبضہ کرتی ہے۔ اس کے باشندوں کو غلام و محکوم بنا لیتی ہے اور اپنی صنعت و
حرفت کو ان کے خرچ پر فروغ دیتی ہے مغربی قوموں نے اس ملک گیری اور لوٹ
مار کا نام "تہذیب و تمدن کی اشاعت" اور "نوع بشری کی خدمت" رکھا ہے
ان کے آئین تہذیب و تمدن کی پہلی دفعہ یہ ہے کہ "قوت حق ہے" اور کمزور کو دنیا
میں جینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ کمزور قوموں میں تہذیب کی اشاعت کا جو طریقہ
انھوں نے ایجاد کیا ہے وہ یہ ہے کہ ان کو جہالت و افلاس۔ غلامانہ کمینگی اور
بے دینی و ضمیر فروشی کے جواہر سے مالا مال کر دیتی ہے اور "نوع بشری"
کی خدمت کے لئے ان کی بہترین کوششوں کا مظاہرہ اس وقت ہوتا ہے
جب ان کی بہیمی قوتیں ایک دوسرے سے ٹکرا کر دنیا کے امن و امان کو غارت
کر دیتی ہیں۔

مسلمانوں کا خلیفہ:۔ اسلام کی مقدس تعلیم اس جہانگیری کے عیب سے
پاک ہے۔ اس کا دعوٰی یہ ہے۔ کہ حکومت و بادشاہی صرف اللہ کے لئے ہے۔
ان الحکم الا للّٰہ بندوں کو یہ حق نہیں پہونچتا کہ اللہ کے غلاموں کو اپنا
غلام بنائیں۔ ان کا کام صرف یہ ہے کہ اللہ کے نائب و خلیفہ کی حیثیت سے اس

کے بندوں کی خدمت و اصلاح کریں۔ اور حکومت و اقتدار کی ان لذتوں کے فریب میں نہ آئیں جن کے لالچ میں انسان اس کے حصول کی کوشش کرتا ہے مسلمانوں کا خلیفہ عام مسلمانوں کے مقابلہ میں کسی مافوق البشر ہستی کا مالک نہیں اس کی حیثیت کا اندازہ آنحضرت صلعم کے مشہور صحابی حضرت معاذ بن جبلؓ کی اس تقریر سے لگائیے جو آپ نے قیصر روم کے دربار میں اپنے خلیفۂ وقت کی نسبت کی تھی۔ آپ نے فرمایا "ہمارا سردار ہم میں کا ایک فرد ہے۔ اگر ہماری مذہب کی کتاب اور ہمارے پیغمبر صلعم کے طریقہ کی پیروی کرے تو ہم اس کو اپنا سردار باقی رکھیں اور اگر ان کے سوا وہ کسی اور چیز پر عمل کرے تو ہم اس کو معزول کر دیں، اگر وہ چوری کرے تو ہاتھ کاٹیں، اور اگر زنا کرے تو سنگسار کریں اور اگر وہ کسی کو گالی دے تو اس کو مناسب سزا دیجائے، اگر وہ کسی کو زخمی کرے تو اس کا بدلہ دینا پڑے اور وہ ہم سے چھپ کر پردہ میں نہیں بیٹھتا۔ وہ ہم سے غرور نہیں کرتا۔ مال غنیمت میں اپنے آپ کو ہم پر ترجیح نہیں دیتا وہ ہم میں ایک معمولی آدمی کا درجہ و رتبہ رکھتا ہے"

اس سے ظاہر ہے کہ مسلمانوں کا بادشاہ یا حکمراں جاپانیوں کے بادشاہ کی طرح نہ تو ان کا خدا ہے اور نہ ہندو بھائیوں کے راجہ مہاراجاؤں کی طرح ان کا ان داتا۔ وہ رعیت کے عام افراد سے نہ کوئی بالاتر ہستی ہے نہ وہ اپنے آگے کسی سے گردن جھکوا سکتا ہے نہ قانون حق کے خلاف ایک حبہ لے سکتا ہے اور نہ ایک چپہ بھر زمین پر قبضہ کر سکتا ہے۔ اس پر ہر وقت یہ خوف غالب رہتا ہے کہ اس کے اعمال کا سخت حساب لیا جائے گا۔ اور اگر حرام کا ایک حبہ۔ جبر سے لی ہوئی زمین کا ایک چپہ، ظلم و بے انصافی کا ایک ذرہ اور ہوائے نفسانی کی بندگی کا ایک شائبہ بھی اس کے حساب میں نکل آیا تو اسے اس کی

سزا بھگتنا پڑے گی۔ یہ اسلام کا صرف دعویٰ ہی نہیں بلکہ شارع اسلام اور آپ کے خلفاء راشدین نے اس کا عملی نمونہ[1] دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔

طریق انتخاب وطریق کار: مسلمانوں کے خلیفہ یا بادشاہ کی پوزیشن وحیثیت سمجھ لینے کے بعد اس کے طریق انتخاب کے بارے میں اتنا جان لینا کافی ہے کہ اسلام میں سلطنت وحکومت کسی خاص خاندان اور کسی مخصوص قبیلہ کا حق نہیں ہے اگر واقعات کو جھٹلایا نہ جائے اور ذرا فراخدلی سے کام لیا جائے تو یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ اسلام ہی وہ سب سے پہلا مذہب ہے جس نے وراثتی شخصی سلطنت کی لعنت کو دنیا سے مٹایا اور یہ بتایا کہ حکومت وسلطنت امانت ہے جو تمام لوگوں کی طرف سے ایک شخص کو سپرد کی جاتی ہے جب وہ شخص فوت ہو یا معزول کیا جائے تو اس کی جگہ پھر تمام سمجھدار لوگ کسی دوسرے شخص کو منتخب کر کے قائم کر دیں اس طرح نہ دنیا میں کوئی شاہی خاندان موجود ہو سکتا ہے نہ کوئی فرمانروا اپنے بیٹے کو ولیعہد بنانے کا خیال اپنے دل میں لا سکتا ہے ساتھ ہی اس بات کو بھی لازمی قرار دیا ہے کہ ہر خلیفہ تمام اہم اُمور سلطنت میں لوگوں سے مشورہ ضرور کرے اور ایک مجلس شوریٰ سلطنت کے کاموں میں ہمیشہ خلیفہ کو مدد دیتی رہے۔

اس لحاظ سے اسلامی جمہوریت ایک مکمل جمہوریت ہے اور اتنی ہی مکمل جتنی کوئی جمہوریت مکمل ہو سکتی ہے۔ البتہ جو چیز اسلامی جمہوریت کو مغربی جمہوریت سے الگ کرتی ہے وہ یہ ہے کہ مغرب کا نظریہ سیاسی "جمہوری حاکمیت" کا قائل ہے اور اسلام "جمہوری خلافت" کا۔ وہاں جمہور خود بادشاہ ہیں اور یہاں بادشاہی خدا کی ہے اور جمہور اس کے خلیفہ ہیں۔ وہاں اپنی شریعت جمہور آپ

---

[1]:- تاریخ کے صفحات اسوۂ حسنہ سے پُر ہیں۔ یہاں نمونہ کے طور پر صرف ایک دو مثالیں پیش کی جاتی ہیں

بناتے ہیں یہاں ان کو اس شریعت کی پابندی کرنی ہوتی ہے جو خدا نے اپنے رسول کے ذریعہ دی ہے۔ وہاں حکومت کا کام جمہور کا منشاء پورا کرنا ہوتا ہے یہاں حکومت

---

(۱) حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں مغیرہ بن شعبہؓ والی بصرہ کی شکایت آتی ہے کہ ان سے ایک عورت کا ناجائز تعلق ہے۔ حضرت عمرؓ یہ خبر سنتے ہی ابوموسیٰ اشعری کو حکم دیتے ہیں کہ بصرہ میں شیطان نے آشیانہ بنالیا ہے تم وہاں جاکر گورنری کا جائزہ لے لو اور مغیرہ کو گواہوں سمیت مدینہ بھیجو چنانچہ ایسا ہی کیا گیا مدینہ میں آکر مقدمہ پیش ہوا۔ چونکہ الزام غلط ثابت ہوا اس لئے مغیرہ کو رہا کر دیا گیا۔ رہائی کے وقت حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اگر واقعہ سچا ثابت ہو جاتا تو میں یقیناً تم کو سنگسار کر دیتا'' یہ مغیرہؓ آنحضرت صلعم کے جلیل القدر صحابی اور عرب کے چار مشہور ترین مدبروں میں سے ایک تھے اسلام کی بڑی بڑی جنگی و سیاسی خدمات انجام دی تھیں۔ مگر ان کی عظمت و عزت۔ بیش قیمت خدمات۔ گورنری کی اعلیٰ پوزیشن۔ غرض کہ کوئی بھی چیز ان کے کام نہ آئی۔ اور ایک معمولی مجرم کی طرح عدالت میں پیش ہونا پڑا۔ دنیاوی حکومتوں میں کسی افسر کا بدکاری کرنا اس کا شخصی معاملہ سمجھا جاتا ہے بلکہ آجکل کی مہذب حکومتوں کے قوانین میں طرفین کی رضامندی سے زنا بھی جائز ہے۔ لیکن جس حکومت الٰہیہ کا اصلی مقصد انسانیت کی اصلاح اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر تھا اس میں کسی ایسے شخص کی قطعی کوئی گنجائش نہ تھی جس کا ذاتی عمل درست نہ ہو۔ (الجہاد فی الاسلام صفحہ ۱۰۵ بحوالہ طبری، ابن اثیر (بلاذری)

(۲) خلیفہ چہارم حضرت علیؓ کی زرہ جبکہ وہ جنگ صفین کے لئے جا رہے تھے راستے میں کھوئی گئی۔ واپسی میں وہی زرہ کوفہ کے ایک یہودی کے پاس پائی جاتی ہے آپ مدعی کی حیثیت سے قاضی شرع کی عدالت میں پیش ہو کر استغاثہ دائر کرتے ہیں اور ثبوت کے لئے اپنے غلام قنبر اور اپنے بیٹے امام حسنؓ کو پیش فرماتے ہیں قاضی نے دونوں کی شہادت قبول کرنے سے انکار کر دیا کیونکہ انمیں سے ایک انکا غلام تھا اور دوسرا انکا بیٹا اس لئے دونوں کی شہادت قانون کی رو سے ناقابل قبول تھی۔ عدل کا یہ عالم دیکھ کر یہودی مسلمان ہو گیا۔

(الجہاد صفحہ ۱۰۳ بحوالہ سیوطی)

اور اس کے بنانے والے جمہوریت کا کام خدا کا منشاء[۱] پورا کرنا ہوتا ہے مختصر یہ کہ مغربی جمہوریت ایک مطلق العنان خدائی ہے جو اپنے اختیارات کو آزادانہ استعمال کرتی ہے۔ اس کے برعکس اسلامی جمہوریت ایک پابند آئین بندگی ہے جو اپنے اختیارات کو خدا کی دی ہوئی ہدایات کے مطابق اس کی مقرر کردہ حدود کے اندر استعمال کرتی ہے۔

یہ بتایا جاچکا ہے کہ خلیفہ عام مسلمانوں سے کوئی بالاتر ہستی نہیں ہے۔ لیکن حکومت کے فرائض کی ادائیگی و نیز گوناگوں ذمہ داریوں کے اعتبار سے وہ بڑی اہمیت کا مالک ہے۔ اسے بیت المال کا انتظام کرنا پڑتا ہے بیت المال میں جو روپیہ یا مال جمع ہوتا ہے وہ رعایا کا مشترکہ خزانہ ہے خلیفہ کو اپنی ذات یا اپنی ذاتی خواہشات کیلئے بیت المال سے کچھ بھی خرچ کرنے کا اختیار نہیں۔ اس کی حیثیت محض امین یا مہتمم کی ہوتی ہے وہ مخلوق خدا کی فلاح و بہبود کے لئے اس خزانہ کو خرچ کرتا ہے۔ بیت المال میں جس طرح مسلمانوں کو زکوٰۃ و عشر کا روپیہ جمع کرنا ضروری ہے اسی طرح غیر مسلموں کو بھی ایک معمولی ٹیکس جزیہ کے نام سے ادا کرنا پڑتا ہے۔ غیر مسلموں کو اس ٹیکس کے علاوہ اور کوئی ٹیکس ادا کرنا نہیں پڑتا لیکن

۱؎ خدا نے اپنے منشاء کو کلام پاک میں صاف طور سے بتادیا ہے کہ وہ (انسان) ان بھلائیوں کو قائم کرے اور فروغ دے جن سے خداوند عالم زندگی کو آراستہ دیکھنا چاہتا ہے اور ان برائیوں کو روکے، دبائے اور مٹائے جن کا وجود انسانی زندگی میں خداوند عالم کو پسند نہیں۔ اسلام میں ریاست کا مقصد کسی خاص قوم کی اجتماعی خواہشات کا پورا کرنا نہیں ہے بلکہ وہ اس کے سامنے ایک بلند نصب العین رکھ دیتا ہے جس کے حصول میں اسکو اپنے تمام وسائل و ذرائع اور اپنی تمام طاقتیں صرف کرنی چاہئیں اور وہ یہ ہے کہ خدا اپنی زمین پر اپنے بندوں کی زندگی میں جو پاکیزگی جو حسن جو خیر و صلاح، جو ترقی و فلاح دیکھنا چاہتا ہے وہ رونما ہو اور بگاڑ کی ان تمام صورتوں کا سدباب ہو جو خدا کے نزدیک اس کی زمین کو اجاڑنے والی اور اس کے بندوں کی زندگی کو خراب کرنے والی ہیں۔

مسلمانوں کو زکوٰۃ وعشر کے علاوہ صدقات اور ضرورت کے وقت بڑے بڑے چندے ادا کرنے پڑتے ہیں مسلمان فوجی خدمات کرنے پر مجبور ہیں اور زکوٰۃ وغیرہ سے کبھی معاف نہیں کئے جا سکتے۔ لیکن غیر مسلم اگر اپنی خوشی سے فوجی خدمات ادا کرنے پر آمادہ ہوں تو جزیہ معاف ہو جاتا ہے۔

۱۷۔ غیر مسلموں کے مقابلہ میں مسلمانوں کے جان و مال کو اس لئے زیادہ خرچ کیا جاتا ہے کہ یہ نوع انسان کی فلاح وبہبود کے زیادہ خواہاں اور امن وامان کی قدر وقیمت پہچاننے کے سبب اس کے قیام کے زیادہ ذمہ دار ہیں اعانت حق کیلئے جس طرح اللہ نے ان کی جانوں کو خرید لیا ہے اسی طرح ان کی دولت کو بھی اپنے لئے خرید کر محفوظ کر لیا ہے یہی وجہ ہے کہ مسلمان کو اپنے جان ومال پر قطعی اختیار نہیں وہ دونوں کا امین ہے وہ امانت میں خیانت نہیں کر سکتا اس کو یوں سمجھئے کہ وہ اللہ کے بتائے ہوئے راستوں اور طریقوں کے علاوہ کسی دوسرے راستے یا طریقہ پر نہ اپنی جان قربان کر سکتا ہے نہ مال یہی وجہ ہے کہ اسلامی حکومت میں نہ تو ناجائز طریقوں سے دولت کمائی جا سکتی ہے اور نہ ناجائز کاموں میں دولت کو صرف کیا جا سکتا ہے ناجائز نفع بازی جو آجکل کی سرمایہ دارانہ نظام کی جان ہے اسلام نے اسکو قانوناً روک دیا رشوت کو جو انسان کے لئے بلا استحقاق آمدنی ہے ناجائز قرار دیا۔ تجارت کی ترغیب دی لیکن سودخوری کو اس لئے ممنوع قرار دیا کہ اس میں بہت سی اخلاقی و اقتصادی مضرتیں مضمر ہیں سودخوری سے انسان کی باہمی محبت ومہربانی وہمدردی کی صفت حسنہ معدوم ہو جاتی ہے۔ بے محنت دولت کمانی سے انسان آرام طلب، بزدل اور نکما ہو جاتا ہے سودخوری کے رواج سے ملک کی تمام دولت بتدریج سمٹ کر ایک محدود گروہ کے قبضہ میں آجاتی ہے۔ اور باقی لوگوں کو مظلومانہ طور پر افلاس میں مبتلا ہونا پڑتا ہے غلّہ یا دوسری ضروریات زندگی کی چیزوں کو گرانی کے انتظار میں فروخت نہ کرنے اور روکے رکھنے کو بھی اسلام نے منع کیا ہے کیونکہ اس سے صرف ایک شخص کو فائدہ پہونچتا ہے اور باقی تمام لوگوں کو اس سے اذیت ہوتی ہے اسی طرح قماربازی اور شراب خوری کو بھی اسلام نے ممنوع قرار دیا ہے کیونکہ ان چیزوں سے بھی فتنے اور فسادات پیدا ہوتے ہیں۔ (باقی صفحہ ۴۱ پر)

خلیفہ جس طرح مسلمانوں کو نماز روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ عبادات پر قائم رکھتا ہے اور ان چیزوں کو ادا کرنے کا اہتمام کرتا ہے اسی طرح غیر مسلموں کے اخلاق کی درستی اور اس کی نگہداشت بھی کرتا ہے لوگوں کو پُرامن زندگی بسر کرنے کی ترغیب دیتا ہے اور تمام بیحیائی کے کاموں کو روکتا ہے۔ ملک کو اندرونی و بیرونی خطرات سے محفوظ رکھنے کے لئے فوج و پولیس کا انتظام کرتا ہے وہ عدل و انصاف قائم کرتے وقت مسلم و غیر مسلم میں کوئی امتیاز روا نہیں رکھتا اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام میں عدالت انتظامی حکومت کے ماتحت نہیں ہے بلکہ براہ راست خدا کی نمایندہ اور اس کو جوابدہ ہے۔ حاکمان عدالت کو مقرر تو انتظامی حکومت ہی کرتی ہے مگر جب ایک شخص عدالت کی کرسی پر بیٹھ جائے گا تو وہ خدا کے قانون کے مطابق لوگوں کے درمیان بے لاگ انصاف کرے گا اور اس کے انصاف کی زد سے خود حکومت بھی نہ بچ سکے گی حتّٰی کہ خود حکومت کے رئیس اعلیٰ کو بھی مدعی یا مدعا علیہ کی حیثیت سے اس کے سامنے اسی طرح حاضر ہونا پڑے گا جیسے ایک عام شہری حاضر ہوتا ہے۔

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۴۰:- بہرحال اس قسم کے احکام و قوانین کا منشا یہ ہے کہ سوسائٹی کا معیار ہر لحاظ سے بلند رہے اور اندر باہر سے جو خرابیاں پیدا ہوسکتی ہیں یا پیدا ہونے کا امکان ہے انھیں سختی سے روکا جائے۔

باب اوّل

ہندوستان میں آمد کے وقت اسلامی سوسائٹی کا رنگ

پچھلے صفحات میں جن اصولوں کا جائزہ لیا گیا ہے ان سے قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں جس اسلامی سوسائٹی سے ہندوستان کو واسطہ پڑا آیا وہ ان تمام اصولوں کو صحیح مان کر ان پر عمل پیرا تھی یا اس کا طریق عمل کچھ اور تھا یہ ایک نہایت اہم مسئلہ ہے اس کا حل ہم اس لئے اور بھی زیادہ ضروری سمجھتے ہیں کہ اس کی روشنی میں ہندوستان کے مسلم سلاطین کے اعمال و کردار کا جائزہ لیکر ہندوستان کی تاریخ میں ان کا صحیح درجہ متعین کیا جا سکے نیز اس کو پڑھ کر ذہن ان اثرات کو قبول یا رد کرنے کے لئے تیار ہو سکے جو اس عہد کی اسلامی سوسائٹی سے ہندوستان کی تہذیب و معاشرت نیز سیاسی اور سماجی زندگی پر مترتب ہوئے۔ آسانی کی غرض سے اس کو چند عنوانات میں تقسیم کر لیا گیا ہے جن کو یکے بعد دیگرے بیان کیا جاتا ہے۔

فصل اوّل۔ اسلامی شریعت (فقہ و تصوف)

(۱-) **قانون شریعت:-** یہ تو ظاہر ہے کہ نبی کریم صلعم کے وصال کے بعد آپ کی تربیت یافتہ جماعت (یعنی صحابۂ کرام) بدستور اسلامی اصولوں کو عملی جامہ پہناتی رہی۔ اور ۳۰ سال کے اندر اندر آپ کی دعوت کو مشرق سے لیکر مغرب تک عام کر دیا۔ آپ کی بعثت کا مقصد ہی یہ تھا کہ عام عالم انسانی کو ایک ایسا حیات پرور اور ایمان افزا نظام عمل دیں جو سب نظاموں سے بہتر و اعلیٰ ہو آپکی بعثت کا

یہ مقصد اس صورت میں پورا ہوا کہ قیصر و کسریٰ کا نظام جو ایک مدت تک ساری دنیا پر حاوی تھا پاش پاش ہو گیا اور انسانیت کو قیصریت و کسرویت دونوں سے نجات مل گئی۔ کلیلہ دمنہ کے مصنف ایرانی حکیم برزویہ نے اسوقت ایران کی جو حالت تھی اس کا ان الفاظ میں نقشہ کھینچا ہے:-

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں نے صداقت سے ہاتھ اٹھا لیا ہے جو چیز مفید ہے وہ موجود نہیں اور جو موجود ہے وہ مضر ہے جو چیز اچھی ہے وہ مرجھائی ہوئی ہے اور جو بُری ہے وہ سرسبز ہے۔ دروغ کو فروغ ہے اور نیکی بے رونق ہے علم پستی کے درجہ میں ہے۔ اور بے عقلی کا درجہ بلند ہے۔ بدی کا بول بالا ہے اور شرافت نفسی پامال ہے۔ محبت متروک ہے اور نفرت مقبول ہے۔ لطف و کرم کا دروازہ نیکوں پر بند ہے اور شریروں پر کھلا ہوا حکام کا فرض صرف عیاشی کرنا[۱] اور قانون کو توڑنا ہے مظلوم اپنی ذلت پر قانع ہے اور ظالم کو ظلم پر فخر ہے۔ حرص اپنا منہ کھولے ہوئے ہے۔ اور دور و نزدیک کی ہر چیز کو نگل رہی ہے تسلط لائقوں سے نالائقوں کی طرف منتقل ہو گیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دنیا مسرت کے نشہ میں یہ کہہ رہی ہے کہ میں نے نیکی کو مقفل اور بدی کو رہا کر دیا ہے"[۲۷]

کم و بیش یہی حالت روم کی تھی۔ اسلام کے عدل پرور اور اخوت و مساوات پر مبنی اصولوں نے اس قسم کے فرسودہ نظام حیات کے بجائے جو انسانیت کو گھن کی طرح کھائے جا رہا تھا ایک نیا نظام نافذ کیا جس کی وجہ سے لوٹ کھسوٹ

---

[۱]:- عجم و روم کے شاہنشاہ اس قدر تعیش میں مبتلا ہو گئے تھے کہ اگر ان کا کوئی درباری لاکھ روپئے سے کم قیمت کی ٹوپی یا کمر بند پہنتا تو اسے ذلیل سمجھا جاتا تھا۔

(حجۃ اللہ البالغہ ص۱۰۵)

۲۷:- ماخوذ از مولانا عبید اللہ سندھی ص۲۷۲

کرنے والے طبقے یا تو سرے سے ناپید ہوگئے یا اُن کے ہاتھوں سے اقتدار چھن گیا۔ قدرتی طور پر اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسلام کے مفتوحہ ممالک کے عوام کو ہاتھ پیر مارنے کا موقع ملا اور وہ جماعتی زندگی میں پیش پیش نظر آنے لگے۔ چنانچہ تھوڑے ہی عرصہ کے اندر جبکہ عہد بنو امیہ میں عربی قوت و اقتدار کا آفتاب نہایت آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا غیر عرب بھی دین و سیاست میں حصّہ لینے لگ گئے۔ کہا جاتا ہے کہ اموی خلیفہ ہشام نے ایک مرتبہ اپنے مصاحب سے دریافت کیا کہ اس وقت بصرہ کا سب سے بڑا عالم کون ہے مصاحب نے اس کا نام لیا خلیفہ نے پوچھا وہ عرب ہے یا غیر عرب جواب دیا غیر عرب پھر پوچھا کہ کوفہ میں سب سے بڑا عالم کون ہے پھر قسطاط (قاہرہ) یمن، مکّہ، مدینہ اور دمشق کا حال پوچھا۔ راوی کا بیان ہے کہ ان تمام شہروں کے سب سے ممتاز اہل علم غیر عربوں میں سے تھے۔ غرضکہ تمام دینی و دنیوی علوم میں اہل عجم عربوں کے برابر کے شریک ہوگئے اور جب خلافت عباسیوں میں منتقل ہوئی تو چونکہ اس انقلاب میں عجمیوں کا غالب حصّہ تھا۔ اسی مناسبت سے ان کے اثرات زندگی کے ہر شعبہ میں نمایاں ہوتے چلے گئے۔ اب وہ کسی معاملہ میں عربوں سے پیچھے نہیں تھے۔ جنگوں میں قیادت ان کے ہاتھ میں تھی۔ سیاست کے گھوڑے وہ دوڑاتے تھے۔ قرآن کی تفسیریں وہ کرتے تھے احادیث کی ترتیب و تدوین کا کام وہ انجام دیتے تھے اور دوسری قوموں سے جو علوم عربی زبان میں منتقل ہوئے ان میں بھی یہی لوگ پیش پیش تھے۔

غرضکہ مملکت اسلامیہ جس قدر حیرت انگیزی سے وسیع ہوتی چلی گئی اور اس میں صدہا و ہزارہا اقوام کے افراد مع اپنے آبائی و خاندانی روایات و رجحانات کے دائرۂ اسلام میں داخل ہوتے چلے گئے اتنی ہی تیزی سے مسلمانوں

کو بیشمار نئے نئے مسائل سے سابقہ پڑتا رہا۔ ان مفتوحہ ممالک میں اکثر و بیشتر ایسے قوانین سے دوچار ہونا پڑا جن سے عرب کی سرزمین بالکل نا آشنا تھی۔ مثلاً آبپاشی کا نظام۔ کاشتکاروں اور تاجروں کے ساتھ حکومت وقت کے تعلق کی نوعیت شادی بیاہ کے مقامی مروجہ طریقے بعض جرائم کا نیا ڈھنگ اور نیا طرز الغرض اس قسم کے نت نئے مسائل کا انہیں قرآن و حدیث کی روشنی میں حل تلاش کرنا پڑا اور پھر جس خوبی و کامیابی کے ساتھ اس اہم انسانی ذمہ داری کو انھوں نے پورا کیا وہ آج تک غیر قوموں کے لئے باعث حیرت و استعجاب ہے اور ان کی وہ عجیب عجیب تاویلیں پیش کرتے ہیں۔

قرآن کریم و سنت نبوی نے ان تمام فروعی مسائل کو جو پہلے تھے یا جو آج ہیں یا کل پیش آئیں گے طے نہیں کر دیا بلکہ حیات انسانی میں پیش آنے والے بہت سے مسائل کو اولی الامر کے اجتہاد پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ قرآن و سنت کی روشنی میں ان کا حل تلاش کریں اسی کا نام اصول فقہ میں "قیاس" ہے چنانچہ اسی پر عمل کیا گیا اور یہی نبی اکرم کا حکم بھی تھا ترمذی و ابوداؤد کی یہ مستند روایت ہے کہ

"جب پیغمبر خدا صلعم نے حضرت معاذ رضؓ کو یمن بھیجا تو ان سے پوچھا کہ تم لوگوں کے معاملات میں کیونکر فیصلہ کرو گے۔ معاذؓ نے جواب دیا کہ میں کتاب اللہ کی رو سے فیصلہ کروں گا۔ آپ نے پھر سوال کیا۔ اگر تم اس کو کتاب اللہ میں نہ پاؤ۔ اس پر عرض کی میں سنت نبوی میں اس کی نظیر ڈھونڈوں گا۔ آپ نے دریافت کیا کہ اگر یہ نظیر بھی نہ ملے تو پھر کیا کرو گے۔ اس پر انھوں نے بلا تامل جواب دیا کہ میں اجتہاد سے کام لونگا۔ پیغمبر خدا نے یہ جواب سن کر خدا کا شکر ادا کیا۔"

فی الحقیقت یہ روایت فقہ اسلامی کی جان ہے اور اسی پر تمام صحابہ کرام عمل پیرا

رہے۔ حضرت علیؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت علقمہؒ، حضرت ابراہیم نخعیؒ اور حضرت حمادؒ نے فقہ کو بہت کچھ وسعت دی لیکن فقہ اسلامی کی باضابطہ تدوین حضرت امام ابو حنیفہؒ کے حصہ میں آئی۔ آپ نے فقہ اسلامی کے منتشر شیرازے کو جو اس وقت تک زبانی روایتوں اور فتووں کی شکل میں جاری تھا یکجا مدوّن کردیا۔ آپ نے استنباط و استدلال کے قواعد مقرر کئے۔ احکام کے استخراج کے اصول وضع کئے اور مراتب حدیث میں امتیاز قائم کیا اور چونکہ اسلام دین فطرت ہے اسلئے آپ نے انسان کی پوری فطرت کو مدنظر رکھتے ہوئے اصول فقہ کو کلام اللہ کی منشاء کے مطابق قیاس وعقل کی رو سے منضبط کیا۔ اس کام میں آپ کے تیس برس صرف ہوئے اور اس عرصہ میں بعض کے نزدیک بارہ لاکھ نوے ہزار اور بعض کے نزدیک چھ لاکھ ضروری مسائل مدوّن کئے۔ حیات انسانی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جو اِن مسائل میں نہ آگیا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ دُنیائے اسلام کے اکثر حصّوں میں فقہ حنفی کو جو قبولیت تامّہ حاصل ہوئی وہ دوسرے مذاہب حقہ کو نہیں ہوسکی۔ کیونکہ ان میں وہ ہمہ گیری نہیں جو اس میں ہے گو اپنے اپنے قومی مزاج کے مطابق وہ بالکل صحیح اور درست ہیں۔

حنفی مسلک ہر زمانہ اور ہر ملک میں بالخصوص عجمی ممالک میں پسندیدہ نگاہوں سے دیکھا گیا غزنوی وسلجوقی سلاطین نے اس کو ترقی دی اور خاندان عباسیہ نے بھی اسی مسلک کو اختیار کیا۔ یہی وہ مسلک ہے جو ایک ضابطہ وقانون کی شکل میں مسلمانوں کے ساتھ ہندوستان آیا۔ اِس کے اندر بین الاقوامیت کی روح ہے، ہمہ گیری ہے اور مسائل انسانی کا حل ہے۔

(ب) "تصوف یا تہذیب شریعت"

یہ تو اسلام کی ظاہری شکل تھی جس کو عملی صورت میں ہندوستان کے

اندر پیش کیا گیا اس کو کُل اسلام سمجھ لینا غلطی ہے۔ یہ فقہ ظاہری تو اسلام کا جسم ہے اور جسم بغیر روح کے بیکار۔ اسلام کی روح ہے طریقت۔ اس طرح فقہ ظاہری و باطنی دونوں کے مجموعہ کا نام ہے اسلام۔ یہ دونوں لازم وملزوم ہیں انھیں ایک دوسرے کی ضد سمجھنا حقیقت کا خون کرنا ہے۔ اسلام تو ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے جس کی بنیاد قرآن وحدیث پر قائم ہے۔ اس کا عملی خاکہ رسول، اصحاب رسول اور اُن کے نقش قدم پر چلنے والے بزرگان سلف کا تعامل ہے جو زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہے اس کے اہم عنوانات ہیں ایمان و ایقان اور احسان۔ ایمان کی مزید تفصیل عقائد، عبادات، معاشرت اور معاملات وغیرہ کے تحت میں ملتی ہے جس کی حامل ہے فقہ ظاہری؟ جس میں اعمال قلب وجوارح شامل ہیں۔ احسان کی تشریح اخلاق[ع۱] وتصوف، فقر ودرویشی، عشق ومحبت، اخلاص وطریقت وغیرہ عنوانات کے ماتحت کی گئی ہے۔ ان ہی سب کا جامع عنوان "تصوف" ہے جو باطن کی فقہ ہے تصوف کا کام قلب وجوارح کے اعمال وارکان میں اخلاص کی روح پھونکنا ہے اور اخلاص یہ ہے کہ کسی کام سے بجز رضائے الٰہی اور کچھ مقصود نہ ہو جو دنیا و آخرت کے صلاح وفلاح کی ضامن ہے۔

ع۱ : تخلقوا باخلاق اللّٰہ یعنی اپنے اندر اللہ کے اخلاق پیدا کرو۔ اسکی تشریح احاطہ تحریر سے باہر ہے لیکن اجمالی تعارف کیلئے غالباً سطور ذیل کافی ہونگی۔ جن سے ایک سچے صوفی کے مکارم اخلاق پر روشنی پڑتی ہے۔ مکارم اخلاق کے سلسلہ میں ایک بزرگ وعالم متبحر نے بحث کرتے ہوئے قول نبویؐ پیش کیا ہے۔ لکھتے ہیں "فرمود علیہ الصلوٰۃ والسلام آیا خبر کنم شما را باں کسانیکہ محبوب ترو قریب ترمن بروز قیامت خواہند بود، گفتند (اصحاب رسول) خبر کن، فرمود آنانکہ نیک اخلاق ونرم خو والفت گیرندہ والفت دہندہ ہستند واز اخلاق ایشاں مہربانی کردن ومحبت ودلاوری وچشم پوشی وسترو (باقی صفحہ ۴۸ پر)

افسوس ہے کہ عہد حاضر کے مفکّرین رضائے الٰہی کو ضروری نہیں سمجھتے وہ خدا سے بے نیاز ہو کر دنیوی معاملات کی گتھیاں سلجھانے کے لئے صرف اتنا ضروری سمجھتے ہیں کہ اپنے اندر احساس ذمہ داری پیدا کیا جائے تاکہ "آنے والی نسلوں کے سامنے انھیں اپنے اعمال و افعال کی جوابدہی نہ کرنا پڑے" اس میں ان کا سب سے بڑا معین و مددگار ساتھی ضمیر یا کانشنس ہے۔ اس کو اگر بنظر حقیقت دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہی غلطی مغالطے اور ذہنی ژولیدگیاں ہیں جن میں اُلجھ کر اس زمانہ کا انسان ان بلند حوصلوں سے محروم ہوگیا جن کے بل بوتے پر وہی کیا جاتا تھا جو کہا جاتا تھا

یہاں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ خدا کے سامنے جوابدہ ہونے اور اس سے ڈرنے کیلئے انسانی فطرت میں ضمیر یا کانشنس کے احساس کا جو کانٹا چبھا دیا گیا ہے اب اگر بجائے خدا کے اسکی تخلیق کردہ چیز یعنی ضمیر کی بے بس آواز

بسلسلۂ فٹ نوٹ برصفحہ ۴۷:- درگذشتن و صبر و رضا و بشارت و بردباری و تواضع و نصیحت و شفقت و برداشت سختی ہا و موافقت و احسان و آشتی و منفعت غیر را بر مصلحت خود مقدم داشتن و خدمت نمودن و الفت کردن و کشادہ رو شدن و کرم و جوانمردی و در یافتن جاہ و مروت و آہستگی و دوستی و عفو و درگذشتن از گناہ و سخاوت و جوانمردی کردن و وفا و حیا و نرمی نمودن و کشادہ روی و تمکین و وقار و دُعا و ثنا و حسن ظن و انکساری و توقیر برادران و تعظیم بزرگان و ترحم برخورد و کلاں حقیر پنداشتن چیزیکہ بدیگرے دہد و بزرگ پنداشتن چیزے کہ بدو رسد"

"تصوف آنیست نہ آنکہ مدعیان گفتہ اند ایشاں طمع را زیارت نام کردہ اند و بے ادبی و گستاخی را اخلاص نام کردہ اند و خروج از حق را شطح می نامند یعنی بفراخ زبانی و بے باکی چیزے گفتن کہ سبب بیروں آمدن از دین باشد ..... الخ (سبع سنابل صفحہ ۵۳، صفحہ ۵۴ از میر عبد الواحد بلگرامی)

کے ڈر ہی کو کافی سمجھ لیا جائے تو کیا اُس (اللہ) سے نڈر بن جانے اور بنا دئے جانے کے بعد واقعی اِس مسکین ضمیر کی روک ٹوک سے یہ انسان ڈر جائے گا ؟ اِس کا جواب اگر آپ تاریخ کے صفحات میں تلاش کرنا چاہتے ہیں تو یہ ہے کہ خدا کے سامنے جوابدہی کی ذمہ داریاں جن نتائج کو پیدا کر رہی تھیں اُن نتائج وثمرات کے پیدا کرنے سے آج ضمیر کا غیر منطقی خوف قطعی قاصر ہے۔ اللہ کا حکم اور اُس کے رسول کا فرمان "خبردار! خبردار! جن لوگوں سے امن کا عہد کر لیا گیا ہے اُن پر ہرگز ظلم نہ ہونے پائے۔ دیکھو اُن کی برداشت اور تحمل سے زیادہ بار اُن پر نہ ڈالا جائے اور اُن کی رضامندی کے بغیر اُن کی کسی چیز کو ہاتھ نہ لگایا جائے ورنہ میں اس پر قیامت کے دن دعویٰ کروں گا اور اس سے لڑونگا" انصاف کے ساتھ ٹھنڈے دل سے سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا جائے کہ کیا کوئی حاکم جو مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اللہ تعالیٰ کی آخری عدالت میں نبی کریمؐ کا مدعیٰ علیہ بن کر پیش ہونے کی جرأت اپنے اندر رکھتا ہے۔ اس احساس کا موازنہ اُس احساس ذمہ داری سے کیجئے جس کا دعویٰ آج بے خدا والی زندگی میں کیا جاتا ہے تو کیا پھر یہ حقیقت آپ پر منکشف نہیں ہو گی کہ اگلی نسلوں کے سامنے جوابدہ نہ بننے کے لئے یا بالفاظ دیگر اُن کو خوش رکھنے کے لئے آج بیکس ضمیر کا کس طرح خون کیا جا رہا ہے۔ سوال چھوٹوں کا نہیں بڑوں کا ہے اور اُن کا جو دنیا میں عزت کی بلند سے بلند کرسی پر متمکن ہیں اُن کے متعلق دیکھا جا رہا ہے کہ ابھی معاہدہ کی روشنائی خشک بھی نہیں ہونے پائی کہ اس کے الفاظ کے اُلٹ پھیر سے نفع اُٹھانے کی تدبیریں سوچی جانے لگتی ہیں پھر ذہنی کرتبوں سے کام لے کر الفاظ کو معانی اور معانی کو الفاظ سے بیگانہ بنانے کی فکروں میں انھیں مشغول ومنہمک دیکھا جاتا ہے لیکن ضمیر یہ سب کچھ

دیکھتا ہے اور کچھ نہیں کر سکتا۔

اِس میں شبہ نہیں کہ اگر ضمیر یا کانشنس کی کیل جس کو قرآن نے "الامانۃ" کے لفظ سے یاد کیا ہے آدمی کی فطرت میں ٹھونک نہ دی جاتی تو انسان عملاً صرف ظالم نہیں بلکہ ظلوم (بہت بڑا ظالم) اور علماً جاہل نہیں بلکہ جہول (بہت بڑا جاہل) بن کر رہ جاتا۔ اِس "الامانۃ" کے جذبہ کا مطلب یہی ہے کہ جن چیزوں پر آدمی کو اقتدار بخشا گیا ہے اس اقتدار و اختیار کے استعمال میں اسے اپنی مرضی کی نہیں بلکہ اُس کی مرضی کی پابندی کرنی چاہئے جس نے بداامانت اسے یہ "جذبہ" عطا فرمایا ہے اور اس کا اقرار تو یہ ضمیر والے بھی کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ "جو جی میں آئے کر گذریں" اِس قسم کا مطلق العنان اختیار ہمیں نہیں ملا ہے مگر "الامانۃ" کے اقتضاء کا یہ صرف منفی پہلو ہے آگے سوال ہوتا ہے کہ "اپنی مرضی کے مطابق جب اپنے اقتدار کے استعمال میں ہم آزاد بن کر پیدا نہیں ہوئے ہیں تو پھر کس کی مرضی کی پابندی کریں" یہ مثبت و ایجابی پہلو جذبۂ امانت کا عصری مفکرین کی نظروں سے اوجھل ہو گیا حالانکہ فطرت انسانی کی یہی پیاس آدمی کو اس پر مجبور کرتی ہے کہ اس کی مرضی کو جس کا وہ امین ہے دریافت کرے۔ اسی کے بعد نبوت اور وحی کے پانی کی تلاش پیدا ہوتی ہے۔ ورنہ فرض کی پابندی فرض عائد کرنے والے کے بغیر ایک مہمل سی بات ہے۔

بہر حال ذکر رضائے الٰہی کے حصول کا تھا جس کی طرف رہنمائی کرنے والی فقہ باطنی ہے۔ یہی وہ فقہ باطنی ہے جو فقہ ظاہری کے احکام کو باحسن وجوہ نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دینے کی انسان کے اندر صلاحیتیں پیدا کرتی ہے۔ غرضکہ ہر دو فقہ کا مجموعہ "تفسیر شریعت" ہے جسکو عرف عام میں شریعت و طریقت کہا

جاتا ہے۔ ان دونوں میں حقیقتاً کل وجزو کا رشتہ ہے اور انھیں ایک دوسرے سے جدا سمجھنا ناواقفیت کی بات ہے۔ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ امام مالک رحؒ کا ایک قول نقل فرماتے ہیں :۔

"جو شخص صوفی ہوا اور فقیہہ نہ ہوا وہ گمراہ ہوا اور جو فقیہہ ہوا اور صوفی نہ ہوا وہ فاسق رہا جس نے ان دونوں کو جمع کیا وہ محقق ہوا" ع۱

چنانچہ تمام بڑے بڑے ائمہ کرام بیک وقت صوفی بھی تھے اور فقیہہ بھی اسی طرح صوفیاء کرام کا بھی غالب حصّہ ظاہری و باطنی دونوں علوم سے آراستہ و پیراستہ تھا۔

صحابۂ کرام کو باطنی اصلاح کے لئے کسی اور طرف نظر دوڑانے کی ضرورت نہ تھی کیونکہ ان کی باطنی صلاحیتوں کو خود نبی کریمؐ کی صحبت نے اُبھارا اور سنوارا تھا لیکن بعد کو جس طرح ہمسایہ ملکوں کے اداری انتظامات کو تمدن اسلامی میں جگہ ملی اور اواخر عہد اموی اور اوائل عہد عباسی میں مختلف علوم وفنون کو ترتیب دیا گیا اسی طرح تصوف کو بھی علمی شکل دیدی گئی۔ مسلمانوں نے یونانی، ایرانی، اور ہندی تمام تصوفوں کو کھنگالا۔ ان کے کھرے کھوٹے کو پرکھا جو ردّی تھا اسے رد کیا جو جز و صالح تھا اسے اپنا کر رکھا۔ اسی کے متعلق ڈاکٹر تاراچند نے "ہندو کلچر پر اسلام کے اثرات" پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے :۔

"اِس کی مثال ایک دریا کی سی تھی جس میں ہر طرف سے ندیاں اور نالے آآکر مل جاتے ہوں، اس تصوّف کا منبع اصلی قرآن اور رسول اللہ صلعم کی زندگی تھی۔ عیسائیت اور نو افلاطونی خیالات نے اس میں بڑا کام کیا اور پھر

ع۱ بحوالہ مولانا عبیداللہ سندھی صہ ۱۴۹

ہندو اور بودھ مت سے اس میں بہت سے نئے افکار شامل ہو گئے اور ایران کے قدیم مذاہب کی باقیات بھی اس میں آملیں"[1]

یہ ایک حد تک صحیح ہے لیکن اس سے کہیں یہ نہ سمجھا جائے کہ اذکار و اشغال، مجاہدات و مراقبات وغیرہ کے وہ طریقے جو بظاہر قرآن وحدیث میں مذکور نہیں "احداث فی الدین"[2] ہیں اس لئے بدعات ہیں انھیں بدعات کہنا ایک بے معنی سی بات ہے کیونکہ یہ چیزیں دراصل تصوف کے مقاصد و غایات نہیں جیسا کہ عام طور سے سمجھ لیا گیا ہے۔ ان کی اصل حیثیت تدابیر و مقدمات یا آثار و ثمرات کی ہے۔

بدعت یا "احداث فی الدین" اصلاً نام ہے کسی نئی چیز کا دین میں دین کا مقصد جان کر اضافہ کرنا، نہ کہ "احداث للدین" یعنی مقاصد دین کے حصول کے لئے از راہ تجربہ کسی نئی تدبیر کا اختیار کرنا جیسے طب میں صحت کے حصول و حفاظت کے لئے نئی نئی تدابیر و ادویہ کا تجربہ اور اضافہ ہوتا رہتا ہے یا خود دین میں علوم دین کی حفاظت و اشاعت کے لئے مدرسے کھولنا، کتبخانے قائم کرنا، لیتھو اور ٹائپ میں کتابیں چھاپنا، درس و تدریس کے لئے نئی نئی صورتیں تجویز کرنا۔ یہ سب باتیں نئی ہیں لیکن چونکہ "احداث للدین" ہیں اسلئے نہ یہ بدعات ہیں اور نہ ان کو کتاب و سنت میں ڈھونڈھنے کی ضرورت

---

[1] بحوالہ مولانا عبید اللہ سندھی صہ ۱۴۸

[2] تفصیلات کیلئے ملاحظہ ہو مقالہ موسومہ "تصوف و سلوک کی تجدیدات" از جناب مولانا عبد الباری صاحب ندوی در رسالۂ معارف ماہ اکتوبر ۱۹۴۸ء صہ ۲۴۹-۲۴۶ بحوالہ الافاضات الیومیہ جلد ہفتم صہ ۳۲۶ و صہ ۳۲۷ مولفہ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رح۔

ہے۔ اسی طرح مثلاً نماز میں خشوع اور حضور قلب مقصود و مامور ہے اور تجربہ سے ذکر و شغل یا مراقبہ وغیرہ کی کوئی خاص صورت وہیئت اس مقصود کے حصول میں معین معلوم ہوئی جس میں کوئی شرعی ممانعت و قباحت بھی نہیں تو اس کا اختیار کرنا جائز ہے خواہ غیر مسلموں ہی سے کیوں نہو۔ پس ذکر و اذکار کے جتنے اشغال ہیں وہ چونکہ مقصود بالذات نہیں بلکہ جمع خواطر کے لئے ہیں اسی لئے مشائخین کرام نے اسمیں یہاں تک وسعت پیدا کی کہ بعض اشغال غیر مسلموں تک سے لے لئے ہیں مثلاً پاس نفس یا حبس دوام جو بعض جوگیوں کے اشغال ہیں۔

راقم الحروف نے جلد اول میں سندھ کے علماء و علوم کا ذکر کرتے وقت یہ بتایا ہے کہ خلفاء عباسیہ کے زمانہ میں کس طرح بغداد میں سنسکرت کی کتابوں کے ترجمے ہندو پنڈتوں کی مدد سے عربی میں کئے گئے انھیں کتب میں بعض ویدانت وغیرہ پر بھی تھیں جن سے مسلمانوں نے استفادہ کیا لیکن جیسا کہ بتایا جاچکا ہے انھوں نے ہندو یوگ کا کلیتاً تتبع نہیں کیا بلکہ اس میں ایک نیا پن پیدا کیا اور اس کے اندر بت پرستی کی وجہ سے جو آلائشیں آگئی تھیں انھیں دور کرکے صاف و پاکیزہ شکل میں جبکہ وہ درۂ خیبر سے ہندوستان میں داخل ہوئے ہندوؤں کے سامنے پیش کیا یہی وجہ ہے کہ اسلامی تصوف جو بین الاقوامی طریقہ ہائے فکر و ذکر پر مشتمل ہے ہر سمجھدار غیر مسلم کو اپنی طرف کھینچ سکتا ہے۔ ہندوستان میں فرقہ وارانہ تعصبات اگر زور پر نہ ہوتے تو کچھ بعید نہ تھا کہ مسلمان عارفین کے فیض سے ہر غیر مسلم کے دل میں اسلامی تصوف گھر کر لیتا اور ہندوؤں کے سمجھدار طبقے اسلام کے گرویدہ ہو جاتے پھر بھی ہندوؤں کو اسلام سے قریب تر لانے میں مسلمان صوفیاء نے بڑا کام کیا ہے جس کا ہر شخص معترف ہے[1]۔

---

[1] تفصیلات کیلئے ملاحظہ ہو۔ پریچنگ آف اسلام از ڈاکٹر ٹی۔ ڈبلیو آرنلڈ۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ خلافت راشدہ کے بعد اسلامی سوسائٹی سے وہ سادگی وسادہ روی قریب قریب مفقود ہوگئی جو اس کا طرۂ امتیاز تھی۔ اور اس کے بہت سے وجوہ ہیں فتوحات کے سیلاب نے اسے جادۂ اعتدال سے ڈگمگا دیا۔ دولت کی کثرت و فراوانی نے اسے عیش پرستی کی طرف مائل کردیا۔ ادھر خلفاء کی باہمی رزم آرائیوں نے اسلامی سوسائٹی کی وحدت کو ختم کرکے اس کو مختلف سیاسی گروہوں میں تقسیم کردیا جن پر بعد کے آنے والوں نے مذہبی رنگ و روغن مل کر اور زیادہ شوخ کردیا[1]۔ نو افلاطونی، ایرانی و ہندی فلسفۂ حیات کے عمیق مطالعہ نے عقائد کی دُنیا میں ہیجان برپا کر رکھا تھا۔ جس کی وجہ سے علماء و فقہاء میں مناظرہ و مکالمہ کی گرم بازاری ہوئی۔ یہ تمام باتیں سوسائٹی کے سچے عبادت گذار بندوں کے لئے شاق تھیں۔ انھوں نے اپنے گھروں اور مسجدوں میں اور بعد کو آبادی سے الگ تھلگ خانقاہوں میں گوشہ نشین ہوکر مشاغل الٰہی میں اپنی زندگیاں بسر کرنی شروع کردیں۔ اُن کے یہ زاویے دراصل ایک طرح کی تربیت گاہیں تھیں[2] جہاں معتقدین کی سیرتوں کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ یہیں سے جمہور کی رہنمائی کے لئے وہ پاک و بے لوث اسلامی لیڈر نکلتے تھے جن سے حکومت وقت بھی خائف رہتی تھی۔

بہر حال تصوف کا یہ وہ دور تھا جبکہ صوفیہ سپاہی تھے اور سلاطین اُن کے

---

(۱) ہندو کلچر پر اسلام کے اثرات از ڈاکٹر تاراچند (۲) مولانا عبید اللہ سندھی از پروفیسر محمد سرور جامعی۔ خانقاہوں کی تاسیس و تعمیر اور درویشی کے قیام کی ذمہ داری جس قدر علماء و ملوک پر ہے اسیقدر اُن بزرگوں پر بھی ہے جنھوں نے حکومت الٰہیہ (رام راج) کے قیام کو پس پشت ڈال کر اپنی انفرادی نجات اور روحانی ارتقاء کو زندگی کا مقصد بنا لیا۔ لیکن یہ بہت بعد کی بات ہے جس کو زیر بحث دور سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کا ذکر مناسب موقع پر تیسری جلد میں کیا جائیگا۔

مشوروں پر چلنا اپنی سعادت سمجھتے تھے۔ اِس عہد کے صوفیہ دنیاوی مال ومتاع اور جاہ وعزّت سے بیشک متنفر تھے لیکن تبلیغ اور اشاعت اسلام ان کی زندگی کا مقصد تھا۔[۱] اعلاء کلمۃ الحق اور صداقت کے اظہار میں وہ بے باک تھے کیونکہ وہ بے لوث و بے طمع تھے اس لئے ان کو یہ حق ضرور حاصل تھا کہ غلط کاروں کو غلط اقدام سے روک دیں اور اس طرح بادشاہ سے لیکر عام متصدی اور سپاہی تک کے کردار کی نگرانی کریں۔ اِس عہد کے صوفیہ کو یہ سمجھنا کہ وہ محض اہل اللہ تھے اور دُنیا کے کاروبار سے انھیں کوئی سروکار نہ تھا صحیح نہیں۔ یہاں پر اس بات کا موقع نہیں کہ ان کے کاموں کا جائزہ لیا جائے پھر بھی اظہار حقیقت کی غرض سے اتنا عرض کردینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ محمود غزنوی سے پہلے بھی اور بعد کو بھی کئی ایک صوفی بزرگوں نے اُمور سلطنت میں حصّہ لیا چنانچہ ۴۰۸ھ میں جب سلطان محمود غزنوی نے قنوج پر فوج کشی کی اور راستہ میں بدایوں کے مقام پر راجہ مدن پاُل سے لڑائی ہوئی تو اِس لڑائی میں بہت سے صوفیائے کرام نے حصّہ لیا اور ان میں سے بعض درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔[۲] اسی طرح حملۂ سومنات میں ایک بہت بڑے چشتی بزرگ شامل تھے[۳]

ع۱۔ رائل ایشیاٹک سوسائٹی بلیٹ وجیا چندر وجے چندر، کتاب آثار قدیمہ ہندوستان جلد ۱۵ ص۷ سطر ۸، شاہان دہلی کے سکّہ جات ص۵۰، ص۱۳۶ از طامسن، تذکرۃ الواصلین ص۶ بار دوم

ع۲۔ باقیات الصالحات (قلمی) مولفہ عبدالوالی چشتی بدایونی کے حوالہ سے مؤلّف تذکرۃ الواصلین نے کئی بزرگوں کے تفصیلی حالات بیان کئے ہیں مثلاً میر ملہم شہید، علی شہید (ناصرالدین) حمید شہید (حیدر علی حلبی معروف بہ پہلوان) کالو شہید (سید رشید زنجانی)، بے سر شہید (سید مرتضیٰ) روضۃ الصفاء کے مؤلف نے انمیں سے بعض بزرگوں کو سید سالار مسعود غازیؒ کے ہمراہیوں میں شمار کیا ہے لیکن بدایوں کی مقامی روایات نیز مذکورہ بالا شہادتوں کی بنا پر ان کا محمود غزنوی کے ساتھیوں میں ہونا مسلم ہے (باقی صفحہ ۵۶ پر)

سید سالار مسعود غازیؒ کے ہمراہیوں میں حضرت جنگی شہید (بایزید)، میر برہان الدین قتال، میر ابراہیم شہید، نظام بخاری، جلال بخاری رحمہما اللہ وغیرہ صاحب کشف و کرامات بزرگ تھے ؏۱ محمد غوری سے پہلے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اجمیر میں پہونچ چکے تھے۔ اس کے بعد کا زمانہ تو صوفیائے کرام کے مبارک اجتماع کے لئے مشہور ہے ؏۲۔ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ التمش کی حکومت کی جان تھے۔ اسی طرح علاء الدین خلجی جیسے پُرشکوہ شاہنشاہ کے زمانہ میں حضرت خواجہ نظام الدین بدایونیؒ پایۂ تخت دہلی میں سلطان الاولیاء تھے اور شاہ و گدا دست بستہ اُن کے سامنے حاضر ہوتے تھے۔

المختصر صوفیائے کرام کے اس گروہ سے علماءِ حکومت یعنی سلطنت کی قوت عادلہ بھی دبتی تھی چنانچہ اس طرح ہندوستان میں ایک عرصہ تک عہد وسطیٰ کی اسلامی سلطنت کا نظام چلتا رہا۔

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۵۵)

؏۳ - ان بزرگ کا اسم گرامی خواجہ ابومحمد بن ابی احمد چشتی ہے۔ موصوف سلسلۂ عالیہ چشتیہ کے امام و مقتدا ہیں۔ حضرت عارف جامیؒ نفحات صـ۲۲۳ میں لکھتے ہیں کہ "جس زمانہ میں سلطان محمود نے سومنات پر حملہ کیا حضرت خواجہ کو الہام ہوا کہ سلطان کی امداد کو جانا چاہئے چنانچہ ۷۰ سال کی عمر میں چند درویشوں کے ساتھ سومنات کی طرف روانہ ہوئے اور وہاں پہونچ کر بنفس خود بُت پرستوں اور مشرکوں سے جہاد کیا"۔ اسی واقعہ کو شیخ اللہ دیا نے "سیر الاقطاب" میں اور مولانا غلام علی آزاد نے مآثر الکرام صـ۳ میں درج کیا ہے۔ (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو رسالہ الفرقان جلد ۶ نمبر ۶)۔

؏۱ :- ملاحظہ ہو تذکرۃ الواصلین صـ۱۷ تا صـ۲۰ بار دوم

؏۲ :- تفصیلی حالات کے لئے سلطان شمس الدین التمش کا عہد حکومت ملاحظہ ہو۔

فصل دوم۔ ہندوستان میں آنے سے پہلے مسلمانوں کی علمی ترقیاں

علمی ترقیات:۔ دُنیا میں کوئی قوم اس امر کا دعویٰ نہیں کرسکتی کہ علم وہنر کی شمع اسی کے دم سے روشن ہوئی ہے نیز یہ کہ علم وہنر اسی کے دامن دولت سے وابستہ رہے ہیں تعصب کی بات تو دوسری ہے ورنہ حقیقت یہی ہے کہ ہر آنیوالی جماعت نے اپنی پیشرو جماعت کے حاصل کردہ علوم وفنون کو اپنا کر انھیں آگے بڑھایا ہے۔ یہ سلسلہ برابر جاری رہا ہے اور آئندہ بھی رہیگا۔ ایک وہ زمانہ تھا جبکہ دنیا نے مصر و بابل، چین ہندوستان یونان وروما کی روشن کی ہوئی علم وہنر کی شمع سے روشنی پائی ان کا دور ختم ہونے کے بعد یہ سعادت عرب کے حصہ میں آئی کہ وہ دُنیا کا امام بنے اور اس کی صحیح رہنمائی کرے۔

عربوں نے دُنیا کی تمام متمدن اقوام کے علوم کو اپنایا۔ ان میں ہند ویونان کا عقل اور روم وعجم کا ملکۂ سلطنت یہ دونوں چیزیں فطرتاً موجود تھیں یہی وجہ تھی کہ وہ بہت جلد اہل قلم اور اہل سیف ہو گئے انھوں نے برسوں میں وہ ترقی کی جو دوسری اقوام نے صدیوں میں نہیں کر پائی۔

علوم کے لحاظ سے بعض وہ علوم ہیں جو خالص اسلامی ہیں مثلاً تفسیر وحدیث فقہ و قرأت، اصول علم الرجال وغیرہ اور بعض وہ ہیں جو دوسری زبانوں سے عربی[1] میں منتقل کئے گئے مثلاً طب وہندسہ، نجوم وہیئت، فلسفہ ومنطق طبعیات وکیمیا وغیرہ۔ مسلمانوں نے خلفاء بنو امیہ وبنو عباس کے زیر سایہ ان سب کو مدوّن کیا اور دوسروں تک پہونچایا۔ چنانچہ یعقوب ابن اسحاق کندی[2] کی وہ تصانیف جو منطق میں

---

[1]۔ عربوں نے سندھ وملتان میں ۱۲ھ سے لیکر ۳۰۰ھ تک حکومت کی اس عرصہ میں ان کی ہندوستان سے جو علمی سیاسی تعلقات رہے اس کا تفصیلی تذکرہ جلد اوّل کے آخری دو ابواب میں کیا جاچکا ہے اس لئے اس جگہ اس کا اعادہ بیکار ہے (مؤلف) (۲) یعقوب بن اسحاق کندی مسلمانوں کا سب سے پہلا مشہور فلاسفر ہے

(بقیہ صفحہ ۵۸ پر ملاحظہ ہو)

ہیں ایک مدت تک درس میں داخل رہیں۔ چوتھی صدی ہجری میں ابونصر فارابی[1] (المتوفی ۳۳۹ھ) نے احصاء العلوم لکھ کر جدید تمدن کی نہ صرف بنا ڈالی بلکہ اسے مکمل کیا۔ شیخ الرئیس ابن سینا المتوفی ۴۲۸ھ اور ابو حامد غزالی المتوفی ۵۰۵ھ/۱۱۱۱ء کے تبحر علمی کی دنیا قائل ہے۔ ابن ماجہ ابن رشد اور ابن رومیہ نے فلسفہ، طب اور کیمیا سے یورپ کو روشناس کرایا[2]۔

ابوبکر رازی نے جو عام طور سے جالینوس عرب کے نام سے مشہور ہے عقید الدولہ دیلمی کے لئے "الملوکی" لکھی اس کتاب میں اس نے وہ تمام امراض اور اُن کے معالجات جو زمانۂ قدیم سے اس وقت تک دنیا کو معلوم ہو چکے تھے جمع کر دئے۔ اسی کتاب پر ایک عرصہ تک اسلامی اطباء کا عمل رہا یہاں تک کہ ابن سینا کی القانون نے جو آج تک عزت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے اس کو تقویم پارینہ بنا دیا۔ القانون جو ترکوں کے ہندوستان میں آنے سے پہلے مرتب ہو چکی تھی۔ دراصل علم طب کی قاموس ہے اس میں یونان، کلدان، ہندوستان اور فارس وعرب کے طبی مباحث کا خلاصہ ہے۔ القانون کی طرح ابو القاسم زہراوی اندلسی[3]

بقیہ صفحہ ۵۷: خلیفہ مامون الرشید اور معتصم باللہ نے اسکی خاص طور سے سرپرستی فرمائی۔ اس نے فلسفہ، حساب، ہندسہ، فلکیات، طب، سیاست، منطق، نفسیات وغیرہ پر ۲۳۱ تصانیف اپنی یادگار چھوڑیں (ملاحظہ ہو المامون صـ۱۰۲ از علامہ شبلی نعمانی)

ع[1]:- ابو نصر فارابی نے وہ تمام علوم حاصل کئے جو کندی کی طرف منسوب ہیں۔ اسنے ان علوم کو آگے بڑھایا اہل ادب کا خیال ہے کہ جدید تمدن انھیں کی ایجاد ہے حالانکہ فارابی ایک ہزار برس پیشتر ہی اسکو مکمل طور پر لکھ چکا ہے (ابن خلکان صـ۷۷ جلد دوم)۔ اسکی کتابوں کا ترجمہ جانس ہیپلس اور جیرو ڈ نے ۱۱۵۶ء میں کیا۔ اور عربی سے لاطینی میں منتقل کیا۔

ع[2]:- ابن رشد کی کتابوں کا ترجمہ لاطینی میں میکائل اسکاٹ نے ۱۲۲۰ء میں کیا۔ ع[3]:- یہ پانچویں صدی ہجری کا ایک نہایت نامور طبیب ہے۔ اس نے اپنی کتاب میں اعمال جراحت نہایت تفصیل سے بیان کئے ہیں۔

اور عبد الملک اندلسی[1] کی الہیٰ تصانیف بھی یورپ میں بہت مقبول ہوئیں

حکیم بو علی سینا کی "القانون" پندرھویں صدی کے ربع آخر میں یورپ کے اندر سولہ مرتبہ شائع ہوئی پھر سولھویں صدی میں ۲۰ بار سے زائد۔ اٹھارھویں صدی کے نصف اوّل تک تمام اطباء یورپ کا اسی پر عمل رہا۔ اسی طرح ۱۷۵۸ء میں ابن بیطار کی مفردات شائع ہوئی۔ اس میں ۱۴۰۰ مفردات کا حال ۱۲۵ عربی حکماء کے پچھلے تجربات کے ساتھ قلمبند ہے۔ ابوالہیثم اور علی بن عیسیٰ کے بنائے ہوئے آنکھ کی جراحی کے آلات و نشتر ۱۸۵۰ء تک انگلینڈ میں اور ۱۸۴۲ء تک جرمنی میں مستعمل رہے۔

کشف الظنون، طبقات الاطباء اور تراجم الحکماء کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان اطباء کا شمار لاکھوں سے متجاوز ہے۔ ان میں جراح بھی ہیں اور کحال و دندان ساز بھی۔ طبیبوں کے امتحان کا قاعدہ بھی مسلمانوں نے ہی مقرر کیا۔[2] انھوں نے بیشمار طبی ایجادیں کیں اور قدماء کے بہت سے علاجوں کو غلط ثابت کیا مثلاً فالج، لقوہ، استرخاء کا علاج گرم دوائیوں سے کیا جاتا تھا انھوں نے ٹھنڈی دوائیاں استعمال کرائیں اور حیرت انگیز نتائج برآمد کئے۔ شیخ ابومنصور بغدادی اس طریق علاج کا بانی ہے۔ اسی طرح جراحت پر داغ دینے کا طریقہ، یرقان کا علاج، جنون کے علاج میں افیون کا استعمال یہ سب انھیں کی ایجادیں ہیں۔ اس کے علاوہ طب کی بعض چیزوں مثلاً جذام و خارش وغیرہ پر ایسی کتابیں لکھیں جو اس سے پہلے کبھی نہیں لکھی گئی تھیں۔

عنا ۱: ۔ عبد الملک اندلسی نے چھٹی صدی ہجری میں ابن رشد فلسفی کے نام پر ایک کتاب لکھی جو انگریزوں میں خاص طور سے نہایت مقبول ہوئی۔

۲: ۔ عیون الانباء صفحہ ۲۲۲ جلد اول، علماء سلف صفحہ ۵۶

کیمیا (Chemistry) اور نباتات (Botany) یہ دونوں طب کی بہت بڑی شاخیں ہیں مسلمانوں کو ان دونوں سے بہت زیادہ دلچسپی تھی اس کی ابتدا یحیٰی برمکی کے زمانہ سے ہوئی مسلمان ہندوستان تک سے مفرد دوائیں تلاش کر کے لاتے اور ان سے مرکبات تیار کرتے تھے پہلی قرابادین سابور ابن سہل المتوفی ۲۵۵ھ نے لکھی اس کے بعد دوسری سب سے مشہور قرابادین ابن الدو نے چھٹی ہجری میں لکھی[1] - ادویہ کی دوکانداری کا طریقہ بھی سب سے پہلے مسلمانوں ہی کی ایجاد ہے۔ اسی طرح کیمیا جدید کے بانی بھی مسلمان ہی ہیں۔ انھوں نے بہت سی ایسی کیمیاوی دوائیں ایجاد کیں جو اس زمانہ میں بھی نہیں ہیں۔ ابن اثیر لکھتا ہے کہ ایک الیسا روغن ایجاد کیا گیا تھا جس کے لگا دینے سے لکڑی آگ سے محفوظ رہتی تھی[2] - بارود بھی انھیں کی ایجاد ہے۔ ۱۳۴۰ء میں الجسر کی حفاظت کے لئے انھوں نے الفانسو یازدہم کے مقابلہ میں پہلی مرتبہ بارود اور توپ کا استعمال کیا[3] میر فتح اللہ شیرازی ان دونوں چیزوں کا موجد ہے۔ مسلمانوں کے ایجادات کی فہرست نہایت طویل ہے۔ نمونتاً چند ایک کا ذکر فٹ نوٹ میں درج ہے[4] -

---

عہ۱ - ۱۸۳۰ء میں عربی قرابادین کا خلاصہ یورپ میں شائع کیا گیا

عہ۲ - کامل ابن اثیر ص ۱۵۱ جلد ہفتم

عہ۳ - تمدن عرب ص ۴۳۸ از موسیو لیبان، اخبار الاندلس ص ۶۹۷ از مسٹر اسکاٹ

عہ۴ - نام موجد ، نام ایجاد

نام موجد	نام ایجاد
یونس کاتبی المتوفی ۷۶۵ء	گھڑی ، ابن الساعتی مشہور گھڑی ساز تھا
ابو القاسم اندلسی	جہاز
ابو الحسن	دوربین
ابن الہیثم ۱۰۳۹ء	آلۂ عکاسی یا فوٹو گرافی

(بقیہ صفحہ ۶۱ پر ملاحظہ ہو)

نجوم و ہیئت اور ہندسہ و حساب میں مسلمان ہند و یونان کے شاگرد ہیں۔ وہاں سے یہ علوم حاصل کر کے انھوں نے عام کر دئے۔ اسلام میں سب سے پہلا منجم ابو جعفر منصور ہے اُس کے لئے ۷۵۴ء میں برہم گپت کی "برہم سپت سدھانت"

(بقیہ صفحہ ۶۰ ملاحظہ ہو)

محمد بن موسیٰ	کُرہ
احمد محمود اصفہانی ۹۸۴ء	اصطرلاب کا موجد، ۱۰۰۶ء کے بنے ہوئے اصطرلاب میڈرڈ میں اب بھی موجود ہیں
ابو الصلت اُمیہ ۱۱۳۴ء	جرثقیل، غرق شدہ جہاز کو نکالنے کا ایک آلہ بنایا تھا۔
یوسف بن عمرو دمشقی	دمشقی کاغذ کا موجد
رشید الدین ابن رفیقہ	ایک پیالہ کا موجد جس کے بیچ میں ایک تبہ تھا اسپر ایک چڑیا بنی ہوئی تھی۔ پیالہ میں جب پانی ڈالا جاتا تھا تو چڑیا پھڑ پھڑاتی اور بولتی تھی۔

اسی طرح آلہ باد نما، مقیاس الحرارت، تھرماس، قطب نما، صابن، میز کرسی، آلات کیمیا و ہیئت و ریاضی وغیرہ سب کے سب مسلمانوں کی ایجاد ہیں۔ دسویں صدی عیسوی میں ایک نوجوان پادری گربرٹ نامی نے اندلس کے بعض شہروں کا چکر لگایا تو وہ وہاں کی حالت دیکھکر متحیر رہ گیا۔ اُس نے لاتعداد مدرسے اور کتب خانے دیکھے جنمیں بیشمار سائنس کے آلات، جغرافیہ کے رنگین نقشے، گھومنے والے کرے، دھوپ گھڑیاں، پانی کی گھڑیاں، آب پیما، آلات رصدیہ، اصطرلاب وغیرہ موجود تھے۔ بالآخر وہ مسلمان علماء سے استفادہ کے لئے قرطبہ یونیورسٹی میں داخل ہوگیا۔ (مسٹر جوزف میکیب ص۱۳ تا ص۱۵)۔ یہاں سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد جب وہ اٹلی پہونچا تو اُسنے ایک مدرسہ کی طرح ڈالی لیکن یہ مدرسہ اور اسکے آلات سائنس پادریوں ... اور انکے [illegible] آلات [illegible]

کا "السند ھند" کے نام سے عربی میں ترجمہ کیا گیا اسی طرح وراہ مہر اور آریہ بھٹ کی کتابیں بھی عربی میں منتقل کر لی گئیں۔ حسن بن صبّاح، حسن بن خصیب، فضل بن حاتم تبریزی، احمد بن عبداللہ اور ابوریحان بیرونی وغیرہ نے اس کو فروغ دیا۔ نجوم وہیئت کو اسپین میں پانچویں صدی ہجری میں ابوالقاسم اصبغ اور ابراہیم زرقانی کے ذریعہ فروغ حاصل ہوا۔ انھوں نے متعدد رصدگاہیں قائم کیں جن کے ذریعہ ستاروں کی حرکات ومقامات کی جانچ کیجاتی تھی۔ پہلی رصدگاہ یونانیوں نے اسکندریہ میں قائم کی تھی مگر جب مسلمانوں نے ترقی کی اور بغداد، دمشق، قاہرہ، اندلس، مراغہ اور سمرقند وغیرہ میں متعدد رصدگاہیں بن گئیں تو اسکندریہ کو لوگ بھول گئے۔ دولت اسلامیہ میں اول جس نے رصدخانہ کی بنیاد ڈالی اور بیش بہا آلات رصدیہ مہیا کئے وہ دولت عباسیہ کا نامور خلیفہ مامون الرشید ہے اس کے زمانہ تک جس زیچ پر اعتماد کیا جاتا تھا وہ محمد بن ابراہیم فراری کی تالیف تھی لیکن نئی تحقیقات کے بعد مامون کے ایک بہت بڑے منجم ابوجعفر محمد بن موسیٰ خوارزمی نے جو زیچ ترتیب دی اس کی شہرت نے اوروں کا نام مٹا دیا۔ یہ زیچ تمام مستند زیچوں سے ماخوذ تھی۔ اوساط ہندوستان کی زیچ کے مطابق رکھے، تعدیلیں فارس کی تحقیقات کے موافق تھیں اور میل شمس میں بطلیموس کی رائے لی تھی اس کے ساتھ ترتیب وتقریب کے متعلق خود پسند ایجادیں کی تھیں[1]۔ اس سے مسلمانوں کی اپج کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

ابتدائے اسلام میں مسلمان حساب وکتابت کو ذمیوں کا کام سمجھتے تھے وہ اپنی اولاد کو فنون سپہ گری اور شاعری وغیرہ کی تعلیم دیتے تھے لیکن جب مختلف ضرورتوں نے مجبور کیا تو ان کی طبیعتیں ادھر متوجہ ہوئیں اور پھر ابن قرانگم کا یہ مقولہ بہت مشہور ہوا کہ "اپنے بیٹے کو کتابت سے پہلے حساب پڑھاؤ"۔ دوسری صدی ہجری میں ہندی قوم

---

[1] المامون حصہ ۱ ۱۴۰ از علامہ شبلی نعمانی۔

وحساب کو انھوں نے عربی میں منتقل کیا پھر ان سے مغرب والوں نے سیکھا۔ جبر و مقابلہ میں وہ یونان کے شاگرد ہیں لیکن اس میں بھی وہ استادوں سے بڑھ گئے انھوں نے جبر و مقابلہ کے ان اصولوں کو جو یونانی کتب میں تھے ناقابل اعتماد سمجھا اور خود اس فن میں اصول مرتب کئے چنانچہ ابو جعفر خوارزمی، ابو کامل، ابن اسلم، ابو حنیفہ دینوری اور ابو العباس سرخسی وغیرہ نے اس فن میں بیش بہا کتابیں لکھیں۔ اہل یورپ نے اپنی آخری اور موجودہ ترقی کے دور میں جبر و مقابلہ بالکل عربی سے لیا ہے۔ الجبرا میں خوارزمی ۸۲۰ء ایک نمایاں خصوصیت کا مالک ہے اس کی تصنیف کا ترجمہ ۱۸۳۱ء میں مسٹر الیف روزی نے کر کے یورپ کو روشناس کرایا۔ مسلمانوں ہی نے علم ہندسہ کی تحلیلی بنیاد ڈالی اور علم مثلث مستوی (Plane Trignometry) اور کروی (Spherical Trignometry) کو ایجاد کیا۔

دوسرے علوم و فنون کی طرح مسلمانوں نے موسیقی میں بھی کمال پیدا کیا۔ اس فن میں وہ ہند و یونان کے شاگرد ہیں لیکن آخر میں وہ سب سے گوئے سبقت لے گئے۔ انھوں نے ایسے الحان اور نغمے ایجاد کئے جو پہلے نہ تھے مثلاً بعض راگ ایسے تھے جن کو آدمی کھانا کھا کر نہیں گا سکتا تھا اور نہ سقہ مشک لیکر، اسی طرح بعض راگوں کو کوئی تکیہ لگا کر نہیں گا سکتا تھا یہاں تک کہ بیٹھ نہ جائے اور بعض راگوں کو کوئی بیٹھ کر نہیں گا سکتا تھا یہاں تک کہ کھڑا نہ ہو جائے[۱]۔ اسی طرح مختلف اقوام کے آلات نغم کو دیکھ کر انھوں نے بہت سے نئے آلات ایجاد کئے مثلاً فارابی فلسفی نے ساز قانون نکالا ایک دوسرا آلہ لکڑیوں کا بنایا تھا جو توڑ مروڑ کر جیب میں رکھ لیا جاتا تھا اور جس سے مختلف نغمے اور لحن پیدا ہوتے تھے[۲]

۱۔ آغانی صـ۲ جلد اول

۲۔ ابن خلکان صـ۷۷ جلد دوم۔

طبقات و مغازی اور تاریخ و جغرافیہ ایک لحاظ سے مسلمانوں کے خود اپنے مضامین ہیں جس وقت مسلمان قرآن، حدیث، تفسیر اور فقہ کی طرف متوجہ ہوئے تو اُنھیں ضرورت محسوس ہوئی کہ اُن حالات اور مقامات کی بھی تحقیق کریں کہ جن میں وہ آیتیں اُتریں یا احادیث بیان کی گئیں اس کے لئے انھوں نے سب سے پہلے سیرت نبوی کو ترتیب دیا اس میں ان کو ایک لاکھ پچیس ہزار سوانح عمریاں لکھنا پڑیں[1] اس طرح فن رجال کا ایک نیا شعبہ نکل آیا۔ جس کے ترتیب دینے میں وہ آپ اپنی مثال ہیں۔ چنانچہ محمد بن سعد المتوفی سنہ ۲۳۰ھ کی طبقات الصحابہ جو دس جلدوں میں ہے اسی فن کی ایک کتاب ہے۔ اس کے بعد ابن قتیبہ کی طبقات الشعراء ہے۔ اس کے ساتھ ہی لوگوں نے وزراء، قضاۃ، اُمراء، عمال، حکام، اذکیاء، بخلاء، عشاق وغیرہ کے حالات پر ضخیم کتابیں لکھ ڈالیں غرضکہ تیسری صدی ہجری کے وسط تک اسی قسم کی تصانیف کا سلسلہ جاری رہا۔ اس کے بعد تواریخ عامہ کی طرف میلان ہوا۔ اس فن کی سب سے پہلی کتاب ابن واضح ہے جو یعقوبی کے نام سے بھی مشہور ہے یہ دو جلدوں میں ہے[2] پہلی میں اقوام عالم کا حال اور دوسری میں ابتداء اسلام سے لیکر معتمد باللہ عباسی کی تخت نشینی (۲۵۶ھ) تک کے حالات درج ہیں۔ اس کے بعد اور تاریخیں لکھی گئیں۔ جن میں سب سے زیادہ مشہور طبری[3]، مروج الذہب[4]، اخبار الزماں اور سنی ملوک الارض[5] وغیرہ ہیں۔ خلافت

---

[1] ۔ کشف الظنون صفحہ ۴۷ جلد دوم

[2] ۔ یہ بیان علامہ جرجی زیدان کا ہے۔ راقم الحروف کی نظر سے تاریخ یعقوبی کی تین جلدیں گذری ہیں یہ مطبعہ الغری نجف سے سنہ ۱۳۵۸ھ میں شائع ہوئیں اور علامہ حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے کتب خانہ حبیب گنج میں محفوظ ہیں۔ دوسری اور تیسری جلدیں زائد کار آمد ہیں دوسری جلد ۲۲۷ اور تیسری ۲۳۲ صفحات (علاوہ فہرست)

(باقی صفحہ ۶۵ پر)

عباسیہ کا شیرازہ منتشر ہونے کے بعد حسب گردوں، ترکوں اور بربریوں کی سلطنتیں قائم ہوئیں تو ان کے حالات پر الگ کتابیں لکھی گئیں۔ یہ تاریخ کا دوسرا دور ہے اسمیں صدہا کتابیں تاریخ پر عربی و فارسی میں لکھی گئیں جن کا شمار حد سے باہر ہے صاحب کشف الظنون نے ۱۳۰۰ تصنیفیں شمار کی ہیں جنمیں خلاصے اور شروح شامل نہیں اور جو کتابیں ضبط تحریر میں نہیں آئیں وہ اس تعداد سے کہیں زائد ہیں۔ کیونکہ تاریخ و جغرافیہ کی کتابوں کے مقدمات میں ایسی کتابوں کا حوالہ ملتا ہے جنکو صاحب کشف الظنون نے تحریر نہیں کیا مثلاً مسعودی نے اپنی کتاب مروج الذہب میں بیسیوں ایسی کتابوں کے حوالے دیئے ہیں جو اس کے زمانے میں تھیں مگر اس فہرست میں ان میں سے صرف ایک آدھ کتاب نظر آتی ہے۔

مسلمانوں کو جغرافیہ میں یونان و روما سے گنتی میں لے دیکر صرف دو چار کتابیں ہاتھ لگی تھیں۔ بطالسہ یعنی خاندان بطلیموس نے جو مصر کے حکمران تھے بحر احمر اور حبشہ کے حالات قلمبند کرائے۔ یونانیوں میں اراٹسٹین نے (المتوفی ۱۹۶ سنہ ق۔م) اور بلینوس نے ۵۰ سنہ ء میں جغرافیہ لکھا۔ موخر الذکر نے ۲۲۵۰ شہروں کا ذکر کیا۔ متمدن دنیا میں اسلام سے پہلے جغرافیہ کی بس اتنی سی کائنات تھی۔ اہل اسلام نے ان کتابوں کے دیکھنے سے پہلے ہی جغرافیہ کی تدوین شروع کر دی تھی۔ کیونکہ فاتح اور تاجر ہونے کے ساتھ ساتھ انھیں حج کے لئے سالانہ سفر

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۶۴ ملاحظہ ہو)

۳؎:۔ ابن جریر المتوفی سنہ ۳۱۰ھ نے بترتیب سنہ ۳۰۲ھ تک کے حالات لکھے ہیں کئی جلدیں ہیں۔

۴؎۔ مروج الذہب اور اخبار الزمان مسعودی کی جو سنہ ۳۴۶ھ میں بقید حیات تھا تصانیف ہیں۔ مروج الذہب کی ترتیب دول اور اقوام پر رکھی گئی ہے۔ اخبار الزمان ضائع ہوگئی یہ مروج الذہب سے زیادہ ضخیم تھی۔

۵؎۔ حمزہ اصفہانی نے سنہ ۳۵۰ھ میں ترتیب دی۔

کرنا پڑتا تھا اسلئے راستہ کے حالات جاننا ازبس ضروری تھے۔ چنانچہ شہروں اور راستوں کے حالات میں اصمعی اور سکونی نے کتابیں لکھیں۔ بعد کو ہمدانی اور ابوالاشعث نے حجاز وعرب کے حالات پر کتابیں لکھیں۔ غرضکہ چوتھی ہجری کے اختتام تک وہ جغرافیہ کے فن کو مکمل کر چکے تھے اسی زمانہ میں ابوزید بلخی نے صوٓالاقالیم ۲۰ جلدوں میں لکھی افسوس ہے کہ وہ آج دستیاب نہیں۔ اس کے ہمعصر ابواسحاق کرخی نے مسالک الممالک لکھی جو طبع ہو گئی ہے۔ جغرافیہ کی دیگر کتابیں ابن جوقل، مسعودی، مقدسی، ابن فقیہہ ہمدانی وغیرہ نے لکھیں لیکن اس فن میں سب سے مشہور کتابیں یاقوت حموی کی معجم البلدان اور ابوالفداء کی تقویم البلدان ہیں۔ یہ جغرافیہ کی قاموس خیال کیجاتی ہیں۔

اہل علم کی ہمّت افزائی۔ مسلمانوں کے اتنی عجلت کے ساتھ علمی میدان میں ترقی کرنے کا سب سے بڑا سبب خلفاء اسلام کی وہ قدرشناسی و ہمّت افزائی ہے جو بلالحاظ قومیت و مذہب اور وطن و نسل اپنے اور پرائے تمام اقوام کے علماء کے ساتھ عام تھی۔ ان میں مسلمان یہودی، مجوسی، سامری، نصرانی، صابی اور ہندو سبھی شامل ہیں۔ منصور عبّاسی کے دربار میں یہودی، نصرانی اور ہندو طبیب بھی تھے[1]۔ ہارون الرشید نے اپنے نصرانی طبیب جبریل بن بختیشوع کے لئے عرفات میں دُعا مانگی[2]۔ ہارونی و مامونی فیاضیوں نے مال و دولت کے لحاظ سے اس کو ایک مستقل والئی ملک بنا دیا تھا علامہ ابن ابی اصیبعہ نے اپنی تاریخ میں اس کی آمدنی و مصارف کا ایک مفصل نقشہ نقل کیا ہے اس کی

ع۱۔ علوم عرب جلد سوم صہ ۱۲۱ از علامہ جرجی زیدان

ع۲۔ طبقات الاطباء صفہ ۱۳ جلد اوّل

مستقل آمدنی علاوہ انعام و اکرام کے جس کا کچھ شمار نہیں ۵۰ لاکھ درہم سالانہ تھی[۱] - اس کا بیٹا بختیشوع جاہ و منزلت کے اِس پایہ تک پہونچا کہ لباس و آرائش میں خلیفہ متوکل باللہ کا ہمسر گنا جاتا تھا[۲] - ہارون و مامون علماء کی جیسی عزت کرتے تھے وہ ظاہر ہے اُن کے دربار میں ہندو علماء و حکماء بھی تھے جن کا تذکرہ جلد اوّل میں کیا جا چکا ہے متوکل اور مہدی بھی اطباء کی بڑی عزت کرتے تھے جب وہ دربار میں آتے تو خلیفہ کی مسند پر جگہ پاتے تھے[۳]، خلیفہ معتضد باللہ کے دربار میں جہاں تمام وزراء و اُمراء دست بستہ کھڑے رہتے تھے صرف وزیر اعظم اور ثابت بن قرہ کو بیٹھنے کی اجازت تھی - ثابت بن قرہ ایک صابی المذہب عالم تھا ایک دن معتضد اس کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر ٹہل رہا تھا کہ دفعتاً اس نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا، ثابت ڈر گیا، معتضد نے کہا "ڈرو نہیں - میرا ہاتھ اوپر تھا اور میں اس کو سوء[۴] ادب سمجھتا ہوں کہ میرا ہاتھ اہل علم کے ہاتھ کے اوپر ہو - علماء و حکماء کے ساتھ یہی کیفیت دولت فاطمیین اور خلفاء اندلس کی تھی اور انھیں روایات کو ہندوستان میں غزنوی، غوری اور ان کے جانشینوں نے جاری رکھا -

شوق طلب اور توجہ کامل - سطور بالا کے مطالعہ سے کہیں یہ باور نہ کر لیا جائے کہ مسلمانوں کی علمی ترقی تمام تر خلفاء و اُمراء کی داد و دہش اور حوصلہ افزائی پر مبنی تھی - اس زمانہ کے بزرگوں کی جاں کاہیوں کو نظر انداز کر کے اُن کے علمی کمالات کو محض اس زمانہ کے آثار کا ثمرہ سمجھ لینا حقیقت کے صرف ایک رُخ کا مطالعہ ہے اگر سچ پوچھو تو اس زمانہ میں لوگوں کے اندر عزم و ثبات

---

[۱] - المامون حصہ دوم صفحہ ۱۰۳، [۲] - المامون صفحہ ۱۰۱ جلد دوم

[۳] - ابوالفرج ۲۴۹

[۴] - المامون صفحہ ۱۰۱ جلد دوم

کا مادّہ عام طور پر موجود تھا۔ ہر ایک کا دل جوش اور اُمنگ سے لبریز تھا۔ ان کی سرگرم طبیعتیں جس طرف رُخ کرتی تھیں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھتی تھیں۔ اِسی توجہ کامل کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے ہر فن میں کمال حاصل کیا۔ اُن بزرگوں کے دل میں شوق علم کی ایک بے تابی تھی جس نے "اطلبوا العلم ولو کان بالصین" کی ہدایت نبوی کو عملی جامہ پہنا رکھا تھا۔ علم کی دُھن میں بھوک پیاس اور بسا اوقات افلاس کی صعوبتوں[1] کو خاطر میں نہ لاکر براعظم اور سمندر کاٹے کر ڈالنا ایک معمولی بات سمجھتے تھے۔ ایک ایک کتاب کی خاطر صدہا میل پیادہ پا جاتے اور علمی تحقیقات کے لئے ملکوں ملکوں پھرتے تھے۔ اگر اُن کے دلوں میں جوش اور دماغوں میں یہ ولولے نہ ہوتے تو ہم کو ابن بیطار اور سیّد شریف نصیب نہ ہوتے، ابو حاتم رازی اور حافظ ابن طاہر کے کارنامے تاریخ کے صفحات پر زرّیں حروف سے لکھے نہ جاتے۔ علمائے سلف نے احادیث نبویہ کے حاصل کرنے کے واسطے ہزارہا

---

[1] امام بخاری کو طلب علم کیلئے ایک سفر میں تین دن برابر جنگل کی بوٹیاں کھانا پڑیں (دیکھو مقدمۂ فتح الباری صفحہ ۵۶۶)۔ ابن المقری اور طبرانی کو طالبعلمی کے دوران میں تین تین دن کے مسلسل روزے رکھنا پڑے (ملاحظہ ہو تذکرۃ الحفاظ صفحہ ۱۸۲ جلد ۳)۔ فن حدیث کے عالی مرتبہ امام ابو حاتم رازی تحصیل علم کے لئے چودہ برس بصرے میں رہے۔ تنگدستی کیوجہ سے کپڑے تک بیچ کھائے جب کپڑے بھی نہ رہے تو دو دن تک بھوکا رہنا پڑا آخر ایک رفیق نے ترس کھاکر روزہ کھلوایا (تذکرۃ الحفاظ صفحہ ۱۴۷ جلد ۲)

اسی طرح امام ابن جریر طبری نے تنگیٔ خرچ کے سبب سے اپنے کرتے کی دونوں آستینیں بیچ کر گذارا کیا تھا (تذکرۃ الحفاظ صفحہ ۲۸۰ جلد ۲)

مشہور فلسفی وحکیم ابونصر فارابی جس کا ایک عالم میں شہرہ ہے اس کی نسبت بہت کم لوگ جانتے ہوں گے کہ وہ عہد طالبعلمی میں تہی دستی کی بدولت چراغ کا تیل خریدنے سے بھی معذور تھا تاہم حصول علم کا شوق غالب تھا وہ رات کو پاسبانوں کی قندیلوں سے کام لیتا (باقی صفحہ ۶۹ پر)

میل کا پیادہ پا سفر کیا۔ امام ابو حاتم رازی نے اپنی سرگذشت خود بیان کی ہے کہتے ہیں کہ میں نے تین ہزار فرسخ (یعنی نو ہزار میل) سے زائد کی مسافت پیادہ پا طے کی ہے[1]، امام دارمی نے طلب حدیث میں حرمین، خراسان، عراق، شام اور مصر کا سفر کیا تھا[2]۔ امام بخاری نے ۱۴ برس کے سن میں سیاحت شروع کردی تھی[3]۔ بینا تو بینا مادر زاد نابینا حافظ الحدیث ابو العباس رازی اپنے نبی پاک کے اقوال و افعال کی شیفتگی میں بلخ، بخارا، نیشاپور اور بغداد کا سفر کرتے پھرتے تھے[4]۔ بلخ سے بغداد براہ بخارا ۱۳۶۵ میل ہے۔ حافظ ابن طاہر مقدسی نے طلب حدیث میں بہت سے پیادہ پا سفر کئے ان کے علمی شوق کو ملاحظہ فرمایئے کہ سفر میں خون کا پیشاب تک ہونے لگتا تھا لیکن اس پر بھی ہمت نہ ہارتے تھے[5]۔ حافظ ابو الخطاب اندلسی نے تحصیل علم کی غرض سے اسپین، مراکش، حبش، مصر، شام، عراق عجم اور خراسان کا سفر کیا اس طرح تین براعظم ان کے جہاں پیما قدموں کے نیچے سے نکل گئے[6]۔

مسلمانوں نے جس طرح علوم دین کے حصول کے لئے اپنے شوق بے پایاں کا اظہار کیا ٹھیک اسی طرح فن ادب اور دیگر علوم کی تحصیل کے لئے بھی علمی حمیت

بقیہ صفحہ ۶۸ = اور انکی روشنی میں کتاب کا مطالعہ کیا کرتا۔ اسی تنگ حالی میں وہ علمی ترقی کی کہ سارے جہان میں اپنا نام روشن کر گیا (عیون الانباء ص ۱۳۴ جلد ۲)

حضرت خواجہ نظام الدین اولیا سلطان المشائخ ہونے سے بہت پہلے اپنی بچپن میں تین تین دن کے مسلسل روزے رکھ چکے تھے۔ آپکے والد کا انتقال ہو چکا تھا آپکی کفالت ماں کو ذمہ تھی جو سوت کات کر اپنے ہونہار بچے کو پڑھاتی تھیں۔ اکثر ایسا ہوا کہ یا تو سوت فروخت نہ ہو سکا یا گذر اوقات کے لائق کاتا نہ جا سکا اس صورت میں بھوکا رہنا پڑا لیکن تعلیم کا سلسلہ برابر جاری رہا (ملاحظہ ہو نظامی بنسری)

[1] تذکرۃ الحفاظ ص ۱۴۷ جلد ۲ ۔ [2] تذکرۃ الحفاظ ص ۱۴ جلد ۲ ۔ [3] تذکرۃ الحفاظ ص ۱۳۴ جلد ۲

[4] تذکرۃ الحفاظ ص ۲۳۳ جلد ۳ ۔ [5] تذکرۃ الحفاظ ص ۴ جلد ۴ ۔ [6] ابن خلکان ص ۳۸۱ جلد ۱

کو کام میں لائے۔ فنِ ادب کے استاد یگانہ خلیل بصری اور اُن کے نامور شاگرد امام کسائی نے مدتوں حجاز، تہامہ اور نجد کے جنگلوں کی خاک چھانی سیبویہ نے نحو میں اتنی مہارت پیدا کی کہ وہ آج تک تمام نحویوں کے استاد مانے جاتے ہیں۔ امام نضر بن شمیل نے چالیس برس مختلف قبائل کی زبانوں کی تحقیقات کی خاطر صحرائے عرب میں بسر کر دیئے، اندلس کے طبیب ابن رومیہ نے اُن نباتات کے حالات دریافت کرنے کے لئے جو مغرب میں پیدا نہیں ہوتیں مدتوں سیاحت کی اسپین سے مصر آئے اور مصر سے عراق و شام کا سفر کیا اور تمام نباتات کو خاص اُن کی روئیدگی کے مقامات میں جا کر مشاہدہ کیا اور اُن کے افعال و خواص کی تحقیقات کی[1]۔ اسی طرح ضیاء الدین ابن بیطار نے نباتات کی تحقیقات اور اُن کے خواص کی تحقیق کے لئے ممالک روم، یونان اور اسپین کو چھان ڈالا[2] ابو المنظور نے بہت سی نئی نباتات ایسی دریافت کیں جن کا ذکر متقدمین کی کتابوں میں نہ تھا انھوں نے جبل لبنان (شام) میں جو نباتات کی روئیدگی کے لئے مشہور تھا یہ طریقہ اختیار کیا کہ ہر ہر بوٹی کی مصور سے تصویریں کھنچوائیں۔ یہ محقق طبیب ایک بار کے مشاہدہ پر قانع نہ ہوتا بلکہ نشو و نما کے مختلف مدارج میں نباتات کا معائنہ کرتا۔ ایام نمو و تازگی کی علٰحدہ تصویر کھنچواتا اور زمانہ کمال کی جُدا اور جب وہ بوٹی خشک ہو جاتی تو ایک تیسرا نقشہ لیا جاتا۔ اِس طرح ہر بوٹی کی تصویریں اس نے اپنی کتاب میں درج کی تھیں[3]۔

بہر حال قابل لحاظ امر یہ ہے کہ وہ خواہ امام دارمی ہوں یا رازی، ابن رومیہ

ع[1]:۔ عیون الانباء صہ ۸۱ جلد دوم، ع[2]:۔ عیون الانباء صہ ۱۳۳ جلد دوم

ع[3]:۔ عیون الانباء، صہ ۲۱۹ جلد دوم،

ہوں یا ابن بیطار، حکیم فارابی ہوں یا شیخ الرئیس ابو سینا ان سب کے علمی کمالات کی اصل بنیاد یہی علمی شوق اور ۔۔۔ اسمیں غیر معمولی محویت ہے۔ امام رازی کو تاسّف ہوتا تھا کہ کھانے کا وقت علمی مشاغل سے کیوں خالی جاتا ہے[۱]۔

مشہور طبیب ابو البرکات کو طالبعلمی کے زمانہ میں کسی وجہ سے اس عہد کے اُستاد طب ابو الحسن کے درس میں بیٹھنے کی اجازت نہ ملی تو شوق نے ایک نئی راہ بتائی یعنی اُنھوں نے دربان کو ملا لیا اور درس کے وقت دروازے میں چھپ کر بیٹھے رہنے کی اجازت لے لی۔ سال بھر اسی طریقہ سے گذر گیا ایک دن کسی مسئلہ میں اُلجھاؤ پڑ گیا جو سلجھنے میں نہ آتا تھا۔ آخر ابو البرکات اجازت لیکر اندر داخل ہو گئے اور جالینوس کے قول سے حل کر کے کہا کہ فلاں روز یہ قول آپ ہی نے نقل فرمایا تھا اس کے بعد ابو الحسن سے پوری سرگذشت بیان کردی۔ حکیم موصوف کے دل پر اُن کے شوق کا گہرا اثر پڑا اور اسی روز سے ابو البرکات کو اپنے درس میں شامل کر لیا[۲]۔ ابو بکر بشار ادب کے مشہور امام بغداد میں شہزادوں کے اتالیق تھے ایک دن نخاس سے گذرتے ہوئے ایک جاریہ (لونڈی) پر نظر پڑ گئی جو بیحد حسین اور سلیقہ کے لئے سارے بغداد میں مشہور تھی۔ یہ اُس پر مفتوں ہو گئے۔ خلیفہ نے حقیقت حال سے آگاہ ہو کر دوسرے دن اُس کو خرید کر ابن بشار کے مکان پر بھجوا دیا۔ امام موصوف ان دنوں ایک علمی مسئلہ کی تحقیقات میں منہمک تھے۔ جاریہ کو تو اُنھوں نے ایک الگ کمرہ میں بھیج دیا اور خود مسئلہ پر غور کرنے کے لئے دوسرے کمرہ میں چلے گئے۔ چونکہ طبیعت دوسری طرف لگ رہی تھی اس لئے مسئلہ میں اُلجھنے لگے۔ قلب

ع[۱] ۔ عیون الانباء صہ ۲۳ جلد ۲

ع[۲] ۔ عیون الانباء صہ ۲۷۹ جلد اوّل

کا یہ رنگ دیکھ کر ابن بشار نے خادم کو آواز دی اور کہا کہ اس شہر آشوب (جاریہ) کو واپس لیجاؤ میرے دل میں اس کی اتنی قدر نہیں ہے کہ میرے خیال کو علم سے پھیر لے چنانچہ خادم گیا اور جاریہ کو واپس کر آیا۔[1]

یہ علمی ذوق وشوق اور وارفتگی کچھ خواص ہی کے ساتھ مخصوص نہ تھی بلکہ اُس زمانہ کی عام کیفیت ہی کچھ ایسی تھی جس میں عورت، مرد، بچے، بوڑھے اور آزاد وغلام سبھی شریک تھے۔ موجودہ دور شائستگی میں جس طرح اعداد وشمار جمع کر کے تعلیم یافتہ افراد کا اوسط فیصدی نکالا جاتا ہے اس طرح اُس زمانے کے خواندہ مسلمانوں کا ٹھیک شمار پیش نہیں کیا جا سکتا پھر بھی تاریخی واقعات کی بنا پر قیاس سے کام لیکر اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس زمانہ میں تعلیم یافتہ لوگوں کی کتنی کثرت ہوگی۔ علی بن عاصم کے حلقۂ درس حدیث میں تیس تیس ہزار اور یزید بن ہارون کے حلقۂ درس میں ۷۰،۰۰۰ ہزار آدمی جمع ہوتے تھے۔ خلیفہ معتصم باللہ نے ایک بار اپنا معتمد امام عاصم ابن علی کی مجلس کے شرکاء کا اندازہ کرنے کے لئے بھیجا اُس نے واپس آکر حاضرین کی تعداد ایک لاکھ بیس ہزار بتائی۔[2] غور کیجئے کہ جس قوم کے افراد ایک ایک علمی مجلس میں سوا سوا لاکھ جمع ہو جائیں اس کے سینہ میں کتنا شوق علم بھڑک رہا ہوگا اور جو شہر سوا لاکھ باشندے ایک علمی جلسہ میں بھیجدے وہ کتنا آباد ہوگا۔

احمد بن جعفر راوی ہیں کہ جب ابومسلم بغداد میں آئے تو انھوں نے حدیث کا املاء کیا۔ سات مستملی کھڑے ہوئے جو ایک دوسرے کو شیخ کی روایت پہونچاتا تھا۔ املاء حدیث کے بعد لوگوں کا اندازہ لگانے کے لئے

ع[1] ۔ نزہتہ الالباء صد ۳۲۶

ع[2] ۔ علماء سلف صد ۵۳ از مولوی حبیب الرحمٰن خاں شروانی

میدان کی پیمائش کی گئی اور دواتیں گنی گئیں جو شمار میں چالیس ہزار سے اوپر تھیں جو لوگ صرف سماعاً شریک تھے اور لکھتے نہ تھے وہ اس تعداد سے خارج ہیں عامّتہ المسلمین میں علم کی کثرت دریافت کرنے کا دوسرا طریقہ اُن باکمالوں کی تعداد ہے جو ایک ایک شہر میں ایک ہی وقت میں موجود تھے۔ یہ ملحوظ خاطر رہے کہ کتنے پڑھنے لکھنے والوں میں ایک صاحب فن اور باکمال پیدا ہوتا ہے۔ مسلم ابن ابراہیم کہتے ہیں کہ میں نے آٹھ سو شیوخ سے فن حدیث حاصل کیا ہے اور یہ سب ایک ہی شہر (بغداد) میں تھے۔ سنہ ۳۱۹ھ میں ایک شخص کی جان کسی طبیب کے جہل مرکّب کی نذر ہو گئی اس پر خلیفہ عباسی مقتدر باللہ نے رئیس الاطبار ابن ثابت کو حکم دیا کہ "شہر بغداد کے تمام اطباء کا امتحان لیا جائے جو امتحان میں کامیاب ہوں انھیں سند دیدی جائے اور جو ناکامیاب ہوں انھیں علاج سے روک دیا جائے۔ سند میں اس امر کی تشریح بھی ہو کہ سند یافتہ کو فلاں فلاں قسم کے امراض کو معالجے کی اجازت ہے،، حکم کی تعمیل کی گئی تو کچھ کم نو سو کو سند علاج عطا ہوئی اس فہرست میں وہ اطبار داخل نہیں ہیں جو بوجہ شہرت فضل و کمال امتحان سے مستثنیٰ رہے یا جنکو سرکار خلافت سے تعلق حاصل تھا۔ خدا کو علم ہے کہ ایسے طبیب کتنے تھے اور اُن کی تعداد نو سو کے عدد کو کہاں تک بڑھا دیتی[1]۔ بہر حال قیاس کی آنکھوں سے مشاہدہ کیا جا سکتا ہے کہ جس شہر میں نو سو سے زیادہ سند یافتہ طبیب ہوں گے تو اس میں دیگر فنون کے اہل کمال کی تعداد کس قدر ہو گی آگے چل کر تاریخ ہی کی ایک شہادت ملتی ہے کہ امام ادب نضر بن شمیل جب بصرہ سے خراسان کو جانے لگے تو تین ہزار آدمی اُن کی مشایعت کو ایسے نکلے جو یا تو نحوی تھے یا لغوی وعروضی اور اس کے بعد محدث یا اخباری[2]۔

ع۱:- عیون الانباء صفحہ ۲۲۲ جلد اول" ع۲:- ابن خلکان صفحہ ۱۶۰ جلد دوم

مسلمان انھیں اسلاف کے خلف ہیں۔ لیکن اب حالت دوسری ہے۔ آج ان کی پست ہمتی ان واقعات کو بھی رستم و اسفندیار کے افسانوں کے پہلو بہ پہلو بٹھانے پر آمادہ ہے لیکن کیا کیا جائے یہ ہیں سب تاریخی حقیقتیں۔ ان سے بھی زائد حیرت انگیز وہ کارنامے ہیں جو یہ بزرگ علمی دنیا میں بصورت تصنیف و تالیف چھوڑ گئے اور جنکی وجہ سے وہ آجتک زندۂ جاوید ہیں۔ ان میں سے بعضوں کی تصنیفات سیکڑوں سے متجاوز ہیں۔ ابو عبید نے مختلف علوم و فنون میں ۲۰۰ کتابیں لکھیں۔ ابن سریج نے چارسو، ابن خرم نے دوسو، یعقوب ابن اسحاق کندی نے ۲۳۱[ع۱]، قاضی فاضل نے سو، اندلس کے مشہور عالم عبدالملک نے ایک ہزار، جمال الدین حافظ نے بھی اسی قدر[ع۲]۔ ان کتب کی ضخامت کا خیال کیا جائے تو اور بھی حیرت ہوتی ہے[ع۳]۔ خصوصاً تاریخ کی کتابیں بہت ضخیم ہیں مثلاً سبط ابن جوزی کی مرآۃ الزمان ۴۰ جلد کی، ابن

ع۱۔ کندی کی تصنیفات اور اس کے وسعت علم کا اندازہ فہرست مندرجۂ ذیل سے کیجئے اور اسی پر اوروں کے متعلق قیاس فرمائیے۔

فلسفہ	۲۲	جدل	۱۷	موسیقی	۷
حساب	۱۱	سیاست	۱۲	احکام	۱۰
نجوم	۱۹	احداث	۱۴	نفسیات	۵
ہندسہ	۲۳	طبیعات	۲۳	ابعاد	۸
فلکیات	۱۶	کرہ	۸	تقدمۃ المعرفۃ	۵
طب	۲۲	منطق	۹	کل میزان	۲۳۱

دور عباسی کی مترجمہ کتب، مصنفین اور انکی تصنیفات کیلئے ملاحظہ ہو علوم عرب جلد سوم صفحہ ۱۸۰ تا صفحہ ۱۹۲ نیز ابن ندیم کی الفہرست۔ ع۲:- ابن خلکان صفحہ ۲۹۷ جلد اول"

ع۳۔ اس زمانہ میں تصنیف و تالیف کے لئے جو دشواریاں پیش آتی تھیں (باقی صفحہ ۷۵ پر)

عساکر کی تاریخ دمشق ۸۰ جلد کی، خطیب بغدادی کی تاریخ بغداد ۱۴ جلد، آغانی ۲۰ جلد، ابن اثیر ۱۲ جلد۔ جغرافیہ میں معجم البلدان کی دس جلدیں اور ادب میں ابو حنیفہ دینوری کی کتاب النبات ۶۰ جلد کی ہے۔ جلد کے صفحات کا اوسط عموماً ۲۰۰ صفحہ ہے[1]

باقی مضمون یہ، ملاحظہ ہو۔ اس کا آج ہم سائنس کی ایجادات کیوجہ سے اندازہ نہیں لگا سکتے۔ جو بھاری کام آج سیسہ اور پتھر نے اٹھالیا ہے وہ اُسوقت کے شائقین علم کو خود کرنا پڑتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ کثرت مشق اور رات دن کے لکھنے کی وجہ سے وہ لوگ تحریر پر اتنے قادر تھے کہ اب ان کی حکایتیں مشکل سے باور ہوتی ہیں۔ حافظ ابن فرات بغدادی نے جب وفات پائی تو کتابوں کے اٹھارہ صندوق چھوڑے جنمیں اکثر خود اُنکے ہاتھ کی لکھی ہوئی تھیں۔ سبط ابن جوزی مصنف مرآۃ الزماں فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے دادا (شیخ ابن جوزی) کو ایک بار سر منبر کہتے سُنا کہ میں نے اپنی ان انگلیوں سے دو ہزار جلدیں لکھی ہیں۔ جس شیخ وقت نے ۲۵۰ کتابیں تصنیف کی ہوں اُس کا ۲ ہزار جلدیں لکھ لینا تعجبات سے نہیں۔ جن قلموں سے انھوں نے فقط احادیث کو لکھا تھا اُنکا تراشہ جمع کرتے گئے تھے جب وفات پانے لگے تو وصیت کی کہ غسل کا پانی اسی تراشہ سے گرم کیا جائے چنانچہ اُنکے غسل کا پانی اسی پاک ایندھن سے گرم ہوا۔ امام ابو اسامہ کوفی نے ایک سو دس برس کی عمر پائی اُنکا سلسلۂ تحریر آخر عمر تک جاری رہا اُن کے بیٹے نے بیان کیا ہے کہ میرے والد نے کچھ اوپر اسّی قبائل کا کلام جمع کیا جب ایک قبیلہ کا کلام جمع کر چکتے تو اُس کے شکرانہ میں کلام اللہ کا ایک نسخہ لکھکر کسی مسجد کو وقف کر دیتے اسطرح اسّی سے زائد کلام پاک انھوں نے نقل کئے۔ امام ابو جعفر طبری کی وفات کے بعد انکی تصانیف کا اندازہ لگایا گیا تو ابتدائے شباب سے یوم رحلت تک ۲۸ صفحہ روزانہ کا اوسط پڑا۔ اور عام تحریر کا اندازہ کیا گیا تو ۸۰ صفحہ یومیہ ہوئے۔ (ملاحظہ ہو علما سلف ص ۲۷، ۲۸ از مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی)

اب ذرا غور کیجئے۔ کہ وہ لوگ کتنے زود نویس ہوتے تھے اُن کے لئے سو سوا سو دو دو سو جلدیں تیار کر لینا کچھ مشکل کام نہ تھا۔

[1] ۔ تفصیل کیلئے ملاحظہ ہوں علوم عرب ہر سہ جلد از جرجی زیدان

کتب خانے اور مدرسے:۔ کثرت تعلیم اور شوق علم کا اندازہ اُن مدارس اور کتب خانوں سے بھی لگایا جاسکتا ہے جو اِس زمانہ میں پائے جاتے تھے۔ ویسے تو ہر مسجد ایک مکتب تھی اِس قسم کے مکاتب میں سب سے مشہور اور قدیم جامعہ اظہر ہے جو ۳۶۱ھ سے لیکر آجتک (یعنی ایک ہزار سال سے زائد سے) خدمت خلق کے لئے وقف ہے[1]۔ مساجد کے مدارس کے علاوہ پہلا مدرسہ مامون الرشید نے خراسان میں قایم کیا۔ اس کے بعد تو درسگاہوں کے قیام کا ایک سلسلہ چل پڑا چنانچہ ابن فورک المتوفی ۴۰۶ھ نے نیشاپور میں، نصر (برادر سلطان محمود) نے مدرسہ سعیدیہ اور پروفیسر ابو اسحاق اور اسمٰعیل صوفی نے بھی متعدد مدرسے قائم کئے[2]۔ یہ سب مدرسے بغداد کے مدرسۂ نظامیہ سے پیشتر تھے۔ مدرسۂ نظامیہ ملک شاہ سلجوقی کے وزیر اعظم نظام الملک نے قائم کیا تھا اس کا سالانہ خرچ چھ لاکھ دینار تھا[3]۔ جسٹس سید امیر علی نے اندلس کی تاریخ میں متعدد مدارس کے نام گنائے ہیں جو قرطبہ، غرناطہ، اشبیلیہ وغیرہ میں قائم کئے صرف شہر غرناطہ میں، ۱۷ بڑے اور ۱۲۰ چھوٹے مدرسے تھے۔ اسی طرح بلخ، بخارا، خیوا، سمرقند، مرو، ہرات، غزنی وغیرہ تعلیم و تعلم کے لئے مشہور تھے۔ مدارس کے علاوہ بہت سی اساتذہ کے مکانات بجائے خود ایک مدرسہ کا کام دیتے تھے ان کے حلقۂ درس میں جس قدر زائد شاگرد ہوتے تھے اُسی قدر ان کی شہرت ہوتی تھی چنانچہ مشہور ہے کہ ابو بکر رازی کے حلقۂ درس میں صف در صف اتنے طلباء بیٹھتے تھے کہ ان کی آواز سب نہیں سن سکتے تھے۔ یہ شاگرد سفر و حضر میں بھی اپنے اُستاد کے

ع۱۔ اس زمانہ میں بھی جامع ازہر میں تعلیم پانیوالوں کی تعداد ۱۲ ہزار سے زائد ہے (موٗلف)

ع۲۔ السیوطی ص۱۸۵ جلد دوم

ع۳۔ مدارس کی مزید تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو رسائل مولانا شبلی نعمانی ص۲۳۸ تا ص۲۷۵

ساتھ رہا کرتے تھے محمد غوری کے پیش امام حضرت فخر الدین رازی کے ہمرکاب ۳۰۰ فقیہہ ہوتے تھے۔

مدارس کے قیام کے ساتھ ساتھ مسلمانوں نے کتب خانوں کی ترتیب میں بھی کافی دلچسپی کا اظہار کیا۔ موجودہ زمانہ میں کتب خانے نہایت آسانی کے ساتھ ہر جگہ قائم کئے جا سکتے ہیں کیونکہ چھاپہ خانے نیز رسل ورسائل کی فراوانی وکثرت ذی کتابوں کا وجود اتنا آسان کر دیا ہے کہ آج عمدہ سے عمدہ کتابیں بلا دقت ودشواری روپیہ خرچ کرنے سے مل سکتی ہیں لیکن اس زمانہ میں کتب خانوں کا قیام جوئے شیر لانے کا مصداق تھا۔ ایک ایک کتاب کی فراہمی کے لئے زرکثیر کے صرف کے علاوہ خاص اہتمام کرنا پڑتا تھا۔ پھر بھی بعض اوقات ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا تھا۔

دور عباسیہ میں جب علمی ترقی کا آغاز ہوا تو بغداد میں " بیت الحکمت" نامی کتب خانہ قائم کیا گیا اس کا بانی غالباً ہارون الرشید ہے۔ کتب خانے کے ایک حصہ میں ترجمہ نگار بیٹھتے تھے اور ایک حصہ میں نساخ اور ناقلین۔ مامون الرشید نے اس میں ترجمہ کرا کر بہت سی کتابوں کا اضافہ کیا۔ آخر میں کل کتابوں کا شمار دس لاکھ سے زائد تھا۔ اسی کتب خانے کے اصول پر دوسرے امرا[1] نے بھی کتب خانے جمع کرنے شروع کئے چنانچہ بہاء الدولہ دیلمی کے وزیر شاپور بن اردشیر نے ۳۸۱ہجری میں بغداد کے ایک محلہ کرخ میں جو کتب خانہ قائم کیا تھا اس میں کتابوں کی تعداد دس ہزار تھی۔ افسوس ہے کہ طغرل بیگ نے جب بغداد

۱۔ علماء و امراء نے جو کتب خانے قائم کئے ان میں افرائیم طبیب نے ۲۰ ہزار کتابیں، امین الدولہ نے بھی اسی قدر اور موفق الدین نے دس ہزار کتابیں جمع کیں دیگر امراء علماء کا بھی یہی حال تھا (ملاحظہ ہو علوم عرب از جرجی زیدان) ورسائل شبلی نعمانی ص۲۱ تا ص۴۳

کی طرف رُخ کیا تو یہ کتب خانہ جلا دیا گیا[1]۔ مشہور ہے کہ ہلاکو خاں کے ہاتھوں جب بغداد پر تباہی آئی تو "بیت الحکمت" کے ساتھ ساتھ شہر کے اور کتب خانے بھی آگ کے نذر ہو گئے۔ اِس کثرت سے کتابیں جلائی اور دریا بُرد کی گئیں کہ اُن سے دریائے دجلہ پر پُل بندھ گیا اور ۷ دن تک دریا کا پانی اپنے بہاؤ پر غم کی سیاہ چادر ڈالے رہا۔ فارس میں بھی کثرت سے کتب خانے تھے صرف علاقۂ خراسان میں ۶۱۶ھ میں بڑے بڑے کتب خانوں کی تعداد دس تھی۔ بغداد کی تباہی کے بعد ہلاکو تاتاری نے نصیر الدین طوسی کے لئے مراغہ میں جو کتب خانہ قائم کیا تھا وہ غالباً انھیں تباہ شدہ کتب خانوں کی بچی کھچی کتابوں کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے تھا ان کتابوں کی تعداد ۴ لاکھ تھی۔

مصر میں فاطمی خلیفہ عزیز باللہ نے اپنے وزیر یعقوب بن کلس کی رائے سے ایک کتب خانہ قاہرہ میں "خزائن القصور" کے نام سے کھولا تھا اس میں ۱۶ لاکھ کتابیں جمع کی گئیں تھیں اس کے تیس برس کے بعد ۳۹۵ھ میں حاکم بامر اللہ نے قاہرہ ہی کے اندر ایک دوسرا کتب خانہ قائم کیا اور اس کا نام "دار الحکمۃ" رکھا اس کے اندر ایک لاکھ کتابیں تھیں۔ ان کتب خانوں کی تباہی کا قصہ نہایت درد انگیز ہے جسے شاید کوئی علم دوست بھی سننے کے لئے تیار نہ ہو۔ چھٹی صدی ہجری کے وسط میں جب بیاں کُردوں کا عمل دخل ہوا تو یہ کتب خانے برباد ہو گئے۔ بہت سی کتابیں دریائے نیل میں ڈال دی گئیں کچھ جلا دی گئیں کچھ میدانوں میں چھوڑ دی گئیں جن کے اوپر پڑ پڑ کر ہواؤں نے ترس کھا کر خاک ڈال دی اور جو ایک عرصہ تک کتابوں کے ٹیلہ کے نام سے مشہور ہے۔ ان کتابوں میں سے سوا لاکھ عبدالرحیم بیانی لے اُڑا وہی بچ رہیں[2]

---

[1] ابن اثیر ص ۱۴۵ جلد دہم [2] ابن خلدون ص ۸۱ جلد چہارم "

دولت فاطمی کے زمانہ میں ایک نہایت عظیم الشان کتب خانہ طرابلس (واقع شام) میں قائم کیا گیا تھا اس میں تیس لاکھ کتابیں تھیں۔ جب عیسائیوں نے اس کو فتح کیا تو تمام کتابوں کو جلا ڈالا[1]۔ یہی حال غالباً اندلس کے کتب خانوں کا ہوا صرف شہر غرناطہ میں ۸۰ کتب خانے تھے جو عوام کے لئے ہر وقت کھلے رہتے تھے۔ شہر قرطبہ کے اندر حکم بن ناصر (المتوفی ۳۶۶ھ) نے ایک کتب خانہ "الحکم" کے نام سے قائم کیا تھا اس میں ۴ لاکھ کتابیں جمع کی گئی تھیں۔ کتب خانہ کی فہرست ۱۸۶۰ صفحات پر مشتمل تھی[2]۔ اسی کتب خانہ کی تقلید میں اندلس کے اور شہروں میں بھی اُمراء و علماء نے بھی کتب خانے قائم کئے تھے۔

بہرحال جہاں تک مسلمانوں کی علمی ترقیات اور علم سے شغف و وابستگی کا تعلق ہے اُن کی کیفیت اقصائے شرق و غرب میں یکساں تھی جس وقت وہ ہندوستان میں بحیثیت فاتح کے داخل ہوئے ہیں۔ اُس وقت وہ اپنے پیشرو فاتح اقوام سک سیتھین، ہن وغیرہ کی طرح جاہل و غیر متمدن ہرگز نہ تھے۔ وہ علم و ہنر کے شیدائی اور اس کے پرستار تھے، چونکہ خود صاحب فضل و کمال تھے اسلئے اہل علم کی قدر کرنا بھی جانتے تھے۔ محمود غزنوی کالنجر کے راجہ گانڈہ کے قصیدہ کا صلہ دیکر، ابوریحان بیرونی کتاب الہند لکھ کر اور مسعود سعد سلمان ہندی دیوان مرتب کر کے اس کا ثبوت دے چکے تھے۔ اور اگر اسے مبالغہ نہ سمجھا جائے تو اس زمانہ میں جبکہ یورپ اور دنیا کے دیگر حصوں میں جہالت کی تاریک گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں علم کی شمع صرف انھیں کے دم سے روشن تھی۔ تصور کی آنکھ سے دیکھئے تو آپ کو ایک کیف محسوس ہوگا۔ اور ممکن ہے کہ اسے آپ منشاء ایزدی پر محمول کریں

۱۔ Gibbons Roman Empire Vol. VI P 505

۲۔ ملاحظہ ہو ابن خلدون۔

کہ ہندوستان کی خدمت حفاظت اور اپنی روایات کو محفوظ رکھنے کے لئے مسلمان
یہاں اُس وقت آئے جبکہ تاتاری طوفان اُٹھنے ہی والا تھا۔ ہندوستان نے اس
موقع پر ان کے بہترین دل و دماغ اور بہترین روایات کو اپنے دامنِ عاطفت
میں پناہ دی۔ مسلمان بھی ناشکرے نہیں تھے انھوں نے حتی المقدور تاتاریوں
کے مقابلہ میں سینہ سپر ہو کر نہ صرف اپنے کو مٹنے سے بچایا بلکہ یہاں کے لوگوں
کی جان و مال کی بھی حفاظت کی اور اُن کے تمدن و معاشرت کی بھی جس کا ذکر مناسب
موقع پر کیا جائیگا۔

فصل سوم (الف) سیاسی کشمکش

نبی کریمؐ کی وفات کے بعد خلفاء راشدین کی خلافت ایک ایسی عادلانہ حکومت
تھی جس میں ذمی وغیر ذمی سب کے حقوق محفوظ تھے۔ انفرادی و اجتماعی زندگی میں
ایک ربط تھا جس کی وجہ سے حریت و مساوات کا دور دورہ تھا۔ یہ ایک نمونہ کی حکومت
تھی اور ایسی حکومت جس کی طرف دُنیا کو پھر لوٹ کر آنا ہے اگر اسے واقعی یہ منظور
ہے کہ دُنیا میں فتنہ و فساد کی بیخ کنی کر کے امن و امان قائم کیا جائے۔ اسی کی تمنا
گاندھی جی کرتے تھے جس کو وہ "رام راجیہ" کہتے تھے اور اسی کو ہمارے عیسائی
بھائی آسمانی بادشاہت کہتے ہیں۔ اس "رام راجیہ" میں بنیادی حقوق کی حفاظت
آج کل کی دنیوی لادینی حکومتوں کی بہ نسبت زیادہ بہتر ہوتی تھی۔ کیونکہ اُس کی بنیاد
خداپرستی پر تھی اور اس کے چلانے والے شریعت و طریقت کی چلتی پھرتی زندہ تصویر
تھے یعنی دونوں کا مبارک اجتماع ایک ہی ذات میں تھا اور وہ خلیفۂ راشد کی
ذات تھی۔

آگے چل کر عہد امویہ و عباسیہ میں یہ صورت حال تا دیر قائم نہیں رہ سکی

کیونکہ دین کی محافظت کا کام علماء و صوفیہ کو انجام دینا پڑا جبکہ سیاست کے نگہبان سلاطین اور اُن کے امراء ٹھہرے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس دور میں جبکہ حکومت شخصی و خاندانی شکل میں منتقل ہو گئی تو حکمراں طبقے اپنے آپ کو مسئولیت سے بالاتر سمجھنے لگے لیکن یہ حالت صرف شخصی و نجی زندگی تک محدود تھی۔ جہاں تک قوم و ملک پر حکومت کا تعلق تھا اس کے لئے معین ایک قرآنی دستور اور قانون تھا جس کی پیروی ہر برنا و پیر، عورت و مرد اور حاکم و محکوم پر فرض تھی اور جس کی خلاف ورزی کی اول تو کوئی جرأت نہیں کر سکتا تھا اور اگر کوئی بفرض محال کرتا بھی تو اس کی سلطنت و زندگی زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتی تھی۔ اسی طرح یہ بھی ضروری نہ تھا کہ خلیفۂ وقت کی وفات کے بعد اس کا بیٹا ہی حکومت کا مالک بنے اکثر و بیشتر تو خلفاء کو اپنی زندگی ہی میں اپنے بیٹے کو ولیعہد نامزد کرنے میں اور اس کے لئے اپنی حکومت کے اہل الرائے علماء صلحاء اور امراء کے ووٹ حاصل کرنے میں بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اور جب مرکزی حکومت کے کمزور ہونے پر اس کے صوبجات میں نیم آزاد و خود مختار سلاطین با اقتدار بن بیٹھے تو ان کو بھی اپنی اولاد کی جانشینی کے لئے یہی دقتیں پیش آئیں چنانچہ غزنوی حکومت کا وجود اس امر کی روشن دلیل ہے۔ ۹۶۱ء میں ابو الفوارس عبد الملک اوّل بن نوح اوّل سامانی شہنشاہ بخارا کے انتقال کے بعد حسب معمول شہزادوں میں سے کسی ایک کو منتخب کرنے کے لئے رائیں طلب کی گئیں۔ الپتگین نے بھی جو اس وقت کابل و غزنی کا عامل تھا اپنی رائے لکھ کر بخارا کی جانب روانہ کر دی حسن اتفاق سے یہ رائے اس شہزادے کے قطعی خلاف تھی جس کو بخارا میں کثرت رائے سے منتخب کر لیا گیا اسلئے الپتگین کو اپنے تحفظ کے لئے آزادی کا اعلان کرنا پڑا اور منتخب شدہ شہنشاہ منصور اپنی چند در چند مجبوریوں کی وجہ سے اس کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکا۔

بہر حال اس میں شبہ کی گنجائش نہیں کہ خلافت و حکومت ایک خاندانی وراثت

ہو کر رہ گئی اور جب تک بنوامیہ کا دور دورہ رہا اس میں قومی و عربی رنگ بھی تیز رہا لیکن عہد عباسیہ میں حالات بدل گئے جس کے چند وجوہ ہیں اور جن کا مطالعہ خالی از دلچسپی نہیں۔

ان اسباب میں پہلا سبب یہ ہے کہ گو اموی دور خلافت میں حکمراں طبقوں پر تو عربی رنگ ضرور غالب رہا لیکن وہ اسلام کے بین الاقوامی ذہن و فکر کو اپنے تابع نہیں کر سکے۔ اور اہل علم اسلام کی تعلیمات کو مفتوحہ ممالک میں عام کرنے میں برابر مصروف رہے جس کی وجہ سے رنگ و نسل کے اثرات نیز خاندانوں کے غلط امتیازات دن بدن مٹتے رہے اسلئے جس طرح یہ صحیح ہے کہ اموی حکومت کے ایوانوں میں غیر عرب کو مشکل سے بار ملتا تھا اسی طرح یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ حکومت کے علاوہ جماعتی و تمدنی زندگی کے جتنے ادارے تھے ان سب میں غیر عربی مسلمان پیش پیش رہنے لگے جمہوران کی بڑی قدر و منزلت کرتے تھے یہاں تک کہ حاکمان وقت کو بھی ان پر رشک ہوتا تھا[۱]

۱:۔ ایک مرتبہ خلیفہ ہارون الرشید مع جاہ و حشم شہر رقہ میں خیمہ زن تھا اتفاقاً اسی موقع پر حضرت عبداللہ ابن مبارک امام حدیث کا اس شہر میں گذر ہوا۔ اُن کے استقبال کے لئے لوگوں کا یہ ہجوم ہوا کہ سارے افق پر غبار چھا گیا اور کشمکش میں آدمیوں کی جوتیاں پارہ پارہ ہو گئیں۔ اس کیفیت کو حرم سرائے خلافت کی ایک کنیز نے جو دیکھا تو پکار اُٹھی "واللہ حکومت اس کو کہتے ہیں ہارون کی کیا حکومت ہے جس کے لئے لوگ اہلکاروں کے زور اور دباؤ سے جمع ہوتے ہیں"

اسی طرح حضرت امام بخاریؒ جب دربار علم سے کمال کا خلعت پہنکر اپنے وطن بخارا کو واپس آئے تو نہ صرف شہر بخارا کے باشندگان نے بلکہ راستے میں جو شہر بھی پڑے وہاں کے رہنے والوں نے اُن کا تین تین منزل تک بڑھ کر استقبال کیا حضرت امام مسلمؒ فرماتے ہیں کہ وہ جس شان سے شہر نیشاپور میں داخل ہوئے وہ شان میں نے کسی حاکم کی آمد میں نہیں دیکھی۔

حضرت امام فیروزی جب ایک دینی کام کے لئے شہر بغداد سے چلے تو ایک جم غفیر نے ان کی مشایعت

(باقی صفحہ ۸۳ پر ملاحظہ ہو)

دوسرے یہ کہ عربی فتوحات کا سیلاب تو ایک وقتی سیلاب تھا وہ آیا اور گذر گیا لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسلامی عقائد جس جس زمین میں پہونچے وہاں کے لوگوں کی ذہنی وجماعتی زندگیوں کو یکسر بدلتے چلے گئے۔ اور یہ مفتوحہ قومیں ایک صدی کے اندر اندر اس قابل ہو گئیں کہ عرب ان کو اپنے ساتھ حکومت میں برابر کا شریک کرنے پر مجبور ہو گئے۔

حاشیہ صفحہ ۸۲ :- کا قصد کیا انھوں نے ہر چند منع کیا لیکن جوش عقیدت میں کسی نے ممانعت کا لحاظ نہیں کیا۔ سامرہ پہنچکر جو ہمراہیوں کا شمار کیا گیا تو پچاس ہزار آدمی تخمینے میں آئے۔

علماء کے ساتھ عامۂ خلائق کا یہ جوش عقیدت صرف ان کی زندگی تک محدود نہ تھا بلکہ ان کے وفات فرما جانے کے بعد بھی قائم رہتا تھا۔ امام جعفر طبری کی قبر پر کئی مہینے تک شب و روز نماز جنازہ پڑھی گئی۔ امام ابی داؤد کی نماز جنازہ اسّی دفعہ ادا ہوئی کل نمازیوں کا تخمینہ کیا گیا تو تین لاکھ ہوا۔ اس سے ان بزرگوں کے عوام و خواص پر اثر کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ یہی وہ اثر تھا جس سے حکومت عادلہ بھی خائف رہتی تھی چنانچہ یہ مثال خالی از دلچسپی نہیں کہ امیر تیمور نے ایک مرتبہ اپنے ایک قاصد کو کسی ضروری کام پر روانہ کیا اس کو عام اجازت تھی کہ ضرورت کے وقت جس کا گھوڑا اس کو مل سکے اپنے استعمال میں لے آئے۔ راستے میں اس کو اپنا گھوڑا بدلنے کی ضرورت ہوئی تو اسنے بلا جھجک علامہ تفتازانی (مصنّف مطوّل) کی پیش گاہ سے ایک گھوڑا کھول لیا۔ علامہ موصوف اس وقت اپنے خیمہ کے اندر تھے انھیں جب اس کی اطلاع ہوئی تو نہایت برہم ہوئے اور قاصد سلطانی کو پٹواکر نکلوا دیا وہ جب لوٹ کر دربار میں پہونچا تو اس نے تیمور سے علامہ موصوف کی شکایت کی۔ تیمور ہیجان غضب کے سبب سے تھوڑی دیر ساکت رہا اس کے بعد کہا کہ اگر شاہرخ (ولیعہد سلطنت) یہ حرکت کرتا تو بے شک سزا پاتا مگر میں ایسے شخص کا کچھ نہیں کرسکتا جس کا قلم ہر شہر و دیار کو میری تلوار سے پیشتر فتح کر چکا ہے۔

(ماخوذ از علماء سلف صفحہ ۱۲، صفحہ ۱۲۴ مؤلفہ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی)

تیسرے یہ کہ عباسی خلافت کا سنگ بنیاد ہی عجمیوں کے ہاتھ سے رکھا گیا تھا لہٰذا رفتہ رفتہ اُن کا حکومت پر مسلّط ہوجانا کچھ تعجبات سے نہیں۔

علاوہ ازیں فطرت کا یہ کچھ قاعدہ کلّیہ سا ہے جس پر تاریخی واقعات شاہد ہیں کہ فتوحات اور جنگ وجہاد کا جذبہ خاندانی حکومتوں میں صرف تین چار نسلوں تک باقی رہتا ہے چوتھی نسل جب اُن عیش سامانیوں اور فارغ البالیوں میں پھنس جاتی ہے جو اُن کے آباء واجداد کی کاوشوں کا نتیجہ ہوتی ہیں تو اس میں عملی جدوجہد کا جذبہ سرد ہونے لگتا ہے جس کی وجہ سے پانچویں یا چھٹی نسل سے حکومت میں زوال شروع ہوجاتا ہے۔ بنوامیہ میں بھی تین چار نسلوں کے بعد زوال کا آغاز ہوگیا تھا۔ بالکل اسی طرح خلفائے بنی عباس میں المعتصم باللہ کا زمانہ خاندانِ عباسیہ کے عروج کا آخری زینہ تھا۔ معتصم نے ایرانیوں کے غلبہ کو کم کرنے کے لئے ترکوں کو فوج میں داخل کیا یہ ایک سیاسی غلطی تھی جس کا خمیازہ اس کے جانشینوں کو بھگتنا پڑا کیونکہ جو جماعت دوسروں کے سہارے زندہ رہنا چاہتی ہے اس کا حشر ہمیشہ بُرا ہوا کرتا ہے ترک فوج کے سپاہی اس کے زمانہ ہی میں اس قدر حاوی ہوگئے تھے کہ بغداد کے لوگ ان کی حرکتوں سے پریشان ہوکر بغاوت پر آمادہ ہوچلے تھے اس پر معتصم کو بغداد کے بجائے سرمن رائ کو دارالخلافہ بنانا پڑا۔ یہی ترک جماعت رفتہ رفتہ خلفاء عباسیہ پر حاوی ہوگئی اور خلفاء اس کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بن کر رہ گئے۔

ترکوں کی طاقت کمزور پڑنے پر بویہ خاندان نے اقتدار حاصل کرکے ۳۳۴ھ ۹۴۵ء میں بغداد پر قبضہ کرلیا۔ اس انقلاب سے خلفاء کو تبدیلی آقا کے سوا اور کچھ فائدہ نہ ہوا یعنی پہلے اگر وہ ترکی غلاموں کے زیر اثر تھے تو اب انھیں بویہ خاندان کے فرمانرواؤں کا دست نگر بننا پڑا۔ اس بے بسی اور مجبوری کے عالم میں خلفاء کی حلیف اگر کوئی ریاست تھی تو وہ آل سامان کی تھی (۸۷۴ء تا ۹۹۹ء) لیکن سمٰعیل

سامانی (۸۹۲ء تا ۹۰۷ء) کے بعد اس کے جانشین خراسانی و سجستانی رعایا کی بغاوتوں اور خاندان بویہ کے روز افزوں عروج کی وجہ سے ضعیف ہوتے چلے گئے اور خلفاء پر بویہ فرمانرواؤں کا اثر بدستور قایم رہا۔

المختصر خلافت کے قویٰ کمزور پڑتے ہی اس کے مغربی و مشرقی اعضاء الگ ہوتے چلے گئے۔ مغرب میں ہسپانیہ کے اندر ۱۳۸ھ/۷۵۵ء ہی میں بنو امیہ کی خود مختار حکومت قائم ہو چکی تھی اس کے علاوہ افریقہ میں ادریسیہ (۱۷۲ھ/۷۸۸ء تا ۳۷۵ھ/۹۸۵ء)، اخشیدیہ (۳۲۳ھ/۹۳۵ء تا ۳۵۸ھ/۹۷۰ء)، اغلبیہ (۱۸۴ھ/۸۰۰ء تا ۲۹۶ھ/۹۰۹ء) اور اسمٰعیلیہ (۲۹۷ھ/۹۰۹ء تا ۵۶۷ھ/۱۱۷۱ء) وغیرہ خود مختار ریاستیں قائم ہو گئیں جس سے دریائے فرات کے مغرب میں عباسیوں کا دنیوی اقتدار ہمیشہ کے لئے جاتا رہا۔ بحرین والحساء میں قرامطہ کا زور بندھا اور مشرق میں طاہریہ (۲۰۵ھ/۸۲۰ء تا ۲۵۹ھ/۸۷۲ء)، علویہ (۲۵۰ھ/۸۶۴ء تا ۳۱۶ھ/۹۲۸ء)، صفاریہ (۲۵۴ھ/۸۶۷ء تا ۲۹۶ھ/۹۰۹ء)، سامانیہ (۲۶۱ھ/۸۷۴ء تا ۳۸۹ھ/۹۹۹ء)، زیاریہ (۳۱۶ھ/۹۲۸ء تا ۴۳۴ھ/۱۰۴۲ء)، بویہ (۳۲۰ھ/۹۳۲ء تا ۴۴۷ھ/۱۰۵۵ء)، ایلک خانیہ (۳۲۰ھ/۹۳۲ء تا ۵۶۰ھ/۱۱۶۵ء)، بنی حسنویہ (۳۴۸ھ/۹۵۹ء تا ۴۰۶ھ/۱۰۱۵ء) اور غزنویہ (۳۵۰ھ/۹۶۱ء تا ۵۸۲ھ/۱۱۸۶ء) وغیرہ خاندانوں نے علم استقلال بلند کیا گو ان میں سے اکثر نے خطبہ و سکہ خلیفہ ہی کے نام کا جاری رکھا لیکن اور سب طرح سے یہ مکمل آزاد تھے اور انھیں خلیفہ سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہ تھا۔

یہ اسلامی خلافت جس کا سیاسی وجود در اصل نہ ہونے کے برابر تھا اور جس کا اثر جہاں وہ تھی وہاں کی زندگی کے بھی کسی شعبہ پر نہ پڑتا تھا حقیقت میں اسلام کے اس تصور کی یادگار تھی کہ یہ دین قومی نہیں بلکہ بین الاقوامی ہے۔ اسی تصور کو لئے ہوئے مسلمان ہندوستان میں داخل ہوئے اور یہاں آکر لوگوں کی ذہنی و جماعتی زندگیوں میں انقلاب پیدا کر دیا جس کا مناسب موقع پر ذکر آئے گا۔

(ب) ملوکیت و قیصریت:- سیاسی کشمکش و انتشار کے سلسلہ میں شخصی و ورا ثتی حکومت کے بارے میں ذکر آیا تھا۔ ظاہر ہے کہ ملوکیت و بادشاہت کا نظام بھی اپنے اندر کچھ خصوصیتیں رکھتا ہے جس کا ظہور اس نظام کے ساتھ لازمی ہے مثلاً

۱- ملوکیت میں حکومت قوم کی نہیں بلکہ حکمراں کی ذاتی اور خاندانی مِلک ہو جاتی ہے۔

۲- سلطنت کے تمام ذرائع بادشاہ کی عظمت و سطوت کو بڑھانے کے لئے وقف ہو جاتے ہیں۔

۳- بادشاہ قوم کا خادم نہیں بلکہ رفتہ رفتہ مالک بن جاتا ہے اور تمام انسان اس کے نمک پروردہ غلام ہو جاتے ہیں جن سے حرّیت رائے اور آزادئ خیال بالکل سلب ہو جاتی ہے۔

۴- شان و شوکت اور دبدبۂ شاہی کے لحاظ سے بادشاہ اِس زمین پر چھوٹا خدا ہونے کی کوشش کرتا ہے۔

۵- اُس کی ذاتی آسائش و تفریحات پر سلطنت کی بیش قرار آمدنی صرف کی جانے لگتی ہے۔ جس سے آگے چل کر قومی افلاس بڑھتا ہے اور اس طرح فتنہ و فساد کے دروازے کھل جاتے ہیں جو آئندہ خود حکومت کے زوال کا سبب بن جاتے ہیں۔

ملوکیت سے پیدا ہونے والے یہ وہ تمام حقائق ہیں جن سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ حکمراں کی مطلق العنانی اور بے راہ روی سے یہی سب کچھ ہونا بھی چاہئے لیکن ہمیں یہاں پر دوسری اقوام کے مطلق العنان حکمرانوں کے مقابلہ میں اسلام کے خود سر بادشاہوں کا درجہ متعین کرتے وقت بعض بنیادی اصولوں کا فرق ذہن نشین رکھنا چاہئے تاکہ مسلمان حکمرانوں کے بارے میں جب کبھی لفظ "ملوکیت و قیصریت" استعمال کیا جائے تو اُس کے حدود سمجھ میں آسکیں ان کے نہ سمجھنے سے مسلم حکمراں خواہ وہ

خلفائے عباسیہ ہوں یا کوئی دوسرے آمریت پسند بادشاہ ہماری غلط فہمیوں کا شکار ہو سکتے ہیں۔

ضمیمہ ۶ جس میں اسلام و جاہلیت کے نظریۂ حیات سے بحث کی گئی ہے اس بات کو صاف کر دیا گیا ہے کہ ایک مسلمان خواہ وہ کتنا ہی آزاد کیوں نہ ہو دنیا کے دیگر غیر مسلم افراد کے مقابلہ میں پھر بھی آزاد نہیں کہا جا سکتا کیونکہ اُس کی آزادی محدود اور کچھ ضوابط و قوانین کی پابند ہے اسلئے وہ بگڑ کر بھی سنبھل سکتا ہے جبکہ جاہلیت کے تابع افراد کے بگڑ کر مزید بگڑنے کے امکانات سنبھلنے کے مقابلہ میں کہیں زائد ہیں۔ اس کی مزید توضیح یوں کی جا سکتی ہے کہ ایک بگڑا ہوا مسلمان اُس سونے کے ٹکڑے کے مانند ہے جس کے اوپر میل کچیل کی تہہ جم گئی ہو ظاہر ہے کہ میل کچیل چھوٹ جانے کے بعد سونا پھر سونا ہے اسی طرح وہ مسلمان بادشاہ یا خلیفہ جن کو یوربی مورخین اور پھر جن کی اتباع میں دیگر غیر مسلم اقوام کے تاریخ دانوں نے مطلق العنان سمجھا ہے وہ یوربی نیز جاہلی نظریۂ ملوکیت کی حد تک کبھی آزاد نہیں تھے کیونکہ اُن کی آزادی کو بعض عوامل نے مل کر محدود کر دیا تھا اور پھر انھیں عوامل نے ملوکیت کے زنگ کو دور کر کے کندن کو کندن بنائے رکھنے کی کوشش کی۔

I ان عوامل میں یقیناً سب سے بڑا دخل قرآن پاک کے اُن ضوابط و قوانین کو ہے جن کا علم ہر اُس مسلمان کو ہے جو اُن کی تلاوت کرتا ہی یا دوسروں سے سنتا ہے اور پھر اُن پر حتی الامکان عمل بھی کرتا ہے اس کی بین شہادتیں ہیں کہ دیگر اقوام میں اُن کی مذہبی کتب کی پہونچ ایک مخصوص طبقہ تک محدود رہی اور عوام اُن کے صحیح اصولوں سے قطعی ناواقف رہے یا رکھے گئے جس کی وجہ سے ان کے بعض حکمرانوں کو اس کا نہایت آسانی کے ساتھ موقع مل گیا کہ انھوں نے حلال کو حرام اور حرام کو حلال کر دیا اور اُن کی رعایا نے آنکھیں بند

کر کے اپنی جہالت کی بنا پر حکمراں کے غلط احکامات کو بے چون و چرا مان لیا اور اس طرح ایک غلط راہ پر چل پڑے۔ غیر مسلم اقوام کے بعض راجاؤں اور حکمرانوں کو دیوتا اور خدا مانا گیا اور نہ صرف مانا گیا بلکہ آج بھی اِس روشنی کے زمانہ میں اُن کی پرستش جاری ہے لیکن اِس قسم کی کوئی ایک مثال بھی تاریخ اسلام کے اندر تلاش نہیں کی جاسکتی کہ کسی مسلم حکمراں نے جائز کو ناجائز اور حق کو باطل قرار دیا ہو اور مسلم رعایا نے اُس کو صحیح مان کر اُس کی اتباع کی ہو۔

II۔ علاوہ ازیں مُسلم بادشاہوں کی ملوکیت و قیصریت سے پیدا ہونے والے مضر اثرات کو علماء ربّانی نے اکثر و بیشتر جرأت کے ساتھ آگے بڑھ کر پھیلنے سے روک دیا یا اُن کی ذاتی وجاہت و اثر کی وجہ سے مطلق العنان حکمرانوں کو قابل اعتراض کام کرنے کی جرأت ہی نہ ہو سکی۔ مثالوں[ا] سے دفتر کے دفتر بھرے پڑے ہیں جس کا جی چاہے اِس چمن کی سیر کرے اور ان حقائق کی روشنی سے اپنے قلب کو منوّر بنائے۔ فٹ نوٹ میں صرف دو چار مثالوں پر اکتفا کیا گیا ہے۔

عا:۔ (۱) عمر بن ہبیرہ جب خلیفہ دمشق یزید ابن عبدالملک کی جانب سے والیٔ عراق و خراسان مقرر ہو کر آیا تو اُس نے خواجہ حسن بصریؒ۔ امام ابن سیرینؒ اور امام شعبیؒ کے سامنے ایک نہایت سیاسی و مدبرانہ تقریر کی جس کا ماحصل یہ تھا کہ خلیفہ کے ہر حکم کی تعمیل کی جائے۔ اِس موقع پر خواجہ حسن بصریؒ نے اس پولیٹیکل گفتگو کا جواب جن صاف اور سچے الفاظ میں دیا وہ قابلِ شنید ہیں اُنھوں نے فرمایا "اے ابن ہبیرہ! یزید کے معاملہ میں خدا سے ڈر اور خدائے تعالیٰ کے معاملہ میں یزید کا خوف مت کر۔ خدائے تعالیٰ تجھ سے یزید کے شر کو دفع کر سکتا ہے مگر یزید اُس احکم الحاکمین کے قہر کو نہیں روک سکتا۔ وہ دن دور نہیں جبکہ مرنے کے بعد تیرے نیک اعمال ہی تجکو نجات دلائیں گے۔ اور اے ابن ہبیرہ! اگر تو خدا کا گناہ کرے تو خوب سمجھ لے کہ خلیفہ کو اُس نے اپنے دین کا اور اپنے بندوں کا محافظ و ناصر مقرر کیا ہے پس خدا کے دین کے خلاف اُس کے مقرر کیے ہوئے حاکم کی وجہ سے جسارت مت کر کیونکہ خالق کے

(باقی صفحہ ۸۹ پر)

III تیسری چیز جس نے بادشاہوں کی آمریت و ملوکیت میں اکثر رکاوٹیں ڈالی ہیں وہ جمہور اسلام کا طرز عمل تھا جن بادشاہوں نے اپنی غلط اور من مانی کارروائیاں کر کے یا اپنی غفلت

حاشیہ صفحہ ۸۸ : کے مقابلہ میں مخلوق کا حکم ماننا کسی طرح روا نہیں" (بحوالہ علماء سلف صفحہ ۶۵)

(ب) دور عباسیہ میں جب منصور حکمراں تھا تو ملوکیت کو تقریباً سوا سو برس اسلام میں گذر چکے تھے اُس وقت بھی امام مالکؒ اور ابن ابی ذئبؓ کی حق افروز آوازیں جور و استبداد کی ظلمت میں بجلی بن کر چمک اٹھیں اور درباریوں اور مصاحبین کی آنکھوں کو خیرہ کر دیتی تھیں۔ منصور نے ایک مرتبہ ابن ابی ذئب سے دریافت کیا کہ تم مجھ کو کیسا سمجھتے ہو تو آپ نے فوراً جواب دیا "تم بدترین مخلوق ہو مسلمانوں کی تمام دولت اپنی شان و شوکت میں صرف کرتے ہو۔ غریبوں کو پریشان اور امیروں کو ہلاک کر ڈالا۔ بتاؤ کل تم خدا کے سامنے کیا جواب دو گے" منصور نے کہا "تم دیکھتے ہو کہ تمہارے سامنے یہ کیا چیز ہے" ابن ابی ذئبؒ نے کہا "ہاں ننگی تلوار دیکھتا ہوں لیکن آج کی موت کل کی موت سے بہتر ہے (بحوالہ افکار و سیاسیات اسلامی صفحہ ۵۳۰)۔

(ج) امام یزید ابن حبیب تابعی ایک دفعہ علیل تھے۔ ابن سہیل والیٔ مصر اُن کی عیادت کو آیا۔ اثنائے کلام میں اُس نے پوچھا کہ جس کپڑے پر مچھر کا خون لگا ہو اُس سے نماز جائز ہے یا نہیں۔ امام نے یہ سنکر غصہ سے منہ پھیر لیا اور کچھ نہیں کہا جب امیر نے [illegible] قصد کیا تو اُس کو نظر بھر کر دیکھا اور کہا کہ تو روزانہ خدا کے بندوں کا تو خون بہاتا ہے اور مچھر کے خون کا فتویٰ پوچھنے چلا ہے (بحوالہ علماء سلف صفحہ ۷)۔

(د) ابو الحسن نوریؒ نے ایک مرتبہ کشتی میں شراب کے مٹکے دیکھے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ خلیفہ معتضد باللہ نے منگوائی ہے آپ نے تمام مٹکے توڑ ڈالے۔ جب معتضد نے پوچھا کہ "تجھے محتسب کس نے مقرر کیا ہے" تو فوراً جواب دیا کہ جس نے تجھے خلیفہ مقرر کیا (افکار و سیاسیات صفحہ ۵۳۲)

(ہ) علاء الدین خلجی کی جباریت و قہاریت سے بھلا کسے انکار ہو سکتا ہے یہ وہی علاء الدین ہے جس کی مطلق العنانی پر یورپی مورخین خوشیاں مناتے ہیں لیکن کیا پھر اس حقیقت سے بھی کوئی انکار کر سکتا ہے کہ قاضی علاء الملک نے اُسے "ایجاد مذہب" کے فتنہ میں پڑنے سے روک دیا اور قاضی مغیث الدین نے اُس کی بعض غلط کارروائیوں پر کڑی نکتہ چینی کر کے اسلاف کے اعلاء کلمۃ الحق کی سنت کو تازہ کیا (بحوالہ فیروز شاہی

(بقیہ صفحہ ۹۰ پر)

وعیّاشی سے رعایا پر مظالم ڈھائے اُنھیں یا تو تختِ حکومت سے معزول ہونا پڑا اور یا پھر انھیں جلد ہی قتل کر دیا گیا اس طرح تختِ حکومت اُن لوگوں کے لئے جلد جلد خالی کیا جاتا رہا جو واقعی حکومت کے اہل تھے۔

حاشیہ صفحہ ۸۹۔ مصنّفہ ضیاء برنی

(ف) دورِ اکبری کی مذہبی فتنہ سازیاں سب پر روشن ہیں اُس کی گدّی اُس کے سپوت بیٹے جہانگیر کے قبضہ میں آئی۔ یہ وہی جہانگیر ہے جس نے دورِ اکبری کے ایک حق پرست وحق گو عالم ملّا عبد القادر بدایونی کی مشہور کتاب "منتخب التواریخ" کو دُنیا سے محض اسلئے نابید کرنے کی کوشش کی تھی کہ اُس نے اپنی کتاب میں عہد اکبری کے سُنے سُنائے نہیں بلکہ چشم دید سچے سچے حالات بے کم وکاست تحریر کر دیئے تھے۔ اِسی عہد جہانگیری میں حضرت شیخ سرہندی مجدّد الف ثانی دورِ اکبری کے فتنوں کی اصلاح اور شریعت محمدی کی ترویج کے لئے اُٹھے اور شاہی قوت کے مقابلہ میں یکّہ وتنہا احیاءِ دین کی جدوجہد کی۔ اور بالآخر وہ اکبری فتنہ کے مُنہ پھیر دینے میں کامیاب ہو گئے۔ جہانگیر جس نے سجدۂ تحیتہ نہ کرنے پر شیخ کو گوالیار کے قید خانہ میں قید وبند کے مصائب و شدائد میں مبتلا کیا تھا آخر میں شیخ کا معتقد ہو گیا اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت کی غلط روش بدل گئی اور "اکبر شاہی دین الٰہی" اُن تمام بدعتوں کے ساتھ ختم ہو گیا جو درباری شریعت سازوں نے گڑھی تھیں اور غالباً وہ شیخ ہی کے پھیلائے ہوئے اِصلاحی اثرات تھے جن کی بدولت تیموری خاندان کے اُس شہزادہ (اورنگ زیبؒ) کو وہ علمی و اخلاقی تربیت مل سکی کہ اکبر جیسے ہادمِ شریعت کا پرپوتا خادمِ شریعت ہوا" (ماخوذ از الفرقان بریلی شاہ ولی اللہ نمبر صـ ۹۲)۔

(ن) سکندر لودھی نے ایک مرتبہ یہ چاہا کہ تھانیسر کے میلہ کو روک دیا جائے اور جاتریوں کو قتل کر دیا جائے۔ درباریوں میں سے ایک درباری نے بادشاہ سے اِس امر پر علماءِ وقت سے مشورہ لینے کی استدعا کی چنانچہ اس مبارک اجتماع میں پاک پٹن (اجودھن) کے میاں عبد اللہ بھی شریک ہوئے۔ آپ نے نہایت جرأت و بیباکی کے ساتھ بادشاہ کے اِس بیہودہ ارادے کی شدید مخالفت کی اور اُسے خلافِ شریعت بتایا۔ اس پر بادشاہ کو اتنا غصّہ آیا کہ اُس نے ہاتھ میں خنجر اُٹھا لیا اور کہا کہ پہلے اِس سے تمہارا کام تمام کروں گا اس کے

(باقی صفحہ ۹۱ پر)

(ﷺ) آخری لیکن نہایت اہم چیز جس نے ملوکیت کے مضر اثرات کو کم سے کم کرنے میں بہت بڑا کام کیا ہے وہ مسئلۂ جانشینی ہے۔ غیر مسلم اقوام میں قانوناً یا رواجاً وارثِ تخت و تاج بادشاہ کا سب سے بڑا بیٹا سمجھا جاتا ہے لیکن اسلامی قوانین کی رو سے امیر المومنین ہونے کا حق مسلم جماعت میں سے قابل سے قابل ترین فرد کے لئے مخصوص ہے عام اس سے کہ وہ بادشاہ کا بڑا یا چھوٹا بیٹا ہو یا مسلم جماعت کا ایک ادنیٰ فرد۔ اگر یہ صورت نہ ہوتی تو تاریخ ہندوستان کی تاریخ التمش، بلبن، علاء الدین خلجی، فیروز تغلق، شاہجہاں اور اورنگ زیب جیسے قابل ترین شہنشاہوں کے تدبر و سیاست کے ذکر سے خالی نظر آتی۔

حاشیہ بقیہ صفحہ ۹۰ ۔ بعد جاتریوں کا۔ اس پر میاں صاحب موصوف نے نہایت متانت و وقار کے ساتھ جواب دیا کہ موت و زیست تو اللہ کے ہاتھ میں ہے موت وقت سے پہلے تو آ نہیں سکتی لیکن ایک ظالم کے سامنے اس سے ناامید بھی نہیں ہونا چاہیئے۔" بادشاہ کو بالآخر اپنا غلط ارادہ ترک کر دینا پڑا (بحوالہ فاروقی صـ ۱۱۲)

(ح) سلاطین عثمانیہ میں سلطان سلیم خاں اوّل بڑے جاہ و جلال اور سطوت و شوکت کا بادشاہ ہوا ہے ایک روز اس کو ملازمان خزانہ پر غصہ آگیا اور انمیں سے ۵۰ آدمیوں کے قتل کا حکم دیدیا۔ مولانا علاء الدین جمالی ان دنوں قسطنطنیہ میں مفتی اعظم تھے انھوں نے جو یہ سخت حکم سنا تو سیدھے باب عالی کو تشریف لے گئے وہاں پہونچکر سلطان کے سامنے جو تقریر کی وہ سننے کے قابل ہے۔ فرمایا "جو علماء فتویٰ دینے کے مجاز ہیں ان کا فرض ہے کہ سلطانِ وقت کی آخرت درست رکھنے کی فکر رکھیں۔ میں نے سنا ہے کہ سلطان نے ڈیڑھ سو آدمیوں کے قتل کا حکم دیا ہے حالانکہ شرعاً یہ تجویز ناجائز ہے لہذا میں عفو سلطانی کی استدعا کرتا ہوں" بالآخر سلطان کو اپنا غلط حکم واپس لینا پڑا اور اس طرح بے گناہ ملازم قتل سے بچ گئے (ماخوذ از علماء سلف صـ ۱۲۰، ۱۲۱)

باب دوم

ہندوستان عہد یمینی سے پہلے

نیا مذہب و نئی حکومتیں

جلد اول میں ہم نے سندھ کے سیاسی حالات کا مطالعہ کرتے وقت کم از کم اتنا تو جان لیا ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات کا دائرہ سندھ سے نکل کر ایک طرف قنوج اور دوسری طرف شمالی پنجاب یا زیریں کشمیر تک پہونچ چکا تھا لیکن پھر بھی یہ ایک محدود دائرہ اثر تھا۔ عہد یمینی میں محمودی فتوحات نے اس میں بہت کچھ اضافہ کیا اور اگر ایک طرف بنارس و کالنجر تو دوسری طرف گجرات و مہاراشٹر تک اس کو وسعت دی اسلئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ عہد حاضر کے سیاسی واقعات کو چھیڑنے سے پیشتر شمالی ہند کے بالخصوص اور جنوبی ہند کے بالعموم سیاسی وسماجی نظام پر ایک نظر ڈالی جائے تاکہ دونوں ہمسایہ اقوام یعنی ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات کو سمجھنے میں آسانی پیدا ہو اور ان بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ ہوسکے جو بعض مورخین کی غلط ترجمانی کی وجہ سے پیدا ہوچکی ہیں۔ اور پھر چونکہ یہی وہ زمانہ ہے جبکہ ہندوستان کے اندر ایک سیاسی وذہنی ہیجان بپا تھا، زمانہ کی رفتار اور اس کے حالات و واقعات پرانے آریہ مت کو موجودہ ہندومت کی صورت میں ترتیب دے کر ایک نئے ہندومت کی بنیاد ڈال رہے تھے، نئے نئے قبیلے اور جماعتیں ہندو سوسائٹی میں اُبھر اُبھر کر نئی نئی حکومتوں کی داغ بیل ڈالنے میں مصروف تھیں اسلئے ہندوؤں کے سیاسی وسماجی انقلاب سے واقف ہونے کی اور بھی زیادہ ضرورت ہے تاکہ آئندہ آنے والے واقعات کو سمجھنے کی استعداد پیدا ہوسکے۔

فصل اوّل

نئے مت کی تشکیل I (۱) ذہنی ارتقاء

ویدک عہد

ہندوستان میں اب سے ہزار ہا سال پیشتر مظاہر پرستی کا رواج تھا اور یہ وہ زمانہ ہے جبکہ کائنات عالم کے بنانے اور سنوارنے والے (ایشور) کے متعلق انسان کا تخیل نہایت مبہم اور دھندلا سا تھا۔ چنانچہ وید منتر اور برہمن جو زمانہ قدیم میں ترتیب دیے گئے ایسے ۳۳ دیوتاؤں کے ذکر پر مشتمل ہیں جو زمین، آسمان اور فضاء آسمانی سے متعلق ہیں۔

ان کے متعلق اس عہد کے انسان کا یہ عقیدہ تھا کہ ان (دیوتاؤں) کو خوش کرنے کے لئے جو قربانیاں پیش کیجاتی ہیں ان کی وجہ سے دیوتا مجبور ہیں کہ وہ قربانی کرنے والے کے جملہ مقاصد کو پورا کریں۔ گویا قربانیاں ایک قسم کا قرضہ تھیں جن کا ادا کرنا (دیوتاؤں کو مطمئن کرنے کے لئے) ضروری تھا۔[1] آگے چل کر قربانیوں کی کثرت یا اُن کے رسمی رہجانے کی وجہ سے حکماء و علماء کے اندر ذہنی تغیر رونما ہوا اور اُس نے مختلف شکلیں اختیار کیں مثلاً:-

(۱) حکماء کی ایک جماعت کو ایک ایسے خدا کی تلاش و جستجو ہوئی جو تمام دیوتاؤں سے افضل و اعلیٰ ہو چنانچہ اسی ذہنی انتشار کا یہ نتیجہ ہے کہ اِس عہد کے منتروں میں کہیں "ورن" دیوتا کو سب سے بڑا مانا گیا ہے اور کہیں "اندر" دیوتا کو اور کہیں کسی اور کو۔ بالآخر ہوتے ہوتے اس خدا کو جو ۳۳ ویدک دیوتاؤں کا بھی رب ہے وشوکرما (خالق کائنات) اور پرجاپتی (رب العالمین) کے نام سے یاد کیا گیا[2]۔ اور بقیہ تمام ۳۳ دیوتاؤں کو اِس بڑے دیوتا تک پہونچنے کا ذریعہ تسلیم کیا گیا[3]۔

(۲) اِسی عہد میں حکماء و متفکرین کی ایک ایسی جماعت بھی تھی جو خالص توحید کی متلاشی تھی۔

ع۱:- 1. Taittiriya — Samhita VI, iii. 10. 5

2. Indian Philosophy by prof: Hiriyanna P.37

ع۲:- رگوید ۱:۱۶۴:۴۶ ع۳ رگوید ۱۰:۱۲۹

(۳) مذکورہ بالا مختلف الخیال جماعتوں کے علاوہ ایک طبقہ ایسا بھی تھا جو نہ تو دیوی دیوتاؤں کو مانتا تھا اور نہ خدا کے وجود کا قائل تھا۔ اس طبقہ میں اُن جینیوں کو شمار کیا جاسکتا ہے جو مہاویر سوامی سے پہلے موجود تھے ؏[1]

اُپ نشدوں کا زمانہ

اِس ذہنی انتشار میں کچھ عرصہ کے بعد پختگی پیدا ہو گئی اور طرز فکر کے اعتبار سے مختلف اسکول بن گئے۔ چنانچہ اُپ نشد دراصل قربانیوں کے خلاف ایک مستقل آواز ہیں "مونڈک" اُپ نشد قربانیوں کے خلاف لکھا گیا۔ "برہد آرنیک" اُپ نشد میں بتایا گیا ہے کہ اشومیدھ یگیہ کرنے سے یہ کہیں زائد بہتر ہے کہ ایشور کے گیان دھیان میں دُنیا کی ہر چیز کو ہیچ سمجھا جائے۔ سیاسی نقطۂ نظر سے اُپ نشدوں میں حکمراں طبقے کی فوقیت، کو برہمنوں کے مقابلہ میں واضح کیا گیا ہے۔ اس وقت اُپ نشدوں کی تعداد دو سو سے زائد ہے لیکن زمانہ بدھ سے پہلے جو اُپ نشد بنے ان کی تعداد غالباً ایک درجن سے زیادہ نہیں ؏[2]

ویسے تو ان میں بے شمار خیالات کی بھرمار ہے جن میں بڑی حد تک تضاد ہے لیکن خاص طور سے دو طرح کے خیالات کی ترجمانی کی گئی ہے (ا) یہ کہ دُنیا کا وجود وہمی و خیالی ہے (ب) یہ کہ کائناتِ عالم کی اشیا مختلفہ میں ایک قسم کی وحدت ہے اِن خیالات کے اعتبار سے خالق و مخلوق کے تعلقات کے متعلق دو نظریئے قائم ہو گئے ایک "برہما پرنام واد"[3] اور دوسرا "برہما وِورت واد"[4] کے نام سے معروف ہیں فعل و عمل

؏[1] انڈین فلاسفی صـ۴۳ از پروفیسر ہریتنہ — ؏[2]:۔ انڈین فلاسفی صـ۵۱

؏[3]:۔ اِس کو ایک حد تک "نظریہ ہمہ اوست" قرار دیا جاسکتا ہے۔ چند وگیہ اُپ نشد میں اُدّالک اور اُس کے بیٹے شویت کیتو کا مکالمہ ملاحظہ ہو۔ کچھ عرصہ کے بعد اس نظریہ میں تبدیلی ہو گئی کیونکہ خدا کے ساتھ پُرش اور پراکرتی کو بھی شامل کر دیا گیا (مؤلف۔ ؏[4]۔ برہما وِورت واد کو "نظریہ ہمہ از اوست" کہہ سکتے ہیں۔ برہما اُپ نشد میں سماۃ گارگی اور یاگیہ ولکیہ کا مکالمہ دیکھئے۔

کے اعتبار سے آواگون اور تناسخ کے عقیدہ کی تلقین اس عہد کے سب سے آخری
اُپ نشد "سویت سوتیرا" (Svetasvatara Upnisad) میں پائی
جاتی ہے۔

ابتدائی ایک درجن اُپ نشدوں کا زمانہ ویدک عہد سے ملا ہوا ہے لیکن بعد کو جو
اُپ نشد بنے اور بنتے رہے ان کے زمانہ کو متعین نہیں کیا جا سکتا۔ اس زمانہ سے پہلے
جبکہ جین[1] اور بودھ دھرم کی بنیاد ڈالی جارہی تھی جو اُپ نشد ترتیب دیئے گئے ان میں
نجات کا ذریعہ جوگ یا سنیاس کو قرار دیا گیا ہے اور شِو اور وشنو کو سب سے بڑا
خدا مانا گیا ہے[2] اس زمانہ میں لوگوں کے اوپر دراصل دو قسم کے خیالات کا غلبہ تھا ایک کے
تحت دینی و دنیوی کام کسی مقصد کو مدنظر رکھ کر کئے جاتے تھے اور دوسرے کے تحت
رہبانیت کا غلبہ تھا جس کی وجہ سے ہر قسم کے کام سے دستکش ہو کر جنگلوں میں جا پڑنا
ضروری سمجھا جاتا تھا۔

گیتا کی تعلیم

سری کرشن جی نے گیتا میں درمیانی راستہ اختیار کر کے لوگوں کی صحیح
رہنمائی کی۔ انھوں نے بتایا کہ "ہر وہ جائز کام جو سماج کے مفاد کے
لئے ضروری ہے کرم ہے۔ قربانی، یگیہ، گیان، دھیان، دنیوی لین دین یہ سب کرم ہیں۔
کرم اسلئے نہ کرو کہ اس کا تم کو کچھ پھل ملیگا بلکہ اسلئے کہ وہ تم پر فرض ہے اور تمھیں کرنا ہے۔
انسان صرف کرتا (فاعل) ہے ضروری نہیں کہ وہ بھوگتا (یعنی ثمرات سے مستفید ہونیوالا)
بھی ہو۔ اسے ایک سپاہی کی طرح اپنے حاکم کے حکم کو (بے چون وچرا) ذاتی مفاد و
تعصبات سے بالاتر ہو کر صرف حق کو بول و بالا کرنے کے لئے انجام دینا چاہئے۔ "کرم صرف

---

[1] جین دھرم پُرانا ہی یہاں اس زمانہ سے مطلب ہے جبکہ مہاویر سوامی جین دھرم کو از سر نو ترتیب
دے رہے تھے۔

[2] انڈین فلاسفی صفحہ ۸۸ از پروفیسر ہریَنّہ

سماج کے اندر رہ کر ہو سکتا ہے اس کو چھوڑنے سے نہیں"[1]

اُپ نشدوں کے بعد

غرضکہ اس زمانہ میں جبکہ جین و بودھ دھرم کی بنیاد پڑنے والی ہے ہندو دھرم میں چار قسم کے مستقل گروہ پیدا ہو چکے تھے (۱) وہ جو کہ ویدک رسم و رواج اور مظاہر پرستی پر ایمان رکھتے تھے چنانچہ میتری اُپ نشد میں ویدوں کے مطابق قربانیاں کرنا ہی نجات کا سبب قرار دیگئی ہیں لیکن ویدک عہد کے رجحان کے بخلاف اس عہد میں یگیہ اور قربانیوں کا مقصد ذاتی مفاد یا دیوتاؤں کو خوش کرنا نہیں ہے بلکہ ان کا مقصود اپنے گناہوں کی تلافی ہے۔

(۲) دوسرا طبقہ "نظریہ جبر" پر اعتقاد رکھنے والوں کا ہے۔ ان کے نزدیک انسان اپنے فعل کا فاعل و مختار نہیں وہ بے بس و لاچار ہے۔ پرجاپتی یا برہما دُنیا کی تخلیق کا باعث ہے جس کو وہ اپنے منشاء کے مطابق بناتا اور بگاڑتا رہتا ہے اور یہ سلسلہ دن رات کی طرح مسلسل جاری رہتا ہے۔ یہ غالباً سنیاسیوں کا گروہ تھا۔

(۳) تیسرے گروہ کو اوتار پرست کہہ سکتے ہیں۔ ویدک عہد کے دیوتاؤں کی جگہ برہما، شوا اور وشنو نے لیلی شو کو ویدک عہد کے رُدّر دیوتا کا قائم مقام مانا گیا اور وشنو کو اندر دیوتا کا۔ یونانیوں کے حملہ کے وقت یہ دونوں دیوتا وجود میں آچکے تھے اور نہایت معزز و محترم سمجھے جاتے تھے۔ کچھ عرصہ کے بعد کرشن جی کو بھی وشنو نارائن کا اوتار مان کر پوجا جانے لگا۔[2] غالباً یونانیوں کے اثر سے دیوی و دیوتاؤں کے لئے مورتیاں و مندر بھی بننے لگے۔[3]

ع۱: تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو سر سید بھگوت گیتا ادھیائے ۲، اشلوک ۲۔۴، ۳۔۴، ۷۔۴، ۸۔۴ نیز ادھیائے ۳، اشلوک ۴، ۵، ۷، انڈین فلاسفی ص۱۱۶ تا ص۱۳۲۔ ع۲: انڈین فلاسفی ص۱۰۰، قرون وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب ص۱۰

ع۳: مندروں کا آغاز غالباً ۲۰۰ قبل مسیح ہوا۔ نگری (جو کہ چتور سے ۷ میل شمال میں ہے) کے کتبہ میں واسدیو اور سری کرشن کی پوجا کیلئے مندر بنانیکا ذکر ہے۔ مندر بنانے کی تاریخ میں یہ پہلی مثال ہے (قرون وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب ص۱۰)

۴۔ چوتھے طبقہ میں ویدوں کے مخالفین کا شمار ہے جس میں برہمن و غیر برہمن دونوں جماعتوں کے بعض مفکرین شامل ہیں مثلاً وِدُر، مہاویر سوامی اور گوتم بُدھ اگر غیر برہمن اور چھتری ہیں تو اَجاگر کا شمار برہمن عالموں میں ہے[1]۔ اس طبقہ کو دہریت پسند یا ملحد سمجھا گیا ہے۔

المختصر ویدک عہد کے ابتدائی تخیلات کی یہ چاروں ترقی یافتہ شکلیں ہیں جن کو ان کے متبعین نے فروغ دیا اور درشن ترتیب دیکر ان کی جڑوں کو مضبوط کیا۔

درشن مشہور ہے کہ گوتم رشی نے نیائے درشن مدوّن کیا۔ کناڈ نے ویشیسک، کپل نے سانکھیہ، پاتنجلی نے یوگ، جیمنی نے پُورو میمانسا اور بَدرایَن نے اُتر میمانسا ترتیب دیا۔ آخر الذکر کو ویدانت بھی کہتے ہیں۔ جینی، بودھ نیز دوسرے مادّہ پرستوں کے فلسفے ان کے علاوہ ہیں۔

نیائے۔ ویشیشک نیائے کے معنی ہیں "استدلال"۔ اِس فلسفہ کی رُو سے آتما فعلوں کا محرک ہے اور اشیاء کا جالب ہے۔ آتما ہی دنیا کا خالق ہے۔ آتما ہی کی طرح ایشور[2] میں بھی ارادہ، ادراک، انفصال، اتصال، مقدار وغیرہ موجود ہیں لیکن آتما کے بخلاف مستمر صورت میں۔

ویشیشک کے معنی ہیں "مختلف" یعنی دنیا کی تمام چیزیں ایک دوسرے سے مختلف ہیں حتی کہ دو ہم جنس اور ہم شکل چیزیں بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں۔ یہی اختلاف دراصل "تعین ذات" کا سبب ہے۔ مادہ قدیم اور لاثانی ہے اور دنیا کی تخلیق کا باعث

---

[1] انڈین فلاسفی ص ۱۰۲۔ [2] یہ امر مشتبہ ہے کہ آیا گوتم رشی اور کناڈ منی کسی اعلیٰ ہستی کے وجود کے قائل تھے کیونکہ سوتروں میں اس کا ذکر نہیں کیا گیا البتہ ان دونوں اسکولوں کے شارحین نے ایک عرصہ کے بعد اس امر کی کوشش کی ہے کہ اِس فلسفہ میں خدا کے وجود کو ثابت کیا جائے۔ چنانچہ "پرسست پد" (۵۰۰ء) اور اودراین (۹۸۴ء) وغیرہ نے بھاشیہ اور کسما نجلی لکھ کر حق ادا کیا (ملاحظہ ہو انڈین فلاسفی ص ۲۴۲)۔

دونوں فلسفوں نے عملی زندگی میں فرار کی راہیں تجویز کی ہیں۔ چونکہ مقصد زندگی المیہ وحزنیہ ہے اس لئے رنج سے چھٹکارا پانے کے لئے راحت کو بھی خیرباد کہنا پڑتا ہے۔ بودھ جی کی تعلیم یہ تھی کہ رنج سے نجات حاصل کرنے کے لئے "انا" یا "خودی" کے وجود ہی سے انکار کردیا جائے لیکن نیائے۔ ویشیسک کی تعلیم یہ ہے کہ وجود کو تسلیم کیا جائے اور اس کو اس قابل بنایا جائے کہ وہ رنج وراحت کے اثرات کو قبول نہ کرے اگر ایسا ہوگیا تو بس "اپ ورگ" یعنی موکش یا نجات کے لئے یہی کافی ہے۔

سانکھیہ۔ یوگ یقینی طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ سانکھیہ طرز فکر کا بانی کون ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ شاید اس کی بنیاد کپل رشی نے ڈالی۔ بدراین جنھوں نے اپ نشدوں کی تعلیمات کو مربوط کیا کہتے ہیں کہ سانکھیہ کا اپ نشدوں سے کوئی تعلق نہیں[1]۔ سانکھیہ اور یوگ یہ دونوں فلسفے دراصل ملحدانہ طرز فکر کے حامل ہیں[2] وہ خدا کو ایک کامل ومکمل انسان سے زیادہ نہیں سمجھتے۔ پراکرتی، پرش اور مادہ کائناتِ عالم کی تخلیق کا سبب ہیں۔ انسان کو یوگ (سمادھی وغیرہ) پر عمل کرنے سے نجات مل سکتی ہے[3]۔ تناسخ اور کرم کے یہ دونوں فلسفے بھی قائل ہیں۔

پوروميمانسا میمانسا شاستر عمل کا موید ہے اور وید کے عملی حصّہ کی تشریح کرتا ہے اس میں یگیہ اور قربانیوں کی تفصیلات اور ان کے رسومات کا ذکر ہے۔ وید ازلی وابدی ہیں۔ خدا کو ماننے کی ضرورت نہیں یگیہ اور قربانیاں ہی ذریعۂ نجات ہیں۔ آتما، برہم یا موجودات کی تشریح نہیں کی[4]۔ اس فلسفہ کو جیمنی نے ۲۰۰ء میں ترتیب

ع ۱:۔ انڈین فلاسفی ص ۲۶۷ ع ۲:۔ انڈین فلاسفی ص ۲۸۲، قرون وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب ص ۱۰۵

ع ۳:۔ یوگ کا مقصد ہر فلسفہ میں ایک دوسرے سے مختلف قرار دیا گیا ہے کہیں اس کا مقصد یہ ہے کہ انسان خدا کا درجہ حاصل کرے، کہیں نجات حاصل کرنے کیلئے، کہیں خدا سے وصل کیلئے، کہیں مادّہ کو جواس سے چھٹکارا حاصل کرنے کیلئے۔ (تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو انڈین فلاسفی ص ۲۸۴ تا ص ۲۹۸) = ع ۴:۔ قرون وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب ص ۱۱۱

دیا لیکن جن سوتروں پر اِس فلسفہ کا مدار ہے وہ یقیناً بہت پُرانے ہیں اِس کا ثبوت دھرم سوتر اور پاتنجلی (۱۵۰ ق۔م) کا جہا بھاشیہ ہے۔ سوتروں کی تعداد ۲۵۰۰ ہے جو ۱۲ ابواب اور ۶۰ فصلوں میں ایک ہزار عنوانات پر مشتمل ہیں۔ جیمنی کے میمانسا سوتر کی شرح "سابر سوامن" (۴۰۰ء) نے کی۔ سابر سوامن کے بھاشیہ پر پربھاکر (۶۵۰ء) اور کمارل بھٹ (۷۰۰ء) نے شرحیں لکھیں اور بعض باتوں میں ایک دوسرے سے اختلاف کیا۔ یہیں سے میمانسا کے دو اسکول بن گئے جن کے موازنہ کو بخوف طوالت نظر انداز کیا جاتا ہے۔[1]

ساتویں صدی عیسوی کے آخر میں جبکہ بودھ مت کا اثر کم ہوتا جا رہا تھا کمارل بھٹ نے جنم لیا۔ انھوں نے ویدک دھرم کے پرچار کی انتھک کوشش کی۔ اہنسا کے خلاف یگیوں میں قربانیوں کو ثابت کیا۔ قدیم رسم و رواج کو زندہ کرنے کی کوشش کی۔ بودھ بھکشوؤں کی راہبانہ زندگی کو غلط ثابت کیا۔ ان کو ویدوں کی تعلیمات کے رائج کرنے میں بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ یہ زمانہ ویراگ اور اہنسا کے رواج کا تھا۔ برہمن خود اگنی ہوتری اور یگیوں کو چھوڑ کر پُران کے دیوی دیوتاؤں کی پرستش کر رہے تھے ایسی حالت میں کمارل بھٹ کو اپنے مقصد میں اگر خاطر خواہ کامیابی نہ ہو سکی تو کچھ تعجب کی بات نہیں۔[2]

اثر میمانسا

ویدانت کے تمام اسکول اِس بات کا دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کا مآخذ اُپ نشد ہیں۔ اِس دعویٰ کو پورے طور پر تو نہیں البتہ جزوی طور پر صحیح کہا جا سکتا ہے۔ اُپ نشدوں کی تعلیمات زیادہ تر "توحید" کی حامل ہیں لیکن یہ توحید کس قسم کی ہے اِس کے حدود کوئی بھی متعین نہ کر سکا۔ مثلاً سانکھیہ کا پُرانا اسکول اُپ نشدوں

---

[1]:۔ قرون وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب ص ۴۲

[2]:۔ ہسٹری آف میڈیول انڈیا جلد دوم ص ۲۰۶ تا ص ۲۱۲ مصنفہ جی، وی، وید۔

قرون وسطی میں ہندوستانی تہذیب ص ۴۲ از پنڈت گوری شنکر ہیرا چند اوجھا

سے "ثنویت" ([illegible]) کو ثابت کرتا ہے لیکن بَدَرایَن (۵۰۰ء م) سانکھیہ اور پوربہ میمانسا دونوں شاستروں کے نظریے کا مخالف ہے۔ ادھر شنکراچاریہ اگر شیو کو دنیا کا سب سے بڑا دیوتا (خدا) تصور کرتے ہیں تو رامانج اور مادھواچاریہ وشنو کو۔[1]

شنکر آچاریہ جو "ادویت واد" کے بانی ہیں کیرالا (دکن) کے کالپی نام کے ایک گانوں میں ۷۸۸ء میں پیدا ہوئے۔ وہ ایک جید عالم اور فلاسفر تھے۔ انھوں نے کمارل بھٹ کی ناکامیابی کے اسباب کو سمجھ لیا تھا اسی لئے عوام کے ذہنی رجحانات کا خیال رکھتے ہوئے ویدک تعلیم کو پھیلانے کی کوشش کی۔ انھوں نے بودھوں کا استیصال ضرور کیا[2] لیکن چونکہ عوام کے دماغ پر بودھ کی تعلیمات "ویراگ و اہنسا" کا قبضہ تھا اسلئے انھوں نے راہبانہ طریق زندگی کو فائق بتایا۔ اسی طرح خدا کی ہستی کا اقرار کرتے ہوئے بھی دیوی دیوتاؤں کی پوجا کو جائز رکھا[3]۔ اس طرح ان کے فلسفہ "مایا واد"[4] اور "ادویت واد"[5] کو جو اصولاً بودھ فلسفہ کا نقش ثانی تھا بودھوں نے بھی پسند کیا اور ہندوؤں نے بھی بودھوں نے انھیں "کامل بودھ" کا لقب دیا اور ہندوؤں نے انھیں "جگت گرو" کا لقب دیکر عزت افزائی کی۔[6]

ویدانت کا دوسرا اسکول "وششٹادویت" کے نام سے مشہور ہے۔ اِس اسکول کی تعلیمات کا سراغ وید، گیتا، مہابھارت (نرائن کھنڈ) اور وشنو پران وغیرہ میں ملتا ہے۔ شنکراچاریہ نے جیو اور برہمن (ایشور) کے بارے میں جو نظریہ قائم کیا ہے اس کی تردید ۱۰۰۰ء ہی سے دکن میں شروع ہو چکی تھی لیکن رامانج نے (سنہ پیدائش ۱۰۱۶ء) شنکر جی کے نظریات کی مکمل طور سے تردید کر کے ویدانت کا نیا اسکول چلایا۔ چونکہ انھوں نے

ع۱ :۔ انڈین فلاسفی ص۳۳۶ تا ص۳۳۹

ع۲ :۔ شنکر دگ وجے میں ایک اشلوک ہے "ویدوں سے منحرف بودھوں کا خاتمہ کرنے کیلئے آپ نے اوتار لیا ہے"
(بحوالہ قرون وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب ص۷)

ع۳، ع۴ :۔ قرون وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب ۴۴۔ ص۴۳ ع۴، ع۵ :۔ ملاحظہ ہو انڈین فلاسفی ص۳۳۹ تا ص۳۸۲

ع۶ :۔ قرون وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب ص۴۲-۴۳-۴۴

اپنی تعلیمات میں شودروں کی نجات[۱] کا بھی راستہ متعین کیا ہے اسلئے ان کی تعلیمات عوام میں زیادہ مقبول ہوئیں۔

چارواک اسکول

زمانۂ زیر بحث میں جبکہ وید، برہمن، آرنیک، اُپ نشد، گیتا، پران و مہابھارت وغیرہ کسی نہ کسی کی تعلیم کی بنا پر مفکرین کی مختلف جماعتیں سنجیدگی کے ساتھ غور و فکر کر کے انسان کی نجات کے راستے متعین کر رہی تھیں اسی زمانہ میں ہندو سوسائٹی کے اندر ایک ایسی جماعت بھی تھی جس کو ملاحدہ سے بھی ایک درجہ زائد سمجھنا چاہئے۔ میتری اُپ نشد کے ایک سوتر میں برہسپتی کو ملحد استاد بتایا گیا[۲] ہے۔ یہ جماعت ویدوں کی کھُلی ہوئی دشمن تھی اس کو نہ خدا سے کوئی تعلق تھا اور نہ ضمیر کی آواز سے۔ شیشہ و ساغر اِس کا مقصودِ حیات، موت کے بعد نہ کوئی دوسری زندگی ہے اور نہ اعمال کی بنا پر سزا و جزا کا خطرہ۔ دُنیا میں دھرم کی کوئی حقیقت نہیں اور موکش (نجات) کا تو سوال ہی بیکار ہے۔ اصل چیز کام اور ارتھ ہے۔ دُنیا میں خوب گلچھرے اُڑاؤ اور ہر جائز و ناجائز کام کرکے نیز حلال و حرام کی قید اُٹھا کر عیش و مسرت[۳] کا سامان بہم پہونچاؤ یہ کام ہے۔ ارتھ یہ ہے کہ دنیوی منفعت حاصل کرنے کے لئے دوسروں کو بیوقوف بنا کر اپنا کام نکالو۔ مختصراً یہ

ح ۱:۔ شودروں کو چونکہ وید اور اُپ نشد نہیں پڑھائے جا سکتے تھے اسلئے وہ موکش یا نجات پانے کی مستحق نہیں تھے راما نج کو مجبوراً انکی نجات کیلئے ایک نیا طریقہ ایجاد کرنا پڑا اس طریقہ کا نام پرپتّ (प्रपत्ति) ہے یعنی اپنے کو خدا کے رحم و کرم پر چھوڑ دینا اور اپنی مرضی کو اسکی مرضی کے تابع بنا دینا۔ تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو انڈین فلاسفی

ح ۲:۔ تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو ستیارتھ پرکاش باب دوازدہم ص ۵۲۵، ص ۵۲۶

ح ۳:۔ مؤلف "قرونِ وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب" نے ص ۱۱۶ پر اس مفہوم کو ایک اشلوک کے ذریعہ ادا کیا ہے اشلوک یہ ہے

यावज्जीवं सुखं जीवेत, ऋणं कृत्वा घृतं पिबेत्।

भस्मीभूतस्य देहस्य पुनरागमनं कुतः ॥

ترجمہ:۔ جب تک حیات مستعار باقی ہے خوب عیش اُڑاؤ۔ قرض لیکر گھی پیو کیونکہ مرنیکے بعد دوبارہ زندگی کہاں بالفاظ دیگر بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست۔

کہ جس طرح ایران میں مزدکیوں کی جماعت تھی اسی طرح ہندوستان میں اِس جماعت کو سمجھنا چاہیے مسلمان مورخین نے ان کو اباحتی کے نام سے یاد کیا ہے[1]۔

ہندو دھرم پر ایک سرسری نظر زمانۂ قدیم میں جبکہ ویدک دھرم کا رواج تھا گیہ ہون اور قربانیوں کو ضروری سمجھا جاتا تھا ایشور کی مختلف ناموں سے پرستش ہوتی تھی۔ پرستش کے لئے نہ مندر بنے تھے اور نہ انکی ضرورت سمجھی جاتی تھی لیکن جیوں جیوں زمانہ گذرتا گیا برہمن دھرم ویدک یا آریہ دھرم سے دور ہٹتا چلا گیا۔ بت پرستی عام ہو گئی۔ البیرونی کے زمانہ میں وید کو مذہبی کتاب ضرور مانا جاتا تھا لیکن "بہت کم برہمن ایسے تھے جو وید کا مطلب سمجھتے ہوں۔ وہ منتروں کو رٹ لیتے تھے۔ ویشوں اور شودروں کو وید نہیں پڑھائے جاتے تھے"[2]۔ ویشوں نے عام طور سے جین یا بودھ دھرم قبول کر لیا تھا اس لئے ان کو یوں بھی ویدوں سے کوئی لگاؤ نہ رہا۔ ویدوں کی جگہ پرانوں کا رواج ہوا۔ یگیوں کی رسمیں جاتی رہیں۔ ان کی جگہ شرادھ اور ترپن کی رسمیں چل پڑیں۔ مندروں کے ساتھ ساتھ مٹھوں کی داغ بیل ڈالی گئی جو سراسر بودھوں کی تقلید تھی اسی طرح رتھ جاترا کی تقلید بھی بودھوں کے اثر کی وجہ سے ہوئی۔ پرانوں میں بودھوں اور جینیوں کی بہت سی باتیں بڑھا دی گئیں۔ برت (روزہ) کا رواج بھی بودھوں اور جینیوں کی وجہ سے ہوا۔ معمولی معاشرتی اصولوں کو مذہبی رنگ دیکر پرایشچت (کفارہ) کے طریقے ایجاد کئے۔ چنانچہ "اچھوتوں کے ساتھ کھانے، گندا پانی پینے، ممنوع اشیاء کے کھانے، حائضہ اور اچھوت کو چھونے، شودرہ عورت، گائے، برہمن اور چھتری کو قتل کرنے، شرادھ میں گوشت دیا جائے تو اسے نہ کھانے، بحری سفر کرنے، زبردستی کسی کو غلام بنانے، زنا، شراب خوری، گئو مانس کھانے، چوٹی کٹوانے"[3] وغیرہ وغیرہ میں

---

[1] :- اباحتی یا واماچاری یا وام مارگی کی تفصیلات کے لئے منسلکہ ضمیمہ ملاحظہ ہو۔

[2] :- قرون وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب صفحہ ۳۹۔ [3] :- قرون وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب صفحہ ۴۰، صفحہ ۴۱

کفارہ کی ادائیگی کا حکم ہے۔

فصل دوم

(ب) قرونِ وسطیٰ کے مخصوص مذہبی فرقے

شیو فرقہ شیو فرقہ مہادیو یا شیو کا پوجاری ہے۔ یہ عام طور سے "پاشوپت" فرقہ کہلاتا ہے۔ بعد کو اِس میں "لکوٹیش" فرقہ کا اضافہ ہوا جس کا آغاز "بھرگو منی" (۱۰۹۱ء) کی طرف منسوب ہے۔ ریاست بڑودہ میں "کاروان" ان کا مشہور تیرتھ گاہ ہے۔ لکوٹیش کے چار شاگردوں کوشک، گرگ، متر اور کورش کے نام پر چار فرقے اور بنے لیکن آج یہ فرقے مفقود ہیں۔

شیو فرقہ پرستش کے لئے چھ اصولوں پر عمل کرتا ہے، ہنسنا۔ گانا۔ ناچنا۔ بیل کی طرح باں باں کرنا، زمین دوز ہو کر نمسکار کرنا اور جپ کرنا۔ ان کا عقیدہ ہے کہ شخص اپنے اعمال کا پھل بھوگتا ہے۔ جیو قدیم ہے۔ جپ اور یوگ کے ذریعہ نجات حاصل ہوتی ہے۔ نجات پانے کے بعد آدمی چھوٹا شیو بن جاتا ہے۔

شیومت کے دو فرقے "کاپالک" اور "کالامکھ" بھی ہیں۔ یہ لوگ شیو کے بھیرو اور رُدّر روپ کی پوجا کرتے ہیں ان کے چھ نشان ہیں مالا، زیور، کنڈل، رتن، راکھ اور جنیؤ۔ آدمی کی کھوپڑی میں کھاتے ہیں ایک ڈنڈا اور شراب کا پیالہ ہاتھ میں رکھتے ہیں۔ اِس فرقہ کے سادھوؤں کی زندگی نہایت خوفناک اور قابلِ نفرت ہوتی تھی شنکر وِگ وجے، ہرش چیرت اور مالتی مادھو میں ان کا ذکر ہے۔[۱] ہندو دھرم میں شیومت کا پرچار زیادہ ہو رہا تھا۔ آخری دور میں جبکہ مسلمان درۂ خیبر سے ہندوستان میں داخل ہوئے اکثر راجہ شیو دیوتا کے پرستار تھے۔[۲] کشمیر میں شیو فرقہ کا زیادہ زور تھا۔

ع۱ : تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو ستیارتھ پرکاش باب ۱۱   ع۲ : قرونِ وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب ص۴۵

جس زمانہ میں آندھرا اور تامل دیس (جنوبی دکن) میں وشنو فرقہ فیبیوں کی مخالفت میں پھیل رہا تھا ایک نئے شیوی فرقہ کا آغاز ہوا۔ اس کا نام "لنگایت" ہے۔ اِس فرقہ کو بسو نامی پنڈت نے جینیوں کو مٹانے کے لئے جاری کیا۔ یہ شیویوں کا اصلاح یافتہ فرقہ ہے اِس کے خاص اصول یہ ہیں اہنسا پر عمل کرنا، چھوت چھات کی مخالفت کرنا، سنیاس اور تپ کو فضیلت نہ دینا، ہر شخص کو خواہ وہ سادھو ہی کیوں نہ ہو محنت کر کے روزی پیدا کرنے کی تلقین کرنا، بھکتی پر ایمان رکھنا، جنئو کی جگہ گلے میں شولنگ لٹکانا، گاتیری منتر کی جگہ "اوم نمہ شیوایہ" کا ورد رکھنا۔ دکن میں شیو فرقہ کا پرچار غالباً چھٹی صدی عیسوی سے جاری ہوا۔

وشنوی فرقہ[1] غالباً متھرا کے جادو بنشی راجاؤں نے بھگوت گیتا کے وراٹ روپ کے تذکرہ کو مدنظر رکھ کر واسدیو کی بھکتی کے لئے مورتی پوجا کا رواج ڈالا۔ میگاستھینز نے لکھا ہے کہ متھرا کے راجہ ہیرکلیس (سری کرشن یا واسدیو) کی پوجا کرتے تھے۔ سری کرشن کو وشنو نارائن کا اوتار مانا جاتا تھا۔ اِس فرقہ نے پہلے تو ویدک دھرم کی قربانیوں کو جاری رکھا لیکن بعد کو بودھوں کے اثر سے اہنسا پر عمل کرنے لگے۔ "پنج راتر سمہتا" کے مطابق جو اس فرقہ کی مخصوص مذہبی کتاب ہے یہ لوگ پنجگانہ مراسم کو مانتے تھے۔ مندروں میں جانا، پوجا کے لوازمات کو جمع کرنا، منتروں کا پڑھنا پوجا کرنا، اور یوگ کے ذریعہ دیدار الٰہی کو یقینی سمجھنا۔

بودھوں اور جینیوں کے چوبیس اوتاروں کی تقلید میں انھوں نے بھی وشنو دیوتا کے ۲۴ اوتاروں کو تسلیم کیا جن میں متسیہ، کورم، وراہ، نرسنگھ، وامن، پرشورام، رام، کرشن، بدھ اور کلنکی اوتار سب سے فائق تسلیم کئے گئے۔ دکن میں بھاگوت فرقہ (یعنی کرشن کے پجاریوں) کا آغاز نویں صدی عیسوی کے شروع میں ہوا لیکن رام کی پرستش کے لئے دسویں صدی عیسوی تک نہ مندر بنے تھے اور نہ ان کی پوجا شروع ہوئی تھی۔

---

[1]۔ قرون وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب صفحہ ۱۶ تا ۲۲؛ ستیارتھ پرکاش باب یازدہم؛ انڈین فلاسفی صفحہ ۳۸۳ تا ۴۱۳

لوگ دسہرہ نہیں مناتے تھے۔

دکن میں شنکراچاریہ کی تعلیم سے چونکہ "بھکتی مارگ" کو نقصان پہونچا تھا جسکی مخالفت ۱۰۰۰ء سے شروع ہو چکی تھی۔ رامانج نے "وششٹادویت" کی تعلیم کے ذریعہ وشنو بھکتی کی طرف لوگوں کو پھر مائل کیا۔ اگرچہ چول راجہ کی مخالفت کی وجہ سے ان کو اپنا وطن چھوڑنا پڑا لیکن دوسرے علاقوں میں مثلاً دوار سمدر اور میسور میں ان کو کافی پیرو مل گئے۔

رامانج کی تعلیم سے یہ واضح نہیں ہوتا کہ عابد و معبود ایک دوسرے سے جُدا ہیں یا نہیں۔ اس کی وضاحت مدھواچاریہ (پیدائش) (۱۱۹۷ء) نے پرماتما آتما اور پراکرتی کو مستقل وجود بتاکر کی۔ ان کے متبعین رام کے پوجاری ہیں۔

وشنوی پیشانی پر دو لکیریں ڈال کر بیچ میں ایک سیاہ خط کھینچتے ہیں اور ایک سرخ نقطہ لگاتے ہیں۔ ان کے کپڑوں پر اکثر سنکھ، چکر، گدا (سونٹا۔ لکڑی، لٹھ) وغیرہ کے نشانات بنے ہوتے ہیں۔ یہ لوگ کرناٹک میں زیادہ تھے۔

شکتی پوجا

پرماتما کے مختلف ناموں کو دیوتا مان کر ہی ان کی پرستش پر اکتفا نہیں کی گئی بلکہ ایشور کی مختلف شکتیوں اور دیوتاؤں کی مختلف بیویوں کی ایجاد کی گئی اور ان کی پوجا شروع کردی۔ چنانچہ براہمی، ماھیشوری، کوماری، ویشنوی، باراہی، نرسنگھی اور اندری ان سات شکتیوں کو "ماترکا" کہتے ہیں۔ بعض خوفناک شکتیوں کی ایجاد ہوئی مثلاً کالی، کرالی، کاپالی، چامنڈا، اور چنڈی ان کا تعلق کاپالکوں اور کالاکھوں سے ہے[1]۔ کچھ شکتیاں نفس پروری کی طرف لیجانے والی ایجاد ہوئیں مثلاً آنند بھیروی، تری پورسندری اور للتا وغیرہ۔ ان کے معتقدوں کے خیال کے مطابق دنیا کا وجود شیو اور تری پورسندری کی مقاربت کیوجہ سے ہوا[2]۔

---

[1] تا [2]:- قرون وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب ص ۳۱ تا ۳۳

بھیروی چکّر کے پیروؤں کو "شاکت" کہتے ہیں۔ ان کے دو فرقے ہیں کولک اور سمئن۔ کولک فرقہ دو گروہوں میں منقسم ہے۔ پُرانے کولک عورت کے عضو باطن کی تصویر کی اور نئے کولک اصلی عضو کی پرستش کرتے ہیں سمئن ان خرافات سے مجتنب ہیں۔ نویں صدی کے اواخر میں راج شیکھر نامی شاعر نے کرپور منجری میں کولک مت کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

"ہم منتر تنتر وغیرہ کچھ نہیں جانتے، نہ گرو کرپا سے ہمیں کوئی گیان حاصل ہے، ہم لوگ شراب خوری اور زنا کرتے ہیں اور اسی پرستش کے وسیلہ سے نجات حاصل کرتے ہیں۔ فاحشہ عورتوں کی تلقین کر کے ہم ان سے شادی کر لیتے ہیں۔ ہم لوگ شراب پیتے اور گوشت کھاتے ہیں، بھکشا (بھیک) سے ملا ہوا اناج ہماری معاش ہے اور مرگ چھالا ہی ہمارا پلنگ ہے۔ ایسا کول دھرم کسے پسند نہ آئیگا"[1]

سورج کے پوجاری ویدوں اور برہمنوں وغیرہ میں سورج کی پوجا کا ذکر ہے لیکن یقینی طور سے یہ نہیں بتایا جا سکتا کہ یہ پوجا شروع کب سے ہوئی۔ وراہ مہر نے اس کی پرستش کو ایرانی قوم "مگ" کیطرف منسوب کیا ہے۔ سورج کی مورتی دو ہاتھوں والی ہوتی ہے۔ دونوں ہاتھوں میں کنول، سر پر تاج، سینہ پر زرہ اور پیروں میں "فل بوٹ" ہوتے ہیں بھوشیہ پُران میں سورج کی پرستش کا آغاز راجہ سانب (جو کرشن اور جاموتی کا فرزند تھا) کے زمانہ سے ہوا۔ چونکہ ہندی پنڈتوں نے سورج دیوتا کا پروہت بننے سے انکار کر دیا تھا اسلئے راجہ نے ایران سے پروہتوں کو بلا کر انھیں سورج دیوتا کا پروہت بنایا۔ یہ لوگ مگ قوم سے تھے البیرونی کے زمانہ تک سورج دیوتا کے مندروں کے یہی لوگ پروہت تھے۔ راجپوتانہ میں ان کو سیوک اور بھوجک کہتے ہیں۔ سورج کے اب بھی سیکڑوں مندر ہیں مند سور کا مندر، ۴۳۳ء کا تعمیر شدہ اب بھی موجود ہے۔ ریاست سروھی میں "برمان" نامی موضع کا مندر سنگ مرمر کا ہے اس کے ستونوں میں نویں اور دسویں صدی عیسوی کی

---

[1] :- قرون وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب ص۳۱ تا ص۳۳

عبارت منقوش ہے۔ ملتان کے سورج دیوتا کے مندر کا ذکر ہوان سانگ سے لیکر البیرونی کے زمانہ تک ہر عربی سیاح نے کیا ہے جس کی تفصیل تالیف ہذا کی جلد اول میں موجود ہے۔

متفرق مورتیاں

برہما کی پوجا بھی ایک عرصہ سے جاری ہے لیکن شروع ہی[1] سے اس دیوتا کو شو اور وشنو کے مقابلہ میں اہم نہیں سمجھا جاتا تھا چنانچہ شو اور پاربتی کی مشترکہ مورتیوں میں برہما کو ان کا پروہت بتایا گیا ہے[1]۔ آگے چل کر ان کے بھگتوں نے برہما کو بھی شو اور وشنو کی طرح ایک الگ دیوتا مان لیا۔ اور دونوں دیوتاؤں کی طرح برہما کی تعریف میں بھی پُران تصنیف کرلئے گئے۔ اِس زمانہ میں گنیش اور شیو کے بیٹے اسکند کی پوجا کا بھی رواج جاری تھا۔ قرون وسطیٰ میں ہندوؤں کے اندر بُت پرستی کی وبا اس کثرت سے پھیلی ہوئی تھی کہ لوگوں نے گرہ، نچھتر، صبح، دوپہر، شام وغیرہ نیز ہتھیاروں تک کی مورتیاں بنا ڈالی تھیں[2]۔ لیکن آخر میں صرف پانچ دیوتا رہ گئے سورج، وشنو، شو، رُدر اور دیوی۔ ان کی مشترکہ مورتیاں بھی بننے لگی تھیں جو "پنچایتن" کہلاتی ہیں[3]۔ جھالرا پاٹن ریاست کے پدم ناتھ نامی شیو مندر کے پیچھے طاق میں ایک ایسی مورتی ہے جس میں برہما، شو اور وشنو تینوں ملے جلے بیٹھے ہیں۔ یہ مندر غالباً دسویں صدی عیسوی کا بنا ہوا ہے[4]۔

بودھ دھرم

مہاتما گوتم بدھ کپل وستو کے راجہ شدھودن کے بیٹے تھے۔ ان کی تاریخ پیدائش و سال رحلت کے بارے میں مورخین میں اختلاف ہے غالباً ۵۶۷ ق۔م میں پیدا ہوئے اور ۴۸۰ ق۔م میں وفات پائی۔ مہاتما بودھ نے اپنی تعلیمات کو کتابی صورت میں ترتیب نہیں دیا اس کی وجہ سے ان کی باتیں محفوظ نہیں[5] رہ سکیں چنانچہ ان کی وفات کے کچھ ہی دن بعد جب ان کے ایک شاگرد "پورانہ" کو راج گرہیہ میں دعوت دیکر بلایا گیا تو انھوں نے لوگوں کو بعض اُن اصولوں کی اتباع کرتے ہوئے دیکھا جن کی تعلیم مہاتما جی نے نہیں دی تھی[5]۔ یہ اختلاف دن بدن بڑھتا گیا یہاں تک کہ راجہ ہرش کے زمانہ

عہ۱ تا عہ۴۔ قرون وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب ص ۲۹ تا ص ۳۸۔ عہ۵۔ انڈین فلاسفی ص ۱۳۴

تک بودھوں کے ۸ افرقے بن گئے جن میں "ہین یان" اور "مہایان" دو زیادہ مشہور ہیں

مہاتما بودھ نے دیسی زبان (پالی) میں جن مخصوص عقائد کی تلقین کی وہ یہ ہیں:

(۱) زندگی مایۂ غم ہے۔ مسرتوں کے حصول کی تمنا کرنا گویا اسباب غم کا فراہم کرنا ہے اسلئے غم سے نجات پانے کے لئے خواہشات کا ترک کر دینا ہی انسب ہے۔ (۲) دنیا کی حقیقت وہم وخیال سے زائد نہیں۔ یہاں کسی چیز کا وجود نہیں۔ وجود تو جب ہو جبکہ وہ (شے) مستقل بالذّات ہو۔ وہ تو ہر لمحہ تبدیل ہو رہی ہے پھر اس کا نام کیونکر رکھا جا سکتا ہے جبکہ وجود کے لئے نام کی ضرورت ہے۔ اس طرح جس چیز کو ہم دیکھتے ہیں وہ "ہے" بھی اور "نہیں" بھی ہے۔ اِسی اصول کو بودھ کے بعد یونانی حکیم ہیرا کلیٹس نے بتایا اور موجودہ زمانہ میں برگسن نے اپنایا۔ (۳) کائنات عالم کے ذرّہ ذرّہ کی بقا وفنا ضرورت زمانہ پر مبنی ہے۔ نہ اِسے کسی نے بنایا اور نہ مٹا سکتا ہے۔ (۴) جہالت (بے خبری) آواگون کا سبب ہے کیونکہ جہالت کی وجہ سے خواہشات پیدا ہوتی ہیں۔ خواہشات سے "فعل" سرزد ہوتا ہے جس کی وجہ سے انسان ایک زندگی سے دوسری زندگی اختیار کرتا ہے۔ آواگون کا یہ چکر صحیح علم اور ترکِ خواہشات سے ٹوٹ سکتا ہے (۵) مرنے کے بعد نجات حاصل کرنے کا نام "نروان" نہیں۔ نروان تو اسی زندگی میں حاصل ہو سکتا ہے۔ اس کی تعریف یوں کی گئی "نروان اس کیفیت اور حالت کا نام ہے جس کو ہم طمانیت قلب کہتے ہیں"۔ یہ طمانیت خواہشات کے مٹانے اور انکے پیدا نہ ہونے دینے سے حاصل ہو سکتی ہے۔ (۶) آواگون مرنے کے بعد دوسری زندگی کا نام نہیں کیونکہ مرنے کے بعد آدمی دوبارہ پیدا نہیں ہوتا بلکہ صحیح آواگون اس تبدیلی کا نام ہے جو انسان کے اندر ہر لمحہ ہوتی رہتی ہے۔ اِسی چکر سے چھٹکارا حاصل کرنے کا نام نروان ہے۔ (۷) خودی (اہنکار) کی تربیت کے لئے آٹھ باتیں ضروری ہیں یعنی صحیح عقیدہ، صحیح ارادہ، صحیح گفتگو، صحیح عمل، صحیح زندگی، صحیح

کوشش، صحیح خیال اور صحیح رجحان۔ اس کے لئے شب بیداری اور ریاضت وعبادت بیکار ہیں۔ (۸) اہنسا پرم دھرم ہے، یگیہ، ہون اور دیگر ویدک رسومات نیز ورن آشرم (ذات پات) کے قیود غلط ہیں۔

مہاتما بودھ کو اپنے دھرم کے پرچار کرنے میں اس عہد کے چھتری راجاؤں سے بڑی مدد ملی۔ ویشوں اور شودروں نے بھی اس کو خوشی خوشی قبول کر لیا کیونکہ ویدک دھرم کے بخلاف اِس دھرم میں ان کے لئے نجات کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ ادھر بودھ بھکشو اور بھکشنی کی جماعتوں نے چل پھر کر بودھ دھرم کی خوب اشاعت کی۔ بعد کو مہاراجہ اشوک کی تبلیغی سرگرمیوں نے اِس کو ہندوستان سے باہر تبت، چین، ملایا، لنکا وغیرہ میں فروغ دیا۔ بودھ دھرم کی تعلیمات چونکہ دیسی زبان پالی میں تھیں اِس لئے برہمن مت کی تعلیمات کے بخلاف جو سنسکرت میں تھیں زیادہ سریع الفہم تھیں۔ عوام پر اس کا اچھا اثر پڑا۔ اور تھوڑے ہی عرصہ میں بودھ مت ہندوستان کے شرق وغرب میں پھیل گیا۔

لیکن یہ حالت تادیر قائم نہیں رہ سکی۔ موریہ خاندان کے آخری راجہ برہدرتھ کے مارے جاتے ہی برہمنوں کو دوبارہ عروج حاصل ہونا شروع ہو گیا۔ پشیہ متر نے جو مذہباً برہمن تھا برہدرتھ کو مار کر برہمنی مت کو فروغ دیا اور شاید بودھوں پر سختیاں بھی کیں[۱]۔ اِس (شنگ) خاندان کے بعد پاٹلی پتر کے تخت پر بالعموم برہمنی مت کے پرستاروں کا قبضہ رہا اس لئے برہمن مت کو شاہی دھرم بننے میں نہایت آسانی ہوئی۔ اِس کے علاوہ بودھ مت کے زوال کے اور بھی کئی اسباب ہیں مثلاً یہ کہ بودھوں میں بیشمار مذہبی اختلافات پیدا ہو گئے۔ بھکشو اور بھکشنی عیش ومسرت میں پڑ کر اپنے فرائض کو بھول گئے۔ اِدھر ہندو عالموں نے اپنے ترمیم شدہ ہندو مت کی دل وجان سے تبلیغ

---

[۱]۔ قرون وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب ص ۷ تا ص ۱۔

کی۔ اور مہاتما بودھ کو وشنو کا نواں اوتار مان کر اور اہنسا کے اصول کو قبول کر کے بودھ رعایا کے دلوں پر قبضہ کیا۔ اُدھر بودھ علماء کے غلط طرز عمل نے بودھ مت کو زندہ درگور کر دیا۔ انھوں نے یہ دیکھ کر کہ ہر گرہست سنیاس نہیں لے سکتا ہندوؤں کے بھگتی مارگ کا سہارا لیا اور بودھ کو معبود مان کر پرستش کرنے لگے جس کی وجہ سے وہ اپنے مذہب سے بہت دور جا پڑے۔ مہایان طبقہ کے علماء نے تو مہاتما بودھ کے تعلیم کردہ "کرم وسنیاس" کے نظریات ہی کو بدل ڈالا[1] لیکن سب سے بڑی غلطی جو اُن سے سرزد ہوئی وہ یہ تھی کہ انھوں نے مذہبی کتب کو سنسکرت میں ڈھال دیا جو عوام الناس کی زبان نہ تھی نتیجہ یہ ہوا کہ عوام مہاتما بودھ کی تعلیمات سے کورے رہ گئے اور بودھ علماء عوام میں ایک ایسی وسیع خلیج حائل ہو گئی جو پھر پاٹی نہ جا سکی اور عوام توہمات کا شکار ہو کر رہ گئے۔

بدھ مت کے زوال کا ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ باختر سے نکلے ہوئے یونوں (یونانیوں) نے ہندوستان میں داخل ہو کر یونانی بت پرستی کے ڈھنگ پر بودھ مت اور ہندو مت کو رواج دیا۔ ان میں سے بعض گروہ بودھ مت کے پیرو تھے جیسے راجہ مناندر وغیرہ اور بعض ہندو مت کے جیسے ہیلیوڈورس وشنو بھاگوت تھا۔ چونکہ ان کے آبائی طریق عبادات میں مندروں کی تعمیر اور ان کے اندر مورتیوں کا قیام ضروری تھا اسلئے ہندوؤں اور بودھوں نے اپنے فاتحین کی اتباع میں غالباً ہندوستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ اپنے دیوی دیوتاؤں کے لئے مندر اور مٹھ تعمیر کئے اور اس طرح بودھوں اور ہندوؤں میں بلحاظ بت پرستی بہت زیادہ مماثلت پیدا ہو گئی۔

اِس کے ساتھ ساتھ راجپوتوں کا عروج بھی بدھ مت کے زوال کا ایک سبب ہے۔ راجپوتوں نے جو نسلاً مغلوں اور تاتاریوں کے جنگجو قبائل (ستک، سیتھین، ہن وغیرہ) سے تعلق رکھتے تھے ہندوستان میں آ کر بودھ مت کی بجائے ہندو مت کو ترجیح دی اور اسی کی

---

[1] :۔ انڈین فلاسفی صـ ۲۲۳، صـ ۲۲۴

تعلیمات کو عام طور سے قبول کیا۔ راجپوت راجہ جنگ وجدل سے اپنے کو بچا نہیں سکتے تھے
اس کے علاوہ وہ شکار کے بھی شوقین تھے چونکہ ان کو بودھ مت کے بجائے ہندو مت میں
ان دونوں چیزوں کے جواز کا ثبوت مل سکتا تھا اس لئے انھوں نے برہمنی مت کی سرپرستی
کی اور اسی کو قبول کیا۔

بودھ مت کے زوال اور جدید برہمنی مت کے ترتیب دینے میں مسلمانوں کا بھی ہاتھ
ہے۔ انھوں نے سندھ میں بحیثیت فاتح اور دکن میں بحیثیت تاجر داخل ہونے کے بعد
اسلامی "توحید" کے اصول و عقائد کی اشاعت و ترویج کر کے بودھوں اور ہندؤں دونوں
کے مذہبی عقائد میں تزلزل پیدا کر دیا اور اس طرح دونوں اپنا قدیم راستہ چھوڑنے
یا اس میں تبدیلی پیدا کرنے پر مجبور ہو گئے۔ آج مورخین کے لئے یہ امر قابلِ غور ہے
کہ مسلمانوں کی تعلیمات کا اثر سری شنکر اچاریہ اور راما نج سوامی نیز لنگایت طبقہ پر
کہاں تک پڑا ہے۔

جین دھرم جین سنسکرت کے لفظ "جے" یعنی فتح سے مشتق ہے۔ وہ شخص جس نے اپنی
خواہشات پر قابو پالیا ہے "جینی" ہے۔ وردھ مان یا مہاویر سوامی
اُن رشیوں میں سب سے آخری ہیں جنھوں نے جین مت کو چلایا تھا۔ اُن سے گذشتہ
تیئسویں رشی کا نام "پارس ناتھ" ہے جو ۸۰۰ ق م ہوئے ہیں۔ مہاویر سوامی کا جنم ۵۴۰
ق م میں ویسالی (مگدھ) کے مقام پر چھتری بنش میں ہوا۔ باپ کا نام سدھارتھ
اور ماں کا نام ترسال تھا جو ودیہہ کے راجہ کی بہن تھیں۔ ماں باپ کے مرنے کے بعد
۲۸ سال کی عمر میں جوگ لیا۔ ۱۲ سال تک سخت ریاضتیں کیں۔ آخر میں گیان حاصل ہوا
اور اپنی بقیہ عمر اپنی تعلیمات کی اشاعت میں گذار دی۔ افسوس ہے کہ مہاتما بودھ کی
تعلیمات کی طرح ان کی تعلیمات بھی محفوظ نہ رہ سکیں۔ کہتے ہیں کہ ان کی تعلیمات کو پانچویں
صدی عیسوی میں گویا ایک ہزار سال کے بعد قلمبند کیا جا سکا[1]

---

[1] انڈین فلاسفی ص۱۵۶، قرون وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب ص۱۲۱۔

جین دھرم کے اصول وعقائد مجملاً یہ ہیں (۱) کائنات عالم دو حصّوں میں منقسم ہے۔ ذی روح اور غیر ذی روح۔ ہر ذی روح (انسان) کے اندر دو قوتیں ہیں روحانی و مادّی۔ زندگی کا مقصد یہ ہے کہ مادّیت کو دبا کر روحانیت کو ترقی دیجائے یہاں تک کہ انسان الوہیت کا درجہ حاصل کرلے۔ اس عہد کے حکماء ہند کا یہ نظریہ تھا کہ انسانی فطرت تبدیل نہیں ہوسکتی لیکن مہاویر سوامی کا کہنا یہ ہے کہ فطرت گھٹ بڑھ سکتی ہے کیونکہ جتنی روحانیت ترقی کرے گی اُتنی ہی فطرت میں تبدیل ہونے کی صلاحیت پیدا ہوگی[1] (۲) روح کے ساتھ جب تک فعل کا تعلق رہیگا اسے بار بار عالمِ شہود میں آنا پڑے گا۔ لیکن جب وہ الوہیت کا درجہ حاصل کرے گا تو آواگون کا یہ سلسلہ ختم ہوجائیگا۔ اِس کے لئے انسان کو پانچ منزلوں سے گذرنا پڑتا ہے اَسرُو، بندھ، سُانُوَر، نِرجر اور مُوکش (۳) نجات کا واحد ذریعہ رُوح کی حقیقت سے باخبر ہونا ہے یعنی صحیح علم حاصل کرنا (۴) عالم قدیم اور غیر محدود ہے۔ زمانہ، عادت، تعین، فعل اور حرکت ان پانچ علتوں سے مادّہ آپس میں ملتا ہے اور دُنیا وجود میں آتی ہے۔ خدا اِس کا خالق نہیں۔ (۵) سیلاب آتا ہے اور دنیا فنا ہوجاتی ہے لیکن دوبارہ جنم لینے کے لئے۔ پہاڑ پر ہر جنس کا ایک جوڑا باقی رہجاتا ہے اِسی سے دُنیا پھر آباد ہوتی ہے[2]۔ (۶) صحیح علم، صحیح عقیدہ اور صحیح چلن یہ تینوں باتیں زندگی کا جوہر ہیں۔ سادھو کے لئے ان کے علاوہ پانچ مزید باتوں پر عمل پیرا ہونا چاہئیے، اہنسا، حق گوئی، چوری سے اجتناب، برہم چریہ، اور ترک دُنیا۔ عام گرہست لوگوں کو برہم چریہ اور ترک دُنیا ضروری نہیں اس کی جگہ انھیں پاکباز رہنے اور خواہشات کو محدود کرنے کا عہد کرنا پڑتا ہے۔ (۷) ویدک رسوم و رواج اور ذات پات کے قیود چونکہ خود ساختہ ہیں اِس لئے انھیں نہیں ماننا چاہئیے۔

ع۱:۔ انڈین فلاسفی ص ۱۵۸

ع۲:۔ حضرت نوح علیہ السلام کے طوفان کی روایات مدنظر ہیں (مؤلف)

مہاویر سوامی کے انتقال کے بعد ان کی تعلیمات ایک عرصۃ تک سینہ بہ سینہ چلی آئیں۔ جن میں یقیناً تغیر ہوا ہوگا۔ چنانچہ جینیوں کے "دگمبر" طبقہ کے سادھو برہنہ رہتے ہیں، عورتوں کی نجات کے قائل نہیں۔ تیرتھنکروں کی معمولی طور سے پوجا کرتے ہیں لیکن "سوتیامبر" طبقے کے سادھو سفید یا زرد کپڑے پہنتے ہیں اور تیرتھنکروں کی پھول، دھوپ اور زیورات سے پوجا کرتے ہیں۔ بُت پرستی میں یہ کسی سے کم نہیں۔ سوامی دیانند سرسوتی نے تو جینیوں ہی کو بُت پرستی کا موجد قرار دیا ہے[1]۔ جینیوں نے بودھ بھکشوؤں کی طرح اپنے مذہب کی تبلیغ میں سرگرمی کا اظہار نہیں کیا پھر بھی دکن، راجپوتانہ اور گجرات وغیرہ میں ان کو کافی فروغ حاصل ہوا۔ پانڈیہ اور چول راجاؤں نے جین گروؤں کی جی کھول کر مدد کی۔ اُن کے لئے دان دئے اور مندر اور مٹھ بنوائے لیکن بعد کو شیومت قبول کرنے پر چول راجاؤں نے جینیوں کو زک دینے کے لئے (۱۰۰۰ء تا ۱۲۰۰ء) پُر زور کوششیں کیں۔ ہوئسل خاندان کی راجاؤں نے وشنومت اختیار کرکے جین دھرم کو نقصان پہونچایا۔ اسی طرح اُڑیسہ کے راجاؤں نے شیومت کا اثر قبول کرکے جینیوں پر مظالم کئے[2]۔ جس زمانہ میں دکن کے اندر جین مت کس مپرسی کے عالم میں تھا اسی عہد میں راجپوتانہ، مالوہ اور گجرات کے اندر اس کی ترقی ہوئی حالانکہ راجہ یہاں بھی شیومت کے ماننے والے تھے جن پر جین آچاریہ "ہیم چندر" کا کافی اثر تھا۔

فصل سوم

(ج) عہد کمپنی کی شروع تک بودھ و برہمن الگ الگ پہچانے جاتے تھے

جلد اوّل میں سندھ کے حالات تحریر کرتے وقت اِس امر کی وضاحت کی جا چکی ہے

---

(۱):۔ ستیارتھ پرکاش صفحہ ۴۲۳ مولفہ سوامی دیانند سرسوتی۔ (۲):۔ دوسری صدی عیسوی میں کلنگ کے

(باقی صفحہ ۱۱۴ پر)

کہ اس وقت جبکہ مسلمانوں نے سندھ میں پہلی مرتبہ قدم رکھا ہے تو رعایا بہا تما بودھ کی پرستار تھی جبکہ حکومت برہمن مت کی پیرو اور طرفدار تھی۔ یہ بھی بتایا جا چکا ہے کہ برہمنوں اور بودھوں میں مذہبی و سیاسی تفوق حاصل کرنے کی خاطر مناظرہ و مکالمہ نیز جنگ آزمائی کی شکل قائم تھی لیکن مسلمانوں کی آمد نے دونوں جماعتوں کی جنگ آزمائی کو ختم کر کے اُن کے مذہبی مناظروں میں خود بھی شرکت کی اور اپنے سیاسی تفوق نیز مذہبی دلائل کی صداقت کی وجہ سے فریق غالب ثابت ہوا۔ پھر بھی بودھوں اور برہمنوں کی ذاتی کشمکش ایک عرصہ تک جاری رہی اور اس کشمکش اور زد و خورد کا سلسلہ شہاب الدین محمد غوری کے حملوں تک (یعنی ۷۰۰ء تا ۱۲۰۰ء گویا ۵۰۰ سال تک) ملک کے کسی نہ کسی حصہ میں جاری رہا۔ چنانچہ عرب سیاحوں کے بیانات کے بموجب عہد یمینی کے شروع زمانہ تک یہ دونوں گروہ ایک دوسرے سے الگ الگ پہچانے جاتے تھے۔

ابن ندیم (۳۴۹ھ / ۹۶۰ء) نے اپنی کتاب الفہرست میں ہندوستان کے بہت سے فرقوں کا حال لکھتے لکھتے ایک فرقہ بکرنیقیہ یا بیکرجین یا بھکشو کا حال بھی تحریر کیا ہے جس کے بودھ ہونے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ اسی طرح ابن ندیم کے ہمعصر یا قریبی عہد کے ایک عرب متکلم مطہر بیت المقدسی نے ۳۷۵ھ / ۹۸۵ء میں اپنی کتاب البدء والتاریخ میں لکھا ہے کہ "ہندوستان میں ۹۰۰ نو سو فرقے ہیں لیکن ان میں سے صرف ۹۹ کا حال معلوم ہے اور یہ سب ۷۲ مذاہب کے اندر ہیں اور یہ بھی چار اصولوں کے اندر محدود ہیں۔ اور ان کی اصل موٹی تقسیم دو ہے سمنی (بودھ) اور برہمنی۔ سمنی یا تو خدا کے بالکل قائل نہیں یا ہیں تو ایسے خدا کے

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۱۳:- راجہ کھارویل نے جین دھرم کے پرچار کی کوشش کی لیکن اس کے بعد کسی اور راجہ نے اس کی طرح دلچسپی نہیں لی۔ بلکہ اڑیسہ میں جینیوں کو مصائب برداشت کرنا پڑے (قرون وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب ص۱۵)۔ ۲:- یہ چار اصول وہی ہیں جن کا راقم الحروف نے ذہنی ارتقاء کے سلسلہ میں ذکر کیا ہے۔ لیکن ڈاکٹر سید سلیمان صاحب ندوی نے اس سے مراد ذاتیں لی ہیں (ملاحظہ ہو عرب و ہند کے تعلقات ص۲۰۶ تا ۲۱۰

جو بے اختیار ہے۔ برہمنی مذہب والوں میں تین فرقے ہیں۔ ایک توحید اور سزا و جزا کا قائل ہے مگر رسالت کا نہیں۔ دوسرا تناسخ کے اصول پر جزا و سزا کو مانتا ہے لیکن نہ توحید کا قائل ہے اور نہ رسالت کا"۔ اس کے بعد کہتا ہے کہ "گائے ان کے نزدیک ماں کی طرح معزز و محترم ہے اس کے جان لینے کی سزا ان کے یہاں قتل ہے" پھر نیوگ و بت پرستی کے مسائل کو بیان کیا ہے۔ مطہر کے بیان کی تصدیق مذاہب عالم کے مشہور محقق عبدالکریم شہرستانی (۴۶۹ھ / ۱۰۷۶ء تا ۵۴۹ھ / ۱۱۵۴ء) اور ابوریحان بیرونی (۳۶۲ھ / ۹۷۲ء تا ۴۴۰ھ / ۱۰۴۸ء) نے بھی کی ہے[1] مذکورہ بالا بیانات کو اگر سلیمان تاجر[2] (۲۳۷ھ / ۸۵۱ء) اور ابوزید سیرافی (۲۶۴ھ / ۸۷۸ء) کے بیانات سے ملا کر پڑھئے تو ہندوستان کے ان دو مشہور برہمنیہ اور سمنیہ گروہوں کے مظاہر پرست عوام کی توہم پرستی کا پتہ چلتا ہے۔ سلیمان تاجر اپنے سفرنامہ میں ہندوستان کے بہت سے قوانین کا ذکر کرتے ہوئے ملزم کی برأت کے سلسلہ میں گرم لوہے کے تھامنے اور کھولتے ہوئے پانی میں ہاتھ ڈالنے کا حال تحریر کرتا ہے۔ اس کے بعد لکھتا ہے "یہاں (دکن میں) یہ بھی قاعدہ ہے کہ جب راجہ مرتا ہے تو اس کے ساتھ اس کی سب رانیاں جل کر ستی ہو جاتی ہیں لیکن یہ صرف خواہش پر موقوف ہے کوئی جبر نہیں ...... لوگ بودھوں کے مجسمے پوجتے ہیں"[3]

ابوزید سیرافی[4] نے واقعات کو نہایت تفصیل کے ساتھ قلمبند کیا ہے۔ یہ بھی ایک عرب تاجر تھا اور چین سے تجارت کرنے کے سلسلہ میں اکثر ہندوستان آتا جاتا رہا ہے۔ لکھتا ہے "۱۔ ہندوستان اور چین دونوں جگہ تناسخ کا اعتقاد اتنا پختہ ہے کہ لوگ جان

ع۱: ۔ کتاب الہند باب یازدہم صفحہ ۱۴۴ مترجمہ سید اصغر علی۔

ع۲ و ع۳ و ع۴: سلیمان تاجر اور ابوزید سیرافی پر مفصل نوٹ جلد اول میں تحریر کئے جا چکے ہیں۔ اعادہ کی ضرورت نہیں۔ یہاں پر صرف اتنا بتا دینا کافی ہوگا کہ سلیمان تاجر عرب کا سب سے پہلا سیاح ہے جو بسلسلۂ تجارت عراق سے چین تک بارہا سواحل ہند سے گذرا ہے۔ اس کا سفرنامہ سلسلۃ التواریخ کے نام سے ۱۸۴۵ء میں پیرس سے شائع ہو چکا ہے۔ (مولف)

دے دینا معمولی بات سمجھتے ہیں۔ ۲۔ ولبھ رائے اور دوسرے راجاؤں میں کوئی نہ کوئی ایسے بھی ہوتے ہیں جو جان بوجھ کر اپنے آپ کو آگ میں جلا ڈالتے ہیں۔ ۳۔ جب راجہ مرتا ہے تو اس کے سب فدائی بھی (جو تین سو یا چار سو سے کم نہیں ہوتے) اس کے ساتھ آگ میں جل جاتے ہیں۔ ۴۔ اس کے بعد بھکشو یعنی بودھ فقیروں کا ذکر کرتا ہے جو ننگے بدن، ننگے سر، بال اور ناخون بڑھائے اور گلوں میں انسانی کھوپڑیوں کی مالا پہنے دیس بدیس پھرتے رہتے ہیں۔ ۵۔ ساتھ ہی ساتھ اس نے نہایت کراہیت کے ساتھ جنوبی ہند کی دیو داسیوں کا بھی ذکر کیا ہے[1]"۔ لیکن شمالی ہند میں دیو داسیوں کو مندر کے اندر رکھے جانے کے رواج کا پتہ سب سے پہلے ابن رستہ (۲۹۰ھ / ۹۰۳ء) نے دیا ہے[2]۔ بت پرستی یا مورتی پوجا کے فلسفہ پر بحث کرتے ہوئے جو رائے البیرونی نے ظاہر کی ہے وہ بھی یہاں پر قابلِ غور ہے۔ لکھتا ہے کہ "یہ مورتی پوجا صرف ہندوستان کے عوام اور جاہلوں کا دھرم ہے ورنہ پڑھے لکھے ہندو اس کو معیوب سمجھتے ہیں[3]"۔

(د) سمنیہ اور برہمنیہ مل کر ایک ہو گئے

پچھلے صفحات میں یہ بتایا جا چکا ہے کہ وہ کون سے اسباب تھے جن کی وجہ سے ان دونوں گروہوں میں ایک ہونے کی صلاحیت پیدا ہوئی لیکن یہ بتانا ذرا مشکل ہے کہ یہ دونوں کس زمانہ میں ایک ہو کر ہندو کہلانے لگے۔ ہمارے پاس تاریخی

ع۱:۔ عرب و ہند کے تعلقات ص۳۱ تا ص۳۳ از ڈاکٹر سید سلیمان صاحب ندوی۔ ع۲:۔ اعلاق النفیسہ ص۱۳۵ تا ص۱۳۶ لیڈن، تاریخ سندھ ص۲۰۰ تا ص۲۰۴ مؤلفہ مولانا سید ابوظفر صاحب ندوی۔ ڈاکٹر سید سلیمان صاحب ندوی نے اس روایت کا پہلا راوی بشاری مقدسی (۳۷۵ھ) کو مانا ہے (ملاحظہ ہو عرب و ہند کے تعلقات ص۲۱۳)

ع۳:۔ کتاب الہند باب یازدہم ص۱۴۴ مترجمہ سید اصغر علی۔

شواہد کی کمی ہے افسوس ہے کہ ہمارے ہندو بھائیوں نے اپنی تاریخ مُدوّن کرنے کی طرف کوئی توجہ نہ کی اس لئے مورخ کو ان کے حالات جاننے کے لئے بہت مشکل کا سامنا ہوتا ہے۔ البتہ اُن کی مذہبی کتب نیز بعد کی تصنیفات رامائن و مہابھارت اور پُران وغیرہ سے جستہ جستہ حالات کا پتہ لگتا ہے۔ اس لئے مورخ کو انھیں کتابوں کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ اور بے جوڑ، غیر مسلسل نیز ناقابلِ قبول واقعات سے اصلیت کا اندازہ لگانا پڑتا ہے۔

ظن غالب یہ ہے کہ یہ دونوں معاند فرقے اپنے اعمال و عقائد کی یکرنگی کی وجہ سے ایک دوسرے سے قریب تر ہوتے چلے جا رہے تھے۔ اور صرف ناموں کا فرق باقی رہ گیا تھا۔ بعد کو درۂ خیبر سے آنے والے مسلمان ترکوں کی پیہم یورشوں کی وجہ سے وہ آپس میں سیاسی و مذہبی صلح کرنے پر مجبور ہو گئے اور یہ فرق بھی جاتا رہا۔ آنریبل ڈاکٹر ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر جنھوں نے ہندوستان کا گزٹیر مرتب کیا ہے۔ اپنی کتاب "تاریخ اہل ہند" میں وشنو پُران کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔ "وشنو پُران کی تاریخ تصنیف ۱۰۴۵ء سے شمار کرنی چاہیئے۔ اس پوران میں جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے۔ قدیم روائتیں قلمبند ہیں۔ جو شیو اور بودھ متوں کے ساتھ ساتھ چلی آتی تھیں۔ اس پُران کے مسائل براہِ راست وید سے نہیں لئے گئے بلکہ دو مشہور رزمیہ نظموں کی وساطت سے حاصل ہوئے ہیں۔ یہ اٹھارہ پورانوں یعنی علم الٰہی کی سنسکرت کی کتابوں میں سے ایک ہے۔ جس میں برہمنوں نے وشنو اور شو کے مخالف مذہبوں کو ایک جا جمع کیا ہے"[1] ڈاکٹر صاحب کے مذکورۂ بالا بیان کو سامنے رکھ کر غور کیجئے تو معلوم ہوتا ہے کہ وشنو مت کی سب سے پہلی کتاب یعنی وشنو پُران غزنویوں کے ہندوؤں سے سیاسی تعلقات شروع ہونے کے ۰۷ برس بعد (جبکہ

---

[1]۔ ماخوذ از آئینہ حقیقت نما ج ۱ ص ۱۶۴

۹۷۸ء میں سبکتگین بادشاہ ہوا) لکھا گیا ہے وشنو پُران کی تصنیف کا حال لنگ پوران کی ادھیائے چونسٹھ میں بیان ہوا ہے۔ جس کا مفہوم یہ ہے "بششٹھ جی اور پلسٹ منی دو مذہبی پیشوا ہیں۔ جن کے طرفدار گروہوں میں جنگ وجدل جاری ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو راکشش کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ایک موقعہ پر پلست منی کی جماعت نے بششٹھ جی کے بیٹوں کو لڑائی میں ختم کر دیا جس کا بدلہ بششٹھ جی کے مقتول بیٹے شکت نامی کے لڑکے پراشر نے لیا جو اُدرشینی کے بطن سے تھا۔ پراشر جی نے اتنا سخت انتقام لیا کہ بششٹھ جی کو بھی دشمنوں پر رحم آگیا اور اُن کے کہنے سننے اور سمجھانے سے پراشر جی نے راکششوں کا مارنا چھوڑ دیا۔ اسی اثناء میں پلست منی آئے۔ بششٹھ جی نے انھیں عزّت سے بٹھایا۔ پلست منی نے پراشر جی سے کہا کہ چونکہ تمنے بششٹھ جی کے کہنے سے بڑی بھاری عداوت کو فراموش کر دیا ہے اور ہمارے بیٹوں یعنی راکششون کو مارنا چھوڑ دیا۔ اس لئے ہم تم سے خوش ہیں۔ اور تم کو یہ کرامت عطا کرتے ہیں۔ کہ تم کو پُران تصنیف کرنے کی قوت حاصل ہوگی۔ دیوتا تم سے خوش ہوں گے۔ اور تمہاری عقل بالکل صاف اور روشن ہو جائیگی۔ یہ سُنکر بششٹھ جی نے بھی کہا کہ اے پراشر جیسا پلسٹ منی نے فرمایا ایسا ہی ہوگا۔ چنانچہ پراشر جی نے دونوں رشیوں کی مہربانی اور امداد پاکر وشنو پُران تصنیف گیا۔"[1]

لنگ پوران کے مذکورۂ بالا اقتباس سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ "دو مخالف ومعاند گروہوں میں صلح قائم ہونے کی تقریب وشنو پُران کی تصنیف کا سبب ہے۔ بششٹھ جی اور پلست منی دو مذہبی پیشوا ہیں جن میں ایک راکششوں کے بزرگ ہیں اور دوسرے رشیوں کے ممکن ہے کہ بششٹھ جی برہمنی مذہب کے پنڈت ہوں اور پلست جی بودھ مذہب کے یا اس کے برعکس ہوں۔ ان میں سے ہر ایک دوسرے

---

[1] ۔ ماخوذ از آئینۂ حقیقت نما ج ۱ ص ۱۶۵، ص ۱۶۶

کو راکششں کے نام سے یاد کرتا ہو گا لیکن اب حالات ایسے پیدا ہو چکے تھے کہ دونوں مذہبوں کے پنڈتوں نے باہمی عداوتوں کو فراموش کر دیا۔ اور ایسا مذہب اختیار کیا جس پر دونوں متفق و متحد ہو گئے[1]

غرضیکہ اس عہد میں برہمنوں کے ترمیم کردہ اِس نئے مذہب کا اثر بہت بڑھ گیا۔ اور جہاں جہاں بودھوں کا اثر گھٹتا گیا اس کی جگہ برہمن مت لیتا گیا۔ اِس مت کی ترقی کے کئی اسباب تھے منجملہ اُن کے ایک یہ سبب بھی تھا کہ انھوں نے مذہب میں رسم و رواج کو موقر جگہ دیکر نجات کا راستہ سب کے لئے آسان کر دیا۔ وہ کہتے تھے کہ ایشور سب کو مل سکتا ہے خواہ وہ بھوتوں، پریتوں اور پہاڑوں و دریاؤں کی پرستش ہی کیوں نہ کرے اِس طرح بُت پرستی کو فروغ ہوا اور عوام الناس کی جہالت سے انھوں نے پورا پورا فائدہ اُٹھایا۔ پُران کی کہانیوں کا سوسائٹی میں خوب رواج ہوا۔ بھاگوت پُران کی کتھاؤں کے ذریعہ وشنو مذہب کے ماننے والوں کی تعداد بڑھ گئی۔ اسی طرح دیوی پُران میں دُرگا دیوی کی طاقت اور عنایتوں کی کہانیاں تھیں ان کی بھی خوب اشاعت ہوئی۔ بالخصوص بنگال میں شکتی یعنی دُرگا کے پوجاریوں کی کثرت ہو گئی۔ وشنو اور دُرگا کی پوجا کے علاوہ شیو کی پوجا کا بھی بہت رواج ہوا شیو پُران اور لنگ پُران میں شیو کے اوصاف بیان کئے گئے ہیں اس عہد میں شیویوں کے کئی فرقے بن گئے جن کے حالات منسلکہ ضمیمہ میں ملیں گے۔ اِس مذہب کے ماننے والے یوں تو کل ہندوستان میں تھے لیکن کاشمیر اور دکن میں ان کی تعداد زیادہ تھی۔

اِن سب تبدیلیوں کا یہ نتیجہ ہوا کہ برہمن مت کے اندر بہت سی شاخیں بن گئیں ان میں ایک طرف شنکر آچاریہ جی جیسے ویدانتی تھے جو صرف "برہم گیان" ہی کو سچ مانتے تھے اور باقی دُنیا کو مایا کا جال سمجھتے تھے اور دوسری طرف وہ نیم مہذب گروہ اور ذاتیں

---

[1] ماخوذ از آئینۂ حقیقت نما ج ا ص ۱۶۵، ص ۱۶۶

تھیں جو راستوں، دریاؤں اور درختوں ہی کو پوجکر مذہبی فریضہ ادا کرلیتی تھیں اور سمجھتی تھیں کہ انھوں نے زندگی کا مقصد حاصل کرلیا۔ اس سے ہندو سوسائٹی کو بہت نقصان پہونچا جس کا ذکر آگے آتا ہے۔

فصل چہارم۔ نئے مت کی تشکیل II

(۱) ذات پات کی تقسیم اور اُس کے ارتقائی منازل

(ا) ذاتیں اور وید و بودھ

آریوں کے رسم و رواج۔ عقائد اور طور و طریق کی وہ سادگی جو شروع زمانہ رگ وید (۲۵۰۰ ق۔م) میں تھی آخر زمانہ رگ وید (۱۴۰۰ ق۔م) میں چند در چند وجوہ کی بنا پر مٹ چکی تھی اور مٹتی جا رہی تھی۔ ان کے مذہبی عقائد، یگیہ ہون اور رسم و رواج میں جتنی نئی باتیں بڑھ گئی تھیں اُسی لحاظ سے ان میں پیچیدگیاں پیدا ہوگئی تھیں مثال کے طور پر صرف یگیہ (قربانی) کی ہزار قسمیں بن چکی تھیں جن میں بعض یگیہ ایسے تھے جن کے ادا کرنے کے لئے ۱۲ برس درکار ہوتے تھے۔[۲]
غرضکہ رسومات کی زیادتی و کثرت اور ان میں انہماک کیوجہ سے پنڈتوں اور پروہتوں کے پاس اتنا وقت کہاں تھا کہ وہ رگوید کو ازبریاد کرتے رہتے اسلئے انھوں نے اپنی آسانی کی غرض سے رگوید میں سے منتخب کرکے تین اور وید بنالئے اور جب اس سے بھی کام نہ چلا تو سوتر بنا ڈالے رسومات کی ادائگی میں برہمنوں کا جب یہ عالم تھا جن کو سوائے تعلیم و تعلم کے اور کوئی دوسرا کام نہ تھا تو بیچارے عوام الناس کے پاس اتنا وقت کہاں سے آتا کہ وہ ویدوں کو پڑھتے اور ان کے مطابق مذہبی رسوم کو ادا کرتے ان کو تو بخلاف برہمنوں

۱: تاریخ ہند صفحہ ۱۳۵ تا صفحہ ۱۳۷ از اودھ بہاری پانڈے

۲: تاریخ ہندوستان صفحہ ۲۶ از رام کرشن ماتھر

کے دُنیا کے اور بھی کام انجام دینا تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عوام الناس آریہ رسومات کی ادائیگی کے لئے برہمنوں کے محتاج ہو کر رہ گئے اور اب مذہبی دُنیا میں برہمنوں سے بڑھ کر کوئی بھی نہ رہا۔ رفتہ رفتہ یہ طبقہ دوسرے آریاؤں سے ممتاز ہو کر ایک الگ فرقہ بن گیا اور اس نے اپنی برتری و تفوق ثابت کرنے کے لئے کھانے پینے اور چھوت چھات کے قاعدے گڑھ لئے۔" اگر کسی دوسری ذات کا کوئی شخص ویدوں کے احکام کی خلاف ورزی کرتا تو اس کے لئے موت کی سزا تجویز کی جاتی۔ مگر یہی گناہ ویدوں کے پڑھنے والے برہمنوں سے سرزد ہوتا تو انھیں معافی مل جاتی۔"[۱]

لیکن آریوں کی حکمران جماعت (کشتری) نے برہمنوں کی اس برتری کو آسانی کے ساتھ قبول نہیں کیا۔ مذہبی رسم و رواج اور عقائد کی بعض ناقابل فہم پیچیدگیوں نے علما کی ایک طبقہ کو برہمنی مت (ویدک دھرم) کے بارے میں مشتبہ بنا دیا۔ چنانچہ اُپ نشدوں کے بننے کا اصل سبب ہی یہ ہے کہ چھتری راجہ مہاراجہ برہمنوں کے بنائے ہوئے مذہبی اصولوں اور روایات کو جو خود غرضی پر مبنی تھے اُن کے اصلی رنگ میں دیکھنے لگ گئے تھے۔ چھتریوں اور برہمنوں میں مذہبی مسائل اور روح و دنیا کے بارے میں مباحثے ہونے لگے انھیں مباحثوں کے نتیجے اُپ نشدوں میں درج ہیں۔ چھتریوں نے برہمنوں پر مکمل فتح اُس وقت پائی جبکہ چھتری شہزادے بدھ اور مہابیر نے انھیں مسائل کی بنا پر نئے مذاہب بدھ مت اور جین مت قائم کر کے کچھ مدت کے لئے برہمنوں کے بنائے ہوئے یگیہ ہون اور دیگر روایات کو ہندوستان سے مٹا دیا۔ اور ذات پات کے بندھنوں کو ڈھیلا کر کے برہمنوں کو نیچا دکھایا۔

(۱۱) منوجی کا زمانہ بہر حال برہمنوں کی بزرگی و برتری کو چھتریوں کی وجہ سے بہت زبردست صدمہ پہونچا لیکن مہاراجگان موریہ (۳۲۵ ق م)

---

[۱] :- ماخوذ از "تاریخ اہل ہند" مصنفہ ڈاکٹر تاراچند ص ۲۳

تا ۱۸۴ق-م) کے بعد ہی مگدھ میں جب دوبارہ برہمنوں کی حکومتیں (شنگ ۱۸۴-۷۲ ق-م، کنویا کانو ۷۲-۲۷ ق-م) قائم ہوئیں تو برہمنوں کے مذہبی اور سماجی طریقے از سر نو جاری ہونے لگے۔ ہندوؤں کا دھرم شاستر جو منوسمرتی کہلاتا ہے اسی عہد (۱۸۴-۲۷ ق-م) میں مرتب ہوا[1]۔ سماج میں برہمنوں کا درجہ سب سے اونچا سمجھا جانے لگا اور تفوق کا معیار بجائے قابلیت کے حسب ونسب قرار دیا گیا۔ شادی بیاہ، کھانے پینے اور چھوت چھات کے قاعدے مہاتما بدھ کے زمانے کے مقابلہ میں اور زیادہ سخت ہو گئے۔ ہر ذات کے لوگوں کے لئے قانون بھی الگ الگ بنا دئے گئے۔ ایک ہی جرم کی سزا اونچی ذات والوں کے لئے ہلکی اور نیچی ذات والوں کے لئے سخت تھی نیچی ذات والوں کے لئے ویدوں کا پڑھنا یا پڑھانا ممنوع قرار دیا گیا۔ علم تحصیل کرنے کی ممانعت اور اعلیٰ طبقہ کی نفرت نے شودروں کا درجہ چوپایوں کے برابر کر دیا۔ چینی سیاحوں کے بیانات کے مطابق سب سے نیچے طبقے کی جماعتوں کو شہروں کے اندر رہنے کی اجازت نہیں تھی۔ ان کے محلّے شہروں سے باہر ہوتے تھے۔ عورتوں کا مرتبہ سوسائٹی میں گر گیا ان کو پہلے کی طرح خود مختارانہ زندگی بسر کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ بیواؤں کی شادی کو روک دیا گیا اور ستی کے رواج کو قائم کیا گیا۔

(iii) راجپوتوں کا زمانہ

ان تمام باتوں کے باوجود اونچی اور نیچی ذات والوں میں ابھی ایک تعلق باقی تھا اور وہ یہ کہ اونچی ذات والے مردوں کا بیاہ نیچی ذات والی عورتوں کے ساتھ ہو سکتا تھا لیکن یہ رواج بھی رفتہ رفتہ راجپوتوں کے عہد (۶۵۰ء تا ۱۲۰۰ء) میں کم ہو گیا۔ اس عہد میں "ذات پات کی ترتیب" میں ایک اہم تبدیلی واقع ہوئی اور وہ یہ کہ ہر ایک ذات بہت سی چھوٹی چھوٹی ذاتوں میں تقسیم ہو گئی۔ برہمنوں میں تفریق صرف گوتر ہی کی بنا پر نہیں ہوئی بلکہ وطنیت کے

---

[1] منو شاستر کی تدوین و ترتیب میں مورخین کا اختلاف ہے بعض نے عہد گپت کو منو شاستر کا زمانہ تصنیف قرار دیا ہے (مولف)

لحاظ سے بھی ہوئی چنانچہ پنچ گوڑ، پنچ دراوڑ اور دیگر بہت سی چھوٹی چھوٹی شاخیں مثلاً ناگر، سارسوت، کشمیری وغیرہ الگ ہوگئیں اور ذاتوں کی یہ تقسیم ان کے اندر تک جا پہونچی[1]۔ یہی حالت چھتریوں کی بھی ہوئی یہ سورج بنشی اور چندر بنشی دو خاندانوں کے بجائے ۳۶ قبیلوں اور خاندانوں میں بٹ گئے[2]۔ اور پھر ان میں بھی شاخیں در شاخیں نکلیں یہاں تک کہ آج صرف چوہان قبیلہ کی ۲۴ اور پرماروں کی ۳۵ شاخیں ہیں[3]۔ یہی حال شودروں اور اچھوتوں کا بھی سمجھئے۔

"ان چھوٹی چھوٹی ذاتوں کے پیدا ہوتے ہی دو مختلف ذاتوں میں شادی بیاہ کا ہونا اور ساتھ ساتھ کھانا پینا بالکل بند ہوگیا۔ غرضکہ ایک ذات کو دوسری ذات سے کسی قسم کا کوئی بھی تعلق نہ رہا۔ یہی وہ زمانہ ہے جبکہ بچپن کی شادی کا رواج زور پکڑ گیا۔ ستی کی رسم چل پڑی اور لوگ اپنے کو دیوتاؤں پر بھینٹ چڑھانے لگے[4]۔

اس طرح چھوت چھات اور اونچ نیچ کے خیال نے ہندو سوسائٹی کی وحدت کو ختم کردیا اور اُسے اتنے بیشمار ٹکڑوں میں تقسیم کردیا جن کو بعض مذہبی و سیاسی مخلص نیتاؤں کی کوششوں نے آج تک یکجا نہیں کر پایا[5]۔ اِس میں شبہ نہیں کہ اس عہد میں ہندو سوسائٹی کا تعداد کے اعتبار سے دائرہ وسیع ہوگیا اور شک، منگول، یوچی، ابھیر، ہون، گورجر وغیرہ غیر ملکی قومیں بھی سوسائٹی کا جزو بن گئی تھیں لیکن برہمنوں نے

---

[1] : قرون وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب ص ۵۱

[2] :۔ اہل ہند کی مختصر تاریخ ص ۱۴۳ از ڈاکٹر تاراچند صاحب

[3] : تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو چھتری کل بھمن ص ۴۲ تا ص ۴۵۔ مسٹر ٹاڈ نے مختلف فہرستوں کو سامنے رکھ کر اور ان کا موازنہ کرکے جو فہرست مرتب کی ہے اس میں راجپوتوں کے ۳۸ قبیلوں کا ذکر کیا ہے۔

[4] :۔ اہل ہند کی مختصر تاریخ ص ۱۴۴ مرتبہ ڈاکٹر تاراچند صاحب

[5] :۔ ہندوستان کی مرکزی حکومت نے سنہ ۱۹۴۸ء میں قانون مساوات پاس کرکے اونچ نیچ کی ہزارہا سال کی لعنت کو دور

ان کو ہمیشہ نیچا سمجھا جس سے معاشرتی پیچیدگیاں روز بروز بڑھتی ہی گئیں اور ملک نہایت تیزی کے ساتھ تنزل کے گڑھے میں گرتا چلا گیا۔

فصل پنجم

(ب) معیشت و معاشرت

برہمن برہمنوں کا سماج میں سب سے زیادہ احترام کیا جاتا تھا اور تینوں ورن (ذات) والے ان کی فضیلت کو تسلیم کرتے تھے۔ ان کا خاص کام پڑھنا اور پڑھانا، یگیہ کرنا اور کرانا، دان لینا اور دینا تھا۔ لیکن بودھ اور جین مذہبوں کی تعلیمات کی وجہ سے ان کی برتری کا طلسم ٹوٹ گیا اور یہ کام ان کے ہاتھ سے نکل گئے مجبور ہو کر یہ دوسرے برنوں (ذاتوں) کے پیشے کرنے لگے۔ اور ان پیشوں کو اپنے لئے جائز قرار دے لیا جن سے یہ اب تک محترز تھے مثلاً زراعت کا پیشہ معیوب سمجھا جاتا تھا اور ویشوں نے بودھ مت قبول کر کے زراعت کے مذہباً ممنوع پیشہ کو ترک کر دیا تھا یہ موقع دیکھکر بہت سے برہمن کھیتی باڑی کر کے اپنی گذر بسر کرنے لگے چنانچہ پاراشر اسمرتی میں کھیتی باڑی کے جواز کی صورت نکال لی اس اسمرتی کی رُو سے سب ذاتیں کھیتی باڑی کرنے کی مجاز ٹھہریں[1]۔ زراعت کے علاوہ اس زمانہ میں برہمن صنعت و حرفت، دستکاری، تجارت اور دوکانداری بھی کرتے تھے لیکن پھر بھی اپنے وقار کا از حد خیال رکھتے تھے اور نمک، تل، دودھ، شہد، شراب اور گوشت وغیرہ نہیں بیچتے تھے۔ اسی طرح سود کو حرام سمجھ کر اس کے لین دین سے بھی پرہیز کرتے تھے۔

چھتری:- برہمنوں کی طرح چھتریوں کا بھی سماج میں بہت اونچا درجہ تھا۔ ان کے

---

[1]:- قرون وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب صہ۴۸

خاص فرائض رعایا پروری، یگیہ کرنا، دان دینا اور مطالعہ تھا۔ یہ فرمانروا، سپہ سالار اور فوجی منصب دار ہوتے تھے۔ پڑھنے لکھنے کے مواقع چونکہ ان کو حاصل تھے اس لئے ان میں بعض راجہ بہت اچھے عالم ہو گزرے ہیں چنانچہ راجہ ہرش وردھن، چالوکیہ راجا وِنیادتیہ، چوہان راجہ وگرہ راج چہارم اور مالوہ کے راجہ بھوج کا نام ادبی خدمات کے لئے محتاج بیان نہیں۔ برنوں کا نظام درہم برہم ہو جانے کی وجہ سے برہمنوں کی طرح چھتّری بھی دوسرے پیشے کرنے لگے۔

چھتریوں میں تین درجوں کے لوگ شامل ہیں (۱) ویدک عہد کے آریہ چھتّریوں کی اولاد (۲) گونڈ، بھار، ابھیر وغیرہ قدیم ہندی ذاتوں کے وہ لوگ جو ہندو سوسائٹی میں شامل ہو گئے اور جن کا کام حکومت کرنا یا جنگ کرنا تھا (۳) شک، یوچی، منگول، ہن، گرجر وغیرہ غیر ملکی قوموں کے جنگجو لوگ جو ہندو ہو گئے اور چھتّریوں کا سا کام کرتے رہے۔ راجپوت معاملہ کے بڑے صاف، بڑے حوصلہ مند، بہادر، نڈر، راست باز اور بات کے پکّے ہوتے تھے۔ ان کی عورتیں بھی بڑی بلند ہمت، فنون لطیفہ اور ہتھیار چلانے میں ماہر ہوتی تھیں۔ وہ اپنی ناموس کی حفاظت کے لئے جان دینا بائیں ہاتھ کا کھیل سمجھتی تھیں۔ راجپوتوں میں ان خوبیوں کے علاوہ کچھ برائیاں بھی تھیں جو آخری عہد میں پیدا ہو گئی تھیں۔ جن کے سبب سے آگے چل کر انھیں مسلمانوں سے مغلوب ہونا پڑا وہ افیون، شراب اور دوسری نشیلی چیزیں استعمال کرنے لگے اور خود ساختہ عزّت و آبرو کے اصولوں کی حفاظت کی خاطر ذرا ذرا سی بات پر آپس میں لڑنے جھگڑنے لگے۔ جس کی وجہ سے قومی شیرازہ بالکل منتشر ہو گیا اور ملک میں طوائف الملوکی عام ہو کر رہ گئی۔

ویش ویشوں کے خاص فرائض جانوروں کا پالنا، دان دینا، یگیہ کرنا، بیوپار کرنا لین دین اور زراعت تھے لیکن بودھ ہو کر انھوں نے زراعت کا پیشہ ترک

کر دیا کیونکہ ان کو مذہب اجازت نہیں دیتا تھا۔ اس کے علاوہ ویدوں کا پڑھنا چھوڑ دیا اور اس کے رسم و رواج کو بھی بھلا بیٹھے۔ ان کا پیشہ صرف تجارت اور لین دین رہ گیا اسی کے ذریعہ یہ اپنی معاش حاصل کرتے تھے۔ ویشوں کے شاہی مناصب پر مامور ہونے، سپہ سالار بننے اور لڑائیوں میں شریک ہونے کی بھی متعدد مثالیں موجود ہیں۔ یہ زیادہ تر جین یا بودھ دھرم کے پیرو تھے اور اپنے مذاق کے مطابق مندر، مٹھ، کنواں، تالاب، دھرم شالہ اور شفاخانہ وغیرہ بنوانے میں کافی روپیہ خرچ کرتے تھے۔

شودر ہندو سماج میں اوّل الذکر تین برنوں کے بعد ان کا درجہ تھا۔ یہ تینوں کے خدمت گذار اور فرمانبردار تھے۔ شروع شروع میں ان کو اچھوت نہیں سمجھا جاتا تھا کیونکہ اونچی ذات والوں کی طرح یہ بھی یگیہ کرنے کے مجاز تھے[ع ۱]۔ لیکن جب سے زراعت و دستکاری کو معیوب سمجھا جانے لگا اور یہ پیشے شودروں سے متعلق ہو کر رہ گئے اسی وقت سے ان کا درجہ گر گیا اور ان کو ذلیل سمجھا جانے لگا۔ شودر ہی کسان، دھوبی، جولاہے، لوہار، معمار، رنگریز، کمہار وغیرہ ہونے لگے اور زمانۂ زیر بحث میں پیشوں کے اعتبار سے بے شمار ذاتیں بن گئیں۔

ہوان سانگ کے زمانہ ہی سے شودروں سے زیادہ ذلیل انتجوں کو سمجھا جاتا تھا[ع ۲]۔ البیرونی کے زمانہ میں یہ آٹھ طبقوں میں منقسم تھے دھوبی، چمار، مداری، ٹوکری اور ڈھال بنانے والے (کنجر)، ملاح، دھیور (مچھیرے)، چڑیمار اور جولاہے۔ شہروں اور گانوؤں میں یہ لوگ چاروں برنوں سے الگ رہتے تھے۔ سماج نے ان کے بہتر بنانے کا کوئی انتظام نہیں کیا[ع ۳]۔ اس طرح قومی جسم کے ایک عضو کو کاٹ کر جسم کو ہمیشہ کے لئے داغدار بنا دیا۔

ع ۱:۔ وشنو اسمرتی انک ۵، قرون وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب ص ۵۵ ع ۲:۔ قرون وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب ص ۵۵ ع ۳:۔ ہندوستان کی تاریخ ص ۱۲۹ از اودھ بہاری پانڈے۔

باہمی تعلقات

چاروں برنوں میں تقسیم ہونے کے باوجود سماج کی وحدت ایک عرصہ تک شادی بیاہ کی وجہ سے قائم رہی۔ اپنے برن میں شادی کرنا مستحسن ضرور تھا لیکن دوسرے برن میں شادی کرنا دھرم شاستر کے خلاف نہیں سمجھا جاتا تھا۔ برہمن کا لڑکا بقیہ تینوں برنوں کی لڑکی سے شادی کر سکتا تھا چنانچہ بان کوی (شاعر) نے شودر عورت سے پیدا برہمن لڑکے پارشو کا ذکر کیا ہے۔ اسی طرح منڈور کے پرہار وں کے (۷۸۳ء تا ۸۶۱ء) کتبہ جات سے پتہ چلتا ہے کہ ایک برہمن ہرش چندر نے چھتری لڑکی بھدرا سے شادی کی۔ برہمن شاعر راج شیکھر نے چوہان لڑکی اونتی سندری سے شادی کی۔ اس طرح اِس عہد میں عام طور سے یہ رواج تھا کہ اونچے ورن کا لڑکا نیچے ورن کی لڑکی سے شادی کر سکتا تھا لیکن ذات پات کے بندھن جیوں جیوں سخت ہوتے چلے گئے باہمی یگانگت کی یہ صورت بھی جاتی رہی۔ چنانچہ یاگیہ ولکیہ اسمرتی میں جو منو اسمرتی سے بعد کو اور اس سے زائد بہتر انداز میں لکھی گئی شودر لڑکی سے شادی کرنے کی مخالفت کی گئی ہے[1]۔ لیکن جہانتک مذہبی رواداری کا تعلق ہے ہندو سوسائٹی بیشمار مذہبی گروہوں میں منقسم ہونے کے باوجود ہم رنگ ہو چلی تھی۔ چنانچہ البیرونی گواہی دیتا ہے کہ "یہ لوگ آپسمیں ایک دوسرے کے ساتھ مذہبی نزاع کم کرتے ہیں اور بحث و مناظرہ کے سوا جان، بدن اور مال کو نقصان نہیں پہونچاتے[2]"۔ رواداری کا یہ عالم تھا کہ قنوج کی پرتیہار راجاؤں میں اگر ایک وشنوی تھا تو دوسرا شیو کا پرستار، تیسرا بھگوتی کا بھگت تھا تو چوتھا آفتاب پرست۔ قنوج کے گہروار خاندان کے گوبند چندر نے جو شیوی تھا دو بودھ بھکشو وں کو بہار (خانقاہ) کی تعمیر کے لئے چھ گانوں دان دئے۔ بودھ راجہ مدن پال نے ایک برہمن کو جس نے اس کی رانی کو مہا بھارت کا درس دیا تھا ایک گانوں انعام میں دیا[3]۔ راجہ

---

[1] - قرون وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب ص۵۶ تا ص۵۸ [2]:- کتاب الہند باب سولھواں۔

[3]:- قرون وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب ص۴۵

گوبند چندر کی رانی مذہباً بودھ تھی۔

غلامی کا رواج تہذیبی نقطۂ نظر سے نبی کریمؐ جس زمانہ میں مبعوث ہوئے ہیں اس زمانہ میں پوری دُنیا پر جہالت کی تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ مصر و بابل جو کسی زمانہ میں تہذیب کے علم بردار تھے اب اُن کی حالت دگر گوں تھی روم جس کی تہذیب پر مغربیوں کو ناز ہے معاشرت کے لحاظ سے دم توڑ رہا تھا۔ وہاں انسانی جان کا احترام اٹھ چکا تھا ہزارہا انسان رومی امراء کے شوقِ تماشا کی نذر ہو رہے تھے۔ انسان کو درندوں سے پھڑوانا یا جانوروں کی طرح ذبح کرا دینا یا ان کے جلنے کا تماشا دیکھنا ایک معمولی سی بات ہو کر رہ گئی تھی۔ غلامی کا رواج پوری دنیا میں تھا اور ہندوستان جیسے متمدن ملک میں بھی کسی نہ کسی صورت میں موجود تھا۔ مہامہوا دھیائے سری گوری شنکر ہیراچند اوجھا کے بقول "یہ رواج (یہاں) ایک عرصہ دراز سے تھا چنانچہ منو اور یاگیہ ولکیہ کی اسمرتیوں میں اِس کا تذکرہ ہے۔ وگیانیشور نے بارھویں صدی میں پندرہ قسم کے غلاموں کا ذکر کیا ہے۔ مثلاً خانہ زاد (گھر کی لونڈی سے پیدا)، کریت (خریدا ہوا)، لبدھ (دان میں ملا ہوا)، دایادو یاگت (خاندانی)، اناکال بھریت (قحط میں مرنے سے بچایا ہوا)، آہت (روپیہ دیکر اپنے پاس رکھا ہوا)، رِن داس (قرض کی علّت میں رکھا ہوا)، یدھ پراپت (لڑائی میں پکڑا ہوا)، پنیجت (جوئے وغیرہ میں جیتا ہوا)، پربرجیا وست (سادھو ہونے کے بعد بگڑ کر رہتا ہوا)، بڑواھریت (گھر کی لونڈی کے فراق میں آیا ہوا)، اور آتم وکریتا (اپنے آپ کو بیچنے والا)، وغیرہ وغیرہ"[1]۔ لیکن روم کی طرح یہاں انسانی جانوں کے ساتھ کھیل نہیں کھیلا جاتا تھا۔ جو غلام تندہی سے کام کرتے تھے اُن کے مالک اُن کے ساتھ نہایت اچھا سلوک کرتے تھے اور مختلف طریقوں سے انھیں آزاد بھی کرتے رہتے تھے چنانچہ یاگیہ ولکیہ اسمرتی، نارد اسمرتی، اور متاکشرا وغیرہ میں غلاموں کے آزاد ہونے

---

[1] تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو "قرون وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب" ص ۶۹ تا ص ۷۱

اور آزاد کرنے کے طریقے مندرج ہیں۔

ستی کا رواج ہندوستان کی تاریخ میں یہی وہ زمانہ ہے جبکہ پہلی مرتبہ ستی کے رواج کا پتہ چلتا ہے۔ یہ رسم کیوں ایجاد ہوئی اس کا جواب تاریخی شواہد کی کمی کی بنا پر یقینی طور پر نہیں دیا جاسکتا۔ لیکن گمان غالب یہ ہے کہ عورتوں کے حقوق اس حد تک مٹائے جاچکے تھے کہ وہ موت کو زندگی پر ترجیح دینے لگیں۔ شوہر کے مرجانے کے بعد نہ اُن کی وقعت سسرال میں ہوتی تھی اور نہ میکے میں، وہ منحوس خیال کیجاتی تھیں۔ اور سوسائٹی میں باوقعت زندگی بسر کرنے کی راہیں اُن پر مسدود تھیں اس کے علاوہ عقد ثانی کے مواقع بھی اُن کو میسر نہ تھے جس سے وہ کسی کو اپنا شریک حیات بناکر اپنی بقیہ زندگی آرام سے گذار سکیں ایسی حالت میں اگر وہ موت کو خوش آمدید کہتیں تو کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ رسم ورواج نے غالباً اسے مذہبی رنگ دیکر جواز کی صورت نکال لی۔ بہر حال حقیقت جو کچھ بھی ہو ستی ہونے کی تاریخ میں سب سے پہلی مثال چھٹی صدی عیسوی میں ملتی ہے جبکہ راجہ بھانو گپت کے سپہ سالار گوپ راج کی بیوی ستی ہوئی اس کے بعد یہ رسم چل پڑی۔ لیکن ستی ہونا یا نہ ہونا پھر بھی عورت کی مرضی پر موقوف تھا اِس کے علاوہ بعض اوقات عورت کے اعزا کو بھی یہ اختیار حاصل تھا کہ وہ عورت کو ستی نہ ہونے دیں چنانچہ راجہ ہرش نے اپنی بہن راج شری کو ستی ہونے سے روک دیا گو اس کی ماں ستی ہوگئی۔ ہرش کی تصنیف "پریہ درشکا" میں ونذھیہ کیتو کی عورت کے ستی ہونے کا ذکر آیا ہے۔ البیرونی اپنے عہد کے ہندوستان کی کیفیت تحریر کرتے ہوئے بیواؤں کے متعلق لکھتا ہے کہ "بیوائیں یا تو تپسونی (راہبہ) کی زندگی بسر کرتی ہیں یا ستی ہوجاتی ہیں۔ راجاؤں کی عورتیں اگر بوڑھی نہ ہوں تو ستی ہوجاتی ہیں"۔[۱]

غذا۔ اِس عہد میں ہندوستان کی غذا بالعموم گیہوں، چاول، جوار، باجرہ، دودھ، گھی،

۱؎ :- کتاب الہند جلد اول صہ ۱۵۵، قرون وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب صہ ۸۱

گڑ اور شکر بھی الادریسی (مشہور عربی جغرافیہ نویس) انہلواڑہ (واقع گجرات) کے بیان میں لکھتا ہے کہ "یہاں کے لوگ چاول، مٹر پھلیاں، اُرد، مسور اور مچھلی اور اُن جانوروں کو جو خود مر گئے ہوں استعمال کرتے ہیں"[1]۔ مہاتما بودھ سے قبل ہندوستان میں گوشت کھانے کا کثرت سے رواج تھا۔ چنانچہ قدیم مذہبی کتب اس کی مثالوں سے بھری پڑی ہیں[2]۔ مہاتما بودھ کے بعد بھی جب تک کہ یوگ وسنیاس کے خیالات نے سماج پر پورا پورا قابو نہیں پالیا گوشت خوری بدستور جاری رہی لیکن جب ویدک دھرم پر زوال

---

[1] ہسٹری آف میڈیول انڈیا جلد دوم صفحہ ۱۹۲ مولفہ جی، وی، ویدیہ قرون وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب ص ۴۶۔

[2] مثالیں صدہا اور بکثرت ہیں سب کو یکجا طور پر پیش کرنے کی ان صفحات میں گنجائش نہیں محققین نیز اہل علم حضرات قدیم مذہبی کتب کی طرف رجوع فرمائیں۔ یہاں پر صرف دو چار مثالیں پیش کی جا رہی ہیں۔

(ا) ویدر مہاراج (مہاراجہ پانڈو کے چھوٹے بھائی) فرماتے ہیں "اُمراء و شرفاء کی خوراک گوشت ہے، متوسط درجے کے لوگوں کی دودھ وغیرہ اور غرباء تیل پر گذارہ کرتے ہیں (مہابھارت ادیوگ پردہ، اشلوک ۴۹، ادھیائے ۳۴)۔

(ب) جنگلی جانوروں کا شکار جائز تھا اسلئے تمام آریہ بزرگ شکار سے اپنا دل بہلاتے تھے۔ اگست رشی شکار کے بڑے شایق اور مداح تھے (مہابھارت انوپروہ۔ اشلوک ۱۶ ادھیائے ۱۱۶)

سری کرشن جی سندھی گھوڑے پر سوار ہو کر پاکیزہ جانوروں کا شکار کرتے تھے (اشلوک ۵، بھاگوت پُران ۱۰ نصف آخر ادھیائے ۶۹، برہما پُران ادھیائے ۱۱۱)۔

(ج) مہاراجہ رامچندر جی کی دھرم پتنی سیتاجی نے دریائے گنگا اور کالندی ندی کو عبور کرتے وقت منت مانی تھی کہ "اے دیوی تیری برکت سے جب ہم صحیح وسلامت لوٹیں گے تو میں شراب کے ایک ہزار گھڑے اور گوشت پڑے چاول تیرے نذر کرونگی" (رامائن (والمیکی) (ایودھیا کانڈم سرگ ۵۲ (۵۵)

(د) جب بھرت مہاراج راجہ رامچندر جی کو منانے کیلئے چترکوٹ جا رہے تھے تو راستہ میں بھردواج منی نے انکی بڑی شاندار دعوت کی جس میں گوشت بھی تھا (رامائن ایودھیا کانڈم سرگ ۹۱ اشلوک ۵۲)

(بقیہ صفحہ ۱۳۱ پر)

آگیا اور اس کی جگہ جین و بودھ تعلیمات کی بنا پر اہنساہی پرم دھرم تسلیم کر لیا گیا تو گوشت کھانے کا رواج بھی رفتہ رفتہ کم ہو گیا۔ مسعودی لکھتا ہے کہ" برہمن کسی جانور کا گوشت نہیں کھاتے"[1] حالانکہ ویاس اسمرتی کی رُو سے شرادھ میں گوشت نہ کھانے والا برہمن گنہگار ہو جاتا ہے[2]۔ چھتری اور ویش اس زمانہ میں بھی بھیڑ، بکری کا گوشت اور مچھلی کھاتے تھے۔ لہسن پیاز کا استعمال البتہ ممنوع تھا اور کھانے والوں کو کفارہ ادا کرنا پڑتا تھا۔ چنڈال ہر قسم کا گوشت کھاتے تھے۔

شراب کا استعمال معیوب سمجھا جاتا تھا۔ مشہور عربی سیاح المسعودی نے لکھا ہے کہ اگر کوئی راجہ شراب پیتا تھا تو وہ فرمانروائی کے ناقابل سمجھا جاتا تھا لیکن رفتہ رفتہ چھتریوں میں شراب کا استعمال بڑھتا گیا۔ چنانچہ وتسیائن کے کام سوتر سے پتہ چلتا ہے کہ صاحب ثروت لوگ باغیچوں میں جاتے اور شراب کی محفلیں آراستہ کرتے تھے[3]۔

بقیہ صفحہ ۱۳۰:۔ (ط) برہماجی فرماتے ہیں کہ کچھوا، خرگوش، گوہ، مچھلی حلال ہیں۔ گانوں کے پلے ہوئے مرغ اور سور ممنوع ہیں۔ شرادھ کے موقع پر اور بیماری میں اور برہمن کی دہماندار کی) خاطر حلال کئے ہوئے جانوروں کا گوشت کھانے میں کوئی گناہ نہیں (برہما پُران ادھیائے ۱۱۳ اشلوک ۱۱۱، ۱۱۲)

(و) حلال جانوروں کا روزمرہ گوشت کھانے سے بھی آدمی گنہگار نہیں ہوتا۔ خود خالق نے خوراک اور کھانیوالے ساتھ ساتھ پیدا کئے ہیں (منو ادھیائے ۵ شلوک ۳۰) جنگل میں رہنے والے برہمنوں کا فرض ہو کہ یدیہ (قربانی) کیلئے اور متعلقین کی پرورش کیلئے پاکیزہ جانور اور پرندے ذبح کیا کریں جیسے اگست رشی کیا کرتے تھے۔ (اشلوک ۲۲۔ منو ادھیائے ۵)

(ز) آریہ بزرگ یگیہ اور ہون (یعنی دیوتاؤں کو نذرانہ پیش کرنے) کے موقع پر بالعموم قربانی کیا کرتے تھے۔ منو مہاراج کے نزدیک جنگلی اناج، دودھ، سوم، تازہ گوشت اور معدنی نمک سب قدرتی ہوی (اشیاء نذرانہ) ہیں (منو ادھیائے ۳ صفحہ ۱۲۵)۔

[1] تا [3]: تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو"قرون وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب ص ۶۷، ص ۶۸۔

توہم پرستی اِس زمانہ میں توہمات کا بہت زور تھا۔ لوگ جادو، ٹونے، ٹوٹکے، بھوت پریت وغیرہ کے معتقد تھے جادو ٹونے کا رواج ہندوستان میں زمانۂ قدیم سے چلا آتا ہے چنانچہ اُتھروید میں تسخیر، تالیف قلوب اور تخویف وغیرہ کا ذکر موجود ہے۔ راجہ کے پروہت اتھروید کے عالم ہوتے تھے اور وہ دشمنوں کے خاتمہ کے لئے جادو ٹونے اور عملیات کو بھی کام میں لاتے تھے۔ دیویوں کو خوش کرنے کے لئے جانوروں اور آدمیوں کو بلیدان[1] دینے کی وحشیانہ اور شرمناک رسم اس وقت بھی موجود تھی۔ چنانچہ بھابھوتی شاعر نے مالتی مادھو میں لکھا ہے کہ اگھورگھنٹ مالتی کو دیوی کے مندر

---

[1] ۱۔ زمانہ قدیم میں قربانی پر بہت زور دیا گیا ہے اور ذرا ذرا سی بات پر لوگوں کو قربانی کیطرف توجہ دلائی گئی ہے مثلاً

(ا) مہابھارت میں ہے "قربانی نہ کرنے والوں کے لئے نہ یہ دنیا ہے اور نہ وہ دنیا۔ وید کا یہ قطعی حکم ہے اور وید کے سب علماء اس پر متفق ہیں" (مہابھارت شانتی موپروہ ادھیایہ ۲۶۹ شلوک ۴۰)

(ب) برہمن، کشتری اور بنیوں کو جو بڑی عمر تک جینے کے آرزومند ہوں بغیر جانور کی قربانی کئے نیا اناج اور گوشت نہ کھانا چاہیئے (منوادھیائے ۴، اشلوک ۲۷)

(ج) وید کی دی ہوئی قربانی کر کے جو کوئی اس قربانی کا گوشت نہ کھائے وہ مرنے کے بعد بیسیوں دفعہ جانوروں کی جون (قالب) میں پیدا کیا جائیگا (منوادھیایہ ۵، اشلوک ۳۵)

(د) بکری، بھیڑ، گائے، گھوڑا اور پرندے اور نباتات سب انسان کی خوراک ہیں۔ جانور اور غلّہ انسان کی روزمرہ کی خوراک ہیں اور سب کے سب یدنیہ (قربانی) کیلئے پیدا کئے گئے ہیں (اشلوک ۱۹، ۲۰ مہابھارت شانتی موپروہ ادھیایہ ۱۶۸)

(ہ) منو کا حکم ہے کہ جانور صرف چار موقعوں پر ذبح کئے جائیں (۱) مدھوپرکہ کیلئے (۲) قربانی کے وقت۔ (۳) شرادھ کے وقت (۴) دیوتاؤں کو نذرانہ دینے کے لئے (منوادھیایہ ۵، اشلوک ۴۱)

"مدھوپرکہ" ایک قسم کے کھانے کا نام ہے جس پر شہد چھڑکا جاتا ہے۔ (بقیہ صفحہ ۱۳۳ پر)

یں حصول مقصد کے لئے قربان کرنے لے گیا تھا۔ اسی طرح "گوڈوہو" میں بھی دیوی کو خوش کرنے کے لئے آدمیوں اور جانوروں کے قربان کئے جانے کا ذکر موجود ہے[1]۔ عرب سیّاح جو وقتاً فوقتاً ہندوستان میں آتے جاتے رہے انھوں نے بعض توہمات پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ ابوزید حسن سیرافی (۲۶۴ھ/۸۷۸ء) نے دکن کے بارے میں لکھا "لوگ بُت پرست ہیں اور توہم پرستی حد سے زیادہ ہے"۔ ابن ندیم نے اپنی کتاب "الفہرست" میں جو ۳۷۰ھ/۹۸۰ء میں ترتیب دی گئی ہے یعقوب بن اسحاق کندی (۲۴۹ھ/۸۶۴ء) کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ایک کتاب کا حوالہ دیا ہے اس میں دکن کا حال تحریر کرنے کے بعد ملتان کی نسبت لکھا ہے "ملتان بلخ کے شہروں سے قریب ہے۔ یہاں پہاڑوں کی چوٹیوں اور سطح پر بیشمار پجاریوں کے مکان ہیں اور اسی جگہ ان کی قربانیاں بھی ہوتی ہیں۔ یہاں دو بت ہیں۔

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۳۲ = یہ معزز ترین مہمان کے لئے تیار کیا جاتا تھا اس کے ساتھ سالم زندہ گلے یا اس کا گوشت مہمان کی خدمت میں پیش کیا جاتا تھا (ملاحظہ ہو اُتر رام چرتیم انک ۴ مُصنفہ بھابھوتی، رامائن دوالمیکی) اُتر کانڈم سرگ ۳۳ ص ۱۳۳، مہابھارت سبھا پروہ ادھیایہ ۲۱، ادیوگ پروہ ادھیایہ ۳۵، شانتی موپروہ ادھیایہ ۳۲۶، ادیوگ پروہ ادھیایہ ۸، ہری ونش پُران وشنو پروہ شلوک ۴۷، ادھیایہ ۱۲۱ وغیرہ وغیرہ "شرادھ" بزرگوں کی ارواح کو بغرض ایصال ثواب جو کھانا کھلایا جائے یا جو نذرانہ دیا جائے اسکو شرادھ کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں (ملاحظہ ہو اشلوک ۳، ادھیایہ ۲۱۸ سکند پُران ناگر کھنڈ ۶)

(و) آبادی کے جانوروں میں سے سات اور جنگلی جانوروں میں سے سات بلحاظ شرافت ذات قربانی کیلئے منتخب کئے گئے ہیں (اشلوک ۲۱ مہابھارت شانتی موپروہ ادھیایہ ۱۶۸)۔ انکی تفصیل شانتی پروہ ادھیایہ ۲۶۹ کے حاشیہ پر یوں درج ہے۔ گائے، بکرا، انسان، بھیڑ، خچر، گدھا یہ آبادی کے جانور ہیں۔ شیر، چیتا، سور، بھینس، ہاتھی، ریچھ اور بندر یہ سات جنگلی جانور ہیں۔

ان سب کے ذبیحہ کے جو طریقے اور موقعے ہیں انکو نظر انداز کیا جاتا ہے۔

۱۔ قرونِ وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب ص ۷۲، ص ۷۳

ایک کا نام "جنبکست" اور دوسرے کا "زنبکست" ہے۔ یہ اسّی ہاتھ بلند ہے... ہندوستانی اس کا حج کرتے ہیں۔ اور قربانی و بخور وغیرہ چڑھاتے ہیں اور قاعدہ یہ ہے کہ جو لوگ زیارت کے لئے آتے ہیں وہ اس جگہ سے پاپیادہ ہو جاتے ہیں جہاں سے وہ (بت) نظر آنے لگتا ہے اور اگر غلطی سے اس کے خلاف ہو جائے تو پھر اسی جگہ واپس جانا پڑتا ہے کہ جہاں سے وہ نظر نہ آئے اور واپسی میں پھر جہاں سے نظر آنے لگے تو پیدل ہو جاتے ہیں اور یہ محض اس کی عظمت و بزرگی کے لئے ہے۔ یہاں کبھی کبھی پچاس ہزار تک جانیں قربان ہو جاتی ہیں"۔ مؤلف نے اس کی تشریح نہیں کی کہ یہ جانیں جانوروں کی ہوتی تھیں یا آدمیوں کی لیکن ابن رستہ (۲۹۰ھ / ۹۰۳ء) کی تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ آدمی بھی اپنی جانیں قربان کرتے تھے۔ وہ ملتان کے بتوں[1] کے بارے میں لکھتا ہے کہ "بعض ہندو اس (بت) کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اپنی آنکھیں نکال کر اپنے ہاتھ پر رکھ لیتے ہیں اور اُس سے اپنی عمر کے طویل ہونے اور روزی میں اضافہ کئے جانے کی بابت عرض کرتے ہیں۔ بعض ہندو اس خیال کے دیکھے کہ وہ اِس بت سے اس پر فدا ہونے کی اجازت لیتے ہیں اور جب اس کو اجازت مل جاتی ہے (جس کا کوئی طریقہ برہمنوں نے نکالا ہوگا) تو وہ ایک لمبی لکڑی لیکر اس کا سِرا نوکیلا بناتے ہیں اور اس کو زمین میں گاڑ دیتے ہیں پھر اوپر جا کر وہ (جس کو اجازت مل چکی ہے) اس پر اپنا پیٹ رکھ کر اس طرح دباتا ہے کہ وہ نوکیلی لکڑی اُس کے دوسرے جانب سے نکل جاتی ہے اور وہ مر جاتا ہے"۔ اِسی طرح کے اور بھی توہمات ہیں جن کا ذکر کرنے کے بعد لکھتا ہے "اس بُت کیلئے ایک باورچی خانہ بھی ہے جہاں عمدہ چاول[2] پکائے جاتے ہیں۔ اِس کی علاوہ

ع۱:۔ ابن رستہ نے جس بُت کا ذکر کیا ہے وہ غالباً خالص ہندوؤں کا ہے اس کو شو کی مورتی اور جو مکھی بھی کہتے ہیں بعد کے سیاحوں نے جس بُت کا ذکر کیا ہے وہ غالباً گوتم بدھ کی مورتی ہے۔ ملاحظہ ہو جلد اول ص۷۷، ص۷۸ تاریخ ہذا قلمی۔ ع۲:۔ برہما اور مدراس کی مندروں میں اب بھی مورتیوں کو کھانا کھلایا جاتا ہے لیکن کھانے میں زیادہ تر لڈو اور پھل ہوتے ہیں (ملاحظہ ہو فٹ نوٹ بر صفحہ ۲۰۴ تاریخ سندھ از مولانا سید ابو ظفر صاحب ندوی)

دوسرے قسم کی چیزیں مثلاً مچھلی، ساگ وغیرہ تیار کرکے اس کے آگے اس طرح رکھا جاتا ہے کہ کیلے کا بہت بڑا پتّہ جس کا عرض اس قدر ہوتا ہے کہ ایک یا دو آدمیوں کو اس میں لپیٹ سکیں اس کے آگے بچھا دیتے ہیں پھر انسان کے نصف قد کے برابر چاول اُنڈیل دیتے ہیں پھر سب سے بڑا اپجاری کیلے کا ایک پتّہ بطور پنکھے کے جھلتا ہے یہاں تک کہ اس (گرم چاول) کے ابخرات بت کے مُنہ کو لگتے ہیں اور اسی کو وہ لوگ اس کا کھانا سمجھتے ہیں ..... کھانے سے قبل گانا بجانا ہوتا ہے کبھی کبھی سو سولڑکیاں (جو غالباً دیو داسی ہونگی) جن کو اسی کام کے لئے وظیفہ ملتا ہے اِس کام کو انجام دیتی ہیں ..... کھاتے وقت دروازہ بند کر دیتے ہیں اور جب وہ (بت) کھا چکتا ہے تو دروازہ کھول دیتے ہیں۔ اس کے بعد کھانا وقف ہے جو چاہے کھائے یہاں تک کہ پرندے اور کتّے بھی اس سے نفع اٹھاتے ہیں۔ یہ کام ہر روز کیا جاتا ہے......"

سلیمان تاجر (۲۳۷ھ ۸۵۱ء) جس نے بسلسلۂ تجارت عراق سے چین تک متعدد سفر کئے ہیں اور جس کے بیانات سلسلۃ التواریخ کے نام سے ۱۸۴۵ء میں پیرس سے شائع ہو چکے ہیں ہند کی بعض توہم پرستانہ غیبی آزمائشوں کا ذکر کرتے ہوئے۔ لکھتا ہے کہ "ملزم کے ہاتھ پر سات پان رکھ کر اُس پر گرم (دھکتا ہوا) لوہا رکھا جاتا ہے یا کھولتے ہوئے پانی میں سے اس کو انگوٹھی نکالنا پڑتی ہے۔ اگر اس صورت میں اس کا ہاتھ جل جائے تو مجرم خیال کیا جاتا ہے"[1]۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ قانونی سزاؤں کے علاوہ ہندوستان میں غیبی آزمائشوں کا طریقہ بھی رائج تھا۔[2]

ح۱ :۔ عرب و ہند کے تعلقات باب اوّل مولفہ ڈاکٹر سید سلیمان صاحب ندوی

ح۲ :۔ قرون وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب ص ۱۸۷ مولفہ مہا مہوپادھیائے (رائے بہادر) گوری شنکر ہیرا چند اوجھا۔

قرونِ وسطیٰ کے بعض عجیب و غریب رسوم و عادات

اِس عہد کی معاشرتی حالت

کیا تھی اس کا اندازہ لگانے کے لئے اُن بعض رسوم و عادات کا مطالعہ بھی ضروری ہے جن کو البیرونی نے کتاب الہند میں ذرا تفصیل کے ساتھ درج کیا ہے۔ البیرونی نے ہندستان میں ایک عرصہ تک رہکر یہاں کے مذہب، ادب، جغرافیہ، ہیئت و نجوم نیز رسم و رواج اور قوانین کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا ہے۔ وہ ہندوؤں کے رسوم و عادات کے بارے میں لکھتا ہے کہ "ہندوؤں کا طور و طریقہ ہمارے زمانہ میں ہمارے ملک والوں کے رسم و رواج سے اس درجہ مخالف ہے کہ وہ اس وجہ سے ہم لوگوں کے لئے ایک اعجوبہ بنجاتا ہے اور ہم لوگوں کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے بالقصد حالت طبعی کو اُلٹ دیا ہے" ان کے بعض رسوم حسب ذیل ہیں:۔

(۱) "یہ لوگ بال بالکل نہیں منڈاتے۔ اِن کی اصلی حالت گرمی کی شدت سے ننگے رہنے کی ہے۔ بال اس لئے نہیں منڈاتے کہ کھلا رہنے سے سر کو گرمی نہ چڑھ جائے۔

(۲) داڑھی[۱] کی حفاظت کے لئے اس کی چوٹیاں گوندھ لیتے ہیں اور موئے زیرناف صاف نہیں کرتے۔

(۳) ننگے رہنے پر فخر کرنے کے لئے ناخن بڑھائے رہتے ہیں اس لئے کہ ناخن کے ساتھ محنت طلب کام نہیں ہوسکتا اور اس لئے بھی کہ اس سے سر کھجانے اور جوں مارنے میں آرام ملتا ہے۔

(۴) نہار مُنہ شراب پیتے ہیں اس کے بعد کھانا کھاتے ہیں۔

(۵) گائے کا پیشاب تھوڑا تھوڑا پیتے ہیں اور اس کا گوشت نہیں کھاتے۔

ع ۱: سلیمان تاجر کے سفرنامے سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگ تین تین ہاتھ لمبی ڈاڑھیاں رکھنے کے عادی تھے (ملاحظہ ہو عرب و ہند کے تعلقات باب اوّل)

(۶) جو شخص لباس میں اختصار کرتا ہے وہ دو انگل کی دھجی (لنگوٹہ) پر قناعت کرتا ہے
جس کو وہ دھاگے سے ستر پر باندھ لیتا ہے۔ جو زیادتی کرتا ہے وہ ایسی سراویل (لہنگا) پہنتا
ہے جس میں اتنی روئی بھری ہوتی ہے جو کئی لحافوں کے لئے کافی ہو۔۔۔۔۔۔

(۷) جوتا اس قدر تنگ رکھتے ہیں کہ اس کو پنڈلیوں کی طرف سے قدم کی طرف موڑ کر پہنتے ہیں۔

(۸) منہ سے پہلے پاؤں دھوتے ہیں۔

(۹) عیدوں میں بدن پر عطر کی جگہ کیچڑ ملتے ہیں۔

(۱۰) مرد عورتوں جیسا لباس پہنتے ہیں ۔۔۔۔ کان میں آویزے (بندے) ہاتھوں میں
کنگن ۔۔۔۔۔۔ اور پاؤں کی انگلیوں میں سونے کی انگوٹھیاں پہنتے ہیں۔

(۱۱) پیشاب پائخانے کے وقت منہ دیوار کی طرف اور ستر چلنے والوں کی طرف کھلا رکھتے ہیں۔

(۱۲) مہادیو کے لنگ کی پوجا کرتے ہیں۔

(۱۳) بغیر زین کے سوار ہوتے ہیں اور اگر زین رکھتے ہیں تو جانور کے داہنی جانب سے
سوار ہوتے ہیں اور سواری میں دوسرے کو اپنے پیچھے بٹھا کر چلنا پسند کرتے ہیں۔

(۱۴) بچہ پیدا ہونے پر مردوں کے ساتھ سلوک کرتے ہیں اور عورتوں کے ساتھ نہیں کرتے۔

(۱۵) گھر کے اندر آنے کے لئے اجازت نہیں طلب کرتے اور باہر بغیر اجازت کے نہیں جاتے۔

(۱۶) جولاہے (کوری) کو ناپاک سمجھتے ہیں لیکن حجام کو اور اس شخص کو جو مرتے ہوئے جانوروں
کو اجرت لیکر ڈوبا کے یا جلا کے مار ڈالتا ہے پاک سمجھتے ہیں۔

(۱۷) جب ان کو کوئی چیز دی جائے تو یہ چاہتے ہیں کہ اس طرح پھینک کر دیجائے جیسے
کتے کی طرف پھینکی جاتی ہے۔

(۱۸) مصافحہ میں ہاتھ کو پشت دست کی طرف سے پکڑتے ہیں۔

(۱۹) مست ہاتھی کے پسینہ کو جو اس کے دونوں رخساروں پر بہتا ہے خوشبو سمجھتے ہیں حالانکہ
وہ نہایت بدبو کی چیز ہے۔"[۱]

(فٹ نوٹ صفحہ ۱۴۸ پر ملاحظہ ہو)

ہندوؤں کا تعصب اجنبیوں کے ساتھ اور اُس کی وجوہات

ہندوؤں کے مذہبی معتقدات۔ رسم و رواج نیز عادات عہد یمنی کے شروع زمانہ میں جیسے بھی کچھ تھے ان کا ایک اجمالی نقشہ گذشتہ سطروں میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے لیکن یہ نقشہ ادھورا رہ جائے گا اگر اس میں یہ نہ دکھایا جائے کہ ہندوؤں کا طرزِ عمل اور برتاؤ اجنبیوں کے ساتھ کیسا تھا۔ البیرونی نے ۴۲۰ھ تک پنجاب کے کسی علاقہ میں رہ کر اپنی علمی تحقیقات کو مکمل کیا تھا اس کو یہیں کے لوگوں سے واسطہ پڑا اور انھیں کا حال اپنی کتاب میں لکھا ہے۔ یہ وہ علاقہ تھا جو البیرونی کے پنجاب میں داخل ہونے سے کچھ ہی دن پہلے اسلامی سلطنت کا جزو قرار پایا تھا۔ اور جہاں اسلامی اثرات مفقود تھے۔ ساتھ ہی ساتھ اس بات کو بھی ذہن میں رکھئے کہ یہاں (پنجاب) کے لوگوں کے دلوں میں حملہ آوروں (مسلمانوں) اور ان کے تمام ہم قوم اور ہم مذہب لوگوں کی طرف سے معاندانہ جذبات کا موجود ہونا بالکل قدرتی بات تھی۔

البیرونی نے ہندوؤں کی مغائرت کے کئی ایک اسباب بتلائے ہیں جن میں سب سے پہلا نمبر زبان کے اختلاف کا ہے۔ اور دوسرا دین کے مختلف ہونے کا۔ دین کے بارے میں لکھتا ہے کہ "ہندو دین میں ہم سے کلی مغائرت رکھتے ہیں۔ نہ ہم کسی ایسی چیز کا اقرار کرتے ہیں جو ان کے یہاں مانی جاتی ہے اور نہ وہ ہمارے ہاں کی کسی چیز کو تسلیم کرتے ہیں۔ اگرچہ یہ لوگ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ مذہبی نزاع کم کرتے ہیں اور بحث و مناظرہ کے سوا جان۔ بدن اور مال کو نقصان نہیں پہونچاتے لیکن غیروں کے

(بقیہ نوٹ صفحہ ۲۰۷)

(۱) کتاب الہند از البیرونی مترجمہ سید اصغر علی ص ۲۳۹ تا ص ۲۴۳۔ جنوبی ہند کے رسوم و عادات کا نقشہ "تحفۃ المجاہدین" مؤلفہ شیخ زین الدین المعبری صفحات ۲۰ تا ۲۴ پر ملاحظہ فرمائیے۔ اس کتاب کا اُردو ترجمہ حکیم سید شمس اللہ قادری نے شائع کرادیا ہے (مؤلف)

ساتھ ان کی یہ روش نہیں ہے۔ غیروں کو یہ لوگ ملیچھ یعنی ناپاک کہتے ہیں اور ان کو ناپاک سمجھنے کی وجہ سے ان سے ملنا جلنا۔ شادی بیاہ کرنا۔ ان کے قریب جانا یا ساتھ بیٹھنا اور ساتھ کھانا جائز نہیں سمجھتے"

اس کے بعد لکھتا ہے کہ "قطع تعلق کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ یہ لوگ رسم وعادات میں ہم سے اس درجہ اختلاف رکھتے ہیں کہ اپنے بچوں کو ہم سے اور ہماری ہیئت ولباس وغیرہ سے تقریباً ڈراتے ہیں۔ اور ہم لوگوں کو شیطان کی طرف منسوب کرتے ہیں اور شیطان کو خدا کا مخالف یا دشمن قرار دیتے ہیں۔ اگرچہ اس نسبت کا استعمال عام طور پر ہم لوگوں کے حق میں کیا جاتا ہے لیکن وہ ہمارے اور کل دوسری قوموں کے درمیان مشترک ہے"

"نفرت و مغائرت کے بڑھ جانے کا (چوتھا) سبب یہ ہوا کہ فرقۂ شمنیہ (بودھ) اگرچہ برہمنوں سے سخت عداوت رکھتا ہے پھر بھی بمقابلہ دوسرے غیر ہندو مذاہب کے ہندوؤں سے زیادہ قریب ہے" اس کے بعد سبب بیان کیا ہے کہ چونکہ بلخ۔ کابل۔ پنجاب وغیرہ مسلمانوں نے بودھوں سے چھین لئے اس لئے مسلمانوں سے بودھ ہندوؤں کے مقابلہ میں نفرت کرنے لگے۔

مغائرت کا پانچواں سبب اس نے ہندوؤں کی خودپسندی وخود بینی کو قرار دیا ہے اس کے بارے میں وہ تحریر کرتا ہے: "ان لوگوں کا اعتقاد یہ ہے کہ ملک ہے تو ان کا ملک۔ انسان ہیں تو ان کی قوم کے لوگ۔ بادشاہ ہیں تو ان کے بادشاہ۔ دین ہے تو وہی جو ان کا مذہب ہے اور علم ہے تو وہ جو ان کے پاس ہے۔ اس لئے یہ لوگ بہت تعلّی کرتے ہیں اور جو تھوڑا سا علم ان کے پاس ہے اس کو بہت سمجھتے ہیں اور خودپسندی میں مبتلا ہو کر جاہل رہ جاتے ہیں۔ جو کچھ یہ جانتے ہیں اس کو تبلانے میں بخل کرنا اور غیر قوم والے درکنار خود اپنی قوم کے نااہل لوگوں سے بھی شدت کے ساتھ چھپانا ان کی

سرشت میں داخل ہے۔ اس کے علاوہ ان کے گمان میں بھی نہیں ہے کہ دنیا میں ان کے شہروں کے سوا دوسرے شہر اور ان شہروں کے باشندوں کے سوا دوسری جگہ بھی انسان ہیں اور ان کے ماسوا دوسرے لوگوں کے پاس بھی علم ہے۔ یہ حالت یہاں تک پہونچی ہوئی ہے کہ اگر ان سے خراسان وفارس کے علم اور اہل علم کا ذکر کیا جائے تو مخبر کو جاہل سمجھیں گے اور مذکورۂ بالا عیب کی وجہ سے ہرگز اس کو سچا نہ مانیں گے۔ حالانکہ اگر یہ لوگ سفر کریں اور دوسرے لوگوں سے ملیں جلیں تو اپنی رائے سے باز آجائیں۔ باایںہمہ ان کے اسلاف اس درجہ بے خبر نہیں تھے"۔ اتنا کچھ لکھنے کے بعد وہ اپنی آپ بیتی بیان کرتا ہے کہ "ہندوؤں کی زبان نہ جاننے اور ان کی اصطلاحات نہ سمجھنے کی وجہ سے اُن کے منجموں کے مقابلہ میں میری حیثیت وہ تھی جو استاد کے مقابلہ میں شاگرد کی ہوتی ہے" واقفیت حاصل ہونے کے بعد جب وہ ان کو نئی نئی باتیں بتاتا تو پوچھتے تھے کہ تم نے یہ باتیں کس برہمن سے سیکھی ہیں کیونکہ انھیں اس کا یقین ہی نہ آتا تھا کہ برہمن کے سوا کوئی دوسرا بھی علم کا حامل ہو سکتا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ "جب ہم ان سے کسی قدر واقف ہوئے اور ان کو علل کا (یعنی وہ اصول جن پر احکام ومسائل کی بنیاد ہے) تبلانا اور بعض دلائل کی طرف اشارہ کرنا اور حسابات کا صحیح طریقہ سمجھانا شروع کیا تو لوگ تعجب کرتے ہوئے ہماری طرف لپکتے اور سیکھنے کے لئے پروانہ وار گرتے تھے اور اس ہندو عالم کو دریافت کرتے تھے جس کو ہم نے دیکھا اور جس سے علم حاصل کیا ہے۔ اور ہم اُن لوگوں کو اُن کی حیثیت دکھلاتے اور فخر کے ساتھ ان کے مقابلہ میں اپنی برتری جتلاتے تھے۔ حالت یہ ہو گئی تھی کہ یہ لوگ ہم کو تقریباً جادوگر کہتے تھے اور اپنے بڑے لوگوں کے سامنے میرا ذکر اپنی زبان میں سوائے لفظ ساگر (بحر) یعنی سمندر کے اور ایسے پانی کے جو اس قدر ترش ہو جائے کہ سرکہ سے بھی بڑھ جائے، دوسرے لفظ سے نہیں کرتے تھے"[۱]

---

[۱]: کتاب الہند باب اول از البیرونی۔

البیرونی کی اس عینی شہادت سے آپ قرون وسطیٰ کی سوسائٹی کی اخلاقی معاشرتی نیز تمدنی حالت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ آپ اس امر کا بھی اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس عہد کی علمی قابلیت و واقفیت کا درجہ دوسرے متمدن اسلامی ممالک کے مقابلہ میں کیا تھا۔

خلاصۂ کلام

المختصر جدید ہندومت کے فلسفۂ زندگی اور اس کے بنیادی اصولوں پر نظر ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ ان کے (ہندوؤں کے) پورے نظام تمدن میں جو روح کام کر رہی ہے وہ اس عقیدہ پر مبنی ہے کہ انسان کی موجودہ زندگی نتیجہ ہے اس کے ان اچھے یا برے کرموں کا جو اس سے عمداً یا سہواً اس کی پچھلی زندگی میں سرزد ہوئے ہیں۔ اس عقیدے نے ہندوستان کی عالمگیر انسانی برادری کی اس تقسیم پر مہر تصدیق لگا دی جو ظاہر ہے کہ ایک مخصوص طبقہ کو خدائی کا درجہ دینے کے لئے روا رکھی گئی تھی۔ اس کی وجہ سے اپنی اپنی جگہ ادنیٰ سے ادنیٰ مزدور بھی راضی بہ رضائے تقدیر تھا۔ ہر موقعہ پر وہ اپنی ذلت ہوتے دیکھتا تھا اور خاموش رہتا تھا۔ ایک ہی قصور پر عدالت میں اس کو زیادہ سے زیادہ اور دوسرے طبقہ کے افراد کو کم سے کم سزا دیتی تھی۔ بایں ہمہ وہ اس حالت اور ذلت کو اپنے پچھلے کرم کا پھل سمجھتا تھا اور اس کے نزدیک برہمن اور شودر کی یہ تقسیم منجانب اللہ تھی۔

اور پھر اس عقیدہ کی بنا پر جس تمدن کی بنیاد پڑی اس کی یہ نمایاں خصوصیت نظر آتی ہے کہ عام افراد انسانی کو غیر مساوی درجہ پر رکھ کر آزادی اور ترقی کے ولولوں کو ہر طریقہ سے دبانے کی تدبیر کی گئی۔ کسی شودر کی مجال نہ تھی کہ اپنی حالت بہتر بنانے کی سعی کرے یا ملک و قوم کے لئے زیادہ مفید بننے کی آرزو کر سکے۔ اس طرح ویشوں کی واسطے بھی ترقی کا میدان تنگ تھا۔ جس ملک میں ایسی تفریق اور تقسیم روا رکھی جائے اس کی تمام آبادی میں مساوات اور قومی اتحاد کا پیدا ہونا غیر ممکن تھا۔

لیکن ہندوستان کی آبادی کے یہ چاروں بڑے بڑے طبقے بھی اپنی اپنی جگہ ایک متحد گروہ نہ تھے بلکہ ہر طبقے میں الگ الگ بہت سی ذاتیں بن گئیں تھیں۔ ہر شخص اپنی ذات یا برادری کے رسم ورواج اور آئین وضوابط کا پابند تھا۔ اور اس کی اصلی قوم یا ملک جو کچھ سمجھو یہی محدود جماعت تھی۔ یہاں پر اتنا اور یاد رکھئے کہ ہر ملک کے اندر ترقی کے اس ابتدائی دور میں جبکہ انسان نے آپس میں مل جُل کر رہنا سیکھا تو اس کے تمدّن کی پہلی صورت خاندان۔ قبیلہ یا برادری تھی اور ہر فرد اسی قبیلہ یا برادری کو اپنی دُنیا سمجھتا تھا۔ لیکن زمانہ کی ترقی کے ساتھ جب تمدّن کی ضرورتیں بڑھیں تو مختلف قبائل کے میل جول سے انسانی برادری کا دائرہ بھی وسیع ہوتا چلا گیا اور اگر کسی وجہ سے ملک کی تمام آبادی سیاسی طور پر ایک حکومت کے زیر نگیں نہ رہ سکی تو بھی اُنکے رسم ورواج اور معاشرت کے اصول بہت یکساں ہو گئے۔ اور شادی بیاہ۔ کھانے پینے کی معاملات میں باہمی یگانگت پیدا ہو گئی۔ لیکن ہندوؤں کے قبائل یا برادریوں میں جس قسم کی "پابندی" کا آئین مروج تھا اور ہے۔ اُس کی نظیر کسی ملک میں نہیں مل سکتی۔ تو پھر ایسی سوسائٹی جو ابھی تمدن کے ابتدائی دور میں تھی اور اُسی پر قائم رہنا چاہتی تھی بھلا زمانہ کی تیز رفتاری کا ساتھ کیونکر دے سکتی تھی۔

اس لئے بعض مورخین کا یہ کہنا کہ "ہندوؤں کی ترقی تمدن کو غیر اقوام کے حملہ نے خراب کیا صحیح نہیں ہے۔ تاریخ سے یہ بات صاف ظاہر ہے کہ ہندوؤں کے عرصہ دراز (۲۵۰۰ ق م ۱۰۰۰ء تک) ہندوستان میں رہنے کے بعد مسلمان اس ملک میں آئے ہندو تمدن اگر ترقی کی طرف مائل ہوتا تو اس کا بہت کافی وقت اور موقع تھا لیکن ہم دیکھتے ہیں۔ کہ جس قدر زمانہ گذرتا گیا اُسی قدر ہندوؤں میں زوال وپستی کے آثار پیدا ہوتے چلے گئے۔ قدیم مذہب میں جس قسم کی سادگی اور زندہ دلی پائی جاتی تھی اس کا مقابلہ جدید ہندو دھرم سے کیجئے۔ تو زمین وآسمان کا فرق نظر آئیگا۔ اور ثابت ہوگا

کہ عہد یمنی کے شروع میں ہندو سوسائٹی پر ایسے عقائد وخیالات چھا گئے تھے جو آدمی کی ساری خوشدلی اور اولوالعزمی کو مٹا دیتے ہیں۔ زندگی اور زندگی کا ہر فعل۔ قوم وسلطنت کا عروج وزوال غرضکہ ہر چھوٹا بڑا واقعہ "کرموں کا پھل" اور "ہونی بات" مانا جاتا تھا تناسخ "یعنی پیدائش وموت کے لامتناہی دور پر غور کرتے کرتے اگر دماغ پریشان نہ ہوتا تو اس قابل بھی نہ رہتا تھا کہ انسان اپنے عزم وفکر سے کام لیکر اپنے مستقبل کو بہتر بنانے کی سعی کرتا۔ اس فلسفہ کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ عمل کی قوتیں مضمحل ہو جائیں اور اخلاق واذہان اور سیاست ومعاشرت میں ہر قسم کی ترقیاں رُک جائیں۔ یہی ہندو قوم کا اصلی مرض تھا۔ اس کا الزام کسی غیر قوم کو دینا فضول ہے۔ بلکہ سچ پوچھئے تو ہندوستان کا مہلک جمود کسی بہت بڑے انقلاب کے بغیر ہرگز دور نہیں ہو سکتا تھا۔ اور یہ انقلاب مسلمانوں کے آنے سے بروئے کار آیا۔

جس کی وجہ سے ملک میں اس سرے سے اُس سرے تک از سر نو زندگی کے آثار پیدا ہو گئے"[۱]

---

[۱]۔ بحوالہ "تاریخ ہند" مولفہ ہاشمی صاحب ص۱۵۲۔

باب سوم

نئی حکومتیں ۷۰۰ء تا ۱۲۰۰ء

فصل اوّل ۔ راجپوتوں کا عہد حکومت

سندھ کے حالات بیان کرتے وقت ہم یہ بتا چکے ہیں کہ راجہ ہرش (۶۰۶ تا ۶۴۷) کے بعد قنوج کی سلطنت کا شیرازہ بکھرتے ہی شمال و جنوب، مشرق و مغرب میں بہت سی چھوٹی چھوٹی ریاستیں خودسر ہوگئیں ۔ اور ان میں آئے دن لڑائیاں اور فسادات رہنے لگے ۔ شخصی و راثتی حکومتوں میں مرکز کمزور ہوتے ہی سرداران سلطنت کا خودمختار و خودسر ہو جانا کوئی نئی بات نہیں ہے ۔ ہندوستان نے بارہا طوائف الملوکی کے دور دیکھے ہیں ۔ لیکن ہندوؤں کی تاریخ میں اِس مرتبہ (۷۰۰ ۔ ۱۲۰۰) کا بگڑنا ایسا تھا جس کے بعد پھر پنپنا انھیں نصیب نہ ہوا یہی سبب ہے کہ قدیم تاریخ کے اس آخری دور میں ہمیں اشوک یا چندرگپت جیسا کوئی اقبال مند فرمانروا دکھائی نہیں پڑتا ۔ طاقتور سے طاقتور ریاست کی حدود حکومت بھی ہندوستان کے دو ایک صوبوں سے آگے نہ بڑھ سکیں حشرات الارض کی طرح نکلی ہوئی ان ریاستوں کے حالات جمع کرنا صرف اس مورخ کا کام ہے ۔ جو کسی خاص ریاست کی مقامی تاریخ تیار کرے ۔ ہم صرف اس پر اکتفا کریں گے کہ بعض مشہور ریاستوں اور شاہی خاندانوں کے مجمل حالات لکھ دیں تاکہ ناظرین کو اس بات کا سرسری اندازہ ہو سکے کہ خیبر سے آنیوالے ترک مسلمان سے کچھ پہلے ہندوستان کی سیاسی حالت کیا تھی ۔



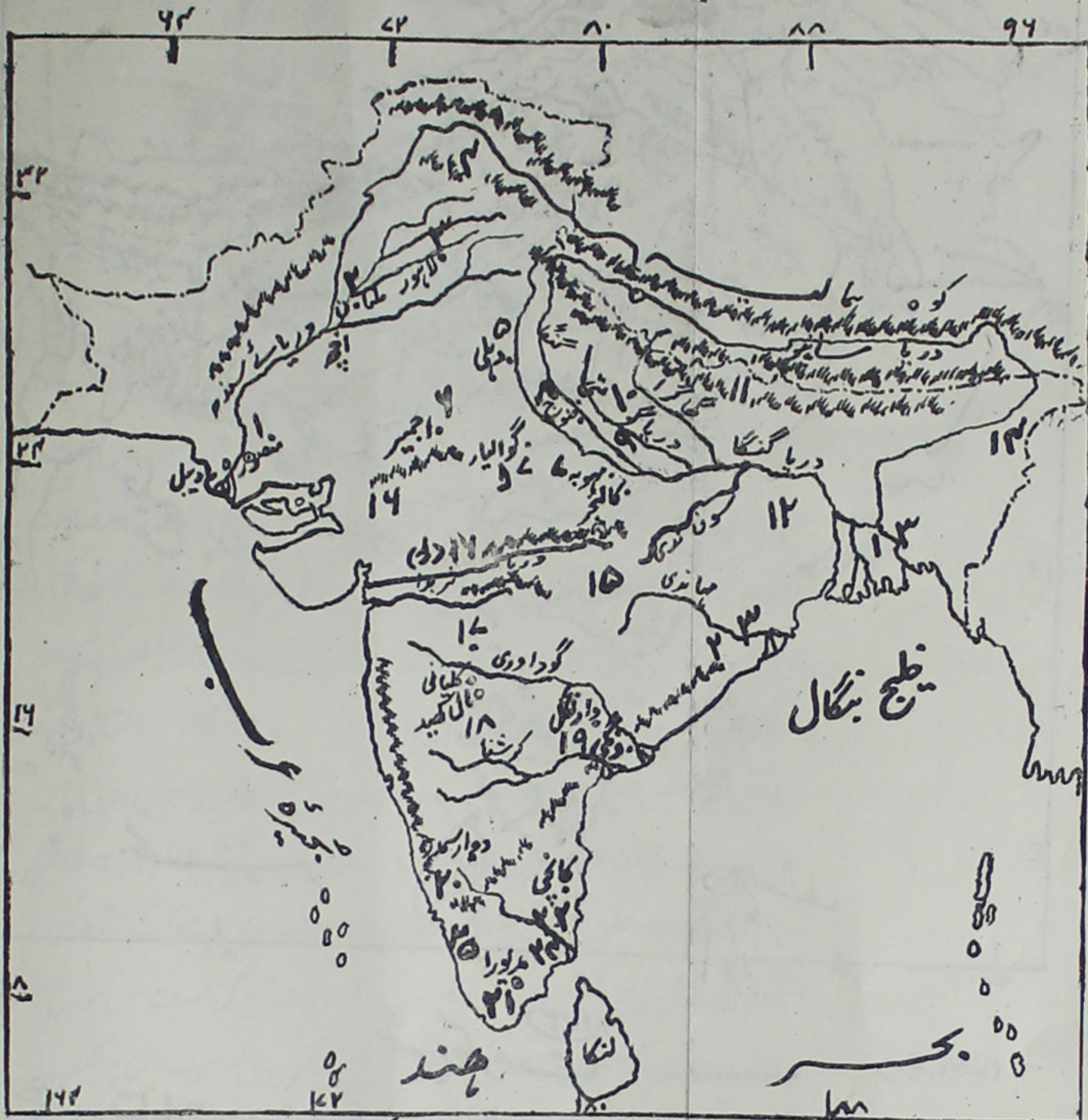
شمسی حکومت ۱۲۳۶ء

(مرتبہ مؤلف) ....

مشہور مقامات:۔ ۱۔ سیالکوٹ ۲۔ جالندھر ۳ کوئل ۴ برن ۴ امروہہ ۵ سنبھل ۶ بدایوں ۸ قنوج ۹ کالپی ۱۰ اودھ ۱۱ فیض آباد ۱۲ کڑا ۱۳ الہ آباد ۱۴ پنڈوہ ۱۵ اکدالہ ۱۶ ست گانوں ۱۷۔ ونگی ۱۸ کلیانی ۱۹ مال کھید ۲۰ ترچناپلی ۲۱ تنجور ۷ کانٹھ

مقابل صفحہ ۱۵۶

راجپوتوں کا زمانہ



مشہور ریاستیں:- ۱ منصورہ ۲ ملتان ۳ ہندوشاہی ۴ کشمیر ۵ تومر ۶ چوہان ۷ چندیلے ۷ا کچھپ گھٹ ۸ گورجر-پرتہار-گہرداد ۹ بہار ۱۰ اتھارو ۱۱ نیپال ۱۲ پال ۱۳ سین ۱۴ آسام ۱۵ کلچری ۱۶ سولنکی ۱۶ا پرمار ۱۷ یادو ۱۸ چالوکیہ-راشٹرکوٹ ۱۹ کاکتی ۲۰ ہوئسل ۲۱ پانڈیہ ۲۲ چولا ۲۳ گنگا خاندان ۲۴ پلوی ۲۵ چیرا۔

(مرتبہ مؤلف)

راجپوت کون ہیں

اس زمانے میں سب سے نمایاں چیز راجپوت قوم کا غلبہ ہے۔ جن کے کئی خاندانوں کی شمالی ہندوستان میں جابجا حکومتیں قائم ہوئیں۔ اُن کی اصل ونسل کے بارے میں اب کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ یورپی محققین نیز اکثر علماء ہند[1] کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ لوگ اُن حملہ آور قبائل کی اولاد سے ہیں جو گپتا خاندان کے زوال کے بعد سے ۷۰۰ صدی عیسوی تک برابر ہندوستان میں آتے رہے برہمنوں نے ان کو حکمراں ہونے کی وجہ سے سوسائٹی میں اونچی جگہ دیکر نئے ہندو مت کا حامی بنا لیا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس موقع پر پنجاب کے ایک نہایت مشہور ہندو لیڈر و مورخ لالہ لاجپت رائے کی تاریخ ہند حصہ اوّل سے راجپوتوں کی اصلیت کے بارے میں حسب ذیل اقتباس پیش کر دیا جاوے۔

"اس میں کچھ شک نہیں کہ موجودہ ہندو سوسائٹی میں ایسے بہت سے آدمی شامل

---

[1]:- ڈاکٹر ایشوری پرشاد صاحب نے راجپوتوں کے حسب ونسب پر بہت تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ ملاحظہ ہو میڈیول انڈیا ص ۲۵ تا ص ۳۰ نیز

1. Early history of India by Smith
2. Annals and Antiquities of Rajasthan by Tod edited by Crooke vol I, PP73—97.
3. Imperial Gazetteer Vol II PP 308—9
4. Dr Bhandarkar (J. Bom. B. R. A. S 1903, PP413-33
5. History of Mediaeval India Vol II PP1-63 by vaidya
6. Journal Antharop Institute 1911, P.P 42.

مذکورۂ بالا نامور مورخین کے بخلاف سری گوری شنکر اوجھا کی رائے یہ ہے کہ راجپوت دراصل قدیم کشتریوں کی اولاد سے ہیں (ملاحظہ ہو ہسٹری آف راجپوتانہ جلد اوّل)۔

ہیں۔ جو خالص آریہ نسل سے نہیں ہیں۔ جو مشرق یا مغرب سے ہندوستان میں آئے۔ اور جن کو ہندوؤں نے اپنے مذہب میں شامل کر کے اپنی سوسائٹی کا مقرر ممبر بنا لیا ....

یہ امر بھی تاریخی طور پر ثابت شدہ سمجھ لینا چاہیئے۔ کہ شاک اور یوچی قوم کے بہت سے آدمی جو کہ ترکمانی نسل سے تھے سن عیسوی کی ابتدائی صدیوں میں اس ملک میں آئے اور ہندو سوسائٹی میں داخل ہو گئے۔ چنانچہ یورپین محقق اقوام جاٹ۔ اہیر اور گوجروں کو بھی انھیں قبیلہ جات میں سے گنتے ہیں۔ لیکن یہ بحث بہت حد تک فضول ہے۔ راجپوتوں کو۔ جاٹوں کو۔ گوجروں اور اہیروں کو ہندو سماج اپنا رکن سمجھتی ہے اور یہ امر کہ وہ کب اور کس طرح ہندو سوسائٹی میں داخل ہوئے۔ بالکل غیر متعلق ہے اور اس پر زیادہ بحث کرنے کی ضرورت نہیں۔ جس طرح بیسیوں خاندان برہمنوں کے اصلی آریہ نسل سے نہیں ہیں بلکہ مخلوط ہیں اسی طرح سے موجودہ راجپوت بھی ہو سکتے ہیں۔" مدراس کے ایک نہایت معروف مورخ مسٹر کے۔ ایم۔ پانکار ایم۔ اے بھی راجپوتوں کی اصلیت کے بارے میں قریب قریب وہی رائے رکھتے ہیں جو لالہ لاجپت رائے صاحب کی ہے۔ مورخ مذکور اپنی کتاب "تاریخ ہند قدیم" میں راجپوتوں کی نسبت لکھتے ہیں۔

"راجپوتوں کا نسب اور ان کی قومیت تاریخ ہند کا لاینحل معمہ ہے اور ان کی اصل ابھی تک سربستہ راز بنی ہوئی ہے۔ غالباً زیادہ تر راجپوت قوم مغول یعنی تاتاری فاتحین کی نسل سے ہیں۔ قوم "کش" مرور ایام سے ہندو مذہب اور ہندو تہذیب اختیار کر کے آریہ ورت کے فرزندوں میں داخل ہو چکی تھی۔ بعد میں آنے والے تاتاری قبائل بھی جنھوں نے دولت گپتا کا شیرازہ منتشر کر دیا تھا اور علاقہ پنجاب میں زبردست حکومت قائم کر لی تھی آریہ مذہب اختیار کر چکے تھے۔ قیاس غالب ہے کہ یہی تاتاری قبائل آریہ مذہب میں داخل ہو کر راجپوتوں کے نام سے مشہور ہو گئے۔ راجپوت روایات

کے مطابق یہ قوم "اگنی کل" یعنی آگ کی نسل سے پیدا ہوئی ہے۔ پرمر۔ پرہار۔ چوہان اور سولنکی چاروں مشہور راجپوت ذاتوں کا سلسلۂ نسب آگ پر جاکر ختم ہوتا ہے۔۔۔ ان ذاتوں کے علاوہ کچھ ایسی ذاتیں بھی راجپوتوں میں شامل ہوگئی ہیں جو نسلاً ہندوستان کے قدیم باشندوں سے تعلق رکھتی تھیں اس دور کی (ہرش کے بعد) طوائف الملوکی اور بے ربطی سے فائدہ اٹھاکر یہ ذاتیں ذی اثر اور ذی اقتدار ہوگئیں اور سیاسی اقتدار نے انھیں راجپوت بنا دیا چندیل۔ گرہ وِیر اور راٹھور راجپوت اسی شاخ سے ہیں۔ یہ تینوں ذاتیں جنوبی راجپوت کہلاتی ہیں شمالی راجپوت یعنی پرمر پرہار اور چوہان جنوبی راجپوتوں سے ہمیشہ سرگرم پیکار رہتے تھے۔"

مذکورۂ بالا اقتباسات پیش کرنے کا مطلب یہ ہے کہ محمد بن قاسم کی حملہ آوری کے زمانہ سے راجپوتوں کا عروج شروع ہوا۔ یہ ہندی قوم نہیں ہیں۔ بلکہ ان میں کے اکثر قبیلے مغول و تاتاری ہیں جو مسلمانوں کی آمد کے وقت یا اس سے کچھ ہی پہلے ہندی قوم میں شامل ہوئے تھے۔ جنوبی راجپوت ہندوستان کی غیر آریہ قوموں سے تعلق رکھتے ہیں۔ برہمنوں نے بودھوں کی سیاسی حالت کے اضمحلال و کمزوری سے فائدہ اٹھاکر اپنے اقتدار کو دوبارہ واپس لانے کے لئے اپنی اس نوزائیدہ راجپوت قوم سے حسب دلخواہ مدد لی۔ یہ نئی قوم مغلوں اور تاتاریوں کے جنگجو قبائل اور غیر آریوں یعنی شودروں کے ذی حوصلہ اور بہادر لوگوں کو اپنا ہمدرد اور ہواخواہ بناکر تیار کی گئی اور ان کو راجپوت کا خطاب دیا گیا۔

راجپوتوں کی بعض خصوصیات

راجپوتوں کے سب سے بڑے طرفدار مشہور و معروف مورخ مسٹر ٹاڈ اور پنڈت گوری شنکر اوجھا نے ان کی قومی خصوصیات کا نہایت دلچسپ خاکہ پیش کیا ہے۔ مسٹر ٹاڈ نے صحیح لکھا ہے کہ راجپوت اقوام نے ملک کی حفاظت کے لئے جان توڑ کوشش کی۔ وہ بڑے

حوصلہ مند، بہادر، نڈر، راستباز، مہاں نواز اور بات کے پکے ہوتے تھے۔ اپنی آن پر مٹنا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ مکر و فریب سے جو ایشیاء والوں کی قومی خصوصیت ہے راجپوت بڑی حد تک محفوظ تھے اور اگر اس سے انھوں نے کبھی کام لیا بھی تو وہ بعض ایسی ناگزیر صورتوں کی وجہ سے تھا جنھوں نے انھیں حملہ آوروں کے دباؤ کی وجہ سے مجبور کر دیا تھا۔ راجپوتوں کو عزت نفس کا از حد خیال تھا چونکہ وہ خود شریف و بہادر تھے اس لئے اپنے بہادر حملہ آوروں کے ساتھ بھی شرافت کا برتاؤ کرتے تھے۔ میدان جنگ میں دغا و فریب سے کام لینا وہ جانتے ہی نہ تھے اور نہ لڑائی کے دوران میں غریب و بے کس لوگوں کو ستاتے تھے۔ کسی قوم کی شرافت و تہذیب کا مظہر وہ طرز عمل ہے جو صنف نازک کے ساتھ روا رکھا جائے۔ وہ عورتوں کی بڑی عزت کرتے تھے اور اُن کی حرمت کی خاطر جان کی بازی تک لگا دینے سے گریز نہیں کرتے تھے۔ راجپوت عورتیں جن کو ملک الموت مہد سے لحد تک ہر وقت خوش آمدید کہنے کے لئے تیار رہتا تھا بڑی بہادر، وفا شعار و وفا پرست ہوتی تھیں وہ اپنی ناموس کی حفاظت کے لئے بیک وقت سیکڑوں کی تعداد میں جلتی ہوئی آگ میں کود کر ہنستے کھیلتے جان دیدیتی تھیں۔ اِس رسم کا نام جوہر تھا۔ بہر حال راجپوت عورتیں ہوں یا مرد اِن کی بہادری کی کہانی دُنیا کی تاریخ میں لاثانی ہے۔ لیکن جہاں ان میں اتنے اوصاف تھے وہاں کچھ ایسی بُرائیاں بھی تھیں جن کے سبب سے آگے چل کر انھیں مسلمانوں کی ماتحتی قبول کرنا پڑی وہ افیون، شراب، اور دوسری نشیلی چیزوں کا استعمال کرتے تھے اور دختر کُشی کی رسم شریف سے شریف گھرانے میں بھی معیوب خیال نہیں کی جاتی تھی اسی طرح رسم ستی کی وجہ سے عورتوں کی ایک بڑی تعداد سے سوسائٹی محروم ہو جاتی تھی۔ یہ رسم خاندانی وقار کو برقرار رکھنے کے لئے ضروری سمجھی جاتی تھی جس کی وجہ سے ایسی عورتوں کو بھی جو ستی ہونا نہیں چاہتی تھیں زبردستی آگ کی نذر کر دیا جاتا تھا۔

عزت وآبرو کا انھیں اتنا خیال رہتا تھا کہ ذرا ذرا سی بات پر مرنے مارنے کو تیار ہو جاتے تھے اور اسی وجہ سے ان میں ہمیشہ آپس میں تلوار چلتی رہتی تھی جس نے قومی اتحاد کو غیر ممکن بنا دیا۔[1] صغر سنی کی شادیوں کا رواج عام ہو چلا تھا اور امیروں میں متعدد شادیاں کرنا معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔[2] چنانچہ اجمیر کے راجہ بیسلدیو کی ساٹھ رانیاں تھیں اور اسکی ایک بیوی "راج متی" نامی ۱۲ برس کی عمر میں بیاہ کر اجمیر آئی تھی۔

انتظام حکومت

راجپوتوں کے دور حکومت میں مرکزی حکومت کا تصور ختم ہو چکا تھا ملک بیشمار چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں منقسم تھا جن میں بڑی سے بڑی ریاست کے حدود حکومت عہد حاضر کے ایک صوبہ سے زائد شاید کبھی نہیں ہوئے ان ریاستوں کے راجہ اپنے پڑوسیوں کو شکست دیکر اپنی ریاست کو وسیع کرنے کی فکر میں لگے رہتے تھے اس طرح اکثر وبیشتر سب ہی چھتریوں کا مقصد چکرورتی راجہ بننے کا رہتا تھا اسلئے پڑوسیوں سے نبرد آزمائی کا ایک لامتناہی سلسلہ جاری رہتا تھا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تقریباً سب ہی ریاستوں کا انتظام حکومت فوجی ہو گیا۔ ہر راجہ سب سے زیادہ توجہ اپنی فوجی طاقت کو مضبوط کرنے میں صرف کرتا تھا۔ اسی سبب سے ریاست میں جاگیرداری کے رواج کو فروغ ہوا۔ ہر جاگیردار اپنی محدود زمینداری میں ایک مستقل چھوٹا راجہ مانا جاتا تھا اس کا فرض تھا کہ وقت ضرورت اپنے آقا کی روپیہ اور فوج سے مدد کرے۔ یہ جاگیردار بالعموم راجہ کے رشتہ دار یا اہل قبیلہ ہوتے تھے جن کی وفاداری مسلم تھی لیکن بعض اوقات ایسا بھی ہوتا تھا کہ وہ وقت پڑنے پر خود بھی راجہ ہونے کا خواب دیکھا کرتے تھے۔ اسلئے وہ بھی فوج کا زیادہ خیال رکھتے تھے ان کا رعایا سے صرف

ع[1]:۔ ٹاڈ راجستھان صفحہ ۴۴-۴۲، جلد دوم میڈیول انڈیا صفحہ ۳۹-۲۶ از ڈاکٹر ایشوری پرشاد صاحب

ع[2]:۔ تاریخ ہند از اودھ بہاری پانڈے صفحہ ۱۳۰، بیسلدیو راسو صفحہ ۲۵، ۱۱-۱۰ مولفہ ستیہ جیون ورما ایم۔ اے، قرون وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب صفحہ ۱۹۳ تا صفحہ ۱۹۵۔

اتنا تعلق رہتا تھا کہ ان کو سالانہ محصول ملجائے اور کوئی بغاوت نہ ہو۔ رعایا کی ترقی وبہبودی کا انھیں کوئی خاص خیال نہیں رہتا تھا۔ اس لئے رعایا کو بھی ان سے کوئی ہمدردی نہیں تھی وہ اپنا فرض صرف لگان دینا سمجھتی تھی۔

قانوناً یا رواجاً راجہ پوری ریاست کا مالک سمجھا جاتا تھا۔ وہ ریاست میں امن و امان قائم رکھنے کے لئے قانون بناتا تھا۔ رعایا اس کے پاس اپنی فریاد لے جاسکتی تھی اس طرح وہ صدر منصف کا کام بھی کرتا تھا۔ لڑائی میں وہ ہمیشہ سپہ سالاری کا عہدہ اختیار کرتا تھا۔ جو راجہ فوجی قابلیت نہیں رکھتا تھا اس کا عرصہ تک گدی پر رہنا ناممکن ہوجاتا تھا۔ اس کے مشیر کار برہمن وزیر، اعلیٰ عہدے دار اور اہل خاندان ہوتے تھے۔ کبھی کبھی برہمن وزیر بھی سپہ سالاری کے فرائض انجام دیتے تھے باقی تمام اونچے عہدے زیادہ تر چھتریوں ہی کو ملتے تھے۔

گانوں کا انتظام قریب قریب گپت عہد کی طرح ہوتا تھا۔ گانوں کی رعایا اپنے آرام کی نگرانی خود ہی کرتی تھی۔ راجہ یا جاگیر دار کے پاس مقدمے بہت کم جاتے تھے کیونکہ عدل وانصاف کا معقول انتظام نہ تھا گو کچھ جج ضرور رہتے تھے۔ جنوبی ہند میں پلووں اور چولوں کے زیر نگرانی مقامی سوراج کے ادارے ترقی کر رہے تھے۔ گانوں کی پنچایتوں کے علاوہ ضلعوں اور صوبوں کے حکمرانوں کی مدد کے لئے رعایا کی منتخب سبھائیں رہتی تھیں جس کی وجہ سے یہاں شمالی ہند کے مقابلہ میں رعایا زیادہ پُر امن اور خوشحال تھی۔

ریاست کے مالیات کا انحصار زیادہ تر لگان اور ان نذرانوں پر تھا جو کسانوں اور ماتحت جاگیر داروں سے وصول ہوتا تھا۔ نیت اور شاستر (قانون) کی رُو سے راجہ کو رعایا سے ٹیکس وصول کرنے کا حق حاصل تھا۔ لگان عائد کرنے کے تین طریقے مروّج تھے[۱] یعنی بٹائی، تخمینی لگان، پیمائشی لگان۔ مسلمانوں نے بھی انھیں

(فٹ نوٹ صفحہ ۱۵۱ پر ملاحظہ فرمائیے)

طریقوں کو اپنے دورِ حکومت میں جاری رکھا۔ لگان کو حکومت جنس یا روپیہ کی شکل میں
وصول کرتی تھی۔ ہندو دھرم شاستر کی رُو سے راجہ کو قانوناً یہ حق حاصل ہے کہ وہ رعایا
سے کل پیداوار کا بقدر ۱/۶ وصول کرے لیکن عملاً یہ شکل قائم نہیں رہ سکی۔ اس کے بیّن[1]
ثبوت ہیں چنانچہ جُتک اور کوٹلیہ ارتھ شاستر میں زائد وصول کرنے کی مراعات روا
رکھی گئی ہیں۔ شکرنیت میں اس کی مزید صراحت ملتی ہے۔ اس کی رو سے ۱/۶ حصہ لگان
صرف بنجر اور پہاڑی زمینوں پر عائد کرنا چاہیئے ورنہ زرخیز زمینوں سے راجہ بقدر ۱/۳،
۱/۴ اور ۱/۲ تک وصول کرسکتا ہے[2]۔ لگان کی یہ شرح یقیناً بہت زائد ہے اور بالخصوص
اس صورت میں جبکہ ریاست کی طرف سے آبپاشی کا کوئی انتظام نہو۔ آبپاشی کی آسانیاں
مہیّا کرنے میں ریاست کے مزید مطالبات پیداوار کے ۱/۵ سے لیکر ۱/۲ تک ہوتے تھے۔
ان کے علاوہ مسلمانوں کی آمد آمد تک بہت سے نئے قسم کے ٹیکسوں کا بار بھی رعایا پر
پڑ چکا تھا جس کے بارِ گراں سے وہ دبی ہوئی تھی اور جن کی ادائیگی اس کے لئے ناقابلِ
برداشت تھی[3]۔ شکرنیت میں مکانوں اور دوکانوں کے ٹیکس کا تذکرہ ملتا ہے اسی طرح
منوجی مہاراج نے ٹیکسوں کی ایک لمبی فہرست دی ہے جس میں خاص خاص ٹیکس
جن جن چیزوں پر عائد کئے جا سکتے ہیں وہ یہ ہیں مثلاً گوشت، شہد، گھی، خوشبویات،

(فٹ نوٹ صفحہ ۱۵۰ ملاحظہ ہو)

1. Agrarian system in ancient India PP 26-27, Administration of the Sultanata of Delhi P.P. 92-129, Hindu Revenue System P.P 37, 38, 61 + 62

۲۔ شکرنیت ص ۱۴۷، ص ۱۴۸

3. History of Mediaeval Hindu India p 140; Albairuni p 276

ادویہ، سیّال چیزیں، پھول، جڑیں، پھل، پتیاں، ہری گھاس، کھالیں، مٹی کی برتن اور پتھر کی چیزیں وغیرہ وغیرہ۔[ع۱]

صنعت وحرفت اور علم وادب کی ترقی

اگرچہ ملک میں مستقل طور پر امن و امان نہیں تھا پھر بھی صنعت و حرفت اور علم و ادب نے کافی ترقی کی۔ اس کا خاص سبب یہ تھا کہ راجہ علماء اور صنّاعوں کی مدد کرنا اپنے لئے باعث فخر سمجھتے تھے اور اپنی شہرت کو قائم ودائم رکھنے کے لئے عمارتیں بنوانا پسند کرتے تھے۔ چنانچہ اس عہد میں بہت سے مندر، تالاب اور درسگاہیں تعمیر ہوئیں۔ مندر بنوانے کے کئی طریقے رائج تھے لیکن سب ہی مندروں میں آرائش اور پتھروں کی کھدائی و کٹائی کا از حد خیال رکھا جاتا تھا۔ بت پرستی کا عام رواج ہونے کی وجہ سے کثرت سے مورتیاں بنائی جاتی تھیں جو بالعموم زیورات سے لدی رہتی تھیں۔ اس عہد میں جو مندر تعمیر کئے گئے ان میں بلحاظ قدامت بھونیشور کا مندر ہے جو ساتویں صدی عیسوی کے طرز تعمیر کا نمونہ ہے۔ کھجوراہو (واقع بندیلکھنڈ) اور پوری (واقع اڑیسہ) کے مندر بھی اپنی آن بان میں انوکھے ہیں اسی طرح ایلورا کا کیلاش مندر اور آبو کا جین مندر بہترین صنعت کے مظہر ہیں۔ ایلورا کی گپھاؤں میں اجنتا کی طرح مصوّری بھی کی گئی ہے فرق صرف اتنا ہے کہ یہ تصویریں برہمن مذہب کے متعلق ہیں جبکہ اجنتا میں جین و بودھ مذہب کے تخیلات کی نقّاشی کی گئی ہے۔ دکن میں بھی بہت سے مندر بنائے گئے جو زیادہ تر ہوئسل خاندان کے راجاؤں کے بنوائے ہوئے ہیں ان میں سوماناتھ پور کا مندر گیارہویں صدی عیسوی میں وِنے دِتیہ بلّال نے تعمیر کرایا۔ بیلور میں وشنو وردھن نے بارھویں صدی عیسوی میں ایک مندر بنوایا اسی طرح ہلیبیڈ میں بارھویں صدی عیسوی کے اختتام پر ایک مندر اسی خاندان کے

ع۱۔ منو باب ہفتم ص ۱۲۹ تا ص ۱۳۲

ایک راجہ نے بنوایا۔ پلّو، چالوکیہ اور چول خاندان کے راجاؤں نے بھی مندروں کے بنوانے میں کافی دلچسپی کا اظہار کیا۔ پلّو خاندان کے راجاؤں نے اپنے دارالسلطنت کانچی ورم کی شان وشوکت کو بیشمار خوبصورت مندر بنوا کر دوبالا کیا۔ ان مندروں میں بعض ساتویں صدی عیسوی کے تعمیر شدہ ہیں۔ ایک ہزار صدی عیسوی میں چول خاندان کے راجہ راج راج نے تنجور میں ایک عالیشان مندر بنوایا۔ چالوکیہ راجاؤں نے بھی اپنے صدر مقام بادامی میں بہت سے نفیس مندر بنوائے۔ ہندوستان کی اس صنعت کا اثر جاوا، سماترا، کمبوڈیا وغیرہ ہندوستانی نوآبادیوں پر بھی کافی پڑا۔

برہمنی مت کو جیسا کہ بتایا جاچکا ہے اِس عہد میں بڑا فروغ حاصل ہوا۔ اس کا اثر علم و ادب پر بھی پڑا۔ چنانچہ شنکراچاریہ نے بھگوت گیتا، برہم سوتر اور اُپ نشدوں کی شرحیں لکھیں۔ دھار راجدھانی میں پدم گپت، دھنن جے، اور دھنکب جیسے لائق و فائق پنڈتوں نے بالترتیب Navasahasankacharita (نوسہاسنک چرت)، Dasarupak (دس روپک)، اور "دس روپک" کی شرح لکھیں۔ اسی طرح ہلایودھ نے علم عروض Pingalchhandsutra (پنگل چھند سوتر) نامی کتاب کی شرح تالیف کی اور اَمت گتی نامی پنڈت نے "شبھاسِت رتن سندوہ" تصنیف کی۔

اِس عہد کے مشہور ڈرامہ نویسوں میں سب سے پہلا نام و کام "بھاب بھوتی" کا ہے اس نے مالتی مادھو، "مہاویر چرت" اور "اُتر رام چرت" تین ڈرامے لکھے یہ آٹھویں صدی عیسوی کا مشہور ڈرامہ نویس ہے۔ قنوج کے راجہ یشوورمن نے اس کی سرپرستی کی یہ راجہ کا درباری شاعر تھا۔ راجہ قنوج کو جب "للتادیتہ مکتاپیڈ" نے تخت سے اُتار دیا تو یہ امیر خسرو کی طرح غنیم کا قیدی بن گیا۔ راجہ کشمیر اس کو قید کرکے لے گیا اب یہ نہیں معلوم کہ وہ کشمیر میں کب تک قید رہا۔ شاعری کے اعتبار سے اس کا پایہ بہت بلند ہے اس کے کلام پر کالیداس کا کافی اثر پڑا ہے۔ بھاب بھوتی کے بعد دوسرا نمبر "بسا کھادت"

اور "بھٹ نارائن" کا ہے یہ دونوں اپنی مشہور تصانیف "مدرراکشس" اور "بینی سمہار"
کی وجہ سے زندۂ جاوید ہیں۔ دسویں صدی عیسوی کا مشہور ڈرامہ نویس "راج شیکھر"
ہے اس نے "کرپورمنجری" کے علاوہ اور بھی کئی کتابیں اپنی یادگار چھوڑیں۔

سنسکرت لٹریچر پر "ماگھ" اور "سری ہرش" کا بھی کچھ کم احسان نہیں ہے۔ انھوں
نے "ششپال بدھ" اور "نیساد ھ چرت" نامی کتابیں تصنیف کیں۔ آخرالذکر شاعر غالباً
راجہ جے چند والیٔ قنوج کا درباری شاعر تھا اس نے اپنی تصنیف میں راجہ نل اور دمینتی کا
قصہ نظم کیا ہے۔ بلہن نے کلیانی کے چالوکیہ راجہ بکرمادیتہ ششم کے کارناموں کو نظم کیا
اور اپنی کتاب کا نام راجہ کے نام کی مناسبت سے "وکرمانک چرت" رکھا لیکن تاریخی
واقعات کے اعتبار سے سب سے مشہور تصنیف کلہن کی ہے اس نے بارھویں صدی
عیسوی کے وسط میں کشمیر کی تاریخ لکھی۔ کتاب کا نام راج ترنگنی ہے مصنف نے اپنے
زمانہ کی سیاسیات میں خود بھی حصہ لیا ہے اسلئے اس کی تصنیف نہایت قابل قدر ہے
گو واقعات پر کہیں کہیں افسانوی پردے پڑے ہوئے ہیں۔ یہی حال جینیوں کے
مشہور عالم "ہیم چندر" کی تصانیف کا ہے۔

گیتوں کو نظم کرنے کا سہرا جے دیو کے سر ہے۔ یہ بارھویں صدی عیسوی کا مشہور
بنگالی شاعر ہے اس نے "گیت گوبند" نامی تصنیف اپنی یادگار چھوڑی۔

نثر نگاروں میں ڈنڈن اور دھن پال پیش پیش ہیں۔ ڈنڈن ساتویں صدی کا مشہور
انشاء پرداز ہے اس نے "دش کمار چرت" اور "اونتی سندری کتھا" دو نہایت عمدہ کتابیں
لکھیں اس کا طرز تحریر نہایت دلنشین ہے۔ دھن پال نے "تلک منجری" اور "رشبھ
تلک" کو لکھکر نام پیدا کیا۔ اسی طرح اور بھی بہت سے کویوں (شاعروں) نے مختلف
مضامین پر کتابیں لکھیں لیکن ان کو فروغ نصیب نہیں ہوا۔

ع ۱:۔ مذکورہ بالا سنسکرت کی اکثر و بیشتر کتابیں راقم الحروف کے مطالعہ میں رہی ہیں۔

پلّووں اور مشرقی چالوکیوں کے اثر سے تامل اور تیلگو ادب کی بھی ترقی ہوئی اور ویشنو آچاریوں نے جنوبی ہند میں بہت سی عمدہ تصنیفات کیں جن کی عزت ویدوں کے مانند تھی۔

یہی وہ زمانہ ہے جبکہ شمالی ہند میں سندھ و پنجاب کے مسلمان حکمرانوں کے زیرِ سایہ ہندو و مسلمانوں کے سیاسی، سماجی، تجارتی، معاشرتی اور علمی تعلقات استوار ہوتے چلے جارہے تھے جن کا راقم الحروف نے جلد اول میں نہایت وضاحت کے ساتھ تذکرہ کیا ہے۔ ان تعلقات کا نتیجہ وہ ہندی ادب ہے جس کی اِس عہد میں داغ بیل پڑی۔ مسلمانوں میں پہلا ہندی شاعر جو اسی (ہندوستان) کی خاک پاک سے اُٹھا مسعود سعد سلمان ہے۔ اِس کے تین دیوان تھے ایک عربی دوسرا فارسی اور تیسرا ہندوستانی ہیں۔ عوفی لکھتا ہے "وا ورا سہ دیوان است، یکے بتازی، یکے بپارسی و یکے بہ ہندوئی" اس طرح اس نے عربی و فارسی کے پہلو بہ پہلو ہندوستانی میں بھی ایک مستقل دیوان اپنی یادگار چھوڑا جو مُلّا عبدالقادر بدایونی کے زمانہ تک موجود تھا[1]۔ یہ شاعر پانچویں صدی ہجری کا ہے۔ ہندی ادب میں یہ عہد "ویرگا تھا کال" (عہد رزم) کے نام سے مشہور ہے[2]۔ اِس زمانہ کے مشہور ہندی کوی تین ہیں۔ ان میں سے پہلے کا نام معلوم نہیں ہوسکا اس نے "کھمان راسو" سمبت ۸۱۰ سے لیکر ۱۰۰۰ تک کسی زمانہ میں ترتیب دیا۔ دوسرا ہندی شاعر "نرپت نالہہ" ہے اس نے اجمیر کے راجہ بیسلدیو کے نام پر سمبت ۱۲۱۲ میں "بیسلدیو راسو" تصنیف کیا[3]۔ اسی طرح تیسرے ہندی شاعر چند کوی نے جو چند بردائی کے نام سے مشہور ہے پرتھوی راج یا رائے پتھورا کے نام پر "پرتھوی راج راسو" ترتیب دیا[4]۔ جس طرح پرتھوی

ع ۱:۔ منتخب التواریخ صفحہ ۳۸ از بدایونی = ع ۲: ہندی ساہتیہ کا اتہاس صفحہ ۲۹ تا صفحہ ۵۲ از پنڈت رامچندر شکل

ع ۳:۔ بیسلدیو راسو صفحہ ۱۷ مولفہ ستیہ جیون ورما ایم۔ اے

ع ۴:۔ پرتھوی راج راسو مولفہ ہری ہرناتھ ٹنڈن ایم۔ اے

راج کے کارناموں کو اُس کے درباری شاعر چند بردائی نے نظم کیا ہے ٹھیک اسی طرح جے چند والیٔ قنوج اور پرمال والی کالنجر و مہوبہ کے کارناموں کو ان کے درباری شعراء بھٹ کیدار (سمبت ۱۲۲۴ تا ۱۲۴۳) اور جگنیک (سمبت ۱۲۳۰) نے بیان کیا ہے۔ بھٹ کیدار نے "جے چند پرکاش" اور غالباً "جے مینک جس چندر کا" نامی کتابیں لکھیں جو آج کہیں نہیں ملتیں لیکن ان دونوں کتابوں سے دیال داس نے فائدہ اٹھایا ہے اور انھیں کتابوں کو سامنے رکھ کر اپنی مشہور کتاب راٹھوڑاں ری کھیات" ترتیب دی۔ یہ کتاب بیکانیر کے ریاستی کتب خانہ میں محفوظ ہے[۱]۔ جگنک کا آلھ کھنڈ بھی گو آج اپنی اصلی حالت میں دستیاب نہیں لیکن شمالی ہند کے ہر ایک گانوٗں میں وہ جس شکل میں پایا جاتا ہے اس سے اس کی قبولیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

بہرحال راجپوتوں کا دور حکومت کئی اعتبار سے نہایت قابل قدر ہے لیکن اس دور کو گذشتہ عہد گپت یا آرین زمانہ کی ترقیات سے کوئی مناسبت نہیں ہندوستان مجموعی حیثیت سے پستی کی طرف مائل تھا اور یہ پستی اُس وقت تک دور نہیں ہوسکتی تھی جب تک کہ قوم کے اندر سیاسی ذہنی انقلاب نہ ہو اس کام کو مسلمانوں نے آکر کس طرح اور کس حد تک پورا کیا اس کی تشریح اگلے ابواب میں ملیگی۔ اب ہم راجپوت قبائل کی ان مشہور ریاستوں کا مختصراً ذکر کریں گے جو راجہ ہرش وردھن کے بعد ہندوستان میں پیدا ہوئیں اور مسلمانوں کی آمد تک باقی رہیں۔

فصل دوم۔ شمالی ہند کی مشہور راجپوت ریاستیں

قنوج راجہ ہرش وردھن کے بعد اس کی سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی لیکن اس کا خاندان ۷۶۰ء تک قنوج کا مالک رہا اس خاندان کا آخری راجہ یشوورمن

---

[۱] ہندی ساہتیہ کا اتہاس ص ۵۰ مصنفہ پنڈت رام چندر شکل

تھا جس کی سرپرستی میں "بھاب بھوتی" نے سنسکرت میں کئی مشہور ڈرامے لکھے۔ یشوورمن کی مملکت پر کشمیر کے راجہ للتادیتہ مکتاپیڈ نے حملہ کیا۔ راجہ قنوج کو شکست نصیب ہوئی اور وہ لڑتا ہوا مارا گیا اس کے مرتے ہی قنوج کی عظمت کا بھی کچھ عرصہ کے لئے خاتمہ ہو گیا۔

للتادیتہ کے جانشین قنوج پر قابض نہ رہ سکے اور معلوم ایسا ہوتا ہے کہ قنوج مگدھ کے پال راجاؤں کا ایک باجگذار صوبہ رہ گیا۔ پھر مالوہ کے پرتہار راجہ ناگ بھٹ دوم (۸۰۰ء تا ۸۲۵ء) نے بنگال کے راجہ دھرم پال سے قنوج چھین لیا لیکن مستقل قبضہ بھوج اوّل (۸۴۰ تا ۸۹۰) کے زمانہ میں ہو سکا۔ آخر میں بھوج اوّل کے پوتے اور مہندر پال (۸۹۰ تا ۹۰۸) کے لڑکے مہی پال (۹۱۰ تا ۹۴۰) کے زمانہ میں پرتہاروں پر زوال آ گیا جبکہ انھیں دکن کے راشٹر کوٹ خاندان کے راجہ اندر سوم کے مقابلہ میں زک اٹھانا پڑی۔ اِردگرد کے تمام علاقے خود مختار ہو گئے۔ پرتہاروں کے قبضہ میں صرف قنوج اور اس کے آس پاس کا علاقہ باقی رہ گیا۔ راجہ راجیپال[1] پرہار (پرتہار) اس خاندان کا آخری طاقتور راجہ تھا۔ جس کو محمود غزنوی نے مطیع و منقاد بنایا ۱۰۱۹ء میں قنوج پر گہروار راجپوتوں نے قبضہ کر لیا۔ اس خاندان میں گوبند چندر (۱۱۱۴ء-۱۱۵۴ء)

ع[1]:۔ راجہ راجیپال پرہار نے چونکہ محمود غزنوی کی اطاعت قبول کر لی تھی اسلئے محمود کے غزنی واپس لوٹ جانے کے بعد راجہ کی ماتحت ریاستوں نے بغاوت کی جن میں کالنجر کا راجہ گانڈہ اور گوالیار کے راجہ ارجن کچھواہہ نے نمایاں حصہ لیا۔ متحدہ فوجوں کا سپہ سالار راجہ کالنجر کا لڑکا ودیا دھر تھا ان متحدہ فوجوں نے راجیپال کو شکست دی اور راجہ میدان جنگ ہی میں راجہ ارجن رئیس گوالیار کے ہاتھ سے مارا گیا۔

(ملاحظہ ہو کتبہ دوب کنڈ (نزد گوالیار) اور کتبہ مہوبہ بحوالہ میڈیول انڈیا مصنفہ از ڈاکٹر ایشوری پرشاد صاحب)

(باقی صفحہ ۱۵۸ پر)

اور اس کا پوتا جے چندر (۱۱۷۰ تا ۱۱۹۴) مشہور ہیں۔ دونوں نے مسلمانوں سے لڑائیاں لڑیں جے چندر آخر میں چندوار کے مقام پر قطب الدین ایبک سے لڑتا ہوا مارا گیا۔ قنوج پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔

گوجر یا پرتھار راجپوت

پرتھار راجپوت اصلاً غیر ملکی نسل سے تھے۔ لیکن برہمنوں نے انھیں بودھوں کے خلاف ہندو مت کا طرفدار بنا لیا تھا۔ ہندوستان کے شمالی مغربی سرحدی صوبہ میں مانسہرہ کے اطراف و جوانب میں اس نسل کے لوگ اب بھی باقی ہیں۔ جو زبان، نسل اور رنگ کے لحاظ سے سرحدی پٹھانوں سے بالکل مختلف ہیں۔ سرحدی صوبہ اصلاً بہت سی قدیم حملہ آور اقوام کا گہوارہ رہا ہے۔ وہاں اب بھی بہت کچھ قدیم روایات کی بنا پر اقوام میں تمیز کیا جا سکتا ہے۔ یہ گوجر کہلاتے ہیں۔ اور سب کے سب مسلمان ہیں۔ علاقہ پنجاب میں گجرات کا ضلع انھیں کے نام پر موسوم ہے۔ و نیز موجودہ صوبۂ بمبی کا شمالی علاقہ جس میں پٹن اور احمد آباد واقع ہیں۔ ایک عرصہ تک مسلمانوں کے عہد حکومت میں گجرات کے نام سے مشہور رہا۔ تاریخ میں پہلے پہل ان کا تذکرہ راجہ ہرش کی سوانح نگار "بان" نے ہرش چرت میں کیا ہے۔ اور جنوبی ہند کے راجہ پل کیسن دوم کے کندہ کرائے ہوئے بعض کتبوں سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کی دونوں سے لڑائیاں ہوئی ہیں۔ ہرش کی وفات کے بعد یہ خود مختار ہو گئے اور جودھپور۔ اونتی

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۵۷:- راجہ راجیہ پال پرتیہار کے بعد اس کا لڑکا ترلوچن پال قنوج کا راجہ بنایا گیا اس نے ۱۰۳۶ء تک حکومت کی۔ چونکہ راجہ راجیہ پال کے ساتھ محمود غزنوی کے دوستانہ تعلقات قائم ہو چکے تھے اور اسی کی موت کا بدلہ لینے کے لئے محمود غزنوی نے کالنجر کے راجہ پر دو حملے کئے اسلئے اگر یہ کہا جائے کہ ترلوچن پال کے راجہ بنانے میں محمود غزنوی کا بھی ہاتھ تھا تو یہ تاریخی حقیقت سے انکار نہیں ہوگا گو تاریخی شواہد کی کمی کیوجہ سے اس کو ہم وثوق کے ساتھ نہیں کہہ سکتے۔ (مؤلف)

اور بروچ کو مرکز قرار دے کر حکومت کرنے لگے۔ پرتہاروں کو گوجر راجپوتوں کی ایک شاخ مانا جاتا ہے۔ مسلمانوں نے سندھ کے مشہور گورنر جنید بن عبدالرحمن کی ماتحتی میں انکی مملکت پر حملہ کیا اور مالوہ و گجرات سے خراج وصول کیا۔ اس وقت مالوہ کا راجہ ناگ بھٹ اول (۷۲۵ تا ۷۴۰ء) تھا۔ اس کے پوتے وتسراج (۷۷۵ تا ۸۰۰ء) نے شمالی ہند میں اپنا اقتدار جمانے کے لئے جنوبی ہند کے راشٹر کوٹوں اور بنگال کے پال راجاؤں سے لڑائیاں لڑیں۔ یہ کشمکش اس کے بیٹے ناگ بھٹ دوم (۸۰۰ء تا ۸۲۵ء) کے زمانہ میں بھی جاری رہی اور قنوج کو راشٹر کوٹوں نے گوبند سوم کی ماتحتی میں لوٹ کر تباہ کر دیا لیکن مہراج بھوج (۸۴۰ء تا ۸۹۰ء) نے اپنے سب مخالفوں کو نیچا دکھا کر قنوج پر قبضہ کر لیا اور اس کو اپنی حکومت کا صدر مقام قرار دیا۔ قنوج کی اس زمانہ میں وہی اہمیت تھی جو آجکل دہلی کو دارالخلافہ ہونے کی وجہ سے حاصل ہے۔ اسی وجہ سے ہندوستان کی ہر ریاست اس پر قبضہ کرنا چاہتی تھی۔

پرتہاروں پر زوال آنے کے بعد بندھیلکھنڈ (جیجاک بھکتی) کے چندیلے۔ ۲۔ ڈہل کے (جبل پور) کلچری۔ ۳۔ گجرات کے سولنکی۔ ۴۔ مالوہ کے پرمار۔ ۵۔ اجمیر کے چوہان۔ ۶۔ اور گوالیار کے کچھب گھٹ خود مختار ہو گئے۔ قنوج خاص بھی گیارہویں صدی عیسوی کے آخر میں پرتہاروں کے قبضہ سے نکل کر گہرواروں کے پاس پہونچ گیا جن کا ذکر پچھلے صفحہ پر کیا جا چکا ہے

۲۔ چندیلے یہ گونڈ اور آریوں کی مخلوط نسل سے ہیں انھوں نے اپنے سردار یشوورمن کی ماتحتی میں کالنجر فتح کر کے حکومت کی بنیاد ڈالی یشوورمن (۹۳۰ء تا ۹۵۰ء) نے کھجوراہو کا مشہور مندر تعمیر کرایا جس میں وشنو دیوتا کی مورتی کو لاکر رکھا۔ یہ "مورتی قنوج کے راجہ دیوپال سے زبردستی بزور شمشیر حاصل کی گئی تھی"[1]

۱۔ Crescent in India by Sharma P10.
&
Delhi Sultanate by Prof: Moinul Haq P. 20.

یشوورمن کے بیٹے راجہ دھنگ (۹۵۰ءتا ۹۹۹ء) کے زمانہ میں چندیلوں کی شوکت بہت بڑھ گئی تھی۔ اس راجہ نے لاہور کے حکمران جیپال کی قائم کردہ قومی لیگ کی پرزور حمایت کی اور سبکتگین کے خلاف اس کو مدد دی۔ راجہ گنڈ یا گانده (۹۹۹ء تا ۱۰۲۵ء) اس کا بیٹا تھا جس نے قنوج کے راجہ کو قتل کر کے محمود غزنوی سے دشمنی مول لی محمود غزنوی نے آخر میں اس کو معاف کر کے اپنا دوست بنا لیا۔ چندیلے محمد غوری کے زمانہ تک خود مختار حکمراں رہے۔ پرتھی راج چوہان نے ان کو مغلوب کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ چندیلوں اور چوہانوں کی لڑائیوں کا حال ہر ہندوستانی کو معلوم ہے۔ موسم برسات میں شمالی ہند کے قریباً ہر قصبہ و قریہ میں آل کھنڈ پڑھا جاتا ہے جس کو لوگ شوق سے سنتے ہیں۔ اس میں چندیلوں کے آخری مشہور راجہ پرمردن یا پرمال کے بہادر سردار آلہ۔ اودل۔ اور ملکھان وغیرہ کی ان نبرد آزمائیوں کے قصے ہیں جو پرتھی راج چوہان سے ہوئیں۔ چندیلوں نے فن جنگ مسلمانوں سے سیکھا تھا۔ راجہ پرمال کے دربار میں بنارس کے جاگیردار سید تعلی[1] اور ان کے بیٹے کمال تھے جن کی راجہ بڑی عزت کرتا تھا۔ آلہ اور اودل نے فن جنگ میں سید تعلی سے مہارت حاصل کی تھی ۱۲۰۳ء میں قطب الدین ایبک نے چندیلوں کو مغلوب کر کے باجگذار بنا لیا۔ مہوبہ چندیلوں کا دارالسلطنت تھا۔

۳۔ دہل کے کلچری جبل پور کے نزدیک ترپوری کا مقام چیدی کے کلچریوں کا صدر مقام تھا۔ اس خاندان کے مشہور راجہ گانگیہ دیو وکرمادیتہ (۱۰۱۵ء تا ۱۰۴۰ء) اور راجہ کرن (۱۰۴۰ء تا ۱۰۷۰ء) ہیں سلطنت کمزور ہونے پر ان کو پہلے چندیلوں

---

[1]:۔ سید تعلی اور اُن کے اہل خاندان کا تفصیلی حال راقم الحروف کو مستند ذرائع سے ابتک معلوم نہیں ہو سکا۔ مروجہ آلکھنڈ میں ان کا نام بار بار آتا ہے۔ انھوں نے راجہ مہوبہ کے اراکین سلطنت جسراج و بچھراج کے ہونہار صاحبزادگان کی اپنی اولاد کی طرح پرورش کی اور فنون حرب میں درجۂ کمال تک پہونچایا۔ آلہ اور اودل انھیں اپنا عموی محترم سمجھتے تھے۔ اس عہد کو ہندوؤں اور مسلمانوں کی خوش محبت ملاحظہ ہو (بقیہ)

نے اپنا ماتحت بنا لیا بعد کو ۱۱۹۶ء میں دیوگری کے یادو راجہ نے اس خاندان کے آخری راجہ وجے سنگھ کو میدان جنگ میں قتل کر کے ریاست کو اپنے قبضہ میں کر لیا۔ "لکشمن نامی ایک کلچری راجہ نے اڑیسہ پر حملہ کر کے سومناتھ میں نصب کرنے کے لئے ایک بت بزور شمشیر حاصل کیا تھا۔"[1]

۴۔ گجرات کے سولنکی

گجرات کے چاوڈا خاندان (۷۲۵ء تا ۹۶۱ء) کے آخری راجہ سامنت سنگھ کو اس کے داماد مولراج (۹۶۱ء تا ۹۹۵ء) نے میدان جنگ میں قتل کر کے سولنکی یا چالوکیہ خاندان کی بنیاد رکھی۔ اس کے پرپوتے بھیم اوّل (۱۰۲۱ء تا ۱۰۶۳ء) کے زمانہ میں محمود غزنوی نے سومناتھ پر حملہ کیا۔ اس کے عہد حکومت میں دھار کے پرمار راجہ بھوج (۱۰۱۸ء تا ۱۰۶۰ء) کے سپہ سالار کلچند نے سولنکیوں کے صدر مقام انہلواڑہ کو فتح کر کے اجاڑ دیا۔ اس خاندان میں جے سنگھ سدھراج (۱۰۹۳ء تا ۱۱۴۳ء) اور کمارپال (۱۱۴۳ء تا ۱۱۷۳ء) دو نہایت مشہور راجہ ہوئے ہیں انھوں نے پرماروں۔ چوہانوں۔ چیدیوں اور چندیلوں سے خراج وصول کیا اور سلطنت کو تقویت دی۔ ان راجاؤں کا رجحان جین مت کی طرف تھا۔ محمد غوری کے حملہ کے وقت انہلواڑہ میں مولراج ثانی حکمراں تھا۔ اس کے بعد بھیم ثانی نے (۱۱۷۸ء تا ۱۲۴۱ء) ۶۳ سال حکومت کی۔ اس کے عہد میں گجرات سے قطب الدین ایبک نے خراج وصول کیا۔ گجرات کا مکمل الحاق علاؤ الدین خلجی کے زمانہ میں ہوا جبکہ گجرات پر سولنکی خاندان کی ایک دوسری شاخ حکمراں تھی جس کو بگھیلہ کہتے ہیں اور جس کا آخری راجہ کرن دیو دوم تھا۔ بگھیلوں میں سب سے مشہور راجہ بیسل دیو (۱۲۴۳ء تا ۱۲۶۱ء) تھا جس نے ۱۸ سال نہایت دبدبہ کے ساتھ حکومت کی۔

---

[1] بحوالہ دہلی سلطنت از پروفیسر معین الحق صاحب ص ۲۱

۵۔ مالوہ (دھار) کے پرمار

مالوہ کے پرمار چندیلوں کی طرح پرتہاروں کے مطیع تھے۔ اس خاندان کی بنیاد اوپیندر عرف کرشن نے ڈالی مگر سب سے پہلا خود سر حکمران واک پتی راج دوم ہوا۔ وہ گجرات کے چالوکیہ حکمرانوں سے برابر بر سرِ پیکار رہا۔ اس کے جانشینوں میں سے ہرش سنگلا نے جنوبی ہند کے راشٹر کوٹون کے صدر مقام "مانیہ کھیت" کو ۹۷۲ء میں لوٹ کر راکھ کا ڈھیر بنا دیا۔ لیکن اس خاندان کا سب سے ممتاز راجہ منج[1] (۹۷۴ تا ۹۹۵ء) تھا۔ یہ راجہ نہایت عالم فاضل تھا اِس کے دربار میں دھن پال، پدم گپت، دھنن جے، دھنک اور ہلایودھ جیسے نامی گرامی اہل علم تھے جن کی راجہ نے بڑی قدر و منزلت کی۔ اُس نے گجرات پر چھ مرتبہ چڑھائی کی اور چالوکیوں کو شکست دی آخر خود بھی جنوبی ہند پر حملہ کرتے وقت کلیانی کے تیلپ دوم کے ہاتھ سے مارا گیا۔ منج کے بعد اس کے بھتیجے بھوج اوّل[2] (۱۰۱۰ء تا ۱۰۶۰ء) نے نہایت شان و شوکت کے ساتھ حکومت کی۔ یہ علم دوست اور فیاض تھا۔ اس نے سنسکرت کی تعلیم کیلئے ایک بڑی درسگاہ اور آبپاشی کے لئے ایک

---

[1] :۔ راجہ منج کئی ناموں سے مشہور ہے اِسکو واک پتی بھی کہتے ہیں۔ اُپتل راجہ، اموگھ ورش اور پرتھوی ولبھ اسکے دوسرے نام ہیں۔ (ملاحظہ ہو فٹ نوٹ میڈیول انڈیا ص[1] از ڈاکٹر ایشوری پرشاد)

[2] :۔ راجہ منج کا جانشین اس کا بھائی سندھ راج (سدھ راج) ہوا۔ اسکو راجہ منج نے اندھا کرا کے لکڑی کے ایک پنجرے میں قید کر رکھا تھا بعد کو اس کو قتل کرا دینا چاہا لیکن ضمیر کی بروقت ملامت نے اس کو اس کام سے باز رکھا۔ ملاحظہ ہو فٹ نوٹ میڈیول انڈیا ص[18] از ڈاکٹر ایشوری پرشاد بحوالہ

1. Ancient India PP170 — 172
2. Archaeological Survey Report 1903-4 PP 238-43 by Aufecht.
3. Catalogus Catalogorum I P 418 & II P 95.

بڑا تالاب بنوایا۔ یہ بڑا منچلا اور جنگجو راجہ تھا۔ اس نے اپنے آباء و اجداد کے علمی و سیاسی کارناموں کو نہ صرف زندہ کیا بلکہ انھیں اور آگے بڑھایا۔ دھار میں ایک سنسکرت کالج "سرسوتی کنتا بھرن" (सरस्वती कन्ठा भरण) قائم کیا جس میں اس نے ڈرامہ تاریخ اور دوسرے مضامین کی مختلف کتابوں کو محفوظ کرایا افسوس ہے کہ یہ شاندار علمی یادگار قائم نہیں رہ سکی۔ کہتے ہیں کہ مسلمان حملہ آوروں کی وجہ سے ضائع ہو گئی۔ راجہ غیر معمولی علمی قابلیت کا حامل تھا اس کو شعر و شاعری، نجوم و تنجیم اور دوسرے علوم میں دستگاہ کامل حاصل تھی۔ بہترین عالم ہونے کے ساتھ ساتھ وہ فنون جنگ میں بھی ماہر تھا اس نے اپنے مقتول چچا راجہ منج کا چالوکیوں سے بدلہ لیا اور ریاست کے حدود کو وسعت دینے کے لئے گجرات، چیدی، اور کرناٹک تک کے راجاؤں سے لڑائیاں لڑیں آخری عمر میں اس کو اپنے پڑوسی دشمن راجاؤں سے زک اُٹھانا پڑی اور غالباً اسی صدمہ سے اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کے مرجانے کے بعد مالوہ پر تباہی آگئی۔ گجرات کے سولنکی راجہ اور چیدی کے کلچری متحد ہو کر مالوہ پر ٹوٹ پڑے۔ دھار کی تباہی سے پرماروں کی عظمت خاک میں مل گئی۔ بارھویں صدی کے وسط میں جب گجرات کے راجہ سدھراج (۱۰۹۳ تا ۱۱۴۲ء) نے مالوہ فتح کر لیا اور راجہ کو پنجرہ میں گرفتار کر کے لے گیا تو پرماروں کا اقتدار بالکل جاتا رہا۔ آخری راجہ بھوج دوم نے علاء الدین خلجی کی اطاعت قبول کر لی اور مالوہ سلطنت دہلی کا ایک صوبہ بن گیا۔

۶۔ اجمیر ہندوستان کی راجپوت ریاستوں میں چوہانوں کی ریاست سانبھر کو جس کا اجمیر ایک حصہ تھا بڑی اہمیت حاصل ہے۔ کہتے ہیں کہ اس ریاست کی بنا اجے دیو یا اجے پال نے ڈالی۔ اجے پال شروع میں ایک معمولی حیثیت کا مالک تھا۔ وہ اپنی زندگی کے ابتدائی ایام میں اناساگر جھیل کے اطراف میں بکریاں چرایا کرتا تھا اور بعد کو ایک سادھو (ولی) کی دعا سے ایک ضلع کا رئیس بن گیا۔ اسی

نے اجمیر کی بنا ڈالی۔ اجمیر کے نام سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ یہ شاہ چوپان تھا سنسکرت میں اَج بمعنی بکری اور میرُو بمعنی پہاڑ مستعمل ہے۔ یہ پہاڑ غالباً اس کی چراگاہ تھی جھیل کے جنوب میں اس کے مکانات کے کھنڈرات اب بھی دیکھنے میں آتے ہیں[1]۔

اِس ریاست کے ابتدائی حالات ابھی تک پردۂ اخفاء میں ہیں اس لئے تاریخی اعتبار سے واقعات کا تسلسل قائم نہیں رہ سکا البتہ بارھویں صدی کے ابتدائی دور میں ارنو راجہ کا نام جاذب نظر ہے جو غالباً ۱۱۳۹ء سے ۱۱۵۳ء تک اجمیر میں حکومت کرتا رہا۔ اِس کے تین لڑکے تھے جگدیو، بیسلدیو (وگرہ راج چہارم) اور سومیسر۔ جگدیو اپنے باپ کو مار کر اجمیر کے تخت پر بیٹھا۔ لیکن اس کے اِس ظالمانہ فعل سے رعایا ناراض تھی اسلئے بیسلدیو نے اس کو جلد ہی تخت سے اُتار کر ریاست پر قبضہ کر لیا اور ۱۱۶۴ء تک نہایت دبدبہ کے ساتھ حکومت کرتا رہا۔ اُس نے مسلمانوں سے متعدد لڑائیاں لڑیں[2] اور دہلی کو اننگ پال سوم سے چھین لیا[3]۔ وہ ایک با اقتدار راجہ تھا اور ہمالیہ سے

۱: بحوالہ "چھتری کل بھمن" ص۵۸، ص۱، مولفہ ٹھاکر دل بھمن سنگھ مرحوم ریٹائرڈ تحصیلدار۔ ۲: دہلی میں فیروز شاہ کوٹلہ والی لاٹ پر سمبت ۱۲۲۰ بکرمی ماہ بیساکھ پورنماشی کے دن کا کندہ کیا ہوا ایک کتبہ ہے جسمیں لکھا ہے کہ اُس (بیسلدیو) نے ہمالیہ سے بندھیاچل تک کے علاقہ کو فتح کر کے لوگوں سے خراج وصول کیا نیز یہ کہ مسلمانوں سے آریہ ورت (غالباً مشرقی پنجاب) خالی کرالیا اور اپنے وارثوں کو وصیت کی تھی کہ انکو اٹک پار بھگادے۔ (بیسلدیو راسو ص۳) اس سے کہیں یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ یہ کوئی ہندو مسلم لڑائی تھی۔ یہ جنگ اسی قسم کی تھی جو راجہ یا سلطان اپنی شان و شوکت کو بڑھانے اور مملکت کو وسعت دینے کیلئے لڑا کرتے تھے۔ یاد رہے کہ راجہ کے دربار میں مسلمان بھی ملازم تھے چنانچہ ایک امیر کبیر میاں تاج الدین راجہ کے جاگیرداروں میں تھے۔ (ملاحظہ ہو ہندی ساہتیہ کا اتہاس ص۳۶ از پنڈت رام چندر شکل، بیسلدیو راسو ص۲۶) ۳: میڈیول انڈیا ص۹۵ فٹ نوٹ از ڈاکٹر ایشوری پرشاد، تاریخ اجمیر ص۱۵۳ از مسٹر سارد (ا) Carr Staphen Archaeolog of Delhi P 138. Indian Antiquary XX P. 201

بندھیاچل تک کی سرزمین اس کے قبضہ میں تھی۔ وہ علم دوست اور عالموں کا قدردان تھا۔ "ہری کیلی" "ناٹک"[۱] اس کی اپنی تصنیف بتایا جاتا ہے اور غالباً اسی کے ایماء سے اس کے درباری شاعر سومیسور نامی نے "للت وگرہ راجا" جو ایک ناٹک کی کتاب ہے تصنیف کی۔ یہ دونوں ڈرامے اجمیر کی میوزیم میں اب بھی محفوظ ہیں[۲]

راجہ بیسلدیو کے بعد اس کا لڑکا امرگنگیہ یا اپارگنگیہ جو ابھی نابالغ تھا راجہ بنایا گیا۔ راجہ کے نابالغ ہونیکی وجہ سے سلطنت کا کاروبار اس کا چچازاد بھائی یعنی جگدیو کا لڑکا پرتھوی بھٹ بحیثیت ایک مدار المہام انجام دیتا رہا جو تین برس کے بعد ۱۱۶۷ء میں خود گدی کا مالک بن بیٹھا لیکن زیادہ دنوں حکومت نہیں کر سکا اور ۱۱۶۹ء میں مر گیا۔

۱۱۷۰ء میں دہلی و اجمیر کا تخت حکومت بیسلدیو کے چھوٹے بھائی سومیسور کی طرف منتقل ہو گیا۔ اسی کا لاثانی و ہونہار بیٹا پرتھوی راج یا رائے پتھورا ہے جس نے ۱۱۷۷ء سے لیکر ۱۱۹۲ء تک اجمیر و دہلی دونوں ریاستوں پر نہایت جاہ و جلال کے ساتھ حکومت کی اس کی شہرت کو چند کوی نے "پرتھوی راج راسو"[۳] (راسا) لکھ کر اور زیادہ چمکا دیا۔

---

[۱]:- یہ ناٹک پتھر کی سلوں پر سمبت بکرمی ۱۲۱۰ مطابق ۱۱۵۶ء ماگھ مہینہ کی ۲۰ تاریخ کو کھدوادیا گیا تھا۔ یہ سلیں "ڈھائی دن کا جھونپڑا" کے قریب کھدائی کرنے پر برآمد ہوئی ہیں (بیسلدیو راسو ص۶)

[۲]:- میڈیول انڈیا ص۹ از ڈاکٹر ایشوری پرشاد۔

[۳]:- پرتھوی راج راسو ایک ضخیم رزمیہ نظم ہے جو ۱۰۰۵۰۰ اشلوکوں پر مشتمل ہے اس کتاب میں ۶۹ سمئے (ابواب) ہیں۔ اسی کی روایات پر یقین کر کے اب تک مورخین اس عہد کے واقعات کو مستند مانتے رہے لیکن عصر حاضر کی تحقیقات نے راسو کی روایات کو فرضی و جعلی ثابت کر دکھایا ہے۔

رائے بہادر ڈاکٹر شیام سندر داس جی کا کہنا یہ ہے کہ پرتھوی راج کے دربار میں چند کوی نام کا کوئی شاعر تھا تو ضرور اور اس نے راسو بھی لکھا لیکن وہ اب اپنی اصلی حالت پر نہیں ہے اسمیں بہت سے ردوبدل ہوئے اور آخر میں رانا پرتاپ سنگھ کے لڑکے امرسنگھ نے اس کو مجتمع کر دیا اس وقت "ملیہ سنگھ" نامی کوی نے اپنی طرف سے اس میں بہت سی فرضی داستانیں

(باقی صفحہ ۱۶۶ پر)

پرتھوی جب بالغ ہوا اور سن تمیز کو پہونچا تو اس نے اپنے باپ اور چچا کے نقش قدم پر چل کر جنگ و جدل کو اپنا مشغلہ بنایا۔ چنانچہ ۱۱۸۲ء میں جبکہ اس کی عمر ابھی بیس سال

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۶۵ : اضافہ کر دیں۔ اس کی تائید مہا مہو اپادھیائے پنڈت ہر پرشاد شاستری بھی کرتے ہیں۔ پنڈت جی موصوف نے ۱۹۰۹ء سے لیکر ۱۹۱۳ء تک بغرض تحقیق راجپوتانہ کے تین چکر لگائے۔ وہ ناگور جا کر چند کوی نسل کے ایک نامی گرامی بھاٹ نانو رام سے ملے۔ ناگور چند کوی کو بطور جاگیر دیا گیا تھا وہاں اس کے خاندان کے لوگ اب بھی موجود ہیں۔ نانو رام نے پنڈت جی موصوف کو بتایا کہ چند بردائی نے صرف تین چار ہزار اشلوک لکھے تھے اس کے بعد اس کے لڑکے جل چند نے آخری دس باب لکھ کر راسو کو ختم کر دیا تھا۔ بعد کے لوگوں نے اس میں اضافے کئے۔ اکبر نے راسو کو سنا تھا اس کی ہمت افزائی سے اس زمانہ میں بہت سے راسو لکھے گئے۔ نانو رام کا کہنا ہے کہ اس کے پاس اصلی راسو کی نقل موجود ہے۔ پنڈت جی موصوف اس سے مہوبہ سمے کی ایک نقل لائے تھے جو بالکل اوٹ پٹانگ اور ردی ہے۔

مہا مہو اپادھیائے پنڈت گوری شنکر ہیرا چند اوجھا راسو کو سترھویں صدی کا ایک نہایت لغو اور جعلی دستاویز قرار دیتے ہیں لکھتے ہیں کہ "اس میں چوہانوں، پرماروں، پریہاروں اور سولنکیوں کی پیدائش چوہانوں کی بنشاولی (شجرہ)، پرتھوی راج کی ماں، بھائی، بہن، لڑکے، رانیاں نیز بہت سے واقعات اور ان کے سنین سب کے سب غلط اور فرضی ہیں۔ زبان و بیان کے اعتبار سے بھی یہ تصنیف پرانی نہیں ہے"۔ آگے لکھتے ہیں کہ "بعض لوگ یہ کہکر مغالطہ دیتے ہیں کہ راسو میں بعد کو اضافے ہوتے رہے ورنہ یہ بھاری بھرکم کتاب نہیں تھی حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ یہ کتاب ایک ہی وقت میں ترتیب دی گئی ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ راجہ کرولی کے درباری شاعر پنڈت جدو ناتھ جو چند کوی کی نسل سے ہیں اس میں ۱۰۰۵۰۰ اشلوکوں کا ہونا شروع ہی سے تسلیم کرتے ہیں۔

بہرحال چند کوی نے جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ "چوہان راجپوت آبو پر کئے گئے یگیہ کی وجہ سے آگ سے پیدا ہوئے۔ پرتھوی راج اجمیر کے راجہ سومیسور کے لڑکے اور ارنوجی کے پوتے تھے۔ سومیسور کو دہلی کے راجہ انگ پال کی لڑکی کملا بیاہی تھی۔ اسی سے پرتھوی راج نے جنم لیا۔

(باقی صفحہ ۱۶۷ پر)

سے کم تھی اپنے پڑوسی طاقتور راجہ پرمال والئی مہوبہ و کالنجر پر فوج کشی کی اور اس کو شکست دینے کے بعد مال غنیمت سے لدا پھندا اپنے دار السلطنت کو واپس آیا۔ یہ وہ زمانہ

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۶۶۔ اننگ پال کی دوسری لڑکی سندری قنوج کے راجہ جے چند کے والد وجے پال کو منسوب تھی۔ اننگ پال نے اپنے نواسے پرتھی راج کو اپنا متبنی کیا۔ جے چند اور پرتھوی راج میں کشیدگی اسی وجہ سے پیدا ہوئی بعد کو راج سوئے یگیہ اور سنجوگتا کی وجہ سے دشمنی بڑھ گئی۔ پرتھوی راج اور محمد غوری کے درمیان گیارہ لڑائیاں ہوئیں۔ محمد غوری کو دو مرتبہ گرفتار کر کے چھوڑ دیا گیا۔ آخر میں محمد غوری کو راجہ قنوج اور گجرات نے پرتھوی راج پر حملہ کرنے کی دعوت دی۔ اس لڑائی میں پرتھوی راج کو محمد غوری گرفتار کر کے غزنی لے گیا اور وہاں لیجا کر قید کر دیا۔ چند بردائی بھیس بدل کر غزنی پہونچا اور پرتھوی راج سے ملاقات کی آخر میں پرتھوی راج کے تیر سے محمد غوری مارا گیا پھر دونوں ایک دوسرے کو مار کر مر گئے۔ درمیان میں جگہ جگہ اور بھی بہت سی فرضی داستانیں ہیں۔ محمد غوری اور پرتھوی راج میں دشمنی کا سبب یہ بتایا ہے کہ محمد غوری کے دربار میں حسین شاہ نام کا ایک سردار تھا اس کی بیوی چترریکھا نہایت حسین تھی جس کو محمد غوری اپنے عقد میں لینا چاہتا تھا اس پر یہ دونوں غزنی سے بھاگ کر پرتھوی راج کی شرن (پناہ) میں آگئے۔ محمد غوری نے ان دونوں کی واپسی کا مطالبہ کیا لیکن پرتھوی راج نے پناہ گزیں کو واپس کر دینا اپنی توہین سمجھا وغیرہ وغیرہ۔

راسو پر تحقیقی نظر:۔ ڈاکٹر بولر نے سنسکرت کی کتابوں کی تلاش میں کشمیر کا سفر کیا وہاں انھیں سنسکرت کی ایک کتاب ہاتھ لگی۔ کتاب کا نام "پرتھوی راج وِجے" ہے جس کو جیانک کوی نے تصنیف کیا ہے۔ یہ پرتھوی راج کا درباری شاعر تھا۔ اس نے جو کچھ لکھا ہے وہ چند بردائی کے راسو کے بالکل خلاف ہے۔ اس کے لکھے ہوئے واقعات کی تصدیق اُن تمام کتبہ جات سے ہوتی ہے جو ۱۰۳۰ سے ۱۲۲۶ سمبت بکرمی تک کے پائے گئے۔ اس کتاب میں جو شجرے درج ہیں اُن کی صحت مالوہ اور گجرات کے کتبہ جات سے ہوتی ہے۔

(باقی مضمون صفحہ ۱۶۸ پر)

ہے جبکہ محمد غوری کے پنجاب پر حملے شروع ہو چکے تھے۔

محمد غوری نے ۱۱۸۶ء میں پنجاب کی تسخیر کو مکمل کر لیا اب اُس نے اُن علاقوں کی طرف توجہ کی جو کبھی سلاطین غزنویہ کے قبضہ میں رہ چکے تھے لیکن اُن پر راجگانِ ہند نے قبضہ کر لیا تھا۔ یہ اسی قسم کا شوق جہانگیری وجہاں کشائی ہے جیسا کہ پرتھوی راج

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۶۷ = (۱) "پرتھوی راج وجے" میں لکھا ہے کہ راجہ سومیسور کا بیاہ چیدی کے راجہ کی لڑکی کرپور دیوی سے ہوا تھا"۔ اِس کی تصدیق "ہمیر مہا کاویہ" اور "سرجن چرتر" سے ہوتی ہے۔ سرجن چرتر بوندی کے راجہ سرجن سین کی سوانحعمری ہے اور سترھویں صدی بکرمی میں لکھی گئی۔ ہمیر مہا کاویہ کو نین چندر نے پندرھویں صدی بکرمی میں ترتیب دیا۔ "راجہ سومیسور کے دو لڑکے ہیر راج اور پرتھوی راج تھے۔ گدّی کا مالک پرتھوی راج ہوا لیکن چونکہ وہ نابالغ تھا اسلئے اس کی ماں کرپور دیوی" کا دمیب بام وزیر کی مدد سے ریاست کا کام ایک عرصہ تک چلاتی رہی"۔ اِس کتاب میں یہ کہیں نہیں لکھا کہ انگ پال نے پرتھوی راج کو گود لیا یا پرتھوی راج کا سنجوگتا سے بیاہ ہوا۔

(۲) اسی طرح راسو کی روایت کے بخلاف چالوکیوں "کا اگنی کل" کے بجائے چندر بنشی ہونا ثابت ہوتا ہے اس کی تصدیق تیرھویں صدی بکرمی کے ایک فرمان سے ہوتی ہے جو کسی چالوکیہ (سولنکی) راجہ کا ہے۔ اجمیر میں ڈھائی دن کے جھونپڑے کی ایک تحریر سے، پرتھوی ڈگ وجے ناٹک سے، اور ہمیر مہا کاویہ سے چوہانوں کا سورج بنشی ہونا مسلّم ہے۔

(۳) ۱۲۲۶ اسمبت کے بجولیا (واقع راجپوتانہ) والے کتبہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ سومیسور کے بڑے بھائی بیسلدیو یا وگرہ راج چہارم نے دلّی اور ہانسی کو بزورِ شمشیر فتح کر کے اجمیر میں ملایا۔ طبقات ناصری سے اسکی تصدیق ہوتی ہے۔ فارسی مورخوں نے پرتھوی راج کو اجمیر کا راجہ مانا ہے دلّی کا مالک پرتھوی راج کا بھائی گوبند رائے تھا اور پہلی لڑائی میں اسی کے بھالے سے محمدؐ غوری زخمی ہوا تھا۔

اگر چند بردائی نام کے کسی شاعر نے یہ "پرتھوی راج راسو"، رائے پتھورا کے زمانہ میں لکھا ہوتا تو مندرجہ ذیل تاریخی واقعات کی غلطیاں اس سے ہرگز سرزد نہ ہوتیں مثلاً۔

(باقی صفحہ ۱۶۹ پر)

کو تھا اسلئے دونوں کا ٹکراؤ مناسب وقت کا منتظر تھا اس کے لئے بھی زیادہ عرصہ نہیں لگا اور سنہ ۱۱۹۱ء میں ترائن کے مقام پر دونوں میں پہلی جنگ ہوئی جس میں محمد غوری ہار گیا اس کے

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶۸ = (۴) راسو کے ۲۱ ویں باب کے مطابق پرتھوی راج کی بہن پرتھا پرتھوی بائی، کا بیاہ میواڑ کے رانا سمرسنگھ کے ساتھ ہوا تھا جو دوسری لڑائی میں محمد غوری کے ہاتھ سے مارا گیا۔ یہ روایت بالکل غلط ہے کیونکہ پرتھوی راج کی موت ۱۲۴۸ سمبت میں ہوئی۔ اس وقت سمرسنگھ کا دادا جیتر سنگھ اور باپ تیج سنگھ دونوں بقید حیات تھے۔ جیتر سنگھ کا ۱۳۰۹ سمبت اور تیج سنگھ کا ۱۳۲۴ سمبت تک زندہ رہنا ثابت ہے۔ سمرسنگھ کے عہد کے سنگین کتبہ جات میں سے ایک ۱۳۳۰ اور دوسرا ۱۳۵۸ سمبت کا ہے۔ ان کی رُو سے پرتھوی راج کی موت کے ۱۰۹ برس بعد سمرسنگھ کا زمانہ ہے اِس صورت میں اس کی شادی پرتھا سے کیونکر ہو سکتی تھی۔

(۵) راسو کے مطابق گجرات کے راجہ بھیم نے پرتھوی راج کے والد سومیسور کو قتل کیا جس کا بدلہ پرتھوی راج نے بھیم کو مار کر لیا"۔ لیکن اصل واقعہ یہ ہے کہ راجہ بھیم ۱۲۳۵ سمبت میں گدّی پر بیٹھا اس وقت وہ صغیر سن تھا۔ سومیسور کی موت ۱۲۳۶ سمبت میں ہوئی اس صورت میں وہ سومیسور کو کیسے قتل کر سکتا تھا۔ علاوہ ازیں راجہ بھیم کو پرتھوی راج نے قتل نہیں کیا۔ راجہ بھیم کے عہد کے کتبہ جات ۱۲۶۵ سے لیکر ۱۲۹۶ سمبت تک کے مل چکے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ پرتھوی راج کے بہت بعد تک زندہ رہا۔

(۶) "آبو کے پرمار راجہ سلک یا سلکھ نامی نے ۱۱۳۶ سمبت میں محمد غوری کو گرفتار کیا" حقیقتاً اس وقت محمد غوری کا وجود بھی نہ تھا وہ ۱۲۳۰ سمبت میں غزنی کا حاکم بنایا گیا۔ اس کے علاوہ آبو کی تاریخ میں سلک نام کا کوئی راجہ کسی زمانہ میں نہیں ہوا۔

(۷) راسو کی روایت کے بموجب پرتھوی راج نے گیارہ برس کی عمر سے لیکر ۳۶ برس کی عمر تک چودہ شادیاں کیں۔ ان شادیوں کی حقیقت شیخ چلّی کی کہانیوں سے زائد نہیں۔ پرتھوی راج کی موت تو ۳۰ برس کی عمر سے پہلے ہوئی تھی۔

(باقی مضمون صفحہ ۱۷۰ پر)

قریباً سوا سال کے بعد محمد غوری نے پرتھوی راج پر دوسرا حملہ کیا۔ اس حملہ میں راجپوتوں کے قدم میدان جنگ سے اُکھڑ گئے اور پرتھوی راج مارا گیا۔ اس طرح اجمیر و دہلی پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۶۹ = (۸) پرتھی راج کا بیاہ راسو کی رُو سے آبو کے راجہ جَیت کی بہن "اچھنی" سے ہوا تھا حالانکہ جیت کے خاندان کا وہاں پتہ بھی نہ تھا۔

(۹) اسی طرح $\frac{\text{۱۱۳۹ انند سمت}}{\text{۱۲۳۰ بکرمی سمت}}$ میں پرتھوی راج کا سمندر شیکھر کے یادو راجہ وِجے پال کی لڑکی پدماوتی سے شادی یا جے چند روائی قنوج کے اشومیدھ یگیہ کی کہانی یا سنجوگتا کا سوئمبر یہ سب باتیں تاریخی حقیقت کے خلاف ہیں۔ سمت ۱۴۶۰ میں گوالیار کے تومر راجہ بیرم دیو کے درباری شاعر نین چندر (جے چند) نے "ہمیر مہا کاویہ" میں پرتھوی راج کی اور "رمبھا منجری" میں جے چندر کی بڑی تعریف کی ہے لیکن اِن دونوں کتابوں میں سے کسی میں بھی پرتھوی راج اور جے چندر کی آپس کی کشمکش کا نہ کہیں ذکر ہے اور نہ اشومیدھ یگیہ اور سنجوگتا کے سوئمبر کا کہیں حال لکھا۔

(۱۰) غرضکہ راسو میں نہ تو واقعات ہی تاریخی معیار پر صحیح اُترتے ہیں اور نہ اُن کے سنین سنین کو صحیح کرنے کے لئے رائے بہادر پنڈت شیام سندر داس نے راسو کے سنین کو انند سمت مانا اور اس طرح ۹۱ سال کے فرق کو دور کرنے کی کوشش کی پھر بھی وہ اپنے مفروضہ میں ناکام رہے ہے۔ مثال کے لئے ایک تاریخی واقعہ لیجئے۔ راسو کے مطابق پرتھوی راج کا جنم ۱۱۱۵ سمت میں ہوا اس کو ذرا دیر کے لئے انند سمت مان لیجئے اس کو بکری سمت بنانے کے لئے ۹۱ سال جوڑ دیجئے تو ۱۲۰۵ یا ۱۲۰۶ بکرمی سمت ہوئے لیکن یہ وہ سنہ ہے جبکہ پرتھوی راج کے والد ابھی بچہ ہی تھے اس طرح ان کی شادی یا پرتھوی راج کی پیدائش ابھی دور کی بات تھی۔

(۱۱) اسی طرح اور بھی بہت سی باتیں ہیں جو قطعی بے سر و پا ہیں مثلاً راسو کے آٹھویں باب میں میواتی مغل جنگ کا تذکرہ یا پندرھویں باب میں جبکہ پرتھوی راج "اچھنی" کو بیاہ کے مع جہیز کے واپس

(باقی مضمون صفحہ ۱۷۱ پر)

(۸) دہلی کہتے ہیں کہ دہلی میں راجپوتوں کے قبیلہ تومر کی حکومت تھی محمد غوری کو ہندوستان میں تومر راجپوتوں کی کسی بڑی طاقت سے سابقہ نہیں پڑا محمود غزنوی کو البتہ تھانیسر کے راجہ سے لڑنا پڑا جو شکست کھا کر دہلی چلا آیا تھا ۱۰۴۳ء میں دہلی کے راجہ نے ایک عجیب وغریب خواب کے ذریعہ جس کا پہلی جلد میں تذکرہ کیا جا چکا ہے تھانیسر اور ہانسی کو دوبارہ مسلمانوں سے چھین لیا اور اس طرح اپنی سابقہ عظمت کو دوبارہ بحال کیا۔ تومروں کے شجرہ کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ راجہ گھوس پال یا اننگ پال تھا جس کا نمبر شجرہ میں پندرھواں یا سولھواں ہے۔

تومر سنسکرت کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں گائے کا ایسا بچھڑا جس کے سینگ نہ ہوں بالفاظ دیگر جو دوسروں کو بلاوجہ تکلیف نہ دیتا ہو۔ تومروں کا دعویٰ ہے کہ وہ پانڈوں کے خاندان سے ہیں اسلئے چندر بنسی ہیں۔ اِس کے ثبوت میں وہ شہنشاہ اکبر کا ایک فرمان پیش

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۷۰ = ہو رہا تھا تو راستہ میں میواڑ کے مغلوں سے اس کی جنگ کا حال۔ یہ وہ زمانہ ہے جبکہ ہندوستانی شاید مغلوں کے نام سے بھی ناواقف تھے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ راسو بہت بعد کی تصنیف ہے اور اس میں فرضی داستانوں کے سوا اور کچھ نہیں۔

مذکورہ بالا نوٹ کی ترتیب میں حسب ذیل ماخذات پیشِ نظر تھے:-

(۱) پرتھوی راج راسو مولفہ ہری ہرناتھ ٹنڈن ایم۔اے

(۲) میڈیول انڈیا از ڈاکٹر ایشوری پرشاد صاحب۔

(۳) ہندی ساہتیہ کا اتہاس از پنڈت رام چندر شکل۔

(۴) بیسلدیو راسو مولفہ ستیہ جیون ورما ایم۔اے

(۵) بھاشا اور ساہتیہ از رائے بہادر ڈاکٹر شیام سندر داس

(۶) ہمیر مہا کاویہ مولفہ پنڈت نیلکنٹھ جناردن ۱۸۸۶ء۔

(۷) ہمیر راسو مولفہ رائے بہادر ڈاکٹر شیام سندر داس۔

کرتے ہیں جس میں خاندانی روایات کی بنا پر انھیں "چندر کل بہال" کا خطاب ملا۔ فرمان کی نقل فٹ نوٹ میں درج ہے[1]۔ اِس خاندان کا بانی بیسلدیو تھا جس نے اپنے لئے اننگ پال کا خطاب پسند کیا بعد کے تمام راجگان اِسی خطاب سے موسوم ہوتے رہے۔ بیسلدیو نے دہلی کو ۷۳۶ء میں دوبارہ آباد کیا۔ یہ شہر آٹھ سو برس سے ویران پڑا تھا۔ ویران ہونے کے زمانہ میں اِس کا نام جوگن پور[2] پڑ گیا تھا۔

اِس خاندان کا انیسواں راجہ پرتھی پال اننگ پال یا اننگ پال سوم ہے جس سے وگرہ راج چہارم نے دہلی کو چھین لیا۔ اور اس طرح اجمیر و دہلی کو ملا کر ایک بڑی طاقت بنا دیا۔ چونکہ تھانیسر و ہانسی وغیرہ پہلے مسلمانوں کے قبضہ میں تھے جن پر پہلے تومروں نے قبضہ کیا بعد کو دہلی چھن جانے کے بعد ان علاقوں کے مالک چوہان ہوئے اسی لئے محمد غوری کو پرتھوی راج سے لڑنا پڑا۔ ورنہ غزنوی حکومت کے ان نکلے ہوئے علاقوں کو واپس لینے کے لئے یہ لڑائیاں اس کو راجہ اننگ پال سے لڑنا پڑتیں۔

عـ۱ :- شہنشاہ اکبر کے فرمان کی نقل۔

بحضور مہر محمد اکبر شاہ بادشاہ غازی ابو نصر معین اسما	مہر بحروف عربی	مہر بحروف عربی

" دریں زمان میمنت اقتران فرمان والاشان واجب الاطاعت والاذعان صادر شد کہ بمقتضائے وفور مراحم خاقانی و فرط تفضلات خسروانی کہ نمونۂ افضال یزدانیست فدوی خاص لایق العنایت والاحسان لچھمن سنگہ را بہ خطاب مہاراجہ و بہادری و راج چندر سوم کل چندر بہال بین الاعیان والارکان فی الامثال والاقران سرفراز و ممتاز فرمودیم باید کہ فرزندان نامدار کامگار والا تبار و وزرائے ذوی الاقتدار و امرائے عالیمقدار و جمیع ارکان دربار جہاں مدار و حکام ممالک فدوی خاص معزی الیہ را از جناب فیض مآب بادشاہے بہ شمول ایں خطاب برگزیدہ والقاب پسندیدہ معزز

(باقی صفحہ ۱۷۳ پر)

۸:- گوالیار کے کچھب گھٹ

قنوج کے پرتہاروں کے زوال کے بعد ایک کچھب گھٹ سردار "بجردمن" نامی نے گوالیار پر قبضہ کرکے اپنی خود مختار حکومت قائم کی اِسکی حکومت کا زمانہ ۹۶۰ء سے لیکر ۹۹۰ء تک مانا جاتا ہے۔ یہ راجپوت راجہ غالباً سورج بنشی تھے اور راجہ رامچندر جی کے دوسرے صاحبزادے "کش" کو اپنا مورث اعلیٰ سمجھتے تھے۔ اِسی خاندان کے ایک راجہ ارجن سنگھ نامی نے چندیلہ راجہ گانڈ کے لڑکے ودیادھر کی ماتحتی میں قنوج کی لوٹ میں حصہ لیا اور محمود غزنوی کے دوست راجہ راجیہ پال پرہیار کو قتل کیا۔ اِس خاندان میں ۱۱۲۸ء تک خود مختار راجہ ہوتے رہے بعد کو یہ چندیلوں کے باجگذار بن گئے۔

۹:- قندھار (گاندھار) یا ویہند کے ہندو شاہی

کابل کے بودھ حکمراں جن کو اسلامی مورخین نے "خاندان رتبیل" میں سے شمار کیا ہے ۷۴۱ھ ہی میں باجگذار بنائے جا چکے تھے لیکن ۲۵۶ھ میں کابل کا الحاق کرکے سامانی حکومت نے اُس کو اپنا ایک صوبہ بنالیا کابل کا الحاق آپس کے فتنہ وفساد اور خانہ جنگی کے باعث عمل میں آیا کیونکہ کابل کے آخری حکمراں "لگتر مان" کو اس کے برہمن وزیر کلر نے تخت سے اُتار کر غاصبانہ قبضہ کرلیا تھا۔ اِس وزیر نے ایک نئے خاندان

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۷۲:- مباہی دانستہ انظار عنایت با بدولت و اقبال را باحوال فرخندہ مآل مہاراجہ معزی الیہ یوماً فیوماً متزاید و بے نہایت دانند بتاریخ پانزدہم محرم سال بست و ہفتم از جلوس ابد مانوس مقدس زیب تحریر و زینت نظیر پذیرفت" (ماخوذ از چھتری کل تھمن ص ۵۱۳، ص ۵۱۴) یہ فرمان تومروں کے رئیس راجہ پاٹن کے پاس اب بھی موجود ہے۔ پاٹن ریاست جے پور سے ۳۵ کوس کے فاصلہ پر بجانب شمال واقع ہے۔ اِس کے اردگرد ۱۵۰ اسالم مواضعات تومر راجپوتوں کے آباد ہیں۔ رئیس راجہ جے پور کا ماتحت ہے۔

ع۲:- خانۂ خالی را دیو میگیرد کے مصداق اِس ویرانہ میں جوگنیاں اور بھوت، پریت رہتے تھے لوگوں کا ایسا خیال تھا اسی وجہ سے لوگ اِس کو جوگن پور کہنے لگے۔ (ملاحظہ ہو تاریخ چھتری کل تھمن ص ۲۵۶)۔

کی بنیاد ڈالی جو "برہمن شاہی" کہلاتا ہے۔اِسی خاندان میں جے پال و انند پال وغیرہ راجہ ہوئے۔اِس خاندان کے حدود حکومت[1] سے کابل کا صوبہ شروع ہی سے نکل چکا تھا۔ہندو شاہی راجاؤں کا صدر مقام اوہندیا[2] وہیند یا قندھار تھا جو پیشاور سے جنوب مشرق میں

---

[1]:- یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہندو شاہیوں کے حدود حکومت کو سمجھ لیا جائے خصوصاً شمالی و مغربی سرحد تاکہ بعض مورخین کی تحریروں سے جن شبہات کے اُبھرنے کا امکان ہے وہ ختم ہو جائیں بعض مورخین نے جن میں سر وولزلے ہینگ اور اُن کے متبعین کی جماعت پیش پیش ہے جے پال کی شمالی مغربی سرحد کو جلال آباد و لمغان تک بڑھا دیا ہے مگر یہ سراسر غلط اور حقیقت کے بالکل خلاف ہے کیونکہ:۔

(۱) رتبیل کی حکومت دریائے سندھ کے مغربی کنارے تک وسیع تھی یہ کسی طرح ممکن نہ تھا کہ کابل و غزنی کا علاقہ سامانی سلطنت میں شامل ہو اور یہ سلطنت جلال آباد تک کا علاقہ ملک پنجاب کے راجہ کو فتح کر لینے دے۔

(۲) یہ بات بھی کسی طرح سمجھ میں نہیں آسکتی کہ دریائے سندھ یا زیادہ سے زیادہ درۂ خیبر اور اُس کے پہاڑی سلسلے کی قدرتی حدود کو چھوڑ کر پنجاب کے راجہ اور اسلامی سلطنت کی غیر قدرتی حدود لمغان۔ (کابل و غزنی کے وسط کا علاقہ) کے میدان میں قائم ہوتی۔

(۳) اسلامی مورخین نے جے پال وغیرہ کو "شاہ ہندوستان" کے لقب سے موسوم کیا ہے اِس سے ثابت ہوتا ہے کہ اُس کے دائرۂ حکومت میں کابل کی مملکت شامل نہیں تھی۔کابل کو ہمیشہ ایک الگ ملک مانا گیا ہے اور تاریخ میں "ملک" کابُش" کے نام سے یاد کیا گیا ہے (ملاحظہ ہو البیرونی ص ۳۴۶)

(۴) گیارہویں صدی عیسوی میں البیرونی نے کتاب الہند کے اندر ہندوستان کا حدود اربعہ بیان کرتے وقت کابل کو ہندوستان کا جز نہیں مانا ہے لیکن سندھ کو جہاں پر مسلمانوں کی تین سو برس سے حکومت قائم تھی ہندوستان ہی کا ٹکڑا بتاتا ہے۔اسلامی ممالک سے ہندوستان پہونچنے کے راستوں کا تذکرہ کرتے ہوئے بیرونی نے لکھا ہے "ملک سندھ ہندوستان کا جز اور اُس سے

(باقی مضمون صفحہ ۱۷۵ پر)

دریائے کابل اور سندھ کے سنگم پر واقع تھا۔ بعد کو لاہور مستقر قرار پایا۔

۱۰۔ کشمیر شمالی ہند کی پہاڑی ریاستوں میں کشمیر، نیپال اور آسام ممتاز ہیں کشمیر راجگان قنوج کی حکومت میں کبھی نہیں رہا لیکن راجہ ہرش نے ضرور وہاں کے راجہ سے بزور مہاتما بودھ کی ایک یادگار کو حاصل کیا۔ کشمیر کے حالات کلہن نے راج ترنگنی میں

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۷۴، پچھم میں ہر ہمارے یہاں سے سندھ پہونچنے کا راستہ ملک نیم روز یعنی ملک سجستان ہو کر ہے اور ہندوستان پہونچنے کا کابل ہو کر لیکن یہی راستہ لازمی نہیں ہے اگر موانع رفع ہو جاویں تو وہاں ہر طرف سے پہونچنا ممکن ہے۔ ان پہاڑوں میں جو ہندوؤں کے ملک کو گھیرے ہوئے ہیں اُن حدود تک جہاں پر ہندو قوم کا سلسلہ منقطع ہوتا ہے اِسی قوم یا اُن کے مشابہ دوسری قوم کے سرکش لوگ آباد ہیں" (ملاحظہ ہو کتاب الہند صہ ۲۶۳ مُصنّفہ البیرونی)

(۵) مذکورۂ بالا بیان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ کابل کی طرف سے ہندوستان آنے جانے میں جو بڑی رکاوٹ ہے وہ سفید کوہ وسلیمان کوہ کے سلسلے ہیں جن میں درۂ خیبر، درۂ ٹوچی، درۂ گومل وغیرہ واقع ہیں اور یہی سلسلے ہندوستان کی غربی سرحد کا کام دیتے تھے۔ ہندو قوم اور اُن جیسے دوسرے لوگوں کے رہنے کی یہ آخری جگہیں تھیں چنانچہ ایک دوسری جگہ البیرونی ہندوستان کی پچھمی سرحد کا تعین کرتے وقت لکھتا ہے "ہندوستان کے پچھم کے پہاڑوں میں (سفید کوہ وسلیمان کوہ) مختلف افغانی قبائل رہتے ہیں جن کا سلسلہ ملک سندھ کے قریب ختم ہوتا ہے" (کتاب الہند صہ ۲۷۷) اور یہی قدرتی سرحد ہندوستان وافغانستان کے درمیان آج تک چلی آرہی ہے (مولف)

(۶) مشرقی مورخ یعنی البیرونی کی شہادت آپ نے سُن لی اب ہم اپنے بیان کی تائید مزید کے لئے مغربی ہی اسکول کے ایک نامور مورخ مسٹر اسٹینلی لین پول کی شہادت دیکر اس بحث کو ختم کرتے ہیں۔ مورخ مذکور کا کہنا ہے "کہ عربوں کا ابتدا میں کوہ ہندوکش کے جنوبی کوہستانی ملک کا الحاق محض برائے نام تھا۔ سجستان کے خاندان صفاریہ (۸۶۸ء تا ۹۰۳ء) کا نامور فرمانروا یعقوب بن لیث (۸۶۷ء تا ۸۷۸ء)

(باقی مضمون صفحہ ۱۷۶ پر)

تفصیل کے ساتھ بیان کئے ہیں۔ ہوانگ سانگ کے زمانہ میں کشمیر کا راجہ غالباً دلبھ وردھن تھا جو کارکوٹ خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کے مرجانے کے بعد اس کے تین لڑکے یکے بعد دیگرے اس کے جانشین ہوئے جن میں پہلا للتا دیتہ مکتا پیڈ ہے جس نے قنوج کی عظمت کو خاک میں ملا دیا۔ اس کا پوتا جے پیڈ ایک نہایت اولوالعزم فرمانروا تھا۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ نویں صدی عیسوی کے شروع میں کارکوٹ خاندان پر زوال آگیا اور اس کی جگہ اُتپل خاندان نے کشمیر میں اپنی حکومت کا ڈول ڈالا۔

اُتپل خاندان کا پہلا حکمراں راجہ اونتی ورمن تھا جس نے ۸۵۵ء تا ۸۸۳ء کشمیر پر حکومت کی۔ اس کے بعد شنکر ورمن (۸۸۳ء تا ۹۰۲ء) نے اس کی جگہ لی۔ اس نے رعایا پر بعض نئے محاصل عائد کئے جن کی ادائیگی رعایا کی برداشت سے باہر تھی۔ اس راجہ کی وفات کے بعد تاریخ میں کھیم یا شیم گپت (क्षेमगुप्त) (950ء تا 958ء) کا حال ملتا ہے جس نے برہمن شاہی خاندان کی لڑکی دِدّا سے شادی کی۔ راجہ کے مرجانے کے بعد چونکہ اس کی اولاد نابالغ تھی اس لئے نابالغ راجہ کی مدار المہام دِدّا ہوئی اس نے باوجود مخالفتوں اور بغاوتوں کے ۱۰۰۳ء تک یعنی اپنی عمر بھر کشمیر کو اپنے قبضہ میں رکھا۔ رانی کے مرجانے کے بعد چونکہ اس خاندان میں حکومت کے قابل کوئی نہ رہا اسلئے حکومت اُتپل خاندان سے لوہارایا لہرا خاندان کی طرف منتقل ہوگئی۔

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۷۵: پہلا شخص تھا جس نے کابل میں اسلامی حکومت کی بنیاد ڈالی۔ خاندان مذکور کے بعد سلطنت سامانیہ (۸۷۴ء تا ۹۹۹ء) کے گورنر برابر اس صوبہ پر حکومت کرتے رہے مقامی گورنر سلاطینہ الپتگین غزنی میں پہلی آزاد اسلامی حکومت کا بانی ہوا (ملاحظہ ہو شجرات فرمانروایان اسلام صفحہ ۲۰۷) اس بیان کے مطابق بھی کابل تین سو برس سے مسلمانوں کے زیرنگین تھا اسلئے یہ کہنا کہ غزنوی چھیڑ چھاڑ سے پہلے رائے لوہارو (لاہور) کے حدود حکومت میں کابل شامل تھا تو اریخی شواہد کے خلاف ہے (مؤلف)۔

ع۱:۔ بحوالہ کتاب الہند صفحات ۳، ۵۱، ۴۷،۲۔

لوہارا خاندان کا پہلا فرمانروا اسمگرام راجہ ہے جو رانی دِدّا کا بھتیجا اور اُدے راج کا لڑکا تھا۔ اِس خاندان نے ۱۱۷۲ء تک حکمرانی کی اسی خاندان کے راجاؤں سے محمود غزنوی کو سابقہ پڑا۔ کلہن نے اِس خاندان کے ایک راجہ ہرش (۱۰۸۹ء تا ۱۱۰۱ء) کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے[۱] وہ تمام خرابیاں جو ایک خود مختار ظالم حکمراں میں ہو سکتی ہیں اس راجہ کے اندر موجود تھیں۔ اس کے ناجائز محصولات سے اگر رعایا پریشان تھی تو اس کی بیہودگیوں سے اہل خاندان بالخصوص اس کی سگی بہنیں اور اس کے والد کی بیوائیں نالاں تھیں۔ مندروں کی دولت اپنے کام میں لے آیا۔ ایسے ظالم کی حکومت زیادہ دن نہیں چل سکتی تھی چنانچہ ایکدن باغیوں نے اس کے محل پر ہلّہ بولا اور راجہ کو قتل کر کے اس کے محل کو آگ لگا دی اور جڑ بنیاد سے اس کو اکھاڑ کر پھینک دیا۔

راجہ ہرش کے بعد تخت حکومت لوہارا خاندان کی ایک دوسری شاخ میں منتقل ہو گیا۔ رانی کوٹا اس خاندان کی آخری فرمانروا تھی جس سے شاہ میر نے ۱۳۳۹ء میں حکومت چھین کر اسلامی حکومت کی بنیاد ڈالی۔ نیپال میں ترہٹ کا علاقہ غازی ملک تغلق نے فتح کیا اور آسام کی مکمل تسخیر اورنگ زیب کے زمانہ میں ہو سکی۔

۱۱۔ وِدھار اور تھارو ریاستیں

گنگا اور گھاگرا کا دوآبہ گیارہویں صدی عیسوی کے شروع تک راجگان پٹنہ اور قنوج کا متنازعہ فیہ علاقہ رہا ہے لیکن ۱۰۵۰ء کے قریب یہیں کی ایک غیر آریائی قوم وِہار یا بھار نامی حکومت قنوج سے بغاوت کر کے آزاد ہو گئی۔ اِس قوم کی آبادی اب بھی ضلاع فیض آباد و سلطانپور میں پائی جاتی ہے۔ اِن کا دائرۂ اثر جنوب میں مالوہ تک اور شمال میں اگر مقامی روایات[۲] پر اعتماد کیا جائے) ضلع بدایوں تک تھا۔ اِن کی قوت کو ۱۲۲۶ء میں ملک

۱:۔ راج ترنگنی جلد اوّل دیباچہ صفحہ ۱۱۲ مؤلفہ سر اورل اسٹین و میڈیول انڈیا صفحہ ۴ از ڈاکٹر ایشوری پرشاد صاحب

۲:۔ بدایوں کے اطراف میں قصبہ اعلیٰ پور کے اِردگرد کئی مشہور کھیڑوں کو وِدھار کا مقبوضہ بتایا جاتا ہے۔

(باقی مضمون صفحہ ۱۷۸ پر)

ناصرالدین گورنر اودھ نے توڑا۔ ان کا کلی استیصال ۱۲۲۶؁ء میں ناصرالدین محمود کے ہاتھوں ہوا جبکہ وہ بہرائچ کا گورنر تھا۔ اس نے اس خاندان کے آخری راجہ دل اور بل کو جو غالباً مل کر حکومت کرتے تھے شکست دیکر برطرف کردیا۔

گھاگرا کے شمال میں اضلاع بہرائچ و گونڈہ وغیرہ میں آٹھویں و نویں صدی عیسوی کے درمیان منگولین نسل کی ایک پہاڑی قوم نے جس کو تھارو کہا جاتا ہے عروج حاصل کیا۔ انھوں نے گندھرب بن[۲۷] کو جگہ جگہ کاٹکر آباد کیا اور بودھوں کے مشہور لیکن اجڑے ہوئے شہر سہیت مہیت[۳۷] کو مستقر بنا کر ایک عرصے تک حکومت کرتے رہے۔ یہ لوگ بودھ مذہب کے پیرو تھے۔ اسی قوم کے آخری راجہ سہیل دیو سے سید سالار مسعود غازیؒ کی بہرائچ کے مقام پر ۴۲۴ھ ۱۰۳۳ء میں جنگ ہوئی۔ اس ریاست کا خاتمہ قنوج کے راٹھور راجہ سری چندر دیو کے ہاتھوں گیارھویں صدی عیسوی کے آخری ربع میں ہوا۔ اور بقول مسٹر کارنیگی (Carnegy) "راجہ سہیل دیو ستر کھ کے مقام پر ہار گیا۔ راجپوتوں نے جو برہمنی مت کے طرفدار تھے بودھوں کو ان اضلاع سے نکال دیا۔ سہیل دیو کے خاندان والے نیپال کے علاقے جلا کو بھاگ گئے"[۴۷]

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۷۷ :- اعلی پور کا زبردست کھیڑہ راقم الحروف نے خود دیکھا ہے کہا جاتا ہے کہ اسے دہلی کے بادشاہ سید علاء الدین نے دہار قوم سے فتح کیا۔ آثار دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ کبھی بڑا شہر آباد ہوگا۔ حال ہی میں کھیت جوتتے وقت کھیڑہ کے اندر سے ایک مورتی سنگ مرمر کی بنی ہوئی برآمد ہوئی جس کو مسلمانوں نے ہندوؤں کے مندر میں رکھوا دیا (مولف)

۱۷ :- تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "گارڈن آف انڈیا ص ۶۷"۔

۲۷ :- دریائے گھاگرا کے شمال میں جو بن تھا اسے گندھرب بن اور جنوب میں یعنی فیض آباد اور سلطانپور کے بن کو بودھا کہتے تھے (گارڈن آف انڈیا ص ۶۶)

۳۷ :- ہندوستان کی قدیم تاریخ میں سہیت مہیت کا دوسرا نام "سراوستی" ہے جو مہاتما بودھ کے

(باقی مضمون صفحہ ۱۷۹ پر)

۱۲- بنگال کے پال

مشرقی مگدھ میں گپت خاندان کی ایک شاخ حکومت کرتی تھی اُن سے ایک اور خاندان نے حکومت چھین لی جو تاریخ میں "پال" کے نام سے مشہور ہے۔ پال خاندان کی بنیاد گوپال (۷۵۰ء تا ۷۷۰ء) نے ڈالی۔ اِس کے بیٹے دھرم پال (۷۷۰ء تا ۸۱۵ء) کو قنوج کے راجہ "اندرایودھ" نے مالوہ کے گوجروں کی مدد سے شکست دی لیکن اِس شکست کا بدلہ اُس نے اِس طرح لیا کہ دکن کے راشٹر کوٹوں کی مدد سے قنوج کو فتح کر کے شمالی ہند کا مالک بن گیا۔ اُس کا خاندان ایک عرصہ تک قنوج میں حکومت کرتا رہا۔ اِس کے بعد گوجروں کے راجہ بھوج نے انھیں قنوج سے خارج کر کے پرتہاروں کی حکومت قائم کی۔ مہی پال اور رام پال نے خاندان کی گئی ہوئی طاقت کو پھر بحال کرنے کی کوشش کی اور بنارس تک سلطنت بڑھالی۔ اِس خاندان کے آخری پال راجہ کو "سین خاندان" کے بانی "راجہ بجے سین" نے شہر گوڑ سے نکال کر اپنی سلطنت قائم کر لی۔ اب پال خاندان کے راجہ صرف معمولی سردار کی حیثیت سے بہار میں رہنے لگے جن کو آخر میں مسلمانوں نے فتح کر لیا۔ یہ خاندان بودھ مت کا پیرو تھا

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۷۸:- زمانہ میں نہایت آباد اور گلزار تھا لیکن آج کل ویران پڑا ہے۔ کھنڈرہ کی صورت میں ہے جس پر خود رو درخت اُگ آئے ہیں۔ یہ جگہ اجودھیا سے قریباً پچاس میل شمال مغرب میں دریائے راپتی کے کنارے ہے۔ دریا کچھ ہٹ کر بہہ رہا ہے۔ مہاتما بودھ کے زمانہ میں یہاں کا راجہ پرا سنجیت تھا جو مہاتما بودھ کا معتقد و پیرو تھا۔ اُس کے لڑکے ورودّھک نے راجہ ہو کر بودھوں پر بڑے ظلم ڈھائے۔ یہ ریاست ۱۳۱۹ء تک مگدھ کے باجگزار کی حیثیت سے قائم رہی۔ فاہیان نے جب اِس شہر کو دیکھا ہے تو اُجاڑ تھا صرف دو سو خاندان آباد تھے۔ ہیونگ سانگ بھی ادھر آیا ہے اُس کو وہ تالاب دکھایا گیا جس میں راجہ ورودھک نے کود کر آگ سے جان بچانے کی کوشش کی تھی۔ یہ آگ مہاتما بودھ کی بد دعا کا نتیجہ تھی (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو لمحہ فکریہ)

ع ۴۵:- بحوالہ "گارڈن آف انڈیا" صـ ۶۶، ۶۷ "مصنفہ لیج رسی اردو"

"اودنڈپور" اور "وکرم شیلا" کی بودھ خانقاہیں انھیں کے عہد میں بنیں اور نالندکے مندر کی دوبارہ تعمیر ہوئی۔

۱۴۔ سین خاندان اِس خاندان کی بنیاد وجے سین نے ڈالی۔ یہ دکن سے نوکری کی تلاش میں مگدھ کی طرف آیا اور یہاں ملازمت کرکے موقع پاتے ہی راجہ بن گیا۔ اِس خاندان میں راجہ بلال سین اور لکشمن سین مشہور راجہ ہوئے ہیں۔ اِن کے زمانہ میں برہمنوں کا مذہب چارسو برس تک دبا رہنے کے بعد پھر اُبھرا اور خوب عروج حاصل کیا۔ اختیار الدین محمد خلجی نے بنگال فتح کرکے لکشمن سین کو پورب کی طرف بھاگ جانے پر مجبور کردیا جہاں تیرھویں صدی عیسوی تک اِس خاندان کے راجہ حکومت کرتے رہے۔

فصل سوم۔ جنوبی ہند کی ریاستیں

۱۔ بادامی کے چالوکیہ عام روایتوں میں اِس خاندان کو چندربنشی راجپوتوں کی شاخ بتایا گیا ہے۔ حقیقت کچھ بھی ہو لیکن اتنا یاد رکھنا چاہیئے کہ یہاں کی رعایا میں دراوڑی نسل کے باشندوں کی کثرت تھی اور دراوڑی علوم وفنون بھی اِس حد تک ترقی کرچکے تھے کہ آریوں کو اپنی چیزیں یہاں داخل کرنے کی گنجائش نہ مل سکی۔ (اُن کے (آریوں) آنے کے وقت بھی یہاں کی زبانیں تامل تلگو۔ کنڑی ملیالم وغیرہ اپنے اندر ادبی شان رکھتی تھیں۔

شت واہنوں کے مٹ جانے کے بعد ۳۵۰ء تا ۵۵۰ء یعنی دوسو برس تک دکن کے وسطی علاقہ میں ناگکٹک لوگوں نے حکومت کی۔ اِن کی جگہ چالوکیوں نے لی اور کم وبیش بارھویں صدی عیسوی کے شروع زمانہ تک حکمراں رہے۔ اِس خاندان کا بانی "پل کیشی اول" تھا۔ اس نے اشومیدھ یگیہ کی شاہانہ رسم منائی تھی اِس کے بعد خاندان مذکور کو اس کے پوتے پل کیشن دوم ۶۰۹ء تا ۶۴۲ء نے عروج پر پہونچایا اس نے گجرات و مدراس

میں فتوحات حاصل کیں اور شمالی ہند کے راجہ ہرش کو شکست دی لیکن خود بھی آخر میں دکن کے پلّو راجہ نرسنگھ ورمن سے شکست کھا کر مارا گیا۔ اِس کے عہد میں شہنشاہ ایران کے سفیر بھی آئے تھے اور ہوان سانگ نے بھی سیاحت کرتے ہوئے حکومت کے صدر مقام بادامی[۱] کا تذکرہ کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:-

"اِس ملک (دکن) کی رعایا کے سادگی پسند اور ایک حد تک راست باز ہونے میں کلام نہیں مگر یہ لوگ نہایت مغرور ہوتے ہیں۔ ان کی دلیری اور جنگ جوئی کا اندازہ اِس سے ہو سکتا ہے کہ کسی سپہ سالار کا شکست کھا کے واپس آنا نہایت ذلت کی بات سمجھی جاتی تھی حتّٰی کہ وہ خودکشی کر لیتا یا اُسے عورتوں کے کپڑے پہننے پڑتے۔ فوج میں ایک خاص جمعیت ایسے سرفروشوں کی تھی جو لڑائی کے وقت سب سے آگے رہتے اور جب شراب پی پی کر طبل جنگ کی آواز پر مقابلہ میں نکلتے تو نشہ میں اُن کا ایک ایک شخص ہزاروں کی بھی پرواہ نہ کرتا تھا"۔ اِن سورماؤں کو جہاں اور امتیازات حاصل تھے انھیں میں ہمارے چینی سیاح نے ایک بات بھی لکھی ہے کہ "اگر وہ راستے میں کسی شخص کو قتل کر دیں تو عدالت انھیں کوئی سزا نہیں دیتی تھی"۔

پل کیشن دوم کے آخری زمانہ میں سلطنت کے دو حصّے ہو گئے تھے جو آپس میں لڑتے رہتے تھے۔ اِس خانہ جنگی سے فائدہ اٹھا کر راشٹر کوٹوں کے سرغنہ "ونت درگ" نے آخری چالوکیہ راجہ "کیرت ورمن" (۷۴۶ء تا ۸۰۳ء) کو جنگ میں مغلوب کر کے نئے خاندان کی بنیاد ڈالی۔ غرضکہ باہمی نفاق اور راشٹر کوٹوں کے غلبہ کی وجہ سے چالوکیہ راجاؤں کا اقتدار جاتا رہا اور وہ دو سو برس تک مغلوب رہنے کے بعد اُبھر سکے جس کا ذکر آگے آتا ہے۔

۲۔ مانیہ کھیت کے راشٹر کوٹ

راشٹر کوٹوں کا صدر مقام مانیہ کھیت تھا۔ یہ جگہ آج کل مملکت حیدرآباد دکن میں واقع

---

[۱] :- بادامی ضلع بیجاپور دکن میں واقع ہے (مولّف)۔

ہے اور مال کھیت یا مالکھیڑا کے نام سے مشہور ہے۔ راشٹر کوٹ غالباً علاقہ مرہٹواری میں چالوکیہ راجاؤں کے باجگذار رئیس تھے۔ ان کے مشہور راجہ گنتی ایک ہیں ونت ورگ۔ کرشن اول۔ (۷۶۰ تا ۷۷۵ء) نے ایلورا کا "کیلاش" نامی شیومندر بنوایا۔ راجہ دھرگ (۷۸۰ تا ۷۹۳ء) نے دھار کے پرتہاروں کو شکست دی اور کرشن دوم نے (۹۴۰ تا ۹۶۵ء) چول راجہ "راج دیتہ" کو ۹۴۹ء کی مشہور لڑائی میں قتل کیا۔ کرشن سوم اِس خاندان کا آخری راجہ تھا اس کے زمانہ میں قریباً ۹۸۲ء میں دکن کی حکومت چالوکیوں کے ہاتھ میں پہونچ گئی۔

۳۔ کلیانی کے چالوکیہ

دو سو برس تک مغلوب رہنے کے بعد چالوکیوں کی اُس شاخ نے جو کلیانی میں باقتدار تھی راجہ تیلپ کی سرکردگی میں راشٹر کوٹوں سے ریاست چھین لی۔ انھوں نے کلیانی واقع حیدرآباد دکن کو پایۂ تخت بنا کر ایک عرصہ تک حکومت کی۔ راجہ تیلپ اور دھار کے راجہ منج کی معرکہ آرائیوں کا ذکر پچھلے صفحات میں آچکا ہے لیکن اِس چالوکیہ خاندان کو اصلی خطرہ دکن کے چول راجاؤں سے تھا جن کی وجہ سے ان کو بادامی کے بجائے کلیانی کو مستقلاً پایۂ تخت بنانا پڑا۔ راج راج چول نے تیلپ کے بیٹے کو شکست دی جس کا بدلہ وکرمادتیہ ششم (۱۰۷۶ء تا ۱۱۲۶ء) نے لیا۔ اِسی راجہ کی سرپرستی میں مشہور قانون دان "وجنانیشور" (وگیانیشور) نے "متاکشرا" نامی قانون کی مستند کتاب لکھی۔ اِس کی وفات کے چند سال بعد "وِجّالا"[۱] نامی سپہ سالار نے بغاوت کی اور خود راجہ بن بیٹھا۔ انھیں جھگڑوں

---

[۱] وِجّالا کی بغاوت کا ذکر اوپر آچکا ہے اِس کے عہد حکومت میں دکن کا سب سے اہم واقعہ یہ ہے کہ اس کے برہمن وزیر باسَو (لبسا وا) نے ویرشیوا یا لنگ پوجا کی تحریک شروع کی۔ اِس فرقے کے لوگ شیو اور اُس کے سانڈ نندی کی پوجا کرتے ہیں اور بھگتی اور فنا پر عقیدہ رکھتے ہیں۔ انھیں ویدوں کے اہم اصول وعقائد سے انکار ہے۔ ان میں اور برہمنوں میں ہمیشہ شدید مخالفت رہی ہے۔

(باقی مضمون صفحہ ۱۸۳ پر)

میں ریاست برباد ہوگئی۔ بارھویں صدی کے آخر میں چالوکیوں نے پھر کروٹ بدلی تھی لیکن دیوگری کے جدو بنشی اور دوار سمدر کے ہوئسل راجاؤں نے اِن کی خودمختاری کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کردیا۔

۴۔ دیوگری کے یادو اِن کا دعویٰ ہے کہ وہ شمالی ہندوستان کے راجپوت ہیں اور متھرا و دوارکا سے دکن پہونچے۔ یہ شروع میں ناسک سے دیوگری تک کے علاقہ پر قابض تھے اور راشٹر کوٹ اور چالوکیہ حکومت کے باجگذار تھے لیکن راجہ سنگھن (۱۲۱۰ء تا ۱۲۴۷ء) نے خودمختار ہوکر دیوگری راج کو وسعت دی اور یہ ریاست کرشنا سے نربدا تک پھیل گئی۔ اِن کی لڑائیاں جنوب میں ہوئسلوں سے اور شمال میں گجرات کے راجاؤں سے برابر رہتی تھیں اور اُن پر اکثر یہی غالب رہتے تھے۔

ان کے مشہور راجاؤں میں مہادیو۔ رامچندر (رام دیو) اور شنکر دیو ہیں۔ اوّل الذکر دو راجاؤں کے عہد میں "ہماوری" پنڈت نے "چترو گ چنتامڑی" نامی کتاب لکھی جس میں موجودہ ہندو مت کی مذہبی رسوم و عقائد کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے اور ضمیمہ میں تمام دیوی دیوتاؤں کے نام۔ پوجا پاٹ کے طریقے اور تاریخیں وغیرہ لکھی ہیں۔ اِس ریاست کو علاء الدین خلجی نے فتح کرکے دہلی سلطنت میں ملا لیا جس کا ذکر موقع پر کیا جائیگا۔

۵۔ دوار سمدر کے ہوئسل جدو بنشیوں کی طرح یہ بھی چالوکیوں کے باجگذار رئیس تھے لیکن آخر میں چالوکیوں کے کمزور ہوجانے پر یہ خودمختار ہوگئے اور جنوب میں پانڈیہ، چول راجاؤں کو شکست دیکر اور شمال میں چالوکیہ و کونکن کے کادمبہ راجاؤں کو زک دیکر اپنی ریاست کو وسیع کیا۔ اِن کا پایۂ تخت

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۸۲۔ راجہ وجا لا اپنے وزیر باسو کی فضول خرچی سے نالاں تھا۔ بالآخر اُس نے وزیر سے محاسبہ کیا۔ باسو نے اس پر علانیہ بغاوت کی اور انھیں ہنگاموں میں راجہ اور وزیر دونوں مارے گئے۔ (مولف)

دوارسمدر واقع ریاست میسور تھا۔ یہ جگہ آج کل ہلیبید کے نام سے مشہور ہے۔ جہاں پر پرانی عظمت کو یاد دلانے کے لئے صرف ایک کھیڑا اور دو مندر باقی ہیں۔ اِس خاندان کا راجہ بٹگ (۱۱۱۰ء تا ۱۱۴۰ء) راما نج کا مرید اور وشنو مت کا پیرو تھا۔ آخری راجہ ویر بلال سوم ہوا ہے جس کو ۱۳۱۱ء میں ملک کافور پکڑ کر دہلی لے گیا بقیہ حالات کے لئے محمد تغلق جونا خاں کا عہد حکومت ملاحظہ فرمائیے۔

۶۔ وارنگل کے کاکاتی یا کاکتی

یہ بھی پہلے پہل چالوکیوں کے ماتحت تھے بعد کو خود مختار ہوگئے۔ اِس خاندان میں گنپتی اور پرتاپ رُدّر مشہور راجہ ہوئے ہیں۔ اِس ریاست کو ملک کافور نے فتح کر کے باجگذار بنایا۔ بقیہ حالات غیاث الدین تغلق کے ضمن میں بیان کئے گئے ہیں۔

۷۔ اُڑلیسہ کا گنگا خاندان

اِس خاندان کا عروج گیارہویں صدی عیسوی کے آغاز میں کلنگ دیش میں شروع ہوا۔ انھوں نے کلنگ نگر کو جو گنجام میں ہے اپنا صدر مقام قرار دیا اور ۱۳۲۴ء تک کسی نہ کسی طرح حکومت کرتے رہے۔ اِن کے حدود حکومت میں اُڑلیسہ شامل تھا۔ اِس خاندان کے ایک مشہور راجہ اننت ورمن چوڈگنگ نے جو ۱۰۷۶ء میں گدّی پر بیٹھا تھا پوری کے جگناتھ مندر کو تعمیر کرایا اِس خاندان کے زوال کے بارے میں یقینی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کیونکر ہوا لیکن خیال غالب یہ ہے کہ آخر میں یہ خاندان شاہان بنگال کا باجگذار بن گیا۔

۸۔ پلّو یا پلّوی خاندان

اِس خاندان کے بارے میں بعض مورخین کا خیال ہے کہ یہ ستھین نسل کے وہ پہلوی یا پارتھین قبائل ہیں جو ایران سے ہندوستان آئے اور کسی نہ کسی طرح دکن کے مشرقی ساحل تک پہونچنے میں کامیاب ہوگئے۔ اِن کے عروج کا زمانہ پانچویں اور چھٹی صدی عیسوی ہے اِن کا پایہ تخت کنجی ورم (کانچی) یا ونگی اور پال کھیڑ میں تھا۔ ہیوان سانگ بسلسلۂ سیاحت کانجی ورم تک پہونچا

تھا وہ لکھتا ہے "یہ سلطنت ایک ہزار میل کے دور میں پھیلی ہوئی ہے جینی اور بودھوں کی یہاں کثرت ہے۔ دس ہزار بودھ بھکشو یہاں پائے جاتے ہیں"

پَلّویوں کا اپنے پڑوسی چالوکیوں، گنگا اور پانڈیہ خاندانوں سے دست و گریباں رہنا قدرتی بات ہے۔ چالوکیہ راجہ پل کیسن دوم نے پلّو راجہ مہندر ورمن (۶۰۰ تا ۶۲۵ء) پر حملہ کیا اور اُسے شکست دے دی تھی لیکن اِس کا پورا پورا بدلہ نرسنگھ ورمن (۶۲۵ء تا ۶۴۵ء) نے لے لیا اُس نے پل کیسن دوم کو مار کر ۱۳ سال تک چالوکیوں کے پایۂ تخت بادامی کو اپنے قبضہ میں رکھا اور اُسے اُجاڑ دیا۔ رفتہ رفتہ اُنھیں باہمی جنگ و جدال نے کمزور کر دیا لیکن پھر بھی علاقۂ تامل میں گیارھویں صدی عیسوی تک ان کی بعض چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم تھیں۔ آج بھی "پدوکوٹہ" کے راجہ اپنے کو اِسی خاندان سے بتاتے ہیں مدراس کے قریب پلّویوں کے بنائے ہوئے ہفت منادر آج تک اُن کی عظمت وشان کی یاد دلاتے ہیں۔

۹۔ چول خاندان

انتہائے جنوب میں دراوڑوں کی دو نہایت قدیم ریاستیں تھیں یعنی چولا اور پانڈیہ۔ خیال ہے کہ یہ ولادتِ مسیح علیہ السلام سے بھی بہت پہلے نہایت بارونق و متمدن سلطنتیں تھیں۔ تاریخی صفحات پر چول خاندان کا ذکر نویں صدی عیسوی میں ملتا ہے جبکہ چول خاندان کے ایک راجہ "آدتیہ" نے پلّو سلطنت کو مغلوب کر کے اپنی حکومت کو وسعت دی اِس خاندان کے سب سے زیادہ مشہور راجہ "راج راج" (۹۸۵ء تا ۱۰۱۸ء) اور اُس کا بیٹا راجندر (۱۰۱۸ء تا ۱۰۳۵ء) ہیں اِن دونوں کے عہد حکومت میں میسور۔ کرگ اور اُڑیسہ کو فتح کیا گیا اور بحری بیڑہ تیار کر کے جزیرۂ لنکا کی تسخیر عمل میں آئی۔ موخر الذکر راجہ صرف فاتح ہی نہ تھا بلکہ ملکی انتظام میں بھی نہایت ماہر تھا۔ رعایا کی بہبودی اور آبپاشی کی آسانی کی غرض سے بہت سے تالاب بنوائے اور نہریں کھدوائیں زمین کی پیمائش کرائی اور گاؤں کی پنچایتوں کو فروغ دیا۔ اِس خاندان کے راجاؤں کا قدیم پایۂ تخت "اُرے یور" (پُرانی ترچناپلی) تھا۔ بعد کو

تنجور قرار دیا گیا اِن کی سلطنت پینار سے ولار وندی تک اور مغرب میں کورگ تک پھیلی ہوئی تھی۔ مذہب کے اعتبار سے آخری چول راجہ "ویرشیوا" (لنگائت) فرقہ سے تعلق رکھتے تھے اور غالباً اِسی فرقہ کی حمایت نے اُن کے ہاتھ سے جینیوں پر بار ہا مظالم کرائے۔ اِس ریاست کو مسلمانوں نے علاء الدین خلجی کے زمانہ میں باجگذار بنا لیا۔

۱۰۔ پانڈیہ خاندان

دراوڑوں کی اِس قدیم ریاست میں مدورا اور رتناولی کے اضلاع اور کسی قدر ٹراونکور کا حصّہ بھی شامل تھا۔ اِس ریاست کا صدر مقام مدورا اور سب سے بڑا بندرگاہ کائیل تھا۔ ہوان سانگ نے ادھر کا سفر نہیں کیا تھا اس لئے ہم اس کی عینی شہادت سے محروم ہیں۔ راج راج چولا نے اس کو فتح کر کے اپنے ماتحت کر لیا تھا اور یوں یہ ریاست دو سو سال تک چولا خاندان کی ماتحت رہی مگر جب پانڈیہ راجہ "جات ورمن سندر" (۱۲۵۱ء تا ۱۲۷۰ء) گدّی پر بیٹھا تو اُس نے خود مختار ہو کر اپنی ریاست کو وسعت دی۔ سیاسی کیفیت کے بقیہ حالات کا تذکرہ علاء الدین خلجی اور محمد جونا خاں تغلق کے تحت میں کیا جائے گا۔

دسویں صدی عیسوی میں جبکہ پانڈیہ راجہ سندر کی شادی چولا خاندان میں ہوئی تو اُس نے بھی جین مت چھوڑ کر "ویرشیوامت" اختیار کر لیا۔ اور پھر نئے مذہب کے جوش میں اپنے سابق ہم مذہبوں پر بڑے بڑے ظلم ڈھائے۔ اُس کے وحشیانہ مظالم کے حالات اب تک جینی مندروں کے بعض کتبات میں محفوظ ہیں۔

پانڈیہ حکومت کی دولت مندی کا اصلی سبب اُس کی تجارت تھی۔ چین اور مغربی ممالک کے سوداگر یہاں تجارت کرنے آتے تھے۔ ملک میں جابجا عربوں کی نو آبادیاں قائم تھیں۔ راجہ اُن سے نہایت شفقت و محبت سے پیش آتے تھے کیونکہ اُن کی تجارت کی وجہ سے ملک کی خوشحالی و آبادی میں دن رات اضافہ ہو رہا تھا۔ مسلمانوں میں یہ علاقہ (ساحل کارومنڈل) معبر کے نام سے مشہور تھا۔ یہاں کے حالات کا تذکرہ اکثر عرب سیاحوں نے

کیا ہے اور اس زمانہ کے مورخین نے بھی معبر کے حالات پر کافی روشنی ڈالی ہے۔ ڈاکٹر سید سلیمان ندوی نے وصاف (المتوفی ۷۲۸ھ) اور رشید الدین مصنف جامع التواریخ (المتوفی ۷۱۸ھ) کے حوالہ سے اپنی ایک ضخیم تصنیف "عرب و ہند کے تعلقات" میں صفحہ ۲۷۱ پر معبر یا کارومنڈل کا نہایت دلچسپ حال تحریر فرمایا ہے چونکہ یہ تجارتی و سیاسی نقطۂ نظر سے کافی اہمیت رکھتا ہے اسلئے اس کا اقتباس پیش کیا جاتا ہے "معبر کولم سے لیکر سیلوار (نیلور) کے ملک تک سمندر کے کنارے تین فرسنگ لمبا ہے اس کے اندر بہت سے شہر اور گانوں ہیں...... چین کے بڑے جہاز جنکو "جنک" کہتے ہیں یہاں چین و ماچین اور سندھ و ہند کے ملکوں سے بیش قیمت سامان اور کپڑے لاتے ہیں۔ معبر سے ریشمی کپڑے۔ خوشبودار لکڑی لیجاتے ہیں۔ اس کے دریا سے بڑے موتی نکالے جاتے ہیں یہاں کی پیداوار یں عراق، خراسان، شام، روم اور یورپ تک جاتی ہیں" اس کے بعد یہاں کے راجہ سندر پانڈے اور اس کے وزیر ملک تقی الدین بن عبدالرحمٰن کا حال درج کیا ہے۔ اسی سلسلہ میں تقی الدین کے بھائی شیخ جمال الدین کی تجارت کے بارے میں لکھا ہے "چونکہ معبر میں گھوڑے اچھے نہیں ہوتے اسلئے درمیان میں (یعنی راجہ اور جمال الدین کے مابین) یہ معاہدہ تھا کہ جمال الدین راجہ کو چودہ سو مضبوط عرب گھوڑے قیس کی بندرگاہ سے لادیا کرے رسال میں دس ہزار گھوڑے خلیج فارس کی دوسری بندرگاہوں مثلاً قطیف، البحرین، ہرمز، الحساء وغیرہ سے آتے تھے اور ہر گھوڑے کی قیمت ۲۲۰ طلائی سکے مقرر تھی"۔ اس کی بعد کی سطروں میں راجہ کی وفات اور اس کی دولت کی تقسیم کا حال درج کیا ہے مرنے کے بعد اس کے نائبوں، وزیروں اور مشیروں میں جو دولت تقسیم کی گئی اس کی کثرت کا اندازہ یوں لگائیے کہ سات ہزار بیلوں کا بوجھ سونا اور جواہرات جمال الدین کے حصہ میں آئے۔ پانڈیہ حکومت بالآخر آپس کے خانگی جھگڑوں سے برباد ہوگئی۔ معبر کے بقیہ حالات علاؤالدین

خلجی اور محمدؒ جونا خاں تغلق کے عہد حکومت میں بیان کئے جائیں گے

۱۱۔ چیرا خاندان

ہندوستان کی موجودہ ریاست ٹراونکور کے حکمراں کے آباو اجداد نے نویں صدی عیسوی میں علاقہ ملابار پر قبضہ جمایا۔ قدیم زمانہ میں اِس علاقہ کو کیرالا کہتے تھے اور بعد کو ملیبار (ملی بمعنی پہاڑ اور بار ملک کو کہتے ہیں یعنی پہاڑی ملک) کہنے لگے۔ چول اور پانڈیہ کی طرح اِس ریاست کے مالک بھی دراوڑ ہی تھے۔ اِس حکومت کی خوش حالی و مالی ترقی کا باعث بھی تجارت ہی تھی۔ اسلام سے پہلے اور بعد کو بھی یہاں کی تجارت کے مالک عرب ہی تھے۔ شیخ زین الدین جو سلطان عادل شاہ بیجاپوری کے درباری اور خاص ملیبار کے باشندے تھے اپنی کتاب تحفتہ المجاہدین[1] میں یہاں کے راجہ زیمور (سامری) کا مسلمان ہونا دوسری صدی ہجری میں بتلاتے ہیں اسی روایت کو فرشتہ نے بھی صحیح مانا ہے[2]۔

یہاں کے راجہ مسلمانوں کے مذہب اور اُن کے شعائر کا بہت کچھ پاس ولحاظ کرتے تھے۔ مسلمانوں نے جہاں جہاں اپنی نو آبادیاں قائم کیں اُن میں سے کدنکلور[3]۔ کولم[4]۔ ہیلی ماراوی[5]۔ جرپٹن[6]۔ دہ پٹن۔ منگلور۔ فاکنور[8]۔ چالیات (شالیا)۔ فندرینا (پنڈارانی)[9] وغیرہ زیادہ مشہور ہیں۔

---

[1]:۔ راجہ کے مسلمان ہونیکا واقعہ کتاب مذکور کے صفحات ۱۳، ۱۴ پر تحریر ہے (مولف)

[2]:۔ فرشتہ صفحہ ۳۶۸ و صفحہ ۳۶۹ جلد دوم

[3]:۔ موجودہ زمانہ میں اسکو کرنگانور کہتے ہیں۔ کوچین کے قریب ملیبار کے جنوبی علاقہ میں ساحل بحر پر واقع ہے زمانۂ قدیم میں رومی و عربی تجار کی تجارت کا مرکز تھا۔

[4]:۔ سرحد ملیبار کا اخیر مقام ہے۔ سلیمان تاجر اور ابوزید سیرانی نے اس کو کولم ملی لکھا ہے۔

[5]:۔ یہ کنانور سے سولہ میل کے فاصلہ پر ایک شہر تھا۔ اب کوہ ہیلی (الائچی) کا ایک ٹکڑا سمندر میں ہے۔

(باقی مضمون صفحہ ۱۸۹ پر)

یہاں کے راجہ تیرھویں صدی عیسوی تک نہایت عمدگی سے حکومت کرتے رہے۔

اِسی خاندان کے ایک راجہ "روی ورمن" نے دکن کے راجاؤں کو مجتمع کر کے ملک کافور کا مقابلہ کیا تھا۔ یہ ریاست آج بھی قائم ہے گو اِس کے حدود حکومت نہایت مختصر و محدود ہیں۔

خلاصۂ کلام

مذکورۂ بالا ریاستوں کی سیاسی حالت آپ نے ملاحظہ فرمائی۔ ان میں سے بعض ریاستیں اگر شو اور وشنو کی پرستار ہیں تو بعض مہابیر و بودھ کی نام لیوا ہیں۔ ان تمام مختلف العقیدہ اور مختلف الخیال ریاستوں کے اندر جو چیزیں بطور قدر مشترک نظر آتی ہیں ان میں سے جو چیز سب سے زیادہ نمایاں ہے وہ ایک دوسرے پر سیاسی تفوق و اقتدار حاصل کرنے کی خواہش و جدوجہد ہے۔ اِس ضمن میں ہمیں برہمن برہمن سے۔ بودھ بودھ سے۔ برہمن بودھ سے اور بودھ برہمن سے اسی طرح شیویوں کی جماعت جینیوں سے اور جینیوں کی شیوی جماعتوں سے بر سرِ پیکار نظر آتی ہیں۔ سیاسی برتری حاصل کرنے کے لئے اگر جدید ہندو مت کے پرستار گورجر، بنگال و بہار کے بودھوں سے دست وگریباں ہیں تو وہ آپس میں بھی ایک دوسرے کو نیچا دکھانے میں کسر اٹھا نہیں رکھتے۔ غرضکہ اپنی ریاست کو وسیع کرنے اور اپنے سیاسی حریف کو نیچا دکھانے کا جذبہ شمالی و جنوبی ہند میں یکساں دکھائی پڑتا ہے۔ اِسی کے ساتھ ساتھ راجاؤں کی آپس کی ذاتی رنجشیں بھی ہندوستان میں طوائف الملوکی پھیلانے کا ایک بڑا سبب ہیں چنانچہ پرتھوی راج اور پرمال کی لڑائیاں اور پرتھی راج وجے چند کی نبرد آزمائیاں اِسی قبیل سے ہیں۔

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۸۸ = عــہ۔ پیلی سو ۳ فرسخ کے فاصلہ پر آباد تھا۔ اسکے قریب صندالپور کی آبادی تھی۔

عــہ :۔ یہ مقام ٹیلی چری کے قریب آباد تھا۔

عــہ :۔ موجودہ زمانہ میں اِس کو برکور کہتے ہیں۔ ساحل بحر کی بستی ہے۔

عــہ :۔ " " " " " چالیام " " " " "

ہندوستان کی اِن تمام شمالی و جنوبی راجپوت ریاستوں میں قومی تفاخر اور نسلی امتیاز نے اگر آپس میں تلواریں چلوائیں تو ساتھ ہی ساتھ مذہب کی خاطر بھی بعض وقت خون بہایا گیا چنانچہ شمالی ہندوستان میں جدید ہندو مت کے پیروؤں یعنی گورجروں اور بہار کے بدھ پرست پال راجاؤں میں جو لڑائیاں ہوئیں ان میں ایک حد تک مذہبی جوش کو بھی دخل ہے۔ اسی طرح جنوبی ہندوستان کے چیرا، چولا اور پانڈیہ خاندانوں میں باوجود ہم نسل ہونے کے مذہبی بیگانگت نے بعض اوقات کشت و خون کرایا۔ پچھلے صفحات میں بتایا جا چکا ہے کہ چندیلوں کے راجہ یشو ورمن (۹۳۰ء تا ۹۵۰ء) نے اپنے تعمیر کردہ کھجراہو کے مندر کی زینت کو بڑھانے کے لئے قنوج کے راجہ سے جنگ کی اور اس سے زبردستی ایک بیش قیمت بُت کو چھین کر اپنے مندر میں لا کر رکھا اسی طرح ایک چیدی راجہ کرشن نامی نے اُڑیسہ کے راجہ پر حملہ کر کے سومناتھ (دوارکا) میں نصب کرنے کے لئے ایک بُت بزور شمشیر حاصل کیا۔

بُتوں کے حصول کے لئے آپس میں یہ جنگ آزمائی سمجھ سے باہر ہے اس میں کچھ شبہ نہیں کہ قنوج اور دھوبہ کے راجہ نسلاً مختلف تھے لیکن دونوں ریاستوں کا مذہب غالباً ایک تھا یہی صورت چیدی اور اُڑیسہ کے ریاستوں کے مابین سمجھئے تو پھر یہ جنگ آزمائی یا تو اس لئے تھی کہ ان ریاستوں میں پوجے جانے والے دیوتاؤں کے درمیان بھی چھوٹائی و بڑائی کا سوال تھا اور اس لئے وہ ریاستیں ایک دوسرے سے اپنے دیوتا کی بزرگی منوانا چاہتی تھیں اور یا پھر اس لئے کہ بُت بلحاظ ساخت و وضع قطع اِس قدر خوبصورت و بیش بہا تھے کہ انھیں حریف سے چھین کر اپنے قبضہ میں کرنا ضروری سمجھا گیا۔ بہرحال اصلیت جو کچھ بھی ہو اس میں کلام نہیں کہ مشرق میں سیاست کے ساتھ مذہب کا ہمیشہ تعلق رہا ہے لیکن سیاست کے ساتھ مذہبی وابستگی کے بندھن اُسی وقت تک سخت رہے ہیں جب تک کہ حریف پر سیاسی تفوق حاصل نہ ہوا۔ سیاسی اقتدار حاصل ہوتے ہی یہ بندھن

بھی ڈھیلے پڑ جاتے ہیں اور رفتہ رفتہ وابستگی و وارفتگی ختم ہو جاتی ہے اس لئے ہندوستان کی یہ مذہبی کشمکش اور فرقہ وارانہ کیفیت بھی عارضی و ہنگامی سمجھئے ۔ بعض یورپی مورخین[۱] نے ہندوستان کے اِن عارضی و ہنگامی جھگڑوں کو اپنے حال پر قیاس کر کے بہت زیادہ اہمیت دیدی ہے حالانکہ مشرقی ممالک میں مغربی عیسائی ممالک کے بخلاف چرچ نے اپنا حریفانہ نظام اسٹیٹ کے مقابلہ میں کبھی بھی قائم نہیں کیا ہے اِسی وجہ سے مشرقی ممالک کی ریاستوں کے آپس کے جھگڑے زیادہ تر سیاسی ہوا کرتے تھے جبکہ یورپ کے اندر کامل ایک ہزار سال تک چرچ نے اسٹیٹ کی قوت کو مغلوب رکھا اور مذہب کی خاطر مذہب کا نام لیکر کروڑوں بندگانِ خدا کا خون بہایا۔

الغرض جس طرح ہندوستان کے اندر ریاستوں میں صلح و جنگ کے متواتر تعلقات قائم تھے اسی طرح ہندوستان اور درۂ خیبر پار کے ملکوں کی ریاستوں کا حال تھا ۔ اسلام سے پہلے کیفیت یہ تھی کہ جب کبھی شاہ کابل کو قوت حاصل ہوئی تو اُس نے ویہند اور لپٹا ور تک قبضہ کر لیا اور جب کبھی رائے لوہارور (لاہور) کو موقع ملا تو اپنی ریاست کی سرحد لمغان و کابل تک بڑھالی غرضکہ افغانی کوہستان کے درّوں سے مسلمانوں کی ہندوستانی راجاؤں کے ساتھ قوت آزمائی محض مذہبی جذبہ کا نتیجہ نہ تھی جیسا کہ یورپی مورخین ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں بلکہ صدیوں کی قومی لڑائیوں کے سلسلہ کی یہ ایک کڑی ہے جس کی تفصیل اگلے صفحات میں پیش کی جائیگی ۔ لیکن فی الحال دو تین ضروری باتیں ضرور ذہن نشین کر لیجئے تاکہ ہمارے مغربی مورخین کے پیدا کردہ مسموم اثرات سے آپ کا قلب و دماغ پاک و صاف ہو جائے اور آپ آنے والے واقعات کو سننے اور پڑھنے کے لئے فراخدلی کے ساتھ تیار ہو سکیں :-

---

[۱] برہمنوں کی بودھوں و جینیوں پر مظالم گنوانے میں Sewell ، Hodgson اور Watters نمایاں ہیں (مولف)

(۱) اول یہ کہ اِن حملہ آور ترکوں کو ہمارے ہندوستانی سرحدی راجاؤں نے خود ہی چھیڑ کر بیٹھے بٹھائے ایک آفت اپنے سر مول لی۔

(۲) دوسرے یہ کہ اِن حملہ آور غزنوی ترکوں کے ہندوستان میں بار بار آنے کا مقصد یہ تھا کہ سندھ و ملتان کے قرامطہ کا استیصال ہو سکے اور اس طرح اُن کی شرقی وجنوبی سرحد محفوظ ہو جائے تاکہ اُن کو اپنے شمالی و مغربی حریفوں کا جو اُس وقت کے ہندو راجاؤں سے یقیناً زیادہ خطرناک و طاقتور تھے دل کھول کر مقابلہ کرنے اور اُن کو نیچا دکھانے کا موقع مل سکے۔

(۳) تیسرے یہ کہ ترک اُنھیں قدیم مغول و تاتار، ستھین وہن اور شکوں کی اولاد سے تھے جو شمالی و مغربی پہاڑی دّروں سے ہندوستان پر اب سے بہت پہلے بار بار حملہ آور ہوتے رہے تھے اور اب اُن کی اولاد نے مسلمان ہو کر اپنے بزرگوں کے کارناموں کو از سر نو دہرایا۔ اسلئے مغربی مورخین کے پیش کردہ حملہ آوری کی فرضی داستانوں پر کان نہ دھرئے بلکہ یوں سمجھئے کہ یہ حملے زمانۂ ماضی کے سیاسی حملوں کا ایک تتمہ تھے جن کا مقصد محض سیاسی برتری و تفوق حاصل کرنا تھا اور مذہب کو ان حملوں میں کہیں دور کا بھی لگاؤ نہ تھا۔ علاوہ ازیں بقول پروفیسر محمد سرور صاحب "حملہ آوروں اور حملہ آوروں میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ بعض حملہ آور موسمی سیلابوں کی طرح آتے اور اپنا چند روزہ جوش و خروش دکھا کر پھر سمٹ سمٹا جاتے ہیں۔ اِن کی مثال آندھیوں کی طرح ہوتی ہے۔ گو خدا کی خدائی کو ان سے بڑے بڑے نقصان سہنے پڑتے ہیں لیکن کم سے کم بیماریوں اور آلائشوں کے جراثیم جو انسانیت کو بری طرح چمٹے ہوئے ہوتے ہیں اُن کی وجہ سے چھٹ جاتے ہیں لیکن بعض حملہ آور ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنے ساتھ ایک زندگی بخش تصور حیات اور ارفع و اعلیٰ نظام تمدن لیکر آتے ہیں اگرچہ اِن حملہ آوروں کا آنا بھی شروع شروع میں بڑی خونریزی کا باعث ہوتا ہے لیکن جوں ہی فتح و تسخیر کا عمل مکمل ہو جاتا ہے تو حملہ آور جو صالح فکر اور

بہتر تمدّن اپنے ساتھ لیکر آئے تھے اُن کے اچھے اثرات مفتوحہ ممالک پر پڑنے لگتے ہیں چنانچہ اُن کی وجہ سے محکوم قوموں کی زندگی میں ایک حرکت پیدا ہوجاتی ہے وسط ایشیا ء سے آنے والے مسلمانوں کے ہندوستان پر حملے بھی اسی قسم کے تھے[1]"

(۴) لہذا آخری لیکن سب سے زیادہ ضروری چیز جس پر آپ کو غور کرنا ہے وہ یہ ہے کہ اُس وقت کے ہندوستان کے سیاسی جمود و انحطاط کو دور کرنے اور سماج میں ازسرِ نو زندہ دلی و تروتازگی کی روح پیدا کرنے کے لئے کسی زبردست سیاسی انقلاب کی ضرورت تھی یا نہیں؟ آپ اِس کا جواب یقیناً اثبات میں دینگے تو پھر یہ وہی انقلاب تھا جو قدرت نے مسلمانوں کے ہاتھ سے ہندوستان میں انجام دیا اس لئے آپ ہندوؤں و ترکوں کے تعلقات کو اِسی نقطۂ نظر سے دیکھئے۔

ع[1]:- ماخوذ از "مولانا عبید اللہ سندھی" صفحہ ۲۷۶ مصنّفہ پروفیسر محمد سرور صاحب۔

باب چہارم استقرار سلطنت

فصل اوّل "سلاطین شنسبانیہ"

غوری خاندان کی مختصر کیفیت

افغانوں کی دو مشہور قومیں ہیں ایک قیسی دوسری شنسبی۔ قیس بن عیص المعروف بہ عبدالرشید کی نسبت بیان کیا گیا ہے کہ یہ آنحضرت صلعم کے زمانہ میں مدینۂ منورہ حاضر ہوکر مسلمان ہوا۔ اور افغانستان واپس آکر اپنے قبیلے کو مسلمان بنایا۔ عبدالرشید کی اولاد افغانستان و سرحدی صوبہ کی غالب آبادی ہے۔

شنسب بن حریق جو علاقۂ غور کا رئیس تھا حضرت علیؓ کے زمانہ میں مسلمان ہوا[1] اس کی اولاد افاغنہ شنسبی کہلائی انہیں میں لودی و سوری پٹھان شامل ہیں۔ بعض مورخین نے لکھا ہے کہ وہ ایران کے نیم تاریخی بادشاہ ضحاک کی اولاد میں ہیں لیکن جدید تحقیقات کی رو سے یہ بادشاہ "تاجیک" یعنی اہل ایران و عرب کی مخلوط نسل سے ہیں۔ اور غالباً خراسان سے آٹھ کر ان اضلاع میں آئے۔

محمود غزلوی کے زمانہ تک ان کے ماتحت قبائل افغانستان کے پہاڑی جرگوں کی طرح نیم خانہ بدوشوں کی زندگی بسر کرتے تھے۔ اور ان کے بہت سے افراد بت پرست تھے۔ اس خاندان کا تعلق سیاسیات اسلامیہ سے ایک عرصۂ دراز سے چلا آرہا تھا۔ بنو امیہ کے خلاف جب سازشیں شروع ہوئیں تو یہ خاندان ابو مسلم خراسانی کا شریک کار بن گیا۔ خلافت عباسیہ قائم ہوجانے پر اس خاندان کی عزت افزائی کی گئی۔ لیکن جب علویوں

---

[1]:۔ طبقات ناصری ص ۲۹

نے عباسیوں کے خلاف سرگرمی شروع کی تو غور کا یہ خاندان محبِّ اہل بیت ہونے کی وجہ سے علویوں کا طرفدار بن گیا یہی وجہ تھی کہ جب قرامطہ نے خراسان و افغانستان میں اپنی تحریک شروع کی تو اس خاندان اور ان کے ناقابل تسخیر کوہی علاقے کو اپنی کوششوں کا مرکز بنایا۔ محمود غزنوی نے جب ان پر فوج کشی کی تو "آہن گران" نامی قصبہ جو غزنی سے ۲۲۵ میل جانب غرب رود میں واقع ہے ان کا سب سے زیادہ مضبوط اور دشوار گزار قلعہ تھا۔ اور محمد بن سوری اُن کا ملک یا سردار تھا، جسے لڑائی میں شکست ہوئی اور قید کر کے غزنی بھیج دیا گیا۔ اسی شکست کے بعد غور کا یہ شنسبی خاندان شاہان غزنی کا باجگزار ہو گیا۔ اور وہاں کے قبائل میں صحیح اسلامی عقائد کی اشاعت ہوئی۔

سلطان محمود غزنوی نے محمد بن سوری کے بعد اُس کے بیٹے ابو علی کو غور کا حاکم مقرر کر دیا۔ ابو علی کے بعد اُس کا بھائی شیش، شیش کے بعد اس کا لڑکا عباس، عباس کے بعد اُس کا لڑکا امیر محمد، امیر محمد کے بعد اُس کا بیٹا قطب الدین حسن اور قطب الدین حسن کے بعد اُس کا بیٹا عز الدین حسین یکے بعد دیگرے غور کے امیر مقرر ہوتے رہے عز الدین حسین نے سلطان سنجر سے نیاز مندانہ مراسم پیدا کر کے غزنی کی اطاعت سے علی طور پر آزادی حاصل کر لی اور سلطان مسعود الکریم اور اُس کے بیٹے ارسلان نے بے التفاتی سے کام لے کر اُس کی آزادی کو تسلیم و گوارا کر لیا تھا۔ اس کی وفات کے بعد سلاطین غزنویہ کو اُس کی اولاد سے کام پڑا جس کا حال جلد اول میں تحریر کیا جا چکا ہے۔

سلطان علاء الدین حسین جہانسوز

سلطان علاء الدین الحسین بن الحسین بن سام شاہان شنسبانیہ میں چودھواں سلطان ہے۔

اس کے زمانہ میں غزنی کے سلطان بہرام شاہ نے علاء الدین کے دو بھائیوں کو قتل کرا دیا تھا جس کا علاء الدین نے بہت سخت انتقام لیا۔ عُروس البلاد غزنی سات شبانہ روز جلتا رہا اور ادھر یہ افغانستان کا نیرو ایک قصر میں بیٹھا عیش و طرب کا لطف اُٹھاتا رہا آخر

آٹھویں روز مطربوں کو حکم دیا کہ چنگ و چغانہ پر یہ نظم گائیں جو خود اس نے اپنی مدح میں نظم کی تھی ؎

جہاں داند کہ من شاہِ جہانم	چراغ دودۂ عبّاسیانم
پر آں بودم کہ از او باش غزنی	چو رُود نیل جوئے خوں برانم
ولیکن گندہ پیرانند و طفلاں	شفاعت می کند بخت جوانم
بہ بخشیدم بدیشاں جان ایشاں	کہ باد اجانِ شان پیوند جانم[1]

مگر اس جان بخشی کا اعلان ہونے تک کم از کم ستر ہزار آدمی قتل ہو چکے تھے۔ تمام عمارات کو کہ "در آفاق نہ بودند" جلا کر خاکستر بنا دیا گیا۔ مگر تقدیر نے اس سے ان وحشیانہ مظالم کا بدلہ لینے میں دیر نہ کی۔ کیونکہ جب وہ واپس لوٹ کر فیروزکوہ پہنچا اور غرور میں سلطان سنجر سلجوقی کی خدمت میں وہ نذرانہ جو عزالدین حسین کے زمانہ سے بھیجا جاتا تھا بھیجنا بند کر دیا تو سلطان سنجر نے غور پر لشکر کشی کی اور اس کو پا بہ زنجیر گرفتار کر کے خراسان کی طرف لے گیا جہاں وہ دو سال تک سنجری لشکر کے نانبائیوں کے تنور سلگاتا اور طرح طرح کی ذلّتیں اُٹھاتا رہا۔ آخر سلطان سنجر نے "ترکان غز" کے خطرات کو محسوس کر کے جہانسوز پر احسان کرنا

---

[1] اس نظم کے چار اشعار اور ہیں جن کو صاحب طبقات ناصری نے نقل کیا ہے، دوسرے موقع پر مندرجہ ذیل نظم تحریر کی اس کے بھی کل آٹھ شعر ہیں جن میں سے بعض درج ذیل ہیں ؎ (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو طبقات ناصری ص ۵۷ تا ۵۹)

آنم کہ ہست فخر ز عدلم زمانہ را	آنم کہ ہست جو ز بذلم خزانہ را
انگشتِ دستِ خویش بدنداں کند عدو	چوں برزہ کماں نہم انگشتوانہ را
بہرام شہ بکینۂ من چوں کماں کشید	کندم بکینہ از کمرِ او کمانہ را
پشتیِ خصم گرچہ ہمہ رائے ورانا بود	کردم بگرز خورد سر رائے ورانا را
کیں توختن بہ تیغ در آموختم کنوں	شاہانِ روزگار و ملوک زمانہ را

چوتھے شعر کے اندر رائے ورانا خاص طور پر قابل توجہ ہیں۔

مناسب سمجھا اس لئے قید سے رہائی بخشی۔

جہانسوز کے واپس آنے کی خبر سن کر امرا نے ناصر الدین حسین بن شجاع الدین علی کو جسے اس کی غیبت میں اپنا بادشاہ بنالیا تھا قتل کرادیا۔ جہاں سوز نے فیروز کوہ آکر تخت سلطنت پر جلوس کیا۔ انہیں ایام میں "ترکان غز" نے سلطان سنجر کو گرفتار کرلیا۔ اور انہیں کی ایک جماعت نے آکر غزنی پر قبضہ کرلیا۔ جہانسوز کا ۵۵۴ھ ۱۱۵۸ء میں انتقال ہوگیا۔ یہ ملاحدہ کا سرپرست تھا۔[۱]

سلطان سیف الدین محمدؒ

جہانسوز کے بعد اس کا بیٹا سیف الدین محمد تخت نشین ہوا۔ اس نے تخت نشین ہوتے ہی اپنے دونوں چچازاد بھائیوں شمس الدین اور شہاب الدین کو جو بہاء الدین سام کے بیٹے تھے اور جنہیں جہانسوز نے قید کردیا تھا رہائی دلائی۔ یہ سلطان نہایت نیک طینت اور رحمدل تھا۔ وہ اپنے بزرگوں کے قرمطی عقائد کے خلاف اسلامی عقائد کا سختی سے پابند اور ملاحدۂ الموت سے سخت متنفر تھا اس نے تخت نشین ہوکر ملاحدہ کے تمام منادوں اور اور مبلغوں کو جو حدود غور میں پھیلے ہوئے تھے قتل کرادیا۔ اس کے زمانہ میں ترکان غز نے غور پر حملہ کیا ان کا مقابلہ کرنے کے لئے یہ لشکر فراہم کرکے رودبار مرو کی طرف بڑھا جہاں عین معرکۂ جنگ میں اس کے سپہ سالار ابو العباس شیث نے پیچھے سے آکر اس کو قتل کردیا۔[۲] فوج بادشاہ کو مقتول دیکھ کر بھاگ کھڑی ہوئی اور بادشاہ کی لاش بھی میدان ہی میں چھوڑ آئی۔ بھاگی ہوئی فوجیں شہر افشیں سے آگے جب ایک قصبہ میں آکر جمع ہوئیں تو ابو العباس نے تمام سرداران لشکر کو رضامند کرکے شمس الدین کو غیاث الدین کے لقب سے بادشاہ بنادیا اور اسی جگہ ہر قسم کا انتظام کرکے ترکانِ غز کو شکست دیکر پسپا کیا۔ یہ واقعہ ۵۵۸ھ

ع۱۔ منہاج سراج ص ۶۳

ع۲ ۔ یہ سپہ سالار قرامطہ کا ایجنٹ تھا۔ (مؤلف)

یا ۵۵۶ھ کا ہے۔

سلطان سیف الدین نے صرف ایک سال اور چند ماہ حکومت کی۔

سلطان شمس الدین الملقب بہ غیاث الدین ۵۵۶ھ ۱۱۶۰ء تا ۵۹۹ھ ۱۲۰۲ء

سلطان نہایت شان وشوکت کے ساتھ ۴۳ سال حکومت کی اس جواں سال بادشاہ کی فتوحات و کارنامے جنھوں نے عہد محمود کی یاد تازہ کردی تھی۔ ہماری تاریخ کے احاطے سے خارج ہیں۔ اہل ہند کو صرف اس کے بھائی شہاب الدین سے سابقہ پڑا جس نے بعض فتوحات کے بعد اپنا لقب معزالدین والدنیا محمد بن سام اختیار کرلیا تھا۔ شہاب الدین بامیاں سے جہاں وہ اپنے چچا فخرالدین مسعود کے پاس رہا کرتا تھا اپنے بھائی کے تخت نشین ہونے کے بعد اجازت لیکر فیروز کوہ چلا آیا۔ ابوالعباس نے چونکہ غیاث الدین کو تخت نشین کرایا تھا۔ اس لئے وہ اس پر بہت حاوی تھا۔ بادشاہ کو قابو میں رکھنے کے لئے شورشیں کراتا رہتا تھا۔ شہاب الدین نے آکر بھائی کو مشورہ دیا کہ اپنے مقتول چچا سیف الدین کا قصاص ضرور لیا جاوے چنانچہ ایک موقعہ پر سرِ دربار ابوالعباس کو قتل کرادیا گیا۔ اس کے بعد تمام شورشیں خود بخود فرو ہوگئیں۔ سلطان غیاث الدین نے اپنے ہونہار بھائی کو تگین آباد اور گرم سیر کے علاقہ کا حاکم مقرر کیا جہاں سے وہ باربار غزنی پر جو ترکان غز کے قبضہ میں تھا حملہ آور ہوتا رہتا تھا۔ بالآخر ۵۶۹ھ ۱۱۷۳ء میں ترکان غز کو غزنی سے نکال کر جب غوریوں نے تیسری مرتبہ غزنی پر قبضہ جمایا تو غیاث الدین نے اپنے بھائی شہاب الدین کو یہاں کا خود مختار حاکم بنادیا۔

شہاب الدین الملقب بہ سلطان معزالدین د سام ۱۱۷۳ء تا ۱۲۰۶ء

چونکہ شاہی خاندان کے صوبیدار اپنی جگہ پر قریب قریب خود مختار حاکم ہوتے تھے۔

ع[۱] - بقول فرشتہ ۵۶۷ھ دیکھو صہ ۵۶

اس لئے بعض مورخین نے ۱۱۷۳ء کو اس کے عہد بادشاہی کا آغاز قرار دیا ہے حالانکہ اپنے بڑے بھائی کی زندگی میں شہاب الدین نے خود مختار ہونے کا کبھی دعویٰ نہیں کیا اور ہمیشہ اس کا مطیع اور فرماں بردار رہا۔

غیاث الدین کو اگر فیروز کوہ میں بیٹھ کر محمود غزنوی کے قدیم مقبوضات کو واپس لینے کی آرزو ہوسکتی تھی تو کوئی وجہ نہ تھی کہ خاص محمودی پایہ تخت کا مالک جس کے سوختہ اور شکستہ در و دیوار اب تک ہمت عالی کے حیرت انگیز کرشمے یاد دلاتے تھے اس کے جنوب و مشرق کے علاقوں کو پھر غزنی کے ماتحت لانے کی سعی نہ کرتا۔ ادھر اُسے اپنے چچا کے وہ جملے بھی یاد تھے جو اس نے شمس الدین کی تخت نشینی کے وقت کہے تھے کہ تیرے بھائی نے تو یہ نام پیدا کیا دیکھیں تو کیا کر کے دکھاتا ہے۔ بہر حال غزنی کا انتظام ٹھیک ٹھاک کرنے کے بعد اس نے ہندوستان کی طرف توجہ کی۔

ع۱۔ ۱۱۷۵ء / ۵۷۱ھ میں غوری نے ملاحدۂ ملتان پر فوج کشی کی اور اسے فتح کر کے

ع۲۔ اُچ کی طرف متوجہ ہوا کیونکہ یہاں ملاحدہ نے پناہ لی تھی ۱۱۷۶ء میں اُچ بھی مفتوح ہوگیا اُچ کے راجہ کی رانی[1] نے غوری سے شادی کرلی۔

ع۳۔ ۱۱۷۸ء / ۵۷۳ھ میں یہ معلوم ہونے پر کہ ملاحدہ کو گجرات کے بگھیلے راجہ بھیم دیو[2] نے پناہ دی ہے غوری فوج جرار لے کر چڑھ دوڑا لیکن فوج دوری سفر کی وجہ سے خستہ حال تھی۔ اس لئے بھیم دیو کے مقابلہ میں ناکامیابی ہوئی پھر بھی اس حملہ کا حسب منشا یہ نتیجہ ضرور نکلا کہ ملاحدہ نے گجرات کو آئندہ کے لئے اپنی سازشوں کا مرکز بنانا چھوڑ دیا

ع۱:۔ فرشتہ کی روایت کے بموجب غوری نے رانی سے نہیں بلکہ اس کی لڑکی سے شادی کی۔ جو غزنی جا کر فرطِ غم سے نڈھال ہو کر ۲ سال کے اندر مرگئی۔

ع۲:۔ بعض مورخین نے راجہ کا نام مولراج دوم بتایا ہے (ملاحظہ ہو تالیف ڈاکٹر حبیب اللہ صہ ۵۳ فٹ نوٹ)

یا کم کر دیا۔[1]

۴۔ ۵۷۷ھ ۱۱۸۰ء میں ملک خسرو یا خسرو ملک پنجاب کے حاکم سے پشاور چھین لیا۔

۵۔ ۵۸۰ھ ۱۱۸۱ء میں غوری نے راجہ جموں کی دعوت پر پنجاب پر حملہ کیا اور سیالکوٹ میں سرحدی قلعہ بنوایا اور وہاں ایک سردار حسین خرمیل کو متعین کیا چکر دیو راجہ جموں کی خسرو ملک سے ہمیشہ ان بن رہتی تھی خسرو ملک کی مدد سے کھوکر قوم نے راجہ جموں کی اطاعت سے انحراف کیا تھا۔ اس بناء پر اس نے غوری کو پنجاب پر حملہ کی دعوت دی تھی۔

۶۔ غوری کے واپس جاتے ہی خسرو ملک نے سیالکوٹ پر حملہ کیا لیکن ۵۸۲ھ ۱۱۸۶ء میں محصورین کی راجہ جموں نے مدد کی اس لئے قلعہ کو فتح نہ کر سکا۔ ۵۸۲ھ ۱۱۸۶ء میں جب غوری نے دوبارہ پنجاب کے غزنی حکمراں پر فوج کشی کی تو وجے دیو ولد راجہ چکر دیو (چکر دیو کا انتقال ہو چکا تھا) نے غوری کی مدد کی اور پنجاب کا غور سے الحاق ہو گیا۔ مؤلف طبقات ناصری کے والد سراج الدین کو قاضی مقرر کیا۔ خسرو ملک کو غزنی پکڑ کر لے گیا۔ جہاں سے باپ بیٹے دونوں کو سلطان غیاث الدین کی خدمت میں فیروز کوہ بھیج دیا۔ غیاث الدین نے دونوں کو دو الگ الگ قلعوں[2] میں نظر بند کر دیا۔ بعد کو خوارزمشاہیوں سے مقابلہ کو روانہ ہوتے وقت غالباً اس خیال سے کہ کہیں ان کی موجودگی سے کوئی فتنہ برپا نہ ہو ۵۸۶ھ میں قتل کر دیا۔

۱۔ افسوس ہے کہ قدیم مورخین نے گجرات پر حملہ آوری کے اسباب پر روشنی نہیں ڈالی۔ اگر یہ حملہ محض ملک گیری کے شوق کو پورا کرنے کے لئے تھا تو سمجھ میں نہیں آتا کہ پنجاب کے قریبی علاقے کو چھوڑ کر اس دور و دراز قطعۂ ہند پر کیوں توجہ کی گئی اس لئے اصل وجہ یہی سمجھ میں آتی ہے کہ ملاحدہ نے اُچ و ملتان سے اخراج کے بعد گجرات میں پناہ لی ہو۔ اس قیاس پر یقین اس لئے اور بھی کرنا پڑتا ہے کہ غوری نے پنجاب فتح کرنے سے پہلے ۵۷۸ھ میں دیبل کو فتح کر کے سندھ کے ملاحدہ کا قلع قمع کیا (طبقات ناصری ص ۱۱۷)۔

۲۔ قلعوں کے نام بلرواں اور سیفرود (سنقران) ہیں جن کا پتہ چلانا آج دشوار ہے۔ (ملاحظہ ہو طبقات ناصری ص ۲۷-۲۶، ص ۱۱۸-۱۱۷)

نوٹ:۔ ملتان کے حاکم علی کرماخ کو لاہور کا صوبیدار بنا دیا گیا۔ مولف طبقات ناصری

۶- آخری غزنوی بادشاہ یعنی خسرو ملک کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اجمیر کے راجہ بیسل دیو نے کرنال اور تھانیسر تک کے علاقہ پر غاصبانہ قبضہ کر لیا تھا[۱]۔ اس علاقہ کا مالک شہاب الدین کے زمانہ میں پرتھوی راج تھا۔ جب لاہور کی غزنوی سلطنت کو غوری نے فتح کر لیا اس نے پرتھوی راج کو لکھا کہ جس طرح سلطان محمود غزنوی کے خاندان کی سیادت کو تسلیم کیا جاتا تھا اسی طرح اب ہماری اطاعت کی جاوے پرتھوی راج نے بجائے اس کے کہ کرنال اور تھانیسر کے علاقہ سے دست بردار ہو جاتا مخالفت پر کمر باندھی۔ غوری نے لاہور سے روانہ ہو کر سرہند (بھٹنڈا) کے قلعہ کو پرتھوی راج کے آدمیوں سے چھین لیا اور اس قلعہ میں قاضی ضیاء الدین تولکی کو ۱۲۰۰۰ آدمی دیکر قلعہ دار مقرر کیا اور خود لاہور کی طرف واپس ہوا لیکن یہ سن کر کہ پرتھوی راج مع اپنے بھائی رائے گوبند[۲] کے مقابلہ کو آرہا ہے تو غوری نے یہ نامناسب سمجھا کہ دشمن سے بغیر مقابلہ کئے واپس چلا جائے اس کے پاس اس وقت صرف تین چار ہزار سے زائد فوج نہ تھی۔ پرتھوی راج کے پاس دو لاکھ سپاہی اور تین ہزار جنگی ہاتھی تھے اس کے جھنڈے کے تلے ۱۵۰ راجہ لڑنے مرنے کو تیار تھے۔ موضع ترائن میں جس کو آج کل تلاوڑی کہتے ہیں۔ دونوں لشکروں کا مقابلہ ہوا یہ مقام دریائے سرسوتی کے کنارے تھانیسر سے سات کوس اور دہلی سے چالیس کوس کے فاصلہ پر تھا سلطان نے اپنے مٹھی بھر سپاہیوں کو میمنہ، میسرہ اور قلب میں تقسیم کر دیا۔ لڑائی شروع ہوئی ہندو لشکر نے بڑے جوش و خروش سے حملہ کیا سلطان قلب لشکر میں جی توڑ کر لڑ رہا تھا کہ اسے معلوم ہوا کہ اس کے لشکر کے دونوں بازو فرار ہو چکے ہیں لیکن سلطان کی غیرت نے دشمن کے مقابلہ سے میدان چھوڑنا گوارا نہ کیا اب چونکہ لڑائی کا پورا با قلب

۲:- طبقات اکبری نے پرتھوی راج کے بھائی کا نام کھانڈے راؤ بتلایا ہے۔ فرشتہ اس کو چاند رائے لکھتا ہے لیکن پرتھوی راج کے بھاٹ چاند کوی نے یہ نام رائے گوبند تحریر کیا ہے اور غالباً یہی صحیح ہے۔

۱:- ہندی ادب کی تاریخ صہ ۳۱، صہ ۳۵

کی قلیل جماعت کو برداشت کرنا پڑا بادشاہ نے پہلے سے چوگنی شمشیر زنی شروع کی رائے گوبند نے جو ہاتھی پر سوار تھا اپنے ہاتھی کو اس پر ریل دیا سلطان نے بھی حملہ آوری میں کوتاہی نہیں کی دونوں کے وار ایک دوسرے پر برابر ہوئے۔ سلطان کے نیزے سے رائے گوبند کے دو دانت ٹوٹ گئے اور رائے گوبند کے نیزے نے سلطان کے بازو کو زخمی کر دیا ساتھ ہی دوسرے ہندو سرداروں کے وار بھی سلطان پر پڑے جس سے وہ سخت زخمی ہو کر بیہوش ہو گیا قریب تھا کہ گر پڑے اتنے میں ایک خلجی بچے نے اس کے گھوڑے کی پیٹھ پر پیچھے سے سوار ہو کر سلطان کو گود میں لے لیا اور گھوڑے کو میدان جنگ سے صاف نکال لے گیا میدان جنگ سے بیس میل کے فاصلہ پر لیجا کے سلطان کو اُتارا جہاں سے مفرورین اُس کو اپنے نیزوں کی ڈولی بنا کر لاہور کی طرف لے گئے[1] محمد غوری لاہور سے پیشاور ہوتا غزنی واپس چلا گیا اور وہاں جا کر بھگوڑوں کو بڑی سخت سزائیں دیں۔

ادھر پرتھوی راج نے فتح یاب ہو کر قلعہ بھٹنڈا پر حملہ کیا اور قاضی ضیاء الدین کو محصور کر لیا یہ محاصرہ ۱۳ ماہ تک جاری رہا لیکن قلعہ فتح نہ کر سکا۔ آخر ۱۳ ماہ کے بعد قاضی ضیاء الدین تولکی نے خود ہی صلح کر کے قلعہ خالی کر دیا اور تمام سامان لے کر لاہور پہونچ گیا۔

۸ء۔ غوری نے غزنی پہونچکر ان لوگوں کو جو تلاوڑی یا ترائن کے میدان سے بھاگے تھے۔ سخت سزائیں دیں اس کو اس شکست کا بہت افسوس تھا۔ اگلے سال ایک لاکھ بیس ہزار کی جماعت لیکر جس میں ۸۰ ہزار پیادے اور ۴۰ ہزار سوار تھے لاہور کی طرف نہایت خاموشی سے روانہ ہو گیا۔ وہ پیشاور و ملتان ہوتا ہوا جب لاہور پہنچا ہے تو قاضی ضیاء الدین تولکی بھی بھٹنڈا سے لاہور پہونچ چکا تھا۔ لاہور پہونچکر اُسنے اپنے ایک سردار قوام الملک رکن الدین ضمیرہ کو اپنا سفیر بنا کر پرتھوی راج کے پاس بھیجا جس میں سرہند اور تھانیسر کے علاقہ کو جو سلطنت اسلامیہ کا ایک حصہ تھے خالی

---

[1]:۔ طبقات ناصری ص ۱۱۹

کرنے کا مطالبہ کیا۔ پرتھوی راج چونکہ لڑائی کے لئے پورے طور سے تیار تھا۔ اس لئے سلطان کو نہایت سختی سے جواب دیا جس میں اپنی فوج کی کثرت اور جنگی ہاتھیوں سے ڈرایا گیا تھا پرتھوی راج کی فوج کو اس ہندو فوج پر قیاس نہیں کرنا چاہیئے۔ جس نے محمد بن قاسم اور محمود غزنوی سے شکستیں کھائیں تھیں۔ کیونکہ اوّل تو پرتھوی راج کی فوجوں کے دل گذشتہ فتح سے بڑھے ہوئے تھے۔ اور دوسرے ہندو مسلمانوں کے طریق جنگ سے اچھی طرح آگاہ ہو چکے تھے اس کے علاوہ اس مرتبہ چھوٹے بڑے ۱۵۰ راجاؤں کی تین لاکھ منتخب فوجیں مقابلے کے لئے تیار تھیں۔ ۳ ہزار ہاتھی ان کے علاوہ تھے۔

سلطان کو جب پرتھوی راج کی طرف سے مایوسی ہوگئی تو اپنی فوجیں لے کر اسی میدان کی طرف بڑھا جہاں اس کو ایک مرتبہ پہلے شکست ہو چکی تھی۔ پرتھوی راج کی فوجیں پہلے سے موجود تھیں رات کے وقت سلطان نے اپنی فوج کو چار حصّوں میں تقسیم کر کے ہر حصّے کی کمان تجربہ کار سپہ سالاروں کے ہاتھ میں دی اور انہیں سمجھا دیا کہ ایک وقت میں صرف ایک سردار حملہ کرے باقی چپ چاپ کھڑے تماشہ دیکھتے رہیں۔ جب زور شور کی لڑائی ہونے لگے تو مصروف جنگ سردار قصداً ایسا ہونا شروع کردے اس طرح دشمن کی صفیں درہم برہم ہو جائیں گی۔ اور اس کی فوج میں انتشار پیدا ہو جائے گا۔ صبح تڑکے سے لیکر تیسرے پہر تک سلطان کے بتائے ہوئے طریقہ پر اس کے سرداروں نے لڑائی جاری رکھی عصر کے قریب وہ اپنے منتخب بارہ ہزار سواروں کو لے کر جو اب تک اس کے ساتھ خاموش کھڑے تھے ہندو لشکر کے قلب پر حملہ آور ہوا جہاں پرتھوی راج ڈیڑھ سو راجاؤں اور انتخابی سورماؤں کے درمیان موجود تھا۔ اس اچانک حملہ نے لڑائی کا پانسہ پلٹ دیا پرتھوی راج اور رائے گوبند نے بہ دشواری تمام میدان جنگ سے بھاگ کر اپنی جان بچائی۔

مسلمانوں نے بھاگنے والوں کا تعاقب کیا اور پرتھوی راج کو قلعۂ سرسوتی کے قریب جالیا اور زندہ گرفتار کر کے اس کی مشعل حیات کو گل کر دیا[1]۔ اس فتح سے ہانسی سامانہ اور کہرام کے قلعہ جات مسلمانوں کے ہاتھ لگے۔ اجمیر میں پرتھوی راج کے لڑکے اکولاجی کو راجہ بنایا اور دہلی میں پرتھوی راج کے دوسرے بیٹے رین جی کو گدّی پر بٹھایا۔

سلطان کے واپس جانے کے بعد میرٹھ کے راجہ نے دہلی کے راجہ یعنی پرتھوی راج کے بیٹے کو سرکشی کی ترغیب دی اور جے چند نے پرتھوی راج کا انتقام لینے پر آمادگی ظاہر کر کے میرٹھ اور دہلی کے راجاؤں کی مدد کا وعدہ کیا۔ قطب الدین نے یہ سن کر قلعہ کہرام سے حملہ آور ہو کر میرٹھ اور دہلی کو بھی فتح کر لیا۔ اور کہرام کے بجائے دہلی کو دارالسلطنت بنایا۔ اسی سال کے موسم برسات میں انہلواڑہ کے راجہ بھیم دیو کے اشارے سے جاٹوں نے بسر کردگی جٹوان ہانسی پر حملہ کیا اور وہاں کے گورنر نصرالدین کو محصور کر لیا۔ قطب الدین مدد کے لئے آیا اور ستمبر میں اس نے جاٹوں کو شکست دی ان کا لیڈر مارا گیا۔ اسی سال میرٹھ فتح کیا اور دسمبر ۱۱۹۲ء میں دہلی مفتوح ہوئی۔ قطب الدین نے دہلی کو اپنا صدر مقام بنایا۔ لیکن آرام کے لئے یہاں ایک لمحہ بھی نہیں رکا کیونکہ دوسرے اہم کام درپیش تھے۔

یہ سال فتوحات کے لحاظ سے مسلمانوں کے لئے بہت مبارک تھا۔ ۱۱۹۳ء کے موسم گرما میں اختیارالدین محمد بہار کو فتح کرتا ہوا مالِ غنیمت سے لدا پھندا دہلی آیا قطب الدین

---

[1]۔ طبقات ناصری صفحہ ۱۲۰۔ مولف تاج المآثر کی روایت یہ ہے کہ پرتھی راج کو اجمیر میں قید رکھا گیا چونکہ بعد کو سازش کرتے ہوئے پکڑا گیا۔ اس لئے قتل کر دیا گیا ملاحظہ ہو تاج المآثر صفحہ ۴۲ بحوالہ تالیف ڈاکٹر حبیب اللہ صفحہ ۵۹ چاند کوی کا یہ کہنا کہ محمد غوری پرتھی راج کو پکڑ کر غزنی لے گیا اور وہاں پرتھی راج کے تیر سے محمد غوری مارا گیا یا یہ کہ محمد غوری کو پرتھی راج نے گیارہ مرتبہ شکست دی اور اس کو ۱۱ مرتبہ گرفتار کر کے چھوڑ دیا صحیح نہیں کیونکہ کسی قدیم فارسی مورخ نے اس کا تذکرہ تو کجا اشارۃً تک نہیں کیا۔ (مولف)۔

نے اُس کی بڑی قدردانی کی اور اُس کو اس کا مفتوحہ علاقہ بطور جاگیر دے دیا گیا۔
اختیار الدین محمد بن بختیار قبیلۂ خلج کا ایک معمولی فرد تھا۔ یہ قبیلہ غزنی اور سیستان کے درمیان آباد تھا۔ اس زمانہ میں مسلمانوں کے اندر الوالعزم آدمیوں کی کمی نہ تھی۔ اختیار الدین محمدؐ نے پہلے ہجور الدین حسن کی ملازمت اختیار کی، جو بدایوں کو کھٹنڈہ سے پیشتر فتح کر چکا تھا۔ اس کے بعد اس نے ایک دوسرے اولوالعزم ہزار ملک حسام الدین فاتح اودھ کی ملازمت کی اور دریائے گنگا اور سون کے درمیان کا علاقہ بطور جاگیر پایا۔ یہیں پر اختیار الدین کے پاس اُس کے قبیلے کے آدمیوں کا ہجوم ہوا جس کی مدد سے اس نے اُودنت پوری جو کہ بہار کا صدر مقام تھا فتح کر کے دہلی کی سلطنت میں ملا یا۔

۹۔ اختیار الدین محمد کے دہلی سے رخصت ہونے کے بعد قطب الدین نے کوئل کو فتح کیا اور یہیں پچاس ہزار سواروں کے ساتھ محمدؐ غوری کے ساتھ شامل ہوا جو کہ قنوج کے راجہ جے چند کو فتح کرنے کے لئے ہندوستان میں آیا تھا۔ محمد غوری خود قنوج کی قریب مقیم رہا اور جے چند پر حملہ کرنے کے لئے قطب الدین کو بھیجا۔ لڑائی کا سبب درج کیا جا چکا ہے۔ جے چند نے مسلمانوں سے موجودہ شہر فیروز آباد کے قریب چندواڑہ نامی مقام پر مقابلہ کیا لیکن شکست کھائی اور مارا گیا۔ اس طرح قنوج اور بنارس دونوں مسلمانوں کے قبضے میں آگئے۔

۱۰۔ ۱۱۹۴ء میں ہیم راج برادر پرتھوی راج نے اجمیر پر غاصبانہ قبضہ کر لیا۔ پرتھوی راج کا لڑکا گولا جی جو اس سے پیشتر اجمیر کا راجہ تھا۔ رنتھنبور میں مسلمانوں کی پاس پناہ گزین ہو گیا۔ رنتھنبور کے فاتح اور حاکم رکن الدین حمزہ قوام الملک نے قطب الدین کو مدد کے لئے لکھا اس اثناء میں ہیم راج دہلی اور رنتھنبور پر فوج کشی کے لئے اپنے رسالے بھیج چکا تھا۔ قطب الدین دہلی سے اجمیر پر حملہ آور ہوا ہیم راج کو

شکست ہوئی اور وہ چتا بنا کر جل مرا۔ اجمیر پر مسلمانوں نے اکولاجی کو دوبارہ تخت پر بٹھایا

۱۱۔ ١١٩٥ء میں قطب الدین نے انہلواڑہ پر حملہ کیا انہلواڑہ کا راجہ بھیم دیو محمدؐ غوری سے ١١٧٨ء میں لڑ چکا تھا۔ اور اُس نے ہانسی کے گورنر نصرت الدین پر حملے کے لئے جاٹوں کی مدد کی تھی۔ راجہ کا سپہ سالار کنور پال قطب الدین سے لڑتا ہوا مارا گیا۔ راجہ بھیم دیو بھاگ گیا۔ مسلمان مالِ غنیمت لے کر براہ ہانسی دہلی واپس آئے۔ قطب الدین محمدؐ غوری کو طلب کرنے پر غزنی چلا گیا۔ جہاں وہ جا کر بیمار پڑ گیا۔ محمد غوری نے اس کو وائسرائے بنا کر دہلی واپس بھیجا۔

۱۲۔ ١١٩٦ء کے آخر میں محمدؐ غوری ہندوستان پر حملہ آور ہوا قطب الدین اِس سے ہانسی میں جا کر ملا۔ اس مہم میں بیانہ اور گوالیار مسخر کئے گئے۔

۱۳۔ ١١٩٧ء میں گرمیوں کے ایام میں راجہ بھیم والئی گجرات کے اشارے سے اجمیر کے گرد و نواح میں بسنے والی ایک قوم مَر (The mers) نے بغاوت کی۔ راجہ خود مدد کے لئے آیا۔ قطب الدین نے گرمی کی شدت کا خیال نہ کرتے ہوئے باغیوں کی متحدہ افواج پر حملہ کیا۔ لیکن شکست کھائی اور اجمیر میں محصور ہونا پڑا لیکن اس خبر نے کہ غزنی سے فوجیں آرہی ہیں۔ ہندوؤں کو محاصرہ اُٹھانے پر مجبور کر دیا۔ سال کے آخر میں قطب الدین نے امدادی فوجوں کو لیکر انہلواڑہ پر دوبارہ حملہ کیا۔ انہلواڑہ پر یہ حملہ براہ نادول اور سروہی ہوا تھا۔ اس لڑائی میں ۱۵ ہزار ہندو مارے گئے اور بیس ہزار گرفتار ہوئے۔

۱۴۔ شمالی ہند میں پانچ سال یعنی ١٢٠٢ء تک سکون رہا۔ لیکن بنگال میں اختیار الدین محمد کی فتوحات کا سلسلہ جاری تھا اس نے زیرین بنگال کے راجہ لکشمن سین پر ١٢٠٢ء میں حملہ کیا اور اس کے صدر مقام ندیا کو صرف ۱۸ اسواروں سے فتح کیا۔ مال غنیمت لیکر لکھنوتی واپس آیا اور محمد غوری کے نام کا خطبہ سکّہ جاری کیا کیونکہ محمد غوری ۱۱ فروری ١٢٠٣ء کو اپنے بھائی کے مرنے پر غور کا بادشاہ ہو گیا تھا۔ لکشمن سین ندیا سے بھاگ کر وکرم پور نامی

شہر میں پہونچا جو کبھی اُس کے پردادا بلال سین کا صدر مقام رہ چکا تھا۔ یہ شہر ڈھاکہ سے ۸ میل جنوب مشرق میں تھا۔ لکشمن سین کے بعد اس کا بیٹا مہادیو سین اور بعد کو اس کا پوتا تخت نشیں ہوا۔ سورسین پر حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔

۱۵۔ قطب الدین ایبک نے ۱۲۰۲ء میں کالنجر کے چندیلے راجہ پرمال پر چڑھائی کی اور اس کو مطیع بنایا پرمال کا اچانک انتقال ہو گیا۔ اور اس کے تخت پر اس کے وزیر اجدیو نے غاصبانہ قبضہ کر لیا اس لئے قطب الدین کو دوبارہ میدان جنگ میں آنا پڑا۔ کالنجر کالپی اور مہوبہ کو فتح کر کے جب قطب الدین بدایوں کی طرف واپس ہو رہا تھا تو راستہ میں اختیار الدین محمد نے ندیہ کے مال غنیمت کو قطب الدین کی خدمت میں پیش کیا۔

۱۶۔ محمد غوری کو ۱۲۰۳ء میں اندخود کے مقام پر خوارزمیوں کے ہاتھ سے شکست اُٹھانا پڑی اس کا اثر ہندوستان کی فتوحات پر برا پڑا۔ کھوکھر نیز کوہ نمک کے شمال میں بسنے والی دیگر پہاڑی قومیں باغی ہو گئیں۔ اِن کا لیڈر رائے سال تھا جو مسلمان ہو کر مرتد ہو گیا تھا۔ اِن باغیوں کو ملتان کے ملاحدہ سے بھی مدد ملی تھی۔ محمد غوری کو اس بغاوت کے فرو کرنے کے لئے خود ہندوستان آنا پڑا وہ غزنی سے ۲۰ اکتوبر ۱۲۰۵ء کو روانہ ہو کر پشاور پہونچا۔ آگے بڑھ کر جہلم اور چناب کے درمیان کھوکھر قوم کو مطیع بنایا۔ ۲۵ فروری ۱۲۰۶ء کو لاہور میں داخل ہوا۔ یہاں پہونچکر اس نے اپنے فوجی سپاہیوں کو گھر جانے کی اجازت دی تاکہ وہ اپنے وطن پہونچکر خوارزمیوں پر حملہ آوری کے لئے تیاری کریں۔ وہ اندخود کی شکست کا بدلہ لینا چاہتا تھا۔ اس لئے خود بھی جلد ہی وطن کو مراجعت فرما ہوا۔ ۳ شعبان ۶۰۲ھ مطابق ۱۵ مارچ ۱۲۰۶ء کو جب سلطان لاہور سے دمیک[1] میں پہونچا تو رات

۱۔ یہ مقتل سلطان شہاب الدین نور اللہ مرقدہٗ موضع دھمک (دمیک) ہے جو سوہاوہ اسٹیشن کے متصل بجانب شمال بفاصلہ ۳ میل تحصیل و ضلع جہلم میں ہے۔ موجودہ وقت میں دریائے جہلم موضع مذکور سے ۶ میل فاصلہ سے گزرتا ہے لیکن دھمک کے قریب اب تک ایک بڑا برنالہ گزرتا ہے جو دریائے جہلم کا معاون ہے۔

(باقی صفحہ آئندہ پر)

کے وقت اُن ملاحدہ[1] نے جو سلطانی لشکر میں موجود اور بعض دربانی کی خدمت پر مامور تھے موقع پاکر سوتے ہوئے سلطان کو چھریوں سے شہید کر ڈالا۔ لاش غزنی لائی گئی اور یہیں سپرد خاک کی گئی۔ صاحب طبقات ناصری نے اُس کی سنہ وفات تحریر کی ؎

شہادتِ ملک بحر و بر معز الدین — کز ابتدائے جہاں شہ چو او نیامد یک

سوم ز غرۂ شعبان بسال ششصد و دو — فتاد در رہ غزنیں بمنزل دمیک[2]

۱۷۔ محمد غوری پر ایک نظر

محمود اعظم کی طرح محمد غوری بھی بڑی خوبیوں کا حامل تھا۔ وہ عالموں کا قدردان۔ فیاض۔ منصف مزاج اور خدا ترس تھا۔ گو وہ محمود غزنوی کی طرح کامیاب سپہ سالار نہ تھا۔ لیکن اس کی فتوحات کہیں زیادہ منظم و دیرپا ثابت ہوئیں۔ وجہ یہ تھی کہ محمود غزنوی نے اپنی تمام تر قوت مغرب میں ایک وسیع و عریض سلطنت کے قیام میں صرف کردی۔ ہندوستان پر اس کے حملے اپنی جنوبی و مشرقی سرحد کے تحفظ نیز قرامطہ کے استیصال کی وجہ سے ہوئے اس وجہ سے اس نے ہندوستان

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۰۷: دھمک کے بالکل قریب ایک راستہ "غوروں کے پھڑ" کے نام سے اب تک مشہور ہے۔ پھڑ پنجابی میں پشتہ یا ٹیلہ کو کہتے ہیں مقام تعجب ہے کہ اب تک اس کا نام غوروں کا پھڑ چلا آتا ہے۔ حالانکہ مقامی لوگ غوروں سے ناواقف ہیں (ماخوذ از رسالہ معارف بابتہ ماہ ستمبر ۱۹۴۳ء)

[1]:۔ مورخین نے ملاحدہ کو مختلف ناموں سے یاد کیا ہے۔ مثلاً

۱۔ طبقات ناصری میں فدائی ملاحدہ	۲۔ جہاں کشائے جوینی میں فدائیاں
۳۔ گزیدہ مستوفی میں فدائیان ہند	۴۔ ابن اثیر میں کفار الکوکریہ
۵۔ ذہبی میں اسماعیلیہ	۶۔ ابن خلدون میں اسمٰعیلیہ
۷۔ مبارک شاہی میں فدائی ملاحدہ	۸۔ بدایونی میں فدائی کھوکھر۔

(بحوالہ رسالہ معارف بابتہ ماہ ستمبر ۱۹۴۳ء)

[2]۔ (طبقات ناصری ص ۱۲۴)

کے اکثر راجاؤں کو مفتوح کر کے اُن کی سلطنت اُن کو واپس کر دی اور اُن سے پیمان مُودّت باندھا۔ ورنہ وہ اگر چاہتا تو تمام شمالی ہند کو غزنی کی حکومت میں شامل کر لیتا۔ لیکن محمد غوری کو اپنی وسیع حکومت کے لئے شمال و مغرب میں بخلاف جنوب مشرق کے مواقع کم تھے کیونکہ اس کے مغربی دشمن ترکان غزو خوارزمی اُس سے کہیں زائد طاقتور تھے اس لئے لامحالہ غوریوں کو حکومت کا دائرہ وسیع کرنے کے لئے جنوب و مشرق کی طرف توجہ کرنا پڑی اور پھر اس کے علاوہ ملاحدہ کی وجہ سے ہندوستان کی طرف توجہ کرنے کا ایک قوی سبب موجود تھا۔

محمود غزنوی اور محمد غوری کے عہد حکومت میں کم و بیش ڈیڑھ سو سال کا فصل ہے۔ اِس عرصہ میں حالات بہت کچھ بدل چکے تھے۔ مسلمانوں کا پنجاب و سندھ پر اقتدار مستحکم ہو چکا تھا۔ صوفیاء کرام کی برکت سے ملک کے اکثر طبقوں میں اسلام کا پیغام پہونچ چکا تھا اور ایک کافی تعداد ملکی مسلمانوں کی پیدا ہو کر ترکوں کی تقویت کا باعث بن چکی تھی۔ چنانچہ محمد غوری نے اس سے فائدہ اُٹھایا اور ایک ہوشمند و عاقل مدبّر کی طرح شمالی ہندوستان کی ریاستوں کو رفتہ رفتہ فتح کر کے ایک زبردست اِسلامی حکومت کی بنیاد ڈالی۔ محمود غزنوی و غوری کی فتوحات میں یہی ایک چیز نوٹ کرنے کے قابل ہے یعنی یہ کہ محمود کی فتوحات کا دائرہ غوری کی فتوحات کے مقابلہ زیادہ سرعت کے ساتھ وسیع ہوا لیکن انتظاماً اس نے صرف پنجاب و سندھ ہی پر قبضہ کیا بخلاف اِس کے غوری نے فتوحات کو آہستہ آہستہ توسیع دیکر تمام شمالی ہند کو اپنے دائرہ حکومت میں لے لیا۔ اور اسلامی حکومت کا بانی کہلایا۔

یہ حسن اتفاق ہے کہ محمد غوری کو غزنوی کی طرح درباری شاعر و مورخ ہاتھ نہیں لگے۔ جو اس کے کارناموں کو دُنیا کے سامنے پیش کرتے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ علم و فضل اور علماء کی قدردانی میں وہ کسی سے پیچھے رہنے والا نہ تھا حضرت امام فخر الدین رازی رحؒ

جو فلسفہ کے امام مانے جاتے ہیں اور موئف طبقات ناصری کے والد قاضی سراج الدین منہاج جو ہندوستان کے اسلامی لشکر کے قاضی تھے اور اسی طرح دوسرے لوگ بھی محمد غوری کی سرپرستی سے فیض اٹھاتے تھے۔ ہندو شعراء کی بھی اس نے سرپرستی کی کہتے ہیں کہ کیدار گوی اس کا درباری شاعر تھا[۱]۔ منہاج الدین کے نزدیک محمد غوری کا درجہ بہت بلند ہے اس کا کہنا ہے کہ "محافظت ترتیب غزوات برجادۂ مسلمانی ہم براں پادشاہ ختم شد"۔ اسی طرح جہاں تک اس کے عدل کا تعلق ہے "در حوصلۂ تحریر نگنجد[۲]"

محمود غزنوی کی طرح محمد غوری بھی نہایت مردم شناس تھا ایک نظر میں انسان کے ذاتی جوہر اس پر عیاں ہو جاتے تھے چنانچہ وہ جس وقت گھکروں کی سرکوبی کے لئے ہندوستان آیا اور التمش کو پرکھا جو اس وقت قطب الدین کا غلام تھا تو اس نے کھلے لفظوں میں قطب الدین کو یہ کہہ کر مخاطب کیا کہ "یہ (التمش) ہونہار ہے۔ اس کی ہمت افزائی کرنا چاہیئے"۔ چنانچہ قطب الدین ایبک نے اس کو آزاد کر کے اپنی لڑکی اس سے بیاہ دی۔ یہ وہی التمش تھا جو آگے چل کر ہندوستان کا شہنشاہ ہوا

بیجا مذہبی تعصب نہ محمود غزنوی میں تھا اور نہ محمد غوری میں اگرچہ بارہا دونوں نے غیر مسلموں سے جنگ کی اور ان کو قتل کیا لیکن کبھی کسی کو جبراً مسلمان نہیں کیا۔ محمود غزنوی۔ محمد غوری اور ان کے جانشینوں کے لشکروں میں بہت سی ہندو سپاہی وسردار تھے۔ جو ان کے جھنڈے کے نیچے ان کے ہندو مسلمان حریفوں سے بے جگری کے ساتھ لڑتے تھے۔ چنانچہ جب محمود اعظم نے قنوج و متھرا کی طرف یلغار کی

---

[۱]۔ ہندی ادب کی تاریخ صہ ۵۰

[۲]۔ طبقات ناصری صہ ۱۲۴

ہے تو اُس کی فوج میں دس ہزار ہندو سپاہیوں کا رسالہ ہندو سپہ سالار کی ماتحتی میں موجود تھا۔ اس کے علاوہ کشمیر و پنجاب کے ہندو راجاؤں کی دو ہزار امدادی فوج بھی شامل تھی۔ اِن سب لے ہندوؤں ہی سے جنگ کی جو ان کے ہم مذہب تھے۔ اسی طرح جب غوری نے لاہور کے آخری غزنوی حکمراں پر حملہ کیا تو جموں کے راجہ چکر دیو اور پھر اُس کے بیٹے وجے دیو نے اُس کی مدد کی اور اپنے مسلمان حریفوں سے لڑے۔ دونوں نے صرف اُنھیں مندروں کو لوٹا اور تباہ کیا جو ان کے دشمنوں کے قبضہ میں تھے اور وہ بھی امن کے زمانے میں نہیں بلکہ جنگ کے دوران میں اور پھر ان کو اس لئے نہیں لوٹا کہ وہ مندر تھے بلکہ اس لئے کہ وہ سازشوں کا مرکز اور قلعہ و بنیک کا کام دیتے تھے۔

شہاب الدین غوری نہ صرف جری، فراخ حوصلہ اور مستقل مزاج شخص تھا۔ بلکہ بے انتہا ضابط و متحمل بھی تھا۔ باوجود اس کے کہ راجگان ہند نے اس کو اکثر حد درجہ مشتعل و غضب آلود کر دیا لیکن میدان جنگ میں پھر بھی اُس بیجا ظلم و ستم سے کبھی کام نہیں لیا جو وحشی اور ناشائستہ قوموں کا شعار ہے اور جسے اسلام نے ممنوع قرار دیا ہے۔ ہندوستان کے سخت معرکوں میں وہ معرکہ بھی تھا جو راجہ بنارس اور شہاب الدین محمد غوری کے درمیان پیش آیا۔ لیکن کامل ابن اثیر کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے باوجود شدت غیظ کے دوران جنگ میں اور باوجود فاتح ہونے کے جنگ کے بعد ایک عورت اور بچہ پر بھی ہاتھ نہیں اٹھایا کیوں کہ محمد غوری کبھی جبر و ظلم یا مکر و فریب کو روا نہیں رکھتا تھا۔

اسی طرح مؤلف جامع الحکایات کا بیان ہے کہ "نہر والہ میں شکست کھانے کے بعد جب محمد غوری واپس آیا تو بعض نے تحریری مشورہ دیا کہ نہر والہ کے ایک ہندو سردار داسا بھر نے بہت سا اسباب تجارت جس کی قیمت دس لاکھ روپیہ ہو گی غزنیں روانہ کیا ہے اس لئے اس کو ضبط کر لینا چاہئے اور اسی رقم سے ایک فوج تیار کر کے نہر والہ پر دوبارہ

حملہ کرنا چاہیئے" شہاب الدین نے اس تحریر کی پشت پر جواب لکھا "یہ انصاف کے خلاف ہے میں ایسا نہیں کر سکتا"[1]

کیا یورپ جسے اپنی تہذیب و شائستگی پر ناز ہے کوئی ایسی مثال پیش کر سکتا ہے جس میں اس قدر رواداری سے کام لیا گیا ہو۔ جنگ طرابلس اور جنگ بلقان میں جو مظالم عورتوں و بچوں پر کئے گئے اُن کا مقابلہ کرنا چاہیئے جنگ بنارس سے کہ جس میں ایک عورت اور ایک بچہ بھی ہلاک نہیں کیا گیا اور عہد حاضر کے اصول حرب کو سردار نہر والہ کے واقعہ سے مطابق کر کے دیکھنا چاہیئے۔ آج مخالف ملک کی تجارت کو تباہ و برباد کر دینا، وہاں کے مال و اسباب پر قبضہ کر لینا اولین اصول قرار دیا جاتا ہے جب کہ محمد غوری اب سے آٹھ سو سال پہلے اس کو ناجائز سمجھتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ زمانہ کا قرب و بعد اسلامی اصولوں کو تبدیل نہیں کر سکتا جس پر محمد غوری عامل تھا۔

"محمود غوری ۱۲۰۶ء تا ۱۲۱۵ء"

شہاب الدین محمد غوری کی شہادت کے بعد چونکہ اس کے کوئی اولاد نہ تھی اس لئے اس کا ایک رشتہ دار علاء الدین جو بامیان کی ریاست کا حاکم تھا بادشاہ بنا لیکن تھوڑے ہی عرصہ بعد غوری کے بھتیجے اور غیاث الدین کے لڑکے محمود نے فیروز کوہ یعنی غورستان کے دار السلطنت پر قبضہ کر کے علاء الدین کو خارج کر دیا اور خود بادشاہ بن بیٹھا۔ محمود غوری صلح کل تھا۔ اس کے پاس صرف غور سیستان۔ ہرات اور مشرقی خراسان تھا اور سلطنت کا باقی حصہ یعنی غزنی تاج الدین کے قبضہ میں اور دہلی و ملتان بالترتیب قطب الدین اور ناصر الدین قباچہ کے تحت میں تھے۔ پانچ چھ برس کے بعد جب محمود کا انتقال ہو گیا تو آپس میں ملکی لڑائیاں ہونے لگیں۔ یہاں تک کہ ۱۲۱۵ء میں شاہ خوارزم نے غزنی کو

---

[1] :- جامع الحکایات قسم ا، باب ۶، حکایت ۳۷

کو فتح کر کے غوریوں کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ مگر غوری لوگ چھوٹے چھوٹے حاکم ایک عرصہ تک رہے۔ چنانچہ بقول پروفیسر ڈارن صاحب محمد سام غوری نے چودھویں صدی کے شروع میں چنگیز خاں کے کسی جانشین سے مقابلہ کیا اور ہرات کو بچایا۔ علاوہ تیمور نے اپنی تزک تیموری میں غیاث الدین بن ایاز الدین یا معز الدین کو خراسان۔ غرغستان اور غور کا حاکم ہونا بیان کیا ہے۔

"راجپوتوں کے انحطاط اور مسلمانوں کی فتوحات کے اسباب"

بعض مورخین نے عجیب مضحکہ خیز اسباب بیان کئے ہیں مثلاً یہ کہ "اہل ہند گرم ملک کے باشندے تھے اس لئے کمزور سست۔ بزدل اور کاہل تھے برخلاف اس کے فاتح جو سرد ملک کے رہنے والے تھے قوی۔ چست و چالاک اور بہادر تھے یا یہ کہ راجپوت راجاؤں کے ہاتھی میدان جنگ سے بھاگ جاتے تھے اس لئے انہیں شکست ہوتی تھی وغیرہ وغیرہ"

یہ اور اسی قسم کے دیگر خیالات صحیح نہیں ہیں۔ ہندوستان کے راجاؤں نے بھی میدان جنگ میں اپنے غیر ملکی حریف کی طرح بلا کی بہادری ثابت قدمی، جسمانی طاقت اور قوتِ عمل کا ثبوت دیا ہے۔ ترک و افغان اور راجپوت درحقیقت ایک ہی نسل سے تعلق رکھتے تھے مسلمان قبائل ہمیشہ سیادت و قوت حاصل کرنے کے لئے آپس میں جنگ کرتے رہتے تھے۔ یہی حال راجپوتوں کا بھی تھا۔ دونوں کے یہاں لڑائی کا نتیجہ سپہ سالار کے انجام پر منحصر ہوتا تھا۔ بہرکیف حملہ آوروں کی کامیابی اور راجپوتوں کے انحطاط کے اسباب کچھ دوسرے ہی ہیں۔[۱]

سب سے اہم سبب یہ ہے کہ اس زمانہ میں ہندوستان کے اندر قومی و مذہبی نظامات تمام درہم برہم ہو چکے تھے مذہبی علماء کی مطلق العنانی اور اُن کی ذاتی اغراض

---

[۱] ہندی ادب کی تاریخ صلا

نے اخلاق وتہذیب کو تباہ کر دیا تھا نئے نئے پنتھ اور گروہ نکل رہے تھے۔ دکن کے ایک
پنڈت وجالا نے شیومت کے اندر لنگ اور بھگ کی پوجا کو اصل عبادت قرار دیکر ایک نیا فرقہ
جاری کیا[1]۔ دکن میں آج بھی لنگ اور بھگ کی پوجا کرنے والے بکثرت موجود ہیں۔ انہیں
شیوی فرقوں میں اگھوریوں کا بھی ایک فرقہ ہے جو انسان کے گوشت کو کھانا جائز سمجھتا
ہے[2]۔ مہادیو کے لنگ کی پوجا کرنے والوں کا معاصر ایک دوسرا گروہ اگم[3] نامی پیدا ہوا۔
جن کے عقیدہ میں ناقابل بیان بے حیائیاں موجب ثواب سمجھی جاتی ہیں۔ اسی زمانہ میں
ہندوؤں کے اندر براگ نہیتوں[4] کا فرقہ پیدا ہوا۔ ان کے مذہب میں کوئی چیز حرام نہیں ہر
ایک دوسرا فرقہ پرم ہنس[5] نامی نکلا جن کے معتقدین نے داڑھی مونچھ منڈانا۔ مادر زاد
ننگے رہنا اور عورتوں سے لنگ کی پوجا کرانا حسن عمل قرار دیا۔ خلاصہ کلام یہ کہ یہ تمام
فرقے اور پنتھ ایجاد ہو رہے تھے اور کسی نہ کسی راجہ کی سرپرستی سے امداد پاتے تھے۔ مذکورہ
بالا قسم کے تمام فرقے اور ان کے اعمال کا آج پتہ لگانا ناممکن ہے۔ اس کے علاوہ ہندوؤں
کے اندر بت پرستی کی کثرت اور ایشور کے ایک نہ ہونے کے تخیل نے خود اعتمادی اور
عزت نفس کے پاک جذبات کو بالکل مردہ کر دیا تھا[6]۔ ساتھ ہی ساتھ ادنیٰ و اعلیٰ کے
امتیاز نے قوم کے اندر سے محبت و یگانگت کو یکسر مٹا دیا تھا۔ ملک کی حفاظت اور
حکومت صرف اونچی ذات کے صرف ایک چھوٹے سے گروہ کے اندر محدود تھی اس لئے
ویش اور شودر طبقوں کو جن میں آبادی کا بہت بڑا حصہ شامل تھا۔ حکمراں طبقہ کی فتح وشکست
سے کوئی لگاؤ اور ہمدردی نہ تھی۔ چھتریوں کو بھی صرف اپنے حکمراں خاندان کی عارضی
فتح وکامیابی کی فکر ہوتی تھی ورنہ بقول ڈاکٹر تاراچند صاحب تہذیب وتمدن۔ سماج

---

۱ تا ۵ ستیارتھ پرکاش باب ۱۱ ملاحظہ ہوں صفحات ۳۸۵، ۳۸۶ - ۱۲ - ۱۱۴، ۱۶۴، ۱۵۰، ۱۴،
۹۵-۹۴، ۹۸، ۴۹، ۴ --- ۵۰۰ وغیرہ وغیرہ

۶۔ اس زمانہ میں عام کیفیت یہی تھی۔ البتہ علماء کے مخصوص گروہ کو مستثنیٰ کیا جا سکتا ہے۔ (مؤلف)

اور ملک کی حفاظت سے انہیں کوئی مطلب نہ تھا۔ غرضکہ ہندو سماج کا نظام اخوت و اتحاد پر مبنی نہ تھا۔ ہندو برائے نام ایک مذہب کے پیرو تھے ورنہ اصل میں ان کے اندر سیکڑوں فرقے در فرقے اور طبقے تھے۔ جنھیں ایک کو دوسرے سے کسی قسم کا کوئی ربط و لگاؤ نہ تھا۔ ان میں مذہب جماعتی نہیں بلکہ شخصی معاملہ سمجھا جاتا تھا۔ کھانا پینا تو در کنار عبادت بھی لوگ مل کر نہیں کر سکتے تھے۔ برخلاف اس کے مسلمانوں میں مذہباً کامل یک جہتی تھی۔ ان کا معاشرتی نظام اخوت و مساوات پر مبنی تھا۔ ان کے افراد کی فضیلت کا معیار نیک عمل اور فرائض مذہبی کی بجاآوری تھی ان میں اپنی قابلیت ولیاقت کی بنا پر ایک غلام کو بھی شہنشاہ بننے کا موقع تھا۔ اور پھر سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ اُن کے اندر توحید و رسالت کے معتقدات نے جوشِ عمل، عزتِ نفس اور خود اعتمادی کے جذبات پیدا کر دئے تھے۔ اُن کے اندر رنگ و نسل اور قوم و وطن کا امتیاز مفقود تھا۔ سب ایک تھے۔ اور سب برابر ہر صالح کو خواہ وہ دُنیا کے کسی گوشہ کا کیوں نہ ہو ترقی کی تمام شاہراہیں کشادہ تھیں اور اُس کے برخلاف غیر صالح کے لئے خواہ دولت وحشمت کی لحاظ سے کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو اور حسب و نسب کے لحاظ سے کتنا ہی معزز کیوں نہ ہو قدم قدم پر تعزیریں تھیں۔ غرض مسلمانوں کے برخلاف ہندوستانیوں میں مذہبی، سیاسی یا سماجی اتحاد نہ تھا ان کے سماج کی بنیاد عدم مساوات اور عدم رواداری پر تھی اور یہی خاص وجہ اس قوم کی کمزوری کی تھی۔

راجپوتوں کو بیرونی حملہ آوروں کے مقابلہ میں جو ناکامی ہوئی اس کی دوسری وجہ اُن کی فوجی طاقت کا حریف کے مقابلہ میں کمتر ہونا ہے۔ ہندوستانی فوجوں کے سپاہی غیر تربیت یافتہ ہوتے تھے۔ اور عموماً وقت کے وقت بھرتی کر لئے جاتے تھے۔ یہ فوجیں ہاتھیوں رتھوں اور پیادوں پر مشتمل ہوتی تھیں ان کی نقل و حرکت سست اور جارحانہ قوت کا حلقۂ اثر محدود ہوتا تھا۔ ترک زیادہ تر گھوڑوں پر سوار ہو کر لڑتے

تھے۔ وہ دُنیا کے بہترین شہسوار اور تیر انداز تھے۔ اُن کے حملوں کا دائرہ بہت وسیع ہوتا تھا۔ ہندوستان کی پیادہ فوجیں ان سواروں کے آگے ٹھہر نہیں سکتی تھیں۔ یہ سوار ہندوستانی فوجوں کو چاروں طرف سے گھیر کر ایک دم ٹوٹ پڑتے تھے۔ اگر ان کا حملہ ناکامیاب رہا تو فوراً بڑی تیزی سے پیچھے ہٹ آتے اور اپنے کو شکست سے بچا لیتے اور اگر اپنے حملہ میں کامیاب ہوتے تو ہندو فوجیں سمٹ کر ایک مرکز پر جمع ہو کر آپس میں گڈمڈ ہو جاتیں اور مسلمان انہیں کاٹ کر رکھ دیتے۔ لیکن یہاں پر یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اس سبب کو غزنوی دور کے صرف اولین عہد کے لئے صحیح قرار دیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اس کے بعد جب مسلمانوں کی پنجاب میں مستحکم سلطنت قائم ہو گئی۔ اور اُن کا بنارس و کالنجر تک کی ہندو ریاستوں سے میل جول بڑھا تو ہندو بھی مسلمانوں کے فنون جنگ سے آگاہ ہو گئے۔ چنانچہ راجہ پرمال کے شہرۂ آفاق درباری آلہا و اودل کے اُستاد سید تعلی۔ سید صاحب بنارس کے جاگیردار اور مہوبہ دربار کے معززین میں تھے۔ اسی طرح محمد غوری کے ہندوستان پر حملہ آور ہونے سے پہلے بیسل دیو راجہ اجمیر کے دربار میں ایک مسلمان سردار تاج الدین نامی تھا[۱]۔ بہت ممکن ہے کہ دوسری ریاستوں میں بھی مسلمان سردار موجود ہوں جن کی وجہ سے اسلامی فن حرب ہندوستان میں پھیلا ہو۔

ع[۱]۔ ملاحظہ ہو سلسلۂ پوسٹ سوم صفحہ ۲۶ و ہندی ادب کی تاریخ صفحہ ۳۶

ضمیمہ - ملاحدہ یا باطنیہ

عجیب اتفاق کی بات ہے کہ جس سال قنوج میں راٹھور راجپوتوں کی حکومت شروع ہوئی اُسی سال سیستان کے قلعہ الموت (آشیانۂ عقاب) میں حسن بن صبّاح نے باطنی سلطنت کی بنیاد ۴۸۳ھ مطابق ۱۰۹۰ء میں رکھی حسن بن صبّاح ایک خاص مذہب کا بانی تھا جس کے ماننے والوں کو عربی تاریخوں میں کہیں اسماعیلیہ فداویہ اور کہیں نزاریہ و ملاحدہ کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ یورپی مورخین نے انہیں اساسین (قتل گمزنی والی) کا نام دیا ہے لوگوں نے قرامطہ اور باطنیہ کے سمجھنے میں غلطی کی ہے۔ یہ دونوں جدا جدا فرقے اور مختلف زمانوں میں ہوئے ہیں لیکن دشمن اسلام اور قاتل مسلمین ہونے میں دونوں ایک دوسرے کے برابر ہیں۔ اِن باطنیوں نے قرامطہ سے بھی زائد عالمِ اسلام کو نقصان پہونچایا۔ بڑے بڑے نامی گرامی سلاطین۔ علماء اور فضلاء اِن کے ہاتھ سے مارے گئے۔ اِن کا سب سے پہلا شکار ملک شاہ سلجوقی کا وزیر اعظم نظام الملک طوسی تھا۔ ۴۹۴ھ تک باطنیوں کا عالم اسلام پر رعب چھا چکا تھا۔ عراق میں ہزار ہا مسلمانوں کا خون ہوا۔ بغداد کی بارونق بازاروں میں لوگ باطنیوں کے ڈر سے دن کے وقت بھی کپڑوں کے نیچے زرہ پہنے رہتے تھے۔ یہ زمانہ عالم اسلام کے لئے بڑی پریشانی اور مصیبت کا زمانہ تھا۔ اِدھر کروسیڈ شروع ہو چکے تھے اور عیسائیوں کے ہاتھوں شام و فلسطین میں مسلمانوں کے خون کی ارزانی تھی۔ سلاطین غزنی کا اقتدار مٹ رہا تھا۔ سلجوقیوں کی جگہ ترکان غز (غارتگر ترک قبائل) خراسان و ایران کے حکمراں تھے۔ یہی وہ زمانہ ہے جبکہ ادھر ملاحدہ کی قوت شباب پر تھی اُدھر غورستان والے غزنویوں کے چنگل سے آزاد ہونے کی فکر میں تھے۔

حسن بن صباح نے ۳۵ برس حکومت کر کے ۵۱۸ھ میں انتقال کیا۔ اُس کی جگہ

بزرگ اُمید بادشاہ بنا اور چودہ برس تک حکومت کرتا رہا۔ اُس کے بعد اس کا بیٹا "کے محمد بن کے بزرگ اُمید" سریر آرائے سلطنت ہوا۔ اُس نے نہایت رعب و داب کے ساتھ ۲۵ برس تک حکمرانی کی۔ بعدہٗ اس کا بیٹا حسن چار برس تک حکمراں رہا۔ یہ حکومت اس کے بعد ۹۲ برس اور قائم رہی۔ بالآخر ۶۲۵ھ مطابق ۱۲۲۸ء میں تاتاریوں کا سیلاب انھیں بھی خس و خاشاک کی طرح بہا لے گیا۔ اگر بہ نظر غور دیکھا جائے تو تاتاریوں کا عالم اسلام پر یہ بڑا احسان عظیم ہے۔

پچھلے صفحات میں یہ بتایا جا چکا ہے کہ غورستان والے قرامطہ عقائد کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے تھے مگر اوّل غزنویوں اور پھر بعد کو سلجوقیوں کی وجہ سے اپنے عقائد و خیالات کی اشاعت میں احتیاط سے کام لیتے تھے۔ لیکن علاء الدین جہانسوز نے اپنے ملحدانہ عقائد کے اظہار میں ذرا بھی تامّل نہیں کیا کیونکہ وہ غزنویوں کو فتح کر چکا تھا اور اُن کا سب سے بڑا مددگار سلطان سنجر ترکان غز کے ہاتھ میں گرفتار ہو چکا تھا جن کو اسلام سے ذرا بھی تعلق نہ تھا۔ علاء الدین نے نہ صرف خود ملاحدہ کے عقیدہ کو اختیار کیا بلکہ محمدؐ بن کے بزرگ اُمید کے بھیجے ہوئے منّادوں کو جا بجا اپنی مملکت میں تبلیغ کرنے کے لئے مامور کیا۔ منہاج سراج کے الفاظ یہ ہیں "باخر عمر رسل ملاحدہٗ الموت نزدیک سلطان علاء الدین آمدند و ایشاں را اعزاز کرد و ہر جا از مواضع غور در سرِ دعوت کردند و ملاحدہٗ الموت طمع بضبط و انقیاد اہل غور در بستند"۔

۵۵۱ھ مطابق ۱۱۵۶ء میں علاء الدین جہانسوز کا انتقال ہوا۔ اس کی جگہ اس کا بیٹا سیف الدین محمد تخت نشین ہوا۔ سیف الدین نے ملاحدہ کے اثر و اقتدار کے مٹانے میں انتہائی کوشش کی اور اسی کوشش کی وجہ سے اپنے سپہ سالار ابو العباس شیث کے ہاتھوں سے جو ملحد تھا قتل ہوا۔ سیف الدین نے صرف ایک سال چند ماہ حکومت کی۔ سیف الدین کا بیٹا غیاث الدین تخت حکومت پر متمکن ہوا۔ اسی کا چھوٹا بھائی شہاب الدین محمدؐ غوری

ہے دونوں بھائیوں نے تمام عمر ملاحدہ کے استیصال میں صرف کی اور اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے۔

ملتان میں چونکہ قرامطہ کی حکومت رہ چکی تھی جس کا خاتمہ غزنویوں نے کیا تھا اب غزنوی اقتدار کے ٹھیس لگتے ہی پھر نئی شکل میں نمودار ہوئی۔ پہلے یہ حکومت قرامطہ کی سرپرست تھی اور اب اسماعیلیہ یا ملاحدہ کی پشت پناہ ہوئی اسی وجہ سے سلطان غوری نے ملتان پر حملہ کرنا ضروری سمجھا۔ اس زمانہ میں (ملتان کی فتح کے وقت) محمدؒ بن علی ذکرہ سی جو تمام سلاطین ملاحدہ میں سب سے زیادہ مستعد و چالاک تھا گمان غالب ہے کہ راجہ بھیم دیو حاکم گجرات کے درمیان غوری کے خلاف سلام و پیام کا سلسلہ جاری ہو کر دوستی کا عہد نامہ ہو چکا تھا۔ راجہ بھیم نے ملاحدہ کی شہ پا کر سندھ و ملتان کو علی کرماخ سے چھین لینے کا ڈول ڈالا۔ اسی خبر کو سن کر غوری نے گجرات پر حملہ کیا تھا۔ غوری نے ملتان و نواح ملتان و نیز شمالی مغربی پہاڑی قوموں کے ملحدانہ عقائد کی درستگی میں بہت کوشش کی۔ خوارزمیوں کے ہاتھوں سے جب اُسے اندخود کے مقام پر شکست ہوئی تو اُس کا بُرا اثر اُس کی ہندوستان کی انھیں مفتوحہ اقوام پر زائد پڑا جن کی تسخیر کے لئے وہ ۱۲۰۵ء میں لاہور کی طرف آیا اور واپس جاتے ہوئے دمیک واقع ضلع جہلم میں ایک ملحد کے ہاتھوں سے شہید ہوا۔ ملاحدۂ الموت کی سرگرمیاں اِس زمانہ میں معراج کمال کو پہونچی ہوئی تھیں۔ سلطان غوری کے لشکر کے پیش امام حضرت امام فخرالدین رازیؒ تھے۔ امام موصوف کی جلالتِ شان و تبحّرِ علمی کا ایک زمانہ گواہ ہے۔ انہیں کے بارے میں حضرت مولانا رومیؒ نے فرمایا ہے۔

"گر بہ استدلال کارِ دین بدے فخر رازی رازدارِ دیں بدے"

اِن کے شاگردوں میں کچھ ملاحدہ بھی تھے جن سے امام صاحب بالکل بے خبر تھے۔ یہ ملاحدہ جب مسلمانوں میں شامل رہتے تو اپنے آپ کو اعلیٰ درجے کا عابد و زاہد ثابت

کرتے اور بعض اوقات سلطنت کے اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوتے۔ غوری کو اپنے لشکر میں اُن کی موجودگی کا علم نہ ہو سکا۔ بہرحال انھیں کے ہاتھوں ۱۵ مارچ ۱۲۰۶ء کو شہید ہوا۔ شہید کرنے والے قاتل بھاگتے ہوئے پکڑے گئے اور پہچانے گئے تو وہی اشخاص تھے جو حضرت امام فخر الدین رازیؒ کی مجلس میں بڑے شوق اور گرویدگی سے شامل ہوا کرتے تھے۔ لوگوں نے قیاس کیا کہ امام صاحب کا تعلق بھی ملاحدہ سے رہا ہے۔ اس لئے گرفتار کر لئے گئے۔ امام صاحب نے بڑی مشکل سے اپنی برأت کا ثبوت دیکر اپنی جان بچائی[ع۱]۔

اِن کا خاتمہ ہلاکو خاں کے ہاتھوں ۱۲۵۰ء کے بعد ہوا جبکہ اُس نے اِن کے "مستقر قلعۂ الموت" کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔

فصل دوم

خاندان غلامان جون ۱۲۰۶ء تا اپریل ۱۲۳۶ء

(۱) سلطان قطب الدین ایبک[ع۲]
۲۶ جون ۱۲۰۶ء تا ۱۲۱۰ء

اگرچہ سندھ و ملتان محمد بن قاسم کی مساعی سے اور پنجاب سلاطین غزنی کی کوشش سے مسلمان حاکموں کے زیر نگیں آ گئے تھے اور ایبک کے دور تک اِن علاقوں میں اسلامی تہذیب و تمدن اوج کمال پر پہنچ چکے تھے لیکن اس امر کا سہرا ایبک ہی کے سر ہے کہ اس نے ہندوستان کے مرکزی شہر دہلی کو دارالسلطنت قرار دیکر ہر قسم کے بیرونی دباؤ سے آزاد ایک اسلامی حکومت کی بنیاد رکھی۔ اِسی لئے مورخ اُسے ہندوستان کا پہلا فرمانروا قرار دیتے ہیں۔

ع۱:۔ محمد غوری اور رازیؒ کے تعلقات کے سلسلہ میں ملاحظہ ہو بدایونی ج ۱ ص ۵۳

ع۲:۔ ایبک ترکی میں اُسے کہتے ہیں جس کے ہاتھ کی چھوٹی انگلی ٹوٹی ہو (طبقات ناصری ص ۱۳۸)

ایبک کی ابتدائی زندگی

ایبک کی زندگی قدرت کی نیرنگیوں کا ایک عجیب و غریب مرقع ہے اس لئے اِس کا مطالعہ نہایت دلچسپ اور سبق آموز ہے۔ وہ ترکستان کی مردم خیز سرزمین میں پیدا ہوا اس کے آبا و اجداد کون ہیں وہ کس قبیلہ میں پیدا ہوا ؟ تاریخ کے صفحات خالی ہیں لیکن اس کی نیک نیتی، علم دوستی، سخاوت اور پاکیزہ سیرتی نیز کامیاب زندگی کے پیش نظر یہ اندازہ لگانا خلافِ حقیقت نہ ہوگا کہ وہ کسی اچھے خاندان کا چشم و چراغ تھا زمانہ کے منقلب حالات نے اسے بہت جلد والدین کے سایۂ عاطفت سے محروم کر دیا اور بردہ فروشوں کی ایک جماعت نے اُسے ترکستان سے لاکر شہر نیشاپور میں فروخت کر ڈالا۔ قاضی شہر فخر الدین عبد العزیز کوفی نے (جو حضرت امام اعظم ابو حنیفہؒ کی اولاد میں سے تھے) اس کو خرید کر اپنے بچوں کی طرح اس کی پوری پوری نگہداشت کی[۱] اس طرح ایبک نے جو بچپن ہی سے ہونہار تھا قاضی صاحب موصوف کے لڑکوں کی معیت میں لکھنے پڑھنے کے علاوہ شہسواری اور تیر اندازی میں بھی مہارت حاصل کر لی۔

کچھ عرصہ کے بعد قاضی صاحب موصوف کا اِنتقال ہو گیا اور اُن کے لڑکوں نے اِس بیش بہا موتی کو ایک تاجر کے ہاتھ فروخت کر ڈالا۔ اس تاجر نے اس کو خرید کر سلطان معز الدین سام کی بارگاہ میں پیش کیا۔ یہیں سے قطب الدین ایبک کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ اور اس کی بہادری، فیاضی[۲]، وفاداری اور حسنِ عمل نے اسے جوہر شناس آقا کی آنکھ کا تارا بنا دیا۔ یہ بتدریج ترقی کرتا ہوا امیر آخور کے عہدہ پر فائز ہوا۔ بعد ازاں خوارزمیوں

ع۱:- (۱) تاریخ فخر الدین مبارک شاہ ص ۲۱ (۲) طبقات اکبری ص ۱۲۷

ع۲:- سلطان شہاب الدین محمد غوری نے ایبک کی بلند نظری و عالی حوصلگی کا اندازہ کیونکر کیا اس کے متعلق مورخین کی روایت یہ ہے کہ ایک رات محمد غوری نے بزم طرب آراستہ کی اور خوشی کے عالم میں تمام حاضرین کو بیش بہا انعامات دئے۔ ان انعام پانے والوں میں قطب الدین بھی تھا۔

(بقیہ صفحہ ۲۲۲ پر)

سے لڑنے کے لئے سرحد پر بھیجا گیا جہاں یہ قید ہوگیا اور ایک سال کے بعد رہائی پائی۔ بادشاہ کی نوازشات روز بروز بڑھتی گئیں اور بالآخر یہ اپنی خداداد قابلیت سے سلطان کے ہندی مقبوضات کا ایک دن نائب السلطنت مقرر ہوگیا۔

ایبک کی تخت نشینی

ایبک ۱۱۹۲ء سے ۱۲۰۶ء تک نائب السلطنت کے عہدۂ جلیلہ پر فائز رہا۔ اِس دوران میں جو کارہائے نمایاں اس کی وجہ سے ظہور میں آئے ان کا تذکرہ پچھلے صفحات میں کیا جاچکا ہے۔ سلطان محمد غوری کو ایبک کی اطاعت شعاری، وفاکیشی اور جاں نثاری کا کماحقہٗ احساس تھا۔ چنانچہ جب ۱۲۰۶ء میں سلطان آخری بار پنجاب میں وارد ہوا تو غالباً فروری ۱۲۰۶ء کے موسم بہار میں لاہور پہونچکر ایک دربار منعقد کیا جس میں ایبک کو ملک کا خطاب عطا کرکے ہندوستان میں اپنا ولی عہد مقرر کیا۔ ہمعصر مورخ فخرالدین مبارک شاہ صدیقی لکھتا ہے۔

"ایں پہلوان وجہاندار ہندرا ملک خطاب فرمود، وولی عہد ہند کرد [ع ۱]"

اِس جشن کے بعد سلطان نے ایبک کو دہلی روانہ کیا اور خود غزنی کی طرف مراجعت کی لیکن جہلم کے قریب دمیک کے مقام پر ۱۵ مارچ ۱۲۰۶ء کو ملاحدہ کے ہاتھوں شہید ہوگیا۔

ملک قطب الدین ایبک کو اپنے محسن و آقا کی شہادت کا بڑا صدمہ ہوا لیکن مصلحت وقت کے پیش نظر اپنے آپ کو سنبھالا اور تخت نشینی کے مراسم کی ادائیگی کے لئے لاہور واپس لوٹ آیا اور یہاں پہونچکر تمام امراء اور رعایا کے متفقہ تعاون سے تاج شاہی زیب سر

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۲۱۔ جب محفل ختم ہوئی تو قطب الدین ایبک نے جو کچھ زر و جواہر اور درہم و دینار انعام میں پایا تھا سب کا سب ادنیٰ خادموں کو تقسیم کردیا اور ایک پیسہ بھی اپنے پاس نہ رکھا۔ صبح کو جب اس کا علم محمد غوری کو ہوا تو اس نے ایبک کی اِس ادا کو بہت پسند کیا۔ اور اُسی وقت طبقۂ امراء میں اسے شامل کرلیا۔ (۱) طبقات ناصری ص ۱۳۸، طبقات اکبری ص ۲۰۔

ع ۱:۔ تاریخ فخرالدین مبارک شاہ ص ۲۸

کیا۔ تخت نشینی کے مراسم ۱۸ ذی قعدہ ۶۰۲ھ مطابق ۲۵ جون ۱۲۰۶ء نہایت تزک و احتشام کے ساتھ ادا کئے گئے[1]۔ دوبارہ یہی تمام مراسم دہلی میں ادا کئے گئے جبکہ محمد غوری کی جانشین سلطان غیاث الدین محمود نے فیروز کوہ سے ملک قطب الدین ایبک کے لئے ہندوستان کی سند حکومت، چتر شاہی اور خطاب سلطانی روانہ کیا۔ اِس موقع پر سلطان قطب الدین ایبک نے اس قدر داد و دہش کی کہ لک بخش کے نام سے مشہور ہوگیا۔ اُس زمانہ کے ایک مشہور فاضل بہاء الدین نے اِن الفاظ میں تعریف کی[2]

"اے بخشش ِ لک تو جہاں آوردہ | کان را کفِ تو کار بجاں آوردہ
از رشک کفِ تو خوں گرفتہ دلِ کاں | وز لعل بہانہ درمیاں آوردہ"

قومی حکومت کا آغاز

قطب الدین ایبک کی ۱۲۰۶ء میں لاہور میں تخت نشینی ہندوستان کی قومی تاریخ میں ایک نئے اور ولولہ انگیز دور کا آغاز ہے اور اسی سنہ سے ہم زمانۂ وسطیٰ کی تاریخ شروع کرتے ہیں۔ کیونکہ شہاب الدین غوری کے انتقال سے ہندوستان کی جدید حکومت میں غیر معمولی تغیر پیدا ہوگیا یعنی اس وقت تک ہندوستان کے جدید حکمراں جو باہر سے آکر ہندوستان پر مسلط ہوئے تھے باہر سے حکومت کرتے تھے۔ یعنی غزنی یا غور ان کا پایۂ تخت تھا اور ہندوستان کی ایک صوبے کی حیثیت تھی لیکن جب شہاب الدین غوری کے انتقال کے بعد قطب الدین ایبک مرحوم سلطان کا ہندوستان میں جانشین قرار دیا گیا تو اس کو غزنی یا غور سے کوئی تعلق نہ تھا بلکہ دہلی اس کا پایۂ تخت قرار پایا اور اسی دہلی میں بیٹھ کر یہ ہندوستان کے تمام مقبوضات پر حکومت کرنے لگا۔ دوسرے الفاظ میں ہندوستان کا پایۂ تخت جو ملک کے باہر غزنی یا غور میں تھا وہ خود ہندوستان

ع ۱:۔ ملاحظہ ہو طبقات ناصری فٹ نوٹ بر صـ ۵۲۵ از راورٹی۔

ع ۲:۔ بحوالہ بدایونی جلد اوّل صـ ۵۵، طبقات ناصری فٹ نوٹ ع ۶ از راورٹی بر صـ ۵۱۲، صـ ۵۱۳۔

میں آگیا کیونکہ قطب الدین اور اس کے تمام جانشینوں نے ہندوستان کو اپنا گھر بنالیا تھا اور وسط ایشیا سے اس کا کوئی تعلق باقی نہیں رہا۔ اس طریقے سے ۱۲۰۶ء سے قومی حکومت کا آغاز ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ یقینی طور پر معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ قطب الدین چند سال اور زندہ رہتا تو اس کا آئندہ اصول عمل کیا ہوتا ممکن ہے کہ غزنی کی بادشاہی اور مرحوم آقا کی پوری سلطنت پر قبضہ کرنے کی آرزو اس کو بیرون ہند کی جانب کھینچتی اور اپنے ہم چشم اور ہم نشیں امرائے ترک میں امتیاز حاصل کرنے کا لالچ دلاتی لیکن اگر اس کے تربیت یافتہ غلام اور لائق جانشین کی آئندہ حکمت عملی دیکھ کر قطب الدین کے دلی منصوبوں کا اندازہ کرنا جائز ہے تو صاف نظر آتا ہے کہ نہ صرف وہ بلکہ اس کے ساتھ بہت سے ترک سردار غالباً یہ فیصلہ کر چکے تھے کہ ان کا "مستقبل" ہندوستان میں ہے۔

دوسری چیز یہ ہے کہ قطب الدین ایبک کی تخت نشینی ہندوستان کی متحدہ سلطنت کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ تخت نشین ہوتے ہی قطب الدین نے تمام مخالف طاقتوں کو راستے سے ہٹا کر شمالی ہند کو ایک رشتے میں منسلک کرنے کی کوشش کی تاکہ تمام ملک دہلی کے مرکز کے تحت آجائے۔ اور یہ قطب الدین کا ایک مبارک منصوبہ تھا۔ کیونکہ ملک کو اس بات کی بہت ضرورت تھی کہ طوائف الملوکی کی جگہ جس میں ہندوستان کا ملک برسوں سے مبتلا تھا متحدہ سلطنت پیدا کی جائے اور حقیقت میں یہ بات کچھ کم سبق آموز نہیں ہے کہ ایک افغانی یا غوری بادشاہ کے غلام کے دل میں وہ وسیع سلطنتِ ہند قائم کرنے کے ولولے پیدا ہوئے جن سے دہلی کے عالی نسب چوہانوں اور قنوج کے ذی ثروت گھرانوں کے دل و دماغ عاری تھے۔ تاریخ ہند میں راجہ ہرش کے بعد قطب الدین ایبک ہی وہ شخص ہے کہ جس کا تمام ہندوستان کو "ایک چتر کے نیچے" لانے کی آرزو کرنا بجا تھا۔ صدیوں کے بعد لکھنوتی سے نہروالہ تک تمام اہل ہند

اسی کے زمانے میں ایک سلطنت کے باشندے کہلائے اور جیسا کہ ہم سابق میں اشارہ کر چکے ہیں بچھڑے ہوئے پنجاب کو اسی کی تدبیر اور شمشیر نے غزنی سے علٰحدہ کر کے دوبارہ ہندوستان کے ساتھ ملا لیا۔

رشتہ داریاں اور جنگ

قطب الدین کا منصوبہ تو بہت اچھا تھا لیکن اس کو بروئے عمل لانا آسان نہ تھا۔ بات یہ ہے کہ شہاب الدین غوری اور خود قطب الدین کی پے در پے فوج کشیوں سے شمالی ہند کی تقریباً تمام ہندو طاقتوں کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ چنانچہ تخت نشین ہونے کے بعد قطب الدین کو پھر کسی راجپوت طاقت کو زیر کرنا نہیں پڑا مگر شہاب الدین کے انتقال سے چند نئی طاقتیں پیدا ہو گئیں جن کا مقابلہ ایبک کے لئے بہت مشکل تھا اور یہ مسلمان طاقتیں تھیں یعنی یہ بنگال کے فاتح خلجی اور ایبک کے ہمسر غلام تھے جو سندھ اور غزنی پر قابض تھے۔ جس طرح ایبک اپنے آقا کی طرف سے سلطنت دہلی پر متعین تھا اسی طرح قباچہ سندھ پر اور یلدوز غزنی پر متعین تھا۔ اگرچہ ایبک کو غالباً اس غرض سے سلطنت دہلی کا والی بنایا گیا تھا کہ بنگال سے لیکر سندھ تک تمام ملک اس کے زیر نگیں رہے لیکن یلدوز اور قباچہ اس کے محکوم ہونے والے نہ تھے کیونکہ یہ بھی اپنے آقا کے اسی طرح کے غلام تھے جس طرح خود ایبک تھا اور اس طرح یہ لوگ بھی اپنے کو ایبک کا ہمسر سمجھتے تھے۔

چونکہ مغربی رقیبوں کو تلوار کے زور سے زیر کرنا مشکل تھا اس لئے ایبک نے اُن کو اپنے زیر اثر لانے کے لئے مختلف طریقے استعمال کئے۔ چنانچہ پہلا یہ تھا کہ اپنی رسم تخت نشینی بجائے دہلی کے لاہور میں منائی تاکہ تاج الدین یلدوز کا استحقاق[1] لاہور پر باقی نہ رہے۔ دوسرے اِن لوگوں سے اُس نے ازدواجی تعلقات پیدا کئے۔ ناصر الدین قباچہ

ع[1]۔ چونکہ لاہور عہد غزنوی سے غزنی کے ساتھ ملحق تھا اور اسی کا ایک صوبہ شمار ہوتا تھا اس لئے تاج الدین یلدوز جو غزنی کا والی تھا لاہور کو اپنا مقبوضہ سمجھتا تھا۔

کو اپنی بیٹی دے دی اور تاج الدین یلدوز کی بہن سے خود شادی کر لی اور غالباً اِن حالات میں جہاں تلوار کام نہ دے شادی بیاہ کا حربہ ہی استعمال کیا جاتا ہے۔ اِس کی مثالیں تاریخ ہند کے اور زمانوں میں بھی ملتی ہیں۔ یہ حربہ اِس حد تک تو کامیاب ہوا کہ قباچہ نے اپنے خسر کی اطاعت اختیار کر لی لیکن یلدوز ایسا حریف تھا کہ اس ازدواجی تعلق کے باوجود اپنی جگہ سے نہیں ہلا تھا۔ چنانچہ یہ کہا جاتا ہے کہ اس حریف سے قطب الدین آخر تک ڈرتا رہا یلدوز قباچہ کی اطاعت سے مشتعل ہو گیا اور اپنے دعوے کے اثبات میں سندھ پر حملہ کر دیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قباچہ کو ملتان چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔

قطب الدین نے ناصر الدین کی مدد کے لئے فوجیں بھیجیں۔ چنانچہ تاج الدین کو شکست ہوئی اور وہ لاہور سے غزنی اور پھر اپنے قدیم صوبۂ کرمان کی طرف چلا گیا قطب الدین نے آگے بڑھ کر ۶۰۳ھ ۱۲۰۸ء میں غزنی پر قبضہ کر لیا[1] لیکن تاج الدین کے جوابی حملے نے اسے لاہور واپس آنے پر مجبور کیا۔ جہاں وہ چوگان[2] کھیلتا ہوا ۱۲۱۰ء میں انتقال کر گیا۔

عادت و خصلت سلطان قطب الدین نے فتح دہلی سے لیکر مرتے[3] تک اٹھارہ سال ہندوستان میں حکومت کی جس میں سے چودہ سال وہ وائسرائے کی حیثیت سے رہا اور آخری چار سال ہندوستان کا شہنشاہ رہا سلطان ہونے کے بعد کوئی قابل تذکرہ جنگ کسی ہندو راجہ سے اس نے نہیں لڑی بلکہ وہ اپنی حکومت کے

ع[1]:- قطب الدین نے اپنے حریف تاج الدین یلدوز سے غزنیں فتح کر کے وہاں چالیس روز تک دادِ عیش دی اس پر وہاں کے اُمراء نے تاج الدین کو کرمان سے بلایا جہاں وہ شکست کھا کر چلا گیا تھا۔ (طبقات ناصری ص ۱۳۵)

ع[2]:- قرونِ وسطیٰ میں مسلمان سلاطین اور اُمراء میں چوگان کا کھیل بہت مقبول تھا۔ ہمارے زمانہ میں "پولو" کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ (مؤلف)

ع[3]:- قطب الدین ایبک کی تاریخ وفات "سلطنت پناہ" سے نکلتی ہے۔
۶۰۷ھ

استحکام میں مصروف رہا سلطان قطب الدین شکل وشباہت کے اعتبار سے جس طرح حسین و جمیل تھا اسی طرح حسن سیرت بھی بدرجۂ اتم رکھتا تھا۔ اُس کی جرات وبے باکی، بلند نظری و عالی حوصلگی اور فیاضانہ فطرت نے اس کو بہت جلد ہر دلعزیز بنا دیا یہاں تک کہ ایک شخص بھی اس کا دشمن نہ تھا۔ وہ شروع ہی سے نہایت فیاض تھا۔ اس کی سخاوت کی وجہ سے لوگ اس کو لک بخش یا لکھ داتا کہتے تھے۔ اِس میں شبہ نہیں کہ اس کی عمر کا بیشتر حصہ حرب وجنگ میں بسر ہوا لیکن اِس کے یہ معنی نہیں کہ وہ ذوق علم سے کورا تھا۔ اس نے سیکڑوں علمی ادارے قایم کئے جو علوم وفنون کا مرکز تھے۔

صاحب تاج المآثر نے لکھا ہے کہ "قطب الدین ایبک ایسا عادل بادشاہ تھا کہ اُس کے عہد میں گرگ وگوسفند ایک ہی جگہ پانی پیتے تھے"۔ اس کے عہد میں سڑکیں محفوظ تھیں، رہزنی مفقود ہو گئی اور تمام رعایا خوش حال اور مطمئن زندگی بسر کرتی تھی۔ بیجا تعصب بالکل نہ تھا۔ اس کی فیاضی سے ہندو ومسلمان دونوں مستفیض ہوتے تھے اور انصاف میں مذہب ودولت اور جاہ وامارت کا کوئی لحاظ نہیں کیا جاتا تھا۔ اس نے دہلی میں ایک نہایت خوبصورت جامع مسجد تیار کرانا شروع کی جس کی یادگار قطب مینار کی صورت میں اب بھی باقی ہے۔

غرضکہ میدان کارزار کے کارناموں اور رعایا پروری اور معدلت گستری دونوں میں یہ اپنی مثال آپ تھا تاریخ میں بہت کم مثالیں ایسی ملیں گی کہ ایک فرماں روا کو بیک وقت عدیم المثال فاتح، یکتائے روزگار منتظم، ہر دل عزیز عادل اور علم وادب کے بے نظیر سرپرست کی حیثیت سے پیش کیا جا سکے۔ ان حیثیتوں سے سلطان قطب الدین ایبک ہندوستان کے ان اہم ترین حکمرانوں میں تھا جن کے کارنامے تاریخ کے اوراق پر رہتی دُنیا تک مہر وماہ کی طرح چمکتے رہیں گے۔

۱؎ طبقات ناصری جلد ا ص ۲۹۸

سلطان کا مقبرہ

سلطان التمش نے ایبک کا بڑا اچھا مقبرہ تعمیر کرایا تھا بعد کو اس کی مرمت سلطان فیروز شاہ تغلق نے کرائی یہ مقبرہ ۱۷۹۹ء تک اچھی حالت میں رہا بعد کو بعض سیاسی ضروریات کی بنا پر رنجیت سنگھ کے حکم سے گروا دیا گیا۔ انگریزی عہد حکومت میں محکمۂ آثار قدیمہ نے قبر اور اس کے چبوترہ کو اینٹوں سے بنوا دیا۔ لاہور میں انارکلی بازار سے میو ہسپتال کی طرف جانے والی سڑک پر میسرز آتما رام اینڈ سنز کتب فروش کی دوکان کے متصل ایک مختصر سی گلی ہے۔ اس گلی میں بائیں ہاتھ کی طرف ایک رہائشی مکان کے نیچے ایک چبوترہ پر ایبک کا مزار ہے۔[۱]

(۲) آرام شاہ سنہ ۱۲۱۰-۱۱ء

غلام سلاطین میں بلحاظ ترتیب دوسرا بادشاہ قطب الدین کا بیٹا آرام شاہ ہے۔ اس نے مشکل سے ایک سال حکومت کی۔ اس کے عہد حکومت میں تمام رجواڑے اور صوبے خود مختار ہو گئے۔ قطب الدین کی وفات کے بعد جب بعض فوجی سرداروں نے اس کے متبنّیٰ بیٹے آرام شاہ کی بادشاہی کا لاہور میں اعلان کیا تو ہندوستان خاص کے صوبہ داروں نے اس کی حکومت تسلیم نہ کی سلطنت کے اکثر بڑے بڑے عہدہ دار دہلی میں تھے انھوں نے مل کر سپہ سالار علی اسمٰعیل کی تحریک سے شمس الدین ایل تتمش یا التمش کو بادشاہ منتخب کیا جو ان دنوں اقطاع بداؤن کا حاکم اور قطب الدین کا عزیز غلام تھا۔ بنگالے کے خلجی امرا نے بھی آرام شاہ کی بادشاہی کو تسلیم نہیں کیا۔ آرام شاہ نے التمش پر چڑھائی کی۔ ایک بڑی جمعیت لیکر لاہور سے دہلی آیا۔ جہاں ایک معمولی سی لڑائی کے بعد آرام شاہ گرفتار کر کے قتل کر دیا گیا۔

(۳) شمس الدین التمش سنہ ۱۲۱۱ء تا ۲۹ اپریل سنہ ۱۲۳۶ء

ابتدائی حالت

شمس الدین ترکان قراخطائی کے ایک نہایت معزز قبیلہ کا فرد تھا۔

ع۱ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو رسالہ معارف بابتہ ماہ جنوری و فروری سنہ ۱۹۴۶ء۔

باپ کا نام ایلخان تھا اس کو اس کے چچازاد بھائیوں نے از راہ حسد ایک سوداگر کے ہاتھ فروخت کر ڈالا۔ اس سوداگر نے اس کو بخارا میں لاکر ایک دوسرے سوداگر کے ہاتھ بیچا۔ اس سوداگر نے اس کی پرورش اور تعلیم و تربیت اپنے بچوں کی طرح کی۔ پھر اس کو حاجی جمال الدین چست قبا نے خریدا۔ حاجی جی موصوف سے اس کو قطب الدین نے اپنے آقا محمدؒ غوری کی اجازت لیکر ایک لاکھ جیتل (ڈیڑھ ہزار روپیہ) میں خرید لیا۔[1] پہلے اس کو میر شکار کا عہدہ دیا۔ بعدہٗ گوالیار برن اور بدایوں کا یکے بعد دیگرے گورنر بنایا۔ آخری مرتبہ جب محمدؒ غوری گھکر یا کھوکر قوم کا فساد رفع کرنے کے لئے ہندوستان آیا تو اس موقع پر شمس الدین نے اپنی کارگذاری سے محمدؒ غوری کو بہت مسرور کیا۔ محمدؒ غوری نے خلعت فاخرہ عطا کر کے قطب الدین سے اس کی سفارش کی کہ یہ جوہر قابل ہے اس کو بڑھانا چاہیئے۔ چنانچہ قطب الدین نے اس کو آزاد کر کے اپنی لڑکی بیاہ دی۔

تخت نشینی کے وقت سلطنت کی حالت

آرام شاہ کے بادشاہ ہوتے ہی ناصر الدین قباچہ نے سندھ و ملتان میں خود مختاری کا اعلان کیا۔ اُدھر بنگالہ میں حسام الدین عوض خلجی نے خود مختار ہو کر تاج شاہی سر پر رکھا۔ تاج الدین نے غزنی سے حملہ آور ہو کر لاہور[2] اور تمام پنجاب پر قبضہ کر لیا صرف صوبہ

---

[1]: حسن سیرت اور فراست کے ساتھ خدا نے اِسے زیور جمال سے بھی آراستہ کیا تھا اور جب دوبارہ کوئی سوداگر خرید کر اسے غزنی لایا تو اس کی شہرت سلطان معزالدین سام کے دربار تک پہنچی۔ مگر سوداگر نے اس کی قیمت اتنی زیادہ طلب کی کہ بادشاہ ناراض ہو گیا اور اُس نے دوسروں کو بھی اس غلام کے خریدنے سے روک دیا۔ آخر سال بھر بعد جب قطب الدین ایک دہلی سے غزنی گیا تو اس نے بادشاہ سے بطور خاص شمس الدین کے خریدنے کی اجازت لی۔ اور یہ سودا غزنی کے بجائے دہلی میں طے ہوا۔ گویا خود ہندوستان والوں نے اپنے آئندہ فرمانروا کو ایک لاکھ جیتل یا ۲۲ ۵۰ روپیہ آٹھ آنہ میں خرید لیا (ملاحظہ ہو طبقات ناصری صفحہ ۹۰۳ انڈر ملورٹی)

[2]: ۔ سنہ ۱۲۱۵ء تک لاہور یلدوز کے قبضہ میں رہا۔ سنہ ۱۲۱۷ء میں چنگیزیوں کے دباؤ سے جب خوارزمی

آگرہ و آودھ کا علاقہ دہلی کی حکومت میں شامل رہا۔ آرام شاہ اس بد نظمی کا کوئی تدارک نہ کر سکا۔ گوالیار۔ اجین۔ رنتھبور۔ قنوج اور منڈاور کے قلعہ بھی مسلمانوں کے ہاتھ سے جاتے رہے۔ التمش کے تخت نشین ہونے کے بعد بعض مسلمان اُمراء نے مخالفت پر کمر باندھی۔ اسلئے شروع کے دو تین سال اِس خانہ جنگی کے فرو کرنے میں صرف ہوئے

ایلتتمش کے مغربی حریف

تخت نشین ہوتے ہی غزنی کے حاکم تاج الدین یلدوز نے جواب تک دہلی کو غزنی کا ایک صوبہ سمجھ رہا تھا ایلتتمش کو بلا طلب سلطان کا خطاب اور تمغہ ہندوستان روانہ کیا۔[1] ایلتتمش اِس بے عزتی کو بھولا نہیں۔ جب ۱۲۱۵ء میں شاہ خوارزم نے غزنی پر قبضہ کر لیا تو تاج الدین غزنی سے نکل کر لاہور چلا آیا۔ لاہور اس نے ناصر الدین سے فتح کیا تھا۔ ایلتتمش نے اس پر برا مانا کیونکہ وہ قباچہ کو باغی حاکم لیکن اس کی مملکت کو دہلی کا صوبہ سمجھتا تھا۔ یلدوز نے دہلی کی طرف خود ہی پیش قدمی کی۔ دونوں فوجوں کا تصادم تلاوڑی کے میدان میں ۲۵ جنوری ۱۲۱۶ء کو ہوا۔ یلدوز گرفتار ہو کر بدایوں میں قید کر دیا گیا اور یہیں اُس کا انتقال ہوا۔ اس کی قبر جامع مسجد شمسی کے جنوبی گوشہ کے عقب میں واقع ہے۔

یلدوز کے لاہور سے روانہ ہوتے ہی اُس پر ناصر الدین قباچہ نے پھر قبضہ کر لیا لیکن ایلتتمش نے ۱۲۱۷ء میں اُس سے لاہور چھین لیا اور بالائی پنجاب پر بھی قبضہ کر لیا۔

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۲۹ = غزنی کی طرف ہٹے اور انھوں نے غزنی پر قبضہ کر لیا تو تاج الدین یلدوز کو غزنی سے ہٹ کر لاہور چلا آنا پڑا۔ یہاں آکر اس نے اپنے شہنشاہی حقوق کی بنا پر حکومت دہلی سے بھی بعض مطالبات کئے جنھیں ایلتتمش نے رد کر دیا۔

[1]:- ایلتتمش شروع سالوں میں اِس قابل نہیں تھا کہ تاج الدین یلدوز جیسے قوی حریف سے ٹکر لے سکے اس لئے اُس نے پنجاب پر یلدوز کا حق شاہی تسلیم کر لیا۔

اِدھر یہ لڑائیاں ہو رہی تھیں اُدھر شاہ خوارزم نے غور و غزنی کو فتح کر کے ہندوستان کی طرف فوجیں روانہ کیں۔ ناصر الدین قباچہ نے اِن فوجوں کو ملتان کے قریب شکست دے کر واپس لوٹ جانے پر مجبور کر دیا۔ ۱۲۲۱ء میں مغولان چنگیزی کا طوفان ہندوستان کی طرف بڑھا۔ یہ بلا صحرائے تاتار سے اُٹھی اور فلسطین میں جاکر ختم ہوئی۔ علاء الدین خوارزمی نے جو بلخ و بخارا کا نہایت مشہور بادشاہ تھا۔ چنگیز خاں کے کچھ سفیر قتل کرا دیئے تھے۔ بس لڑائی کا یہی بہانہ تھا۔ خوارزم شاہ بحر خضر میں پناہ گزیں ہوا اور وہیں مر گیا۔ اُس کا بیٹا جلال الدین ۱۲۲۳ء تک مغلوں سے لڑتا بھڑتا رہا۔ اُس نے بعض مرتبہ مغلوں پر فتح بھی پائی لیکن اُس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ ۱۲۲۱ء میں چنگیز خاں اس کا تعاقب کرتا ہوا اٹک کے کنارے تک آیا۔ اٹک کی لڑائی[۱] میں وہ خود موجود تھا۔ جلال الدین کی بہادری کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ آخر کار جلال الدین نے التمش سے مدد مانگی۔ التمش نے

ع۱ :- یہ لڑائی دریائے سندھ کے مغربی کنارے پر لڑی گئی جلال الدین کے پاس صرف چند ہزار رفیق تھے اور مقابلہ کئی لاکھ تیغ زنوں سے تھا جن کو آج تک کوئی بھی مغلوب نہیں کر سکا تھا۔ لڑائی صبح سے دوپہر تک جاری رہی سلطان کے رفیق فوق العادت شجاعت سے لڑتے اور کٹ کٹ کر گرتے رہے حتیٰ کہ لشکر کے دونوں بازو میمنہ و میسرہ منتشر ہو گئے اور اُن کا کوئی سپاہی زندہ نہ رہا لیکن قلب سپاہ کی پیوستگی میں جس میں سلطان خود لڑ رہا تھا مطلق فرق نہ آیا۔ قلب سپاہ میں ۷ ہزار سے زیادہ نوجوان نہیں تھے ان میں سے بھی صرف ۷۰۰ باقی رہ گئے تھے۔ حملہ آور سمندر کی موجوں کی طرح ہر طرف سے بڑھے چلے آ رہے تھے۔ اور ممکن تھا کہ چنگیز خاں کے حکم کے مطابق سلطان کو زندہ گرفتار کر لینے میں کامیاب ہو جاتے لیکن موقع کی نزاکت کا احساس کر کے سلطان کے ماموں زاد بھائی نے بے حد اصرار کے ساتھ اُسے میدان چھوڑ دینے پر مجبور کر دیا۔ سلطان اپنے جنگی گھوڑے سے اُتر کر اسپ خاصہ پر سوار ہوا۔ اہل و عیال کو الوداع کہی اس کے بعد ایک آخری حملہ کر کے مغلوں کو تھوڑی دور تک ہٹا دیا اور پھر رُخ بدل کر دریا کے کنارے آیا۔ دریا کا کنارہ اُس مقام پر آٹھ دس گز کے قریب بلند تھا۔ اتنی بلندی سے سندھ جیسے تیز و عمیق دریا میں گھوڑا گرا دینا ایسا ہی تھا

(باقی صفحہ ۲۳۲ پر)

اس کو معقول جواب دے کر چنگیزی بلا کو ہندوستان کے سر سے ٹال دیا۔ اس نے جلال الدین کے سفیر کو اس بنا پر قتل کرا دیا کہ وہ فوج اور اُمراء میں سازش کا جال بچھا رہا تھا اور جلال الدین کو لکھا کہ بجائے لاہور کے دہلی کی آب وہوا اُسے زائد مفید ہو گی۔ جلال الدین سمجھ گیا۔ اُس نے دہلی کی رہائش کو قبول نہ کر کے قوم کھوکر یا گھکر کی طرف توجہ کی پہلے اُن سے لڑا اور پھر صلح کر لی۔ کھوکر قوم کے سردار نے اپنی لڑکی جلال الدین کو بیاہ دی۔ چونکہ گھکروں سے قباچہ کی ان بن تھی اس لئے جلال الدین نے اپنی مخصوص دس ہزار فوج کو لیکر قباچہ پر حملہ کیا اور اس کو شکست دے کر اُس سے خراج وصول کیا۔ بالآخر ۱۲۲۴ء میں وہ سندھ اور شمالی گجرات سے مال و دولت سمیٹتا ہوا ایران کی اُمید پر کرمان چلا گیا مگر دجلہ و فرات کے دوآبہ میں قتل کر دیا گیا۔

جلال الدین کا خطرہ ٹل جانے کے بعد ایلتمش نے بنگال کی طرف توجہ کی جس کا ذکر آگے آئے گا۔ وہاں سے فارغ ہونے کے بعد ۱۲۲۸ء میں اُس نے آخری مرتبہ سندھ وملتان پر حملہ کیا۔ ناصر الدین نے جلال الدین کے ہندوستان سے واپس جاتے ہی سندھ وملتان پر اپنا اقتدار قائم کر لیا تھا۔ وہ بالائی پنجاب کا بھی دعویدار تھا۔[ع۱] ایلتمش پہلے

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ (۲۳۱):۔ کام تھا کہ دوست دشمن سب کے منہ سے واہ نکل گئی۔ چنگیز خاں اور اُس کے مُغل جنگ آزما حیرت سے تکتے ہی رہے اور جلال الدین گھوڑا تیرا کر دوسرے کنارے پر پہونچ گیا (ماخوذ از تاریخ ہند ج ۲ صفحہ ۳ مُصنّفہ سید ہاشمی صاحب)

ع۱:۔ اصل وجہ یہی ہے جو مذکور ہوئی لیکن حملہ کا قریبی سبب بعض فارسی تاریخوں میں یہ بتایا گیا ہے کہ خوارزمی فوج کے ایک حصّہ نے چنگیز خانیوں سے شکست کھانے کے بعد سندھ کے شمالی مغربی اضلاع میں پناہ لی تھی ناصر الدین قباچہ نے وہاں بھی انھیں چین نہ لینے دیا اور شکست دے کر اپنے ملک سے نکال دیا۔ ان شکست خوردہ اور مظلوم سپاہیوں نے سلطان دہلی سے فریاد کی اور وہ قباچہ سے ان کا انتقام لینے پر آمادہ ہو گیا (ماخوذ از تاریخ ہند ج ۲ صفحہ ۱۹ مُصنّفہ سید ہاشمی صاحب)

(باقی صفحہ ۲۳۳ پر)

اُچ کی طرف بڑھا۔ ناصر الدین اُچھ کو اپنے وزیر کے سپرد کر کے خود اہراوٹ (یہ شہر اب دریائے سندھ نے مٹا دیا) کی طرف ہٹ آیا۔ ادھر لاہور کے گورنر نصیر الدین آئیطم نے التتمش کے حکم سے ملتان پر حملہ کیا۔ التتمش نے ۹ر فروری ۱۲۲۸ء کو اُچھ کا خود محاصرہ کیا اور اپنے وزیر کمال الدین محمد جنیدی کو قباچہ کے تعاقب میں بھیجا۔ قباچہ نے مجبور ہو کر اپنے بیٹے علاء الدین بہرام شاہ کو جو قطب الدین ایبک کی لڑکی کے بطن سے تھا التتمش سے صلح کرنے کے لئے بھیجا۔ چنانچہ صلح نامہ کے بموجب ۴ر مئی ۱۲۲۸ء کو اچھ التتمش کے قبضہ میں آ گیا۔ اس صلحنامہ کی اطلاع غالباً جنیدی کو نہ تھی اس لئے اُس نے قباچہ کا تعاقب جاری رکھا۔ اور بالآخر بھکر میں قباچہ کو محصور کر لیا۔ قباچہ زیریں سندھ کی طرف فرار کے ارادے سے کشتی میں سوار ہوا لیکن مع خاندان کے ڈوب گیا۔ اس طرح یہ مہم بھی ختم ہو گئی۔ قباچہ کی فوجوں نے التتمش کی ملازمت قبول کر لی۔ التتمش اگست ۱۲۲۸ء کو اپنے وزیر کو اپنا قائم مقام کر کے دہلی لوٹ آیا۔ اُچھ سے واپسی کے وقت التتمش اپنے ساتھ قاضی منہاج الدین جرجانی (مصنف طبقات ناصری) کو جو چند روز پیشتر وارد سندھ ہو کر اُچ میں مقیم تھا اپنے ہمراہ لیتا آیا۔ وزیر نے سومرہ خاندان کے گیارہویں راجہ سنان الدین کو مغلوب کر کے جو زیریں سندھ کا مالک تھا اُس کا ملک اُسی کو واپس کر دیا۔ اس طرح التتمش کی حکومت مغرب میں سمندر تک وسیع ہو گئی۔

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۴۲ شمس الدین التتمش کی مذہبیت اور صالح زندگی کو مدنظر رکھتے ہوئے ان تمام وجوہ کے مقابلہ میں سب سے زیادہ قرین قیاس وجہ یہ ہے کہ ناصر الدین قباچہ نے حکومت کے نشہ سے سرشار ہو کر ملتان میں بعض ایسی ناشائستہ حرکتیں شروع کیں جو مذہباً قابل اعتراض تھیں۔ اس پر ملتان کے فاضل اجل حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی اور قاضی شرف الدین وغیرہ نے سلطان کو ادھر متوجہ کیا اور اُس سے مدد مانگی (ملاحظہ ہو سیر الاولیا صفحہ ۵۳۷ فوائد الفواد صفحہ ۱۱۹، فرشتہ صفحہ ۶۲۷، اسلامک کلچر صفحہ ۱۷۹ بابتہ ماہ اپریل ۱۹۴۷ء)

(۱):- اُچھ ملتان سے جنوب میں ۷۵ میل کے فاصلہ پر اور بھٹنڈہ سے دو سو میل کے فاصلہ پر دریائے ستلج کے کنارے آباد ہے۔

ایلتتمش اور بنگال

گذشتہ صفحات میں یہ بتایا جاچکا ہے کہ اختیار الدین محمدؒ نے کس طرح بنگال و بہار کو فتح کر کے ہندوستان کی اسلامی سلطنت کو وسعت دی۔ بنگال کے مفتوح ہونے کے بعد اُس نے تبت اور آسام کے فتح کرنے کی تجاویز پر غور کرنا شروع کیا۔ ۱۲۰۵ء میں میچ قوم کے ایک نومسلم سردار علی کی رہنمائی میں اُس نے دس ہزار سپاہیوں کو لیکر آسام و تبت کا رُخ کیا۔ موجودہ ضلع دیناج پور کے مشہور مقام دیوکوٹ سے گذرتے ہوئے کامروپ راج میں داخل ہوا۔ اُس نے راجہ کامروپ کو اپنا دوست بنا کر اُس سے وعدہ لیا کہ وہ آگے بڑھنے میں اُس کی مدد کرے اور واپسی میں اُس کی فوجوں کے سدِّراہ نہ ہو۔ پھر بردھانکوٹ پہونچکر جو کہ کامروپ دیس کے راجہ کی شمالی سرحد پر واقع تھا ایک دریا کا پُل باندھا اور اُس کو پار کر کے تبت کے ملک میں داخل ہوا۔ دس دن چلنے کے بعد ایک شہر میں داخل ہوا جہاں اس کو بہت سخت مقابلہ کرنا پڑا۔ اس جگہ سے اُس نے واپس لوٹ آنا مناسب سمجھا اور اس مہم کو اگلے سال کے لئے بشرط تیاری اُٹھا رکھا۔ واپسی میں رسد کی قلت، سفر کی صعوبت اور کامروپ کے راجہ کی وعدہ خلافی نے فوج کو بہت نقصان پہونچایا۔ دریا کا پل شکستہ پایا۔ ایک جگہ پایاب سمجھ کر فوج نے پار ہونے کی کوشش کی تو بہت سے ڈوب گئے۔ غرضکہ دس ہزار میں سے لکھنوتی پہونچتے پہونچتے بمشکل سو سپاہی زندہ بچے ہندوستان میں مسلمانوں کی یہ سب سے بڑی ہزیمت تھی۔ اس کا اختیار الدین محمدؒ کو سخت صدمہ ہوا۔ اور اُس نے بحالت بیماری اپنی جان دی اور بعض مورخین کے نزدیک خلجی قبیلہ کے ایک سردار علی مردان نے اُس کو مار ڈالا۔

اختیار الدین کی موت میں علی مردان کا لوگوں کو ہاتھ نظر آیا اس لئے اُسے گرفتار کر کے قید کر دیا گیا لیکن وہ بھاگ کر لاہور پہونچ گیا اور قطب الدین کو بنگال کے معاملات پر توجہ دلائی۔ قطب الدین کے سامنے چونکہ سلطنت کے دوسرے اہم مسائل درپیش تھے اس لئے اُس نے کوئی توجہ نہ کی۔ اِدھر بنگال میں اختیار الدین محمد کے مرتے ہی سرداروں

میں تقسیم جاگیرات پر جھگڑے شروع ہوگئے۔ اور اسی خلفشار میں علی مردان کا سب سے بڑا رقیب اور دشمن محمد بن شیران مارا گیا۔ علی مردان لاہور سے جا کر بنگال کا بادشاہ ہوگیا اور قطب الدین کے مرتے ہی اپنی خودمختاری کا اعلان کر دیا۔ اپنا شاہی لقب علاء الدین اختیار کیا۔ علی مردان نے نہایت رعب وداب کے ساتھ تین سال تک حکومت کی۔ یہ نہایت ظالم اور طنطنہ کا بادشاہ تھا۔ بالآخر اُمراء نے اس کی سختی وظلم سے تنگ آکر اس کے خلاف سازش کی اور دیوکوٹ کے سرحدی گورنر حسام الدین عوض کو اپنا بادشاہ منتخب کیا۔ علی مردان ۱۲۱۳ء میں مارا گیا۔

حسام الدین عوض نے غیاث الدین لقب اختیار کر کے تاج شاہی سر پر رکھا اور خودمختارانہ حکومت شروع کر دی۔ دہلی کی کمزوری اور خانہ جنگی سے فائدہ اٹھا کر اس نے بہار پر فوج کشی کی لیکن ناکامیاب رہا۔ ایلتمش نے بنگال کے معاملات کی طرف ۱۲۲۵ء میں توجہ کی۔ چنانچہ ایلتمش کے پہونچتے ہی عوض نے فوراً اطاعت قبول کر لی اور شاہی لقب ترک کر دیا۔ ایلتمش نے بہار کا گورنر اپنے ایک معتمد و معتبر سردار ملک عزالدین کو بنایا اور اودھ کی گورنری اپنے سب سے بڑے لڑکے ناصر الدین محمود کو دی تاکہ بہار و بنگال دونوں صوبوں کی نگرانی کر سکے۔ اس مہم میں ۳۰ ہاتھی اور ۸۰ لاکھ روپیہ ہاتھ لگے۔[۱] ایلتمش کے پیٹھ پھیرتے ہی عیوض نے بغاوت کر دی اور بہار کے گورنر کو مار بھگایا۔ اس پر اودھ کے صوبیدار ناصر الدین محمود نے بنگال پر حملہ کیا اور ۱۲۲۶ء میں عیوض کو پکڑ کر قتل کر دیا۔ ساتھ ہی ساتھ تمام خلجی سرداروں کو جنھوں نے دہلی سلطنت کے خلاف ایک پارٹی بنا رکھی تھی قید کر دیا۔ محمود اپنی وفات تک یعنی اپریل ۱۲۲۹ء تک بنگال کا گورنر رہا۔ اس کے مرتے ہی حالات پھر بگڑ گئے۔ عیوض کے لڑکے بالکا یا بلکا نے اختیار الدین دولت شاہ بالکا کے نام سے خودمختارانہ حکومت شروع کر دی۔ ۳۱-۱۲۳۰ء کے موسم سرما میں ایلتمش نے دوبارہ

---

[۱]۔ ملاحظہ ہو طبقات ناصری صفحہ ۱۷۱

بنگال پر چڑھائی کی۔ بالکا قتل ہوا۔ اُس کی جگہ التمش نے علاء الدین جانی کو بنگال کا گورنر مقرر کیا۔

اِس کے بعد بنگال سلطنت دہلی کا ایک مستقل صوبہ بن گیا اور کم و بیش ایک صدی سے زیادہ عرصہ تک یہاں کے صوبہ دار سلاطین دہلی کے فرماں بردار رہے اور اِسی تعلق نے رفتہ رفتہ تمام شمالی ہندوستان کے باشندوں میں ہم ملک ہونے کا وہ احساس پیدا کیا جسے "اتحاد اہل ہند" کی موجودہ آرزو کا پہلا تخم کہہ سکتے ہیں۔ دُنیا کے اور ملکوں میں بھی مطلق العنان بادشاہوں نے بالواسطہ یہ خدمت انجام دی ہے لیکن سلاطین دہلی کی ممتاز خصوصیت اور عظمت کا اس لئے اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اُن کی انتظامی قابلیت اور منصوبہ شہنشاہی نے اتنے وسیع براعظم کی شیرازہ بندی کی اس منصوبے کا اظہار آگے چل کر ہم خود اُلغ خاں بلبن کی زبانی سنیں گے۔

راجپوتانہ کی تسخیر

سنہ ۱۲۲۵ء میں بنگال کی مہم سے فارغ ہونے کے بعد التمش نے راجپوتانہ کی طرف توجہ کی۔ اُس زمانہ میں راجپوتانے کے اندر راجپوتوں کے دو زبردست مستقر تھے ایک دہلی سے جنوب کی طرف رنتھنبور[۱] (رنتھمبور) اور دوسرا مغرب کی طرف منڈ اور[۲] (منڈور)۔ اور دونوں ہی کا فتح کرنا ضروری تھا گو ان پر حملہ آوری کے وجوہ کی تفصیل کہیں درج نہیں ہے لیکن اُس زمانہ کے حالات

ع۱:۔ دریائے چمبل کے کنارے ایک بلند پہاڑی پر یہ سنگین قلعہ تعمیر کیا گیا تھا اِس کا قدیم نام "رن استھمبا پور" ہے یعنی جنگی ستون کا مقام۔ کہتے ہیں کہ ازمنہ گذشتہ میں ۷۰ سے زیادہ اس پر حملے ہوئے اور کوئی بھی اِسے فتح نہ کر سکا۔

ع۲:۔ قلعہ منڈور یا منڈا اور ریاست مارواڑ کا قدیم صدر مقام اور پریہار قوم کے راجپوتوں کا مرکز تھا۔ اجمیر سے تقریباً سو میل مغرب میں، موجودہ جودھپور کے قریب اِس کے کھنڈر آج بھی گذشتہ وسعت و سنگینی کی گواہی دیتے ہیں۔

پر نظر ڈالنے سے کئی باتیں سمجھ میں آتی ہیں مثلاً جوش سپہ گری کا تقاضہ یہ تھا کہ راجپوتانے کے سرکش منچلوں کو تلوار کا جوہر دکھا دیا جائے تاکہ اُن پر مسلمانوں کی جنگی برتری کا رُعب غالب آجائے اور اس طرح وہ سلطنت دہلی کے لئے آئندہ خطرہ ثابت نہ ہو سکیں چنانچہ اس طریق کار پر اکبر کے زمانہ تک سلاطین دہلی کاربند رہے۔ باجگذاری کا اقرار لینے کے سوا انھوں نے یہاں کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو مٹانے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ اُن کے اعلیٰ تدبر اور موقع شناسی کی اس سے بہتر شہادت اور کیا ہوگی کہ اُن کے طریق عمل پر صدہا سال گزر جانے کے باوجود موجودہ فرمانروا بھی کاربند ہیں[1]۔ چونکہ راجپوتانہ کی ریتلی سرزمین اور کوہ اراولی کی چوٹیوں کے پار گجرات و مالوے کے سرسبز میدان تھے اور دہلی سے وہاں پہونچنے میں راجپوتانے سے گزرے بغیر چارہ نہ تھا اس لئے بھی سلاطین دہلی کو بار بار حملہ کرنے کی ضرورت پیش آئی اور قلعۂ رن تھمبور و چتور کی زمین بار بار بہادروں کے خون سے رنگین ہوئی۔

رن تھمبور کا قلعہ پرتھی راج کے قبضہ میں تھا جب مسلمانوں کا اجمیر پر قبضہ ہو گیا تو یہ بھی غالباً بغیر لڑے بھڑے مسلمانوں کے قبضہ میں آگیا۔ قرینہ سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ جب آزادی پسند راجپوت اجمیر کو دوبارہ اپنے قبضہ میں نہ لا سکے تو انھوں نے رن تھمبور کو اپنا جنگی مستقر منتخب کیا اور مسلمانوں کی مختصر فوج کو جو یہاں مقیم تھی نکال کر کسی نہ کسی طرح اس پر قابض ہو گئے اُسی وقت سے یہ قلعہ ایک طرح سے تمام مشرقی راجپوتانہ کے آزاد و جنگجو قبائل کا مامن بن گیا۔ اور چونکہ اس کے قریب ہی جنوب میں اراولی پہاڑ

---

[1]۔ یہ بات بھی نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ راجپوتانہ پر غلبہ قائم رکھنے کے لئے مسلمانوں نے قطب الدین ایبک ہی کے زمانہ سے راجپوتانہ کی کُنجی یعنی اجمیر پر قبضہ کر لیا تھا۔ ضرورت کے وقت اسی مرکز جنگ سے وہ اپنی فوجیں راجپوتانے کے ہر گوشہ میں پھیلا دیتے تھے۔ اسی پالیسی پر انگریزوں نے بھی عمل کیا اور اس پر براہ راست آخر تک اپنا قبضہ رکھا ہے۔ (مؤلف)

کی ایک شاخ پھیلی ہوئی ہے لہٰذا رنتھمبور کو نہایت عمدہ جنگی مورچہ کہہ سکتے ہیں جسے عقب سے نہایت آسانی کے ساتھ کمک پہونچائی جا سکتی تھی اور مدافعت کے ناکام رہنے کی صورت میں بھی انہیں پہاڑیوں میں پناہ لے سکتے تھے جہاں دشمن کی رسائی بہت دشوار تھی۔ التمش نے ۶۲۳ھ/۱۲۲۶ء میں چند مہینے کے محاصرہ کے بعد اس قلعہ کو فتح کرلیا۔ اسی طرح مغربی راجپوتانے کے سب سے مشہور و مستحکم قلعہ منڈور کو ۶۲۴ھ/۱۲۲۷ء میں شمس الدین نے حملہ کرکے فتح کرلیا۔ اس فتح کے اسباب و واقعات کی کسی فارسی مورخ نے تفصیل نہیں لکھی۔ علامہ اکبر شاہ خاں نجیب آبادی نے امیر روحانی بخاری کے اس قصیدہ[1] کی بنا پر جو اس نے اس فتح کے موقع پر سلطان کی خدمت میں پیش کیا اس امر کی طرف توجہ دلائی ہے کہ "یہ ملاحدہ کا مستقر تھا اور ان کے استیصال کے لئے یہ حملہ کیا گیا"[2] قابل غور ہے۔ بہت ممکن ہے کہ ملتان و سندھ سے اخراج کے بعد ملاحدہ نے ادھر پناہ لی ہو کیونکہ یہ جگہ[3] سندھ سے قریب ہے اور ادھر گجرات کی سرحد بھی اس سے متصل ہے جہاں راجہ سدھاراج کے زمانہ ہی میں (۱۰۹۴ تا ۱۱۴۳ء) ایک اسمٰعیلی واعظ "نورستاگر" نامی کی کوششوں سے کنبی، کھاروا اور کوری قومیں اسماعیلیہ مذہب میں داخل ہو چکی تھیں[4]

رنتھمبور اور منڈاور کی فتوحات نے راجپوتانہ کے ان قطعات کو محفوظ کردیا جو براہ راست

---

[1] قصیدہ کے بعض اشعار قابلِ غور ہیں جن سے یقین ہوتا ہے کہ منڈاور کو ملاحدہ کے ہاتھوں سے چھینا گیا۔ اشعار یہ ہیں

خبر باہلِ سما بردہ جبرئیل امیں	ز فتح نامہ سلطانِ عہد شمس الدین
کہ از بلادِ ملاحد شہنشہِ اسلام	کشاد بارِ دگر قلعۂ سپہر آئین
شہِ مجاہد و غازی کہ دست و تیغش را	روانِ حیدرِ کرار میکند تحسین (بدایونی ج ۱ ص ۶۵ ، ۶۷)

[2] تاریخ آئینہ حقیقت نما ج ا ص ۲۶۹ و ۲۷۰ از اکبر شاہ خاں نجیب آبادی

[3] مؤلف آئینہ حقیقت نما کا یہ خیال صحت طلب ہے کہ منڈاور جس پر التمش نے حملہ کیا ضلع بجنور میں واقع ہے کیونکہ واقعات و قرائن اس امر کی تصدیق نہیں کرتے کہ یہ قصبہ کبھی ملاحدہ کا مامن رہا ہو۔

[4] دعوت اسلام ترجمہ دی پریچنگ آف اسلام ص ۲۹۱ از ٹی۔ ڈبلیو آرنلڈ۔

سلطنت دہلی میں داخل ہو گئے تھے۔ اس کے علاوہ راجپوتوں کے طاقت پکڑ جانے کا خطرہ بھی ایک حد تک جاتا رہا۔ یہی وجہ تھی کہ التتمش نے ادھر سے فراغت پانے کے بعد اپنے سب سے خطرناک و قوی حریف قباچہ حاکم سندھ پر دلجمعی کے ساتھ حملہ کیا اور جمادی الاوّل ۶۲۵ھ ۱۲۲۸ء میں اُسے شکست دیکر سندھ کا دہلی سے الحاق کر لیا۔ اس طرح ۱۲۲۸ء میں قریباً پورا شمالی ہندوستان (مالوہ کے علاوہ) التتمش کے قبضہ میں آگیا۔ یہی وہ زمانہ ہے جبکہ خلیفہ بغداد کے سفیر التتمش کے لئے بادشاہی کی سند اور خلعت لیکر دہلی آئے۔ یہ سفارت قاضی جلال عروس کے زیر سرکردگی تھی[1]۔

منشور خلافت

سلطنت دہلی کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ خلیفہ وقت نے حکومت کی سند عطا فرمائی ہو یا بالفاظ دیگر دنیائے اسلام نے ہندوستان کی مستقل اور جداگانہ بادشاہی تسلیم کی ہو ورنہ کچھ عرصہ پہلے تک دہلی کو سلطنت غزنی کے تابع سمجھا جاتا تھا۔" التتمش نے اس تقریب کی خوشی میں ۲۲ ربیع الاول ۶۲۶ھ مطابق فروری ۱۲۲۹ء کو جبکہ خلیفہ بغداد المستنصر باللہ کے سفراء منشور خلافت لیکر آئے شہر کو آئینہ بند کر کے جشن ترتیب دیا اور اس کی یادگار باقی رکھنے کے لئے چھوٹے سے چھوٹے سکہ پر بھی خلیفۂ وقت کا نام بزبان ہندی کندہ کرایا[2]۔" اس سے یہ مقصود بھی تھا کہ عام پبلک کو یہ معلوم ہو جائے کہ اُن کا قانونی اعلیٰ حاکم کون ہے نیز یہ کہ اُن کا شہنشاہ یعنی التتمش منجملہ ان سلاطین کے ایک ہے جو دُنیائے اسلام کی مرکزی حکومت (بغداد) کے تابع فرمان ہیں۔ اور اس طرح ہندوستان کا ملک دارالسلام کا ایک جُز ہے۔ اس سفارت نے ہند اور دیگر اسلامی ممالک میں سلسلۂ ارتباط کو قوی کر دیا اور ایران و عراق کے اہل علم اور تاجر کثرت سے ہندوستان میں آنے لگے۔

---

[1]:- ضیائے برنی ص ۱۰۳

[2]:- ایڈمنسٹریشن آف دہلی سلطنت ص ۲۷

آخری فتوحات و موت

شمالی ہند میں صرف مالوہ کا علاقہ باقی تھا جہاں غزنوی و غوری سپاہ کے قدم نہیں آئے تھے۔ راستے میں گوالیار گو پہلے مسخر ہو چکا تھا لیکن اب خود مختاری کا دم بھر رہا تھا۔ اس لئے افواج شمسی نے بڑھ کر پہلے اسی قلعہ کا محاصرہ کیا اور دس گیارہ مہینے تک اسے گھیرے پڑی رہیں آخر ماہ صفر (۶۳۰ھ ۱۲۳۳ء) میں راجہ چھپ کر فرار ہو گیا اور باقی ماندہ محصورین نے جو غالباً فاقہ کشی میں مبتلا تھے قلعے کے پھاٹک کھول دئے۔

مالوہ خاص کو دو برس کے بعد مسخر کیا گیا اس طرح ۶۳۲ھ ۱۲۳۴ء میں بھیلسہ و اجین کے مفتوح ہو جانے سے سلطنت دہلی کی حدود دریائے نربدا تک وسیع ہو گئیں۔ کہا جاتا ہے کہ اجین کے فتح کرنے میں اس نے مہا کال دیو کا بت خانہ مسمار کیا۔ اس مندر میں راجہ بکرماجیت کی بہت بڑی پتھر کی مورت نصب تھی جس کے ارد گرد چند چھوٹی چھوٹی تانبے اور پیتل کی مورتیں تھیں۔ انھیں اٹھوا کر وہ دہلی لے گیا۔ تاریخ ہند میں ایسی بت شکنی کی خال خال مثالیں اور بھی موجود ہیں لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ مذہبی تعصب کسی خاص ملکی مصلحت پر مبنی ہوتا تھا ورنہ اسلامی شریعت کی رو سے جائز نہیں کہ منادر و معابد کو توڑا جائے۔ خود شمس الدین کی فتوحات ہمارے پیش نظر ہیں ان میں قلعہ منڈور (منڈاور) کا پرانا مندر جو ۱۲۱۱ء سے پہلے کا بنا ہوا ہے[۱] اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ مسلمان بادشاہوں کو ہر مندر کے توڑ دینے کا ایسا شوق نہ تھا جیسا کہ اس زمانہ کی انگریزی تاریخوں میں (کسی خاص مصلحت کی وجہ سے) دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ بھیلسہ کے بالکل قریب ہی بودھ مت والوں کے کئی قدیم اسٹوپ (گنبد) اور زیارت گاہیں موجود ہیں جنھیں شمس الدین یا بعد کے کسی مسلمان فرمانروا نے خواہ مخواہ تڑوا کر مفت کا ثواب حاصل نہیں کیا۔

---

[۱] گزیٹیر جلد ۷ صفحہ ۱۷۱۔

۳۶-۱۲۳۵ء کے موسم سرما میں التمش نے گھکروں کی سرکوبی کے لئے سفر کیا لیکن راستہ میں بیمار ہو گیا۔ بیماری ترقی کرتی گئی اور اسی بیماری میں بروز سہ شنبہ ۲۰ شعبان ۶۳۳ھ مطابق ۲۹ اپریل ۱۲۳۶ء کو سلطان کا انتقال ہو گیا[1]۔ مقبرہ غیر مسقف مسجد قوۃ الاسلام کے عقب میں مہرولی جانے والی سڑک کے بائیں جانب واقع ہے۔

سلطان کی عادت و خصلت

یہ سلطان بڑا خدا ترس، رحمدل، عابد و زاہد، شب زندہ دار اور سخی و دلیر تھا۔ ارکان اسلام کی بڑی سختی سے پابندی کرتا اور دوسروں کو ترغیب دیتا، پنج وقتہ نمازیں مسجد میں باجماعت ادا کرتا اور درویش خدا آگاہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کی مجلس میں اکثر حاضر رہتا تھا۔ حضرت خواجہ صاحب موصوف خواجہ معین الدین چشتیؒ کے خلیفۂ اول ہیں۔ التمش موصوف کی بڑی عزت کرتا تھا۔ جب ۱۴ ربیع الاول ۶۳۳ھ مطابق ۷ دسمبر ۱۲۳۵ء کو قطب صاحب[2] واصل بحق ہوئے تو وفات سے پہلے وصیت کی کہ "اُن کے جنازہ کی نماز ایسا شخص پڑھائے جس نے کبھی عصر کی سنتیں قضا نہ کی ہوں اور ہمیشہ نماز باجماعت میں تکبیر اولیٰ شریک رہا ہو، علاوہ ازیں حرام کی طرف کبھی قدم نہ بڑھایا ہو" یہ شرطیں صرف سلطان التمش کی ذات

---

[1]۔ قاضی منہاج الدین جرجانی (مصنف طبقات ناصری) نے سلطان کی تاریخ وفات لکھی ہے ؎

چو شش صد سی و سہ از سال ہجری	گذشت و بست روز از ماہ شعبان
بشد سلطان شمس الدین التمش	بسوئے جنت الماوا خرامان

(۱۸۴)

[2]۔ حضرت خواجہ صاحب موصوف کی ذات گرامی محتاج تعارف نہیں۔ نہایت ہر دل عزیز بزرگ تھے ہندو مسلمان دونوں اب تک اُن کا احترام کرتے ہیں چنانچہ سال گذشتہ یعنی دسمبر ۱۹۴۷ء میں جبکہ دہلی شہر کی فضا مکدر تھی اور بظاہر یہ غیر ممکن سی بات تھی کہ آپ کا سالانہ عرس ہو سکے اس موقع پر مہاتما گاندھی جی کا دل بے چین ہو گیا اور انھوں نے خود مہرولی تشریف لیجا کر مولینا حفظ الرحمن صاحب کے مشورے سے عرس کا انتظام کرایا حضرت قطب صاحبؒ کے بقیہ حالات زندگی ترکی سلاطین کے عہد حکومت کے دیگر صوفیائے اعظام کے ساتھ الگ سے بیان کئے جائیں گے۔

میں پوری ہوتی تھیں اس لئے اسی نے جنازہ کی نماز پڑھانے کی سعادت حاصل کی۔[1]"

واقعہ یہ ہے کہ حضرت قطب صاحبؒ کی صحبت نے التتمش کی زندگی پر بڑا اثر ڈالا وہ اس کو رعایا پروری اور فقیروں، غریبوں، اور درویشوں کے ساتھ دوستی کی تلقین کرتے رہتے تھے۔ اور وہ اس پر عمل کرتا تھا۔[2] اس کی بابت حضرت قطب صاحبؒ فوائد السالکین[3] میں فرماتے ہیں۔

"اس کا (یعنی التتمش کا) اعتقاد صحیح تھا۔ راتوں کو وہ جاگتا۔ کسی نے اس کو سوتے نہیں دیکھا، وہ بیدار رہ کر عالم تحیر میں کھڑا رہتا اور اگر سو جاتا تو فوراً بیدار ہو جاتا، اُٹھ کر وضو کرتا اور مُصلّے پر جا بیٹھتا، اپنے نوکروں میں سے کسی کو نہ اُٹھاتا[4] اور کہتا کہ آرام سے سونے والوں کو تکلیف کیوں دی جائے، رات کو وہ گدڑی پہن لیتا تا کہ کسی کو خبر نہ ہو اور کسی شخص کو ساتھ لے کر باہر نکل جاتا اس کے ہاتھ میں سونے کے ٹنکوں کا ایک توشہ دان ہوتا ہر مستحق کے دروازہ پر جاتا حالات پوچھتا اور مدد کرتا، وہاں سے واپس ہوتا تو مسجدوں، ویرانوں اور خانقاہوں و بازاروں میں گشت کرتا اور اُن جگہوں کے رہنے والوں اور درویشوں کو مالی مدد پہونچاتا .... دن کو اس کے دربار میں عام اجازت تھی کہ جو ننگے بھوکے ہوں اُس کے پاس لائے جائیں اور جب وہ آتے تو ان میں سے ہر ایک کو کچھ نہ کچھ دیتا اور اُن کو قسمیں دیکر تلقین کرتا کہ جب اُن کے پاس کھانے پینے کو کچھ نہ رہے یا کوئی اُن پر ظلم کرے تو وہ یہاں آ کر عدل و انصاف کی زنجیر کو جو باہر لٹکی ہوئی ہے ہلائیں تا کہ وہ اُن کے ساتھ

ع۱:- خزینۃ الاصفیا ص ۲۷۵، رسالہ معارف بابتہ ماہ ستمبر ۱۹۴۵ء ص ۱۵۸

ع۲:- جواہر فریدی ص ۱۷۴ از اصغر چشتی، مونس الارواح قلمی ص ۷ از جہاں آرا بیگم۔ اسی قسم کی تلقین حضرت قاضی حمید الدین ناگوری خلیفہ اوّل حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ بھی کرتے رہتے تھے (ملاحظہ ہو سبع سنابل ص ۲۳۲ [illegible]

ع۳:- یہ ۲۶ صفحات پر مشتمل ایک رسالہ ہے جس میں حضرت قطب صاحبؒ کی سات صحبتوں کے ملفوظات ہیں جنھیں اُن کے مرید باصفا حضرت بابا فرید گنج شکرؒ نے جمع کیا ہے۔ ع۴:- فوائد الفواد ص ۲۳۵، فوائد السالکین قلمی ص ۱۹

ع۵:- عدل و انصاف کے لئے نور الدین جہانگیر کی طلائی زنجیر کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ ہندوستان میں ترک سلاطین اس کا استعمال صدیوں پہلے سے جانتے تھے۔

انصاف کر سکے، ورنہ قیامت کے روز ان کی فریاد کا بار اس کی طاقت برداشت نہ کر سکے گی۔"[1]

ایلتتمش کی اس نیک نفسی کی وجہ سے تذکرہ نگاروں نے اس کا ذکر اولیاء اللہ کی فہرست میں کیا ہے چنانچہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے پیرو مرشد حضرت خواجہ عثمان ہرونیؒ نے سلطان کو جو اُن کا مرید بھی تھا انسان کامل بتایا ہے۔ انسان کامل از روئے تصوف خود فراموشی و خود آگہی کی چوتھی و آخری منزل ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ایلتتمش کے عہد حکومت میں جب خواجہ عثمان ہرونیؒ دہلی تشریف فرما ہوئے تو انھوں نے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کو سلطان کی تربیت پر مامور فرمایا تھا۔[2] حضرت شیخ احمیریؒ سے خصوصی تعلقات کا ثبوت مؤلف خزینۃ الاصفیاء کی مندرجہ ذیل عبارت سے بھی فراہم ہوتا ہے۔ لکھتا ہے:۔

"بادشاہ رحم دل و عادل و سلطان کامل و مکمل از خلفائے نامدار و مریدان باوقار خواجہ قطب الدین بختیارؒ است، و از محبوبان و لظر منظوران خواجہ معین الدینؒ سنجری بود، و کمال اعتقاد بخدمت حضرات اہل چشت نیک سرشت پیدا کرد، اگرچہ بظاہر تعلق بہ پادشاہی داشت لیکن از دل فقر و فقر دوست بود، کم خوردی و کم خفتی، شبہائے دراز بیدار بودے ۔۔۔۔ الخ"[3]

اس میں شبہ نہیں کہ سلطان کو درویشوں سے تعلق و لگاؤ بچپن ہی سے تھا۔ کہتے ہیں کہ جب وہ بخارا میں ایک حاجی نامی امیر کا غلام تھا اس کے مالک نے اسے کچھ پیسے دیکر انگور خریدنے کے لئے بازار بھیجا۔ پیسے راستہ میں کھو گئے چونکہ یہ ابھی بچہ ہی تو تھا زار و قطار رونے لگا کہ اتنے میں ادھر ایک درویش آنکلا اس نے اسے دوکان پر لیجا کر انگور دلائے

---

[1]:۔ فوائد السالکین ص ۱۹، رسالہ معارف ص ۱۵۶ ماہ ستمبر ۱۹۴۵ء

[2]:۔ گنج الاسرار مؤلفہ حضرت شیخ احمیریؒ مملوکہ برادرم خلیق احمد نظامی لیکچرر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، اسلامک کلچر ص ۱۷۲ ماہ اپریل ۱۹۴۶ء

[3]:۔ خزینۃ الاصفیاء جلد اول ص ۲۷۶ از غلام سرور

اور وعدہ لیا کہ جب وہ سلطنت کا مالک ہو تو فقرا و درویش اور ضرورتمندوں کا خاص طور سے لحاظ رکھے چنانچہ التمش نے مرتے دم تک اس درویش باصفا کی نصیحت پر عمل کیا[۱]۔

اس کے دور غلامی کا ایک اور اہم واقعہ ہے جس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ ہونہار غلام جس پر ہزاروں آزادیاں قربان صوفیاء کرام کا کتنا محبوب نظر اور چہیتا تھا اور اس کو ان سے کتنا لگاؤ تھا یہ اس وقت کی بات ہے جبکہ وہ بحیثیت غلام بخارا سے بغداد لے جایا گیا بغداد اس زمانہ میں تصوف کا مرکز تھا۔ بڑے بڑے گرامی قدر صوفیاء عظام مثلاً شیخ شہاب الدین سہروردیؒ، خواجہ معین الدین چشتیؒ، شیخ احدالدین کرمانیؒ، مولانا عماد الدینؒ اور قاضی حمیدالدین ناگوریؒ وغیرہ کا وہاں مبارک اجتماع تھا۔ ایک مرتبہ التمش کو دیکھ کر فرمایا "من در چہرۂ این شخص انوارِ سلطنت لامع می بینم" اس وقت شیخ احدالدین کرمانی بھی وہاں موجود تھے انھوں نے التمش کو مخاطب کر کے کہا۔

"از برکتِ شما در سلطنتِ دنیوی دینش ہم سلامت باشد"[۲]

اسی طرح ایک مرتبہ خواجہ معین الدین چشتیؒ نے بھی التمش کے بارے میں بشارت دی تھی کہ

"این کودک بادشاہ دہلی خواہد شد"[۳]

ڈاکٹر تارا چند صاحب التمش کی زندگی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"التمش غیر معمولی ہمت اور جوش کا فرمانروا تھا۔ اس کی سلطنت بیشمار اندرونی و بیرونی خطرات میں گھری ہوئی تھی اس لئے ۲۶ سال کی حکومت میں اس نے ایک لمحہ کے لئے بھی ملک داری کے فرائض سے غفلت نہیں برتی۔ اس نے اپنے جانشینوں کے لئے جو سلطنت چھوڑی وہ اس سے کہیں زائد و پائدار تھی جو خود اس کو ملی تھی۔ اس نے نظم و نسق کے ایسے قاعدے بنائے جو مدتوں تک

(حاشیہ: ۴ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی کی خدمت میں حاضر ہوا اور حضرت شیخ نے التمش)

۱:۔ طبقات ناصری ص ۱۶۷ / (۲) سیر العارفین قلمی ص ۲۷

۳:۔ فوائد السالکین قلمی ص ۱

دوسروں کے لئے دستور العمل کا کام دیتے رہے۔ وہ نہ صرف ایک بہادر سپاہی اور دانش مند مدبر تھا بلکہ عالموں اور درویشوں کا بڑا قدردان تھا"[ع۱]

ڈاکٹر صاحب موصوف نے جو کچھ لکھا ہے وہ حقیقت پر مبنی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ التمش کی فیاضی و قدر دانی نے دہلی کو علماء و فضلاء کا مرکز بنا رکھا تھا۔ بلبن جس کا دربار خود بھی اپنے عہد میں علماء کرام اور مشائخین عظام کے اجتماع کے لئے بے مثل و لاثانی تھا اکثر کہا کرتا تھا کہ اس نے ایسے اکابر و مشائخ کو کسی دربار میں نہیں دیکھا جیسے کہ التمش کے دربار میں تھے۔[ع۲] قاضی حمید الدین[ع۳] ناگوریؒ، حاجی مجد الدین[ع۴]، مولانا جمال الدین[ع۵] بسطامی، سید نور الدین مبارک غزنوی[ع۶] اسی عہد کے درخشندہ جوہر تھے۔ فخر الملک[ع۷] عطائی جو تیس سال تک بغداد

ع۱:۔ اہل ہند کی مختصر تاریخ از ڈاکٹر تاراچند۔

ع۲:۔ ملاحظہ ہو تاریخ فیروز شاہی از برنی ص۲۷ تا ص۹۲ نیز ص۲۷

ع۳:۔ التمش قاضی حمید الدین ناگوری کا کتنا احترام کرتا تھا اس کا اندازہ یوں لگایا جا سکتا ہے کہ اس نے اپنے بھتیجے ملک سعد الدین کو مرید ہونے کے لئے قاضی صاحب موصوف کی خدمت میں پیش کیا (ماخوذ از رسالہ اسلامک کلچر ص۱۲۷ ماہ اپریل سنہ ۱۹۴۶ء بحوالہ سنابل ص۲۳۳)۔

ع۴:۔ حاجی مجد الدین کو جو حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کے مرید و خلیفہ ہیں "صدر ولایات" کے ذمہ دار عہدہ پر مامور کیا (ملاحظہ ہو اخبار الاخیار ص۵۲)

ع۵:۔ مولانا جمال الدین بسطامی کو شیخ الاسلامی کا عہدہ تفویض تھا (اسلامک کلچر ص۱۲۵ اپریل سنہ ۱۹۴۶ء)

ع۶:۔ سید نور الدین مبارک غزنوی شاہی دربار میں اپنے وعظ و تلقین کے لئے مشہور ہیں (ضیاء برنی ص۴۱-۴۲)

ع۷:۔ فتوح السلاطین میں وزیر کی آمد کا حال تفصیل کے ساتھ درج ہے لیکن عطائی کے بجائے اسے عصامی تحریر کیا ہے۔ (ملاحظہ ہو فتوح السلاطین از عصامی ص۱۲۲)

میں خلفاء عباسیہ کا وزیر رہ چکا تھا اور کمالات ظاہر و باطن میں شہرت تامہ رکھتا تھا سلطان التتمش کے دربار میں آیا اور اسی کی قدر شناسی نے اُسے منصب وزارت پر متمکن کیا۔ قاضی منہاج الدین سراج (مصنف طبقات ناصری) اور نور الدین محمد عوفی (مصنف جامع الحکایات اور لباب الالباب وغیرہ) اسی کے زمانہ میں تھے چنگیز خانی فتنہ کی وجہ سے بہت سے حکماء و شعراء وسط ایشیاء سے ہندوستان کی طرف ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے انھیں میں امیر روحانی بھی تھا جو بخارا سے دہلی آیا اور التتمش کی زرپاشیوں سے فیضیاب ہوا۔ غرضیکہ ان تمام بزرگوں کی وجہ سے سلطان کا دربار دینی و دنیوی دونوں اعتبار سے محمودی و سنجری دربار معلوم ہوتا تھا۔

مذکورۂ بالا حضرات کے علاوہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ، شیخ جلال الدین تبریزیؒ[۱]، شیخ بدر الدین غزنویؒ[۲]، قاضی قطب الدین کاشانیؒ[۳] وغیرہ سے دہلی کی فضا معمور و منور تھی۔ سلطان کے پیر و مرشد حضرت شیخ عثمانؒ[۴] ہارونیؒ اور خواجہ معین الدین چشتیؒ کا بھی دہلی میں تشریف لانا ثابت ہے۔[۵] خواجہ عماد الدین بلگرامی اور سید محمد صغریٰ بلگرامی

---

[۱]: سلطان نے شیخ جلال الدین تبریزی کا جبکہ وہ بغداد سے دہلی تشریف لائے شاہانہ استقبال کیا اور مؤلف سیر العارفین کی روایت کے بموجب وہ شیخ کو دیکھ کر فوراً گھوڑے پر سے اُتر پڑا اور ان کی طرف استقبال کے لئے تیزی سے بڑھا (سیر العارفین ص ۱۰۷)۔ مزید حالات کے لئے ملاحظہ ہو تذکرۃ الواصلین از مولوی رضی الدین بسمل۔ بار دوم مطبوعہ نظامی پریس بدایوں ۱۹۴۵ء۔ فٹ نوٹ ص ۴۳ تا ۵۰۔

[۲]: شیخ بدر الدین غزنوی کی سلطان بڑی عزت کرتا تھا ایک مرتبہ جب وہ بادشاہ سے ملنے کو تشریف لے گئے تو بادشاہ نے شاہی محل کے دروازہ پر آکر ان کا استقبال کیا اور معانقہ کرنے کے بعد انھیں محل کے اندر لے گیا (فوائد الفواد ص ۲۳)

[۳]: قاضی قطب الدین کاشانی کی بھی دربار میں بڑی قدر و منزلت تھی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو فوائد الفواد ۲۳۶)

[۴]: حضرت شیخ عثمانی ہارونیؒ مرید و خلیفہ ہیں حضرت خواجہ حاجی شریف زندنیؒ کے قنوج کی مقامی

(باقی صفحہ ۲۴۷ پر)

کی سلطان بڑی عزت کرتا تھا۔[۱] جس طرح پایۂ تخت دہلی میں علماء و صلحاء کا اجتماع تھا
اسی طرح بدایوں بھی جہاں التتمش ایک عرصہ تک عہدۂ گورنری پر فائز رہا تھا نہایت گرامی قدر
بزرگوں کا مسکن بن چکا تھا۔ حضرت خواجہ عثمان ہرونیؒ کے مرید و خلیفہ اور سلطان المشائخ
خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے سگے نانا حضرت سید عرب بخاریؒ المتوفی ۶۱۸ھ مع حضرت
سید احمد صاحب (والد بزرگوار حضرت سلطان المشائخؒ) بدایوں میں فروکش تھے۔ اسی
طرح قاضی حمید الدین ناگوریؒ کے مرید و خلیفہ حضرت سلطان العارفین (نام خواجہ بدرالدین
لقب موئے تاب) اپنے جمالی و جلالی فیض کا پرتو ڈال رہے تھے۔ ان دونوں بزرگوں
کے استاد شیخ حسام الدین عرف حاجی جمال ملتانیؒ (مرید و خلیفہ حضرت صدر الدین بن
بہاء الدین زکریا ملتانیؒ) اور خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے استاد محترم سید علاء الدین
اصولیؒ (مرید حضرت جلال الدین تبریزیؒ) بدایوں کے صاحب کشف اولیاء اللہ میں
سے تھے۔ علماء میں خواجہ ضیاء الدین نخشبیؒ، شیخ شہاب الدین جہمرہؒ، مولانا رضی الدین
صغانیؒ (صاحب مشارق الانوار) اور قاضی سعد الدین عثمانی وغیرہ نہایت بلند پایہ بزرگ
تھے۔[۲]

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۴۶: روایت پر اگر اعتبار کیا جائے تو ہندوستان میں خواجہ اجمیریؒ سے بہت پہلے آپ
کے دادا پیر کا یہاں ہونا ثابت ہوتا ہے۔ قنوج میں ایک مزار شریف ہے جو حضرت شریف زندنیؒ کی طرف
منسوب ہے۔ اس کے لوح مبارک پر یہ شعر کندہ ہے ؎

بے ادب پا منہ اینجا کہ عجب درگاہ است — سجدہ گاہِ ملک و روضۂ شاہنشاہ است

اس شعر کے نیچے لکھا ہوا ہے:۔

"مزار پاک حضرت خواجہ حاجی شریف زندنیؒ ۶۱۲ھ" واللہ اعلم بالصواب۔

۵ :۔ اسلامک کلچر ص ۱۲۳، ص ۱۲۵ ماہ اپریل ۱۹۳۶ء بحوالہ تاریخ فرشتہ

۱ :۔ ماثر الکرام ص ۱، ص ۱۱ ۲ :۔ تذکرۃ الواصلین۔

اُس نے اطراف واکناف ہند میں بہت سی درسگاہیں تعمیر کرائیں جہاں دور دور سے طلباء آتے تھے اور وظائف حاصل کرکے تحصیل علم میں مشغول رہتے تھے۔ فیروز تغلق نے ایک صدی سے زیادہ زمانہ گذرنے کے بعد اپنی فتوحات فیروز شاہی میں دہلی کے ایک بڑے دارالعلوم کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "مدرسہ سلطان شمس الدین ایلتتمش مسمار ہوچکا تھا میں نے دوبارہ اس کی تعمیر کرائی اور صندل کے دروازے لگوائے علاوہ اس کے ستون صحن، گنبد وغیرہ کو بھی از سر نو تعمیر کرایا"[1]

بہرکیف سطور بالا پر نظر ڈالنے سے شمس الدین ایلتتمش کی ایک صحیح و روشن تصویر ہمارے ذہن میں آسکتی ہے۔ اس کی پاکبازی و نیک نفسی میں کسی کو کلام کی گنجائش نہیں مسلم سلاطین میں یہ شہرت صرف اسی سلطان کو حاصل ہے کہ چشتی طبقہ کے اکابر و بزرگوں نے جو دنیوی سلاطین سے ہمیشہ الگ تھلگ رہتے تھے اس کو اپنا دوست کہہ کر مخاطب کیا ہے[2]۔ ایسے سلطان کے زیر سایہ رہ کر ہندوستان اور ہندوستان والوں پر اللہ کی کیا کچھ رحمتیں نازل نہ ہوئی ہوں گی ان کا آج ہم اندازہ بھی نہیں لگا سکتے۔ حقیقتاً وہ ہندوستان کا ایک قابل فخر اور قابلِ تقلید سلطان ہے۔

ایلتتمش کی یادگاریں

سلطان مرحوم کی سب سے عمدہ و بہتر یادگار تو خود اُس کے ذاتی خصائل ہیں جو ملفوظات و تواریخ میں ایک عرصۂ دراز تک باقی رہیں گے۔ دنیوی اعتبار سے اُس نے آٹھ لڑکے اور ایک لڑکی اپنی یادگار چھوڑے ان کے علاوہ کچھ عمارتیں ہیں جو آج تک اُس کی یاد دلاتی ہیں اُس نے ۳۲-۱۲۳۱ء میں قطب الدین کے بنیاد کردہ دو منزلہ قطب مینار کو سات منزل تک مکمل کرایا اور حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے نام نامی پر اس کو قطب مینار کے نام سے موسوم کیا[3]۔ قطب مینار

---

[1]:- فتوحات فیروز شاہی صـ ۳۸۳   [2]:- اسرار الاولیاء قلمی صـ ۱۱،   [3]:- راورٹی طـ ۲- ۶۲۲

فٹ نوٹ، میڈیول انڈیا صـ ۱۶۶ فٹ نوٹ از ڈاکٹر ایشوری پرشاد

کے علاوہ مسجد قوۃ الاسلام میں تین دروازے اضافہ کئے۔ دہلی میں حوض شمسی[۱] یا تالاب شمسی بھی اسی کی یادگار ہے۔ التمش اقطاع بدایوں کا جو اس عہد میں دہلی کا سب سے زیادہ وسیع صوبہ تھا ایک عرصہ تک گورنر رہا تھا اس کے عہد گورنری کی یادگار جامع مسجد شمسی[۲] اور عیدگاہ شمسی کی صورت میں آج تک موجود ہے۔ اسی طرح قصبہ منڈاور (واقع ضلع بجنور) میں جہاں باغی راجپوتوں کی سرکوبی کے لئے اسے دو مہینہ تک قیام کرنا پڑا تھا ایک وسیع جامع مسجد تیار کرائی۔ اجمیر شریف میں "اڑھائی دن کا جھونپڑا" بھی التمش ہی کا بنا کردہ ہے۔ اس کی بعد کو توسیع ہوتی رہی۔ عہد حاضر میں جو عالیشان دروازہ شہر کے بازار کی طرف ہے۔ وہ ہز اگزالٹڈ ہائی نس محبوب علی خاں مرحوم نظام دکن کا بنوایا ہوا ہے[۳]۔

ع[۱]:۔ سلطان ایک حوض بنوانا چاہتا تھا اس کے لئے کسی مناسب جگہ کی تلاش میں سرگرداں تھا کہ ایک رات اسے نبی کریمؐ کی زیارت نصیب ہوئی۔ آپ نے ایک جگہ کو متعین فرمایا۔ صبح اٹھ کر یہ خواب حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ سے بیان کیا گیا چنانچہ خواجہ صاحب موصوف سلطان کو لیکر اس متعین جگہ پر پہونچے دیکھا کہ وہاں گھوڑے کے سم کا نشان ہے اور چشمہ جاری ہے۔ اسلئے اسی جگہ حوض شمسی کی بنا ڈالی گئی۔ (ملاحظہ ہو فوائد السالکین ص۱۸، جواہر فریدی ص۱۷۸، خزینۃ الاصفیاء ص۲۷۶ فرشتہ ص۶۶ نولکشور پریس)۔

چونکہ حوض شمسی متبرک خیال کیا جاتا تھا اسلئے بہت سے صوفیاء کرام نے اپنا مسکن بنالیا اور ایک مسجد بھی بنائی جو ابتک اولیاء مسجد کے نام سے مشہور ہے۔ اسی بابرکت حوض کی مٹی کو حضرت بابا فرید گنج شکرؒ نے اپنے پیر حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کی قبر بناتے وقت استعمال کیا۔ اس حوض کی فیوض و برکات کا حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ اکثر تذکرہ فرمایا کرتے تھے۔ اور اگر فوائد الفواد کی اس روایت کو سامنے رکھا جائے کہ اللہ تبارک تعالیٰ نے سلطان التمش کو بعد وفات محض اس حوض کی تعمیر کی وجہ سے بخش دیا تو اس نیک کام کی اہمیت سمجھ میں آسکتی ہے (فوائد الفواد ص۱۱۹، اسلامک کلچر ص۱۲۸، ماہ اپریل ۱۹۴۶ء)

ع[۲]:۔ اس مسجد کا بیرونی طول و عرض ۲۷۶ × ۲۱۶ فیٹ۔ اندرونی صحن ۱۸۰ فیٹ طولاً اور ۹۴ فیٹ عرضاً ہے۔ سطح زمین سے ۱۲ فیٹ اونچائی تک دیواریں کنکر اور پتھروں سے تعمیر کی گئیں ہیں اور اس کے اوپر کا

(باقی صفحہ ۲۵۰ پر)

فصل سوم دور انتشار

خاندان غلامان ۱۲۳۶ء تا ۱۲۴۶ء

(۴) سلطان رکن الدین فیروز شاہ ابن التتمش ۲۹ شعبان ۶۳۳ھ / اپریل ۱۲۳۶ء تا ۱۸ ربیع الاول ۶۳۴ھ / نومبر ۱۲۳۶ء

سلطان شمس الدین التتمش کی وفات کے بعد اُس کی ہدایت کے برخلاف سلطانہ رضیہ کے بجائے امراء نے رکن الدین کو اپنا بادشاہ بنایا۔ رکن الدین بالکل لاأبالی مزاج کا امیرزادہ

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۴۹ - تمام حصہ نہایت پختہ چھوٹی اینٹوں سے بنایا گیا ہے۔ التتمش کی تعمیر کردہ جامع شمسی کی وقتاً فوقتاً ترمیم ہوتی رہی چنانچہ ۷۲۶ھ میں جبکہ دہلی میں سلطان محمد جوناخاں حکمراں تھا حسین بن حسین کوتوال شہر بدایوں نے شمالی جانب مسجد کی عمارت بنوائی ۱۰۱۳ھ میں نواب قطب الدین چشتی نے بعہد اکبر بادشاہ مسجد کا درمیانی گنبد اور اُس کے سامنے حوض تعمیر کرایا اسی طرح جہانگیر کے عہد حکومت میں مسجد کی تعمیر و مرمت ہوئی۔ آخر میں ۱۸۸۶ء میں کلکٹر ضلع مسٹر لمپ کے ایماء و مشورہ سے مسلمانان شہر بدایوں نے چندہ کر کے مسجد کی مرمت کرائی۔ یہ کام مولوی طفیل احمد صاحب وکیل منصفی بدایوں کی نگرانی میں پایۂ تکمیل تک پہونچا اس سے پیشتر ۱۸۵۶ء میں مولوی صاحب موصوف کے والد بزرگوار مولوی رضی اللہ صاحب مرحوم مسجد کے گنبد کلاں کی استرکاری کرا چکے تھے۔ گنبد کے اندر و باہر نیز محاریب پر جو آیات قرآنی مرقوم ہیں وہ حافظ نیاز احمد صاحب مرصع قلم کی محنت کا نتیجہ ہیں۔

یہ مسجد ٹھیک قبلہ رو واقع ہے اس لئے یہ روایت جس کو بعض خود غرض لوگوں نے مشہور کر رکھا ہے کہ یہاں پر کوئی مندر تھا سراسر غلط ہے کیونکہ مندر قبلہ رو نہیں ہوا کرتا مسجد شمسی کا سنہ تعمیر ۱۲۲۳ء مطابق ۶۲۰ھ ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسجد کی تعمیر کا سلسلہ التتمش کی عہد گورنری (۵۹۹ھ تا ۶۰۷ھ) سے شروع ہو کر ۶۲۰ھ تک جاری رہا۔ لیکن عیدگاہ شمسی جو شہر کے غرب میں ایک میل کے

(باقی صفحہ ۲۵۱ پر)

تھا۔ بادشاہی ملتے ہی لہو ولعب میں منہمک ہو گیا۔ تمام خزانہ انعام و اکرام میں لٹا دیا۔ حکومت کی باگ ڈور دراصل اس کی ماں شاہ ترخاں کے ہاتھ میں تھی جو ایک ترکی کنیز تھی اس نے محل کی دوسری خواتین کو گذشتہ رقابت کی بنا پر ستانا شروع کیا التتمش کے چھوٹے بیٹے قطب الدین کو پہلے اندھا کیا اور پھر قتل کرا دیا۔ غرض چھ مہینے بھی نہ گذرے تھے کہ رکن الدین کے خلاف ہر طرف شورش پھیل گئی۔ مظالم اور بدانتظامیو کو دیکھ کر اودھ، بدایوں، ہانسی، لاہور، ملتان وغیرہ کے عامل باغی ہو گئے۔ سلطان پہلے دہلی سے لاہور کی جانب روانہ ہوا تا کہ وہاں کے حاکم ملک علاء الدین شیر خانی کو راہ راست پر لائے۔ ابھی منصور پور تک پہونچا تھا کہ راستہ سے اس کا وزیر محمد جنیدی اُسے چھوڑ کر بدایوں کے گورنر عزالدین محمد سالاری کے پاس چلا گیا جو کہ خود باغی ہو کر دہلی کے ارادے سے علی گڑھ تک پہونچ چکا تھا۔

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۵۰۔ ناصریہ واقع ہے اس کے گورنری کے زمانہ میں تیار ہو چکی تھی۔ جامع مسجد کے شرقی دروازہ پر جو سنگین کتبہ نصب ہے اس سے مسجد کے سنہ تعمیر کا پتہ چلتا ہے۔ عبارت حسب ذیل ہے:

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ من دخلہ کان آمنا۔ وللہ علی الناس حج البیت من استطاع الیہ سبیلا۔ ادخلوھا بسلام۔ بامر السلطان المعظم السلطان الاعظم ملک رقاب الامم شمس الدنیا والدین اعلی الاسلام والمسلمون اعدل الملوک والسلاطین ابو المظفر الشمس السلطان ناصر امیر المومنین خلد اللہ ملکہ سنہ ۶۲۰ عشرین وستمائۃ۔

(مزید تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو کنز التاریخ صفحہ ۱۲ تا صفحہ ۲۶ مؤلفہ مولوی رضی الدین صاحب بسمل بدایونی)

۳۔ Epigraphia Indo-Moslemica J. Horovitz P.30.

اسلامک کلچر صفحہ ۱۲۹ ماہ اپریل ۱۹۲۷ء۔ فاؤنڈیشن آف مسلم رول ان انڈیا صفحہ ۳۳۲۔ از ڈاکٹر حبیب اللہ، دہلی سلطنت صفحہ ۲۹۳ جلد ۲ صفحہ ۔ از پروفیسر معین الحق صاحب۔

رکن الدین کے لاہور کی طرف روانہ ہونے کے بعد شاہ ترخان نے رضیہ کو قتل کرنے کی تیاری کی۔ دہلی کی رعایا رضیہ کی حمایت میں اُٹھ کھڑی ہوئی اور اس کو اپنا بادشاہ بنا لیا۔ رکن الدین کی فوج نے بادشاہ کو قید کر کے دہلی آکر رضیہ کا ساتھ دیا اس طرح بادشاہ اور اُس کی ماں دونوں کو محل میں قید کر دیا گیا۔ رکن الدین کی مدت حکومت صرف ۶ ماہ ۲۷ یوم ہے[1]۔

(۵) رضیۃ الدین یا رضیہ بیگم نومبر ۱۲۳۶ء تا ۳ اپریل ۱۲۴۰ء

سلطانہ رضیہ کا دور

ملک داری سے خوب واقف اور تعلیم یافتہ عورت تھی۔ وہ گھوڑے پر سوار ہوتی اور صفِ قتال میں شمشیر زنی کرتی تھی۔ دربار میں تخت عدالت پر جلوس کرتی اور تمام فرائض شاہی کو عمدگی کے ساتھ انجام دیتی تھی۔ التمش نے اُس کی شجاعت و فراست کی بنا پر اُسے اپنا ولی عہد بنایا تھا اور اپنے بعد اُس کے تخت نشین ہونے کی بارے میں وصیت کی تھی[2]، جس کو اُمراء نے نہیں مانا کیونکہ وہ ایک عورت کو اپنے اوپر حکمراں دیکھنا پسند نہیں کرتے تھے لیکن اب واقعات کی رفتار سے مجبور ہو کر انھوں نے رضیہ کی بادشاہی پر اتفاق کر لیا پھر بھی پورے طور پر مطمئن نہیں ہوئے اور اُس کے خلاف شورش کی آگ کہیں نہ کہیں ہمیشہ بھڑکتی رہی۔

باغیوں کی سرکوبی

رضیہ جب تخت حکومت پر بیٹھی ہے تو ملتان، ہانسی، لاہور اور بدایوں کے گورنر باغی ہو کر دہلی کی طرف بڑھ رہے

ع۱:۔ طبقات ناصری ص ۶۳۶ از راورٹی نٹ نوٹ ۵

ع۲:۔ گوالیار کی مہم سے فارغ ہونے کے بعد التمش نے دہلی آکر تاج الملک محمود کو (جو مشرف ممالک کے عہدہ پر سرفراز تھا) ایک فرمان لکھنے کا حکم دیا جس کی رو سے رضیہ کو اپنا ولی عہد اور جانشین مقرر کیا (طبقات ناصری ص ۶۳۸ از راورٹی)۔

تھے۔ رضیہ نے نہایت تدبّر و استقلال سے کام لیکر سب کا کامیاب مقابلہ کیا۔ نصرۃ الدین جو عزالدین کے باغی ہو جانے پر بدایوں کا گورنر بنایا گیا تھا۔ رضیہ کی مدد کے لئے بدایوں سے چلا لیکن گنگا کنارے عزالدین اور محمد جنیدی (وزیر رکن الدین) کے مقابلہ پر مارا گیا۔ اس عرصہ میں رضیہ نے حالات پر قابو پالیا تھا اُس کی کامیابی نے محمد جنیدی کی امیدوں پر پانی پھیر دیا اور وہ شکست کھا کر سرمور کی پہاڑیوں میں بھاگ گیا اور وہیں مر گیا۔ رضیہ نے خواجہ مہذب الدین کو جو جنیدی کا ماتحت رہ چکا تھا اپنا وزیر بنایا۔

۱۹ مارچ سنہ ۱۲۳۸ء کو اُس نے گوالیار کے باغی گورنر ضیاء الدین جنیدی اور اُس کی معاون و مددگار منہاج الدین کو بس میں کیا پھر سنہ ۱۲۳۹ء کے آخر میں پنجاب کی گورنمنٹ ایاز کو ٹھیک کیا۔ پنجاب سے ۱۵ مارچ سنہ ۱۲۴۰ء کو دہلی واپس آئی جہاں ۳ اپریل سنہ ۱۲۴۰ء کو اُسے ترکی اُمراء کا مقابلہ کرنا پڑا جو یاقوت حبشی کے عروج کی وجہ سے سلطانہ سے ناراض تھے۔ اُس نے ایک حبشی غلام جمال الدین یاقوت کو اُس کی قابلیت کے مطابق امیر الامراء[1] کا عہدہ عطا فرمایا تھا لیکن ترک و افغان اُمراء جو اُس کو اپنے سے کمتر سمجھتے تھے اس کی امیر الامرائی سے برافروختہ ہو کر بغاوت پر آمادہ ہو گئے[2] چنانچہ جب وہ بھٹنڈہ

---

[1]:۔ میجر ایچ۔جی۔ راورٹی جنھوں نے طبقات ناصری پر نہایت قابلِ قدر فٹ نوٹ درج کئے ہیں صفحہ ۶۴۲ و صفحہ ۶۴۳ پر رقمطراز ہیں "فرشتہ نے سب سے پہلے جمال الدین یاقوت کو امیر الامراء کے عہدہ پر فائز بتایا حالانکہ اکبر سے پہلے اِس عہدہ کا وجود بھی نہ تھا۔ جمال الدین کا اصل عہدہ "امیر آخور" کا تھا اور جس کے غالباً یہ فرائض میں داخل تھا کہ وہ بادشاہِ وقت کو سہارا دیکر گھوڑے پر سوار کرائے"۔ "اُمراءِ چہلگانِ شمسی" کے بخلاف جمال الدین حبشی النسل تھا۔ رضیہ ترکی اُمراء کے زور کو توڑنا چاہتی تھی اِس کام کے لئے جمال الدین زیادہ موزوں اور قابلِ اعتماد تھا۔ ترکی اُمراء اِسی وجہ سے رضیہ اور جمال الدین دونوں کے مخالف تھے۔

[2]:۔ جمال الدین یاقوت پر رضیہ کو جو اعتماد تھا اس کو بعض مورخین نے افسانہ کی شکل دے کر

(باقی صفحہ ۲۵۴ پر)

کے حاکم ملک التونیہ کی بغاوت فرو کرنے کے لئے روانہ ہوئی تو راستہ میں اُمراء لشکر نے جمال الدین کو قتل کر دیا اور رضیہ کو گرفتار کر کے بھٹنڈہ بھیج دیا۔

رضیہ کی شہادت

لشکریوں نے دہلی واپس آکر معز الدین بہرام شاہ بن التمش کو اپنا بادشاہ بنا لیا۔ بہرام شاہ کا وزیر اختیار الدین ایتگین تھا۔ التونیہ حکومت میں حسب منشا حصہ نہ ملنے کی وجہ سے وزیر سے ناراض ہوگیا۔ اُس نے رضیہ کو قید سے رہا کر کے اُس کے ساتھ نکاح کر لیا اور اِس بہانہ سے تخت دہلی کو دوبارہ حاصل

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۵۳۔ رضیہ کو بدنام کرنے کی ناکام کوشش کی ہے ورنہ حقیقت صرف اتنی ہے کہ ترکی اُمرا کی ایک بڑی جماعت جس میں ملک عز الدین کبیر خاں، ملک عز الدین محمد سالاری، ملک التونیہ وغیرہ شروع ہی سے رضیہ کے مخالف تھے ان میں سے ہر امیر اپنے کو زائد سے زائد مراعات کا مستحق سمجھتا تھا اس لئے وہ ایک اجنبی امیر جمال الدین یاقوت حبشی کی اس قربت کو جو اس کو رضیہ سے تھی کیونکر برداشت کر سکتے تھے۔ رضیہ سے مخالفت کی دوسری وجہ یہ تھی کہ وہ مردوں کی طرح کھلا خزانہ ہاتھی پر سوار ہوتی تھی اور دربار میں آکر اُمور سلطنت کو انجام دیتی تھی۔ اس بے پردگی کو ترکی امیر برداشت نہیں کر سکتے تھے اِس کے علاوہ ایک عورت کی ماتحتی ترکی سرشت کے مخالف تھی اگر رضیہ و یاقوت کے درمیان کوئی دوسری بات ہوتی تو اس کو صاحب طبقات ناصری ضرور تحریر کرتا کیونکہ اُس نے رضیہ کے ایّام حکومت کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور اس کے علاوہ وہ رضیہ کا مخالف بھی تھا لیکن وہ اِس معاملہ میں خاموش ہے (ملاحظہ ہو طبقات ناصری صفحہ ۱۸۸)

اِس کے علاوہ حضرت امیر خسرو رضیہ کی پاکبازی کی شہادت دیتے ہیں ؎

رضیہ دخترے مرضیہ سیرت — مہر برآراست از رای اسیریرت

سہ سالے کش بتوی بر تخت بنشست — کسے بر حرف او ننہاد انگشت

ملاحظہ ہو مثنوی دولرانی خضر خانی قلمی در کتب خانہ حبیب گنج علی گڑھ سے ڈاکٹر حبیب اللہ نے اپنی تالیف میں یہ وجہ بیان کی ہے کہ چونکہ رضیہ نے اُمراء کی طاقت کو توڑنے کی کوشش کی تھی اسلئے اُمراء اس کے خلاف ہو گئے۔ (Vide Foundation of the Muslim Rule in India P. 113).

کرنے کے لئے رضیہ کو لیکر روانہ ہوگیا۔اس اثناء میں بادشاہ اختیار الدین کو قتل کرا چکا تھا لیکن التونیہ کا مقصد چونکہ کچھ اور تھا اس لئے مجبوراً بادشاہ نے مقابلہ پر فوج بھیجی۔ ۲۴ اکتوبر ۱۲۴۰ء کو کیتھل کے مقام پر لڑائی ہوئی۔ التونیہ اور رضیہ کو شکست ہوئی۔دونوں بھاگے لیکن ہندوؤں نے گرفتار کر کے قتل کر دیا۔مؤلف طبقات ناصری کے الفاظ یہ ہیں:

"رضیہ والتونیہ بدست ہندوان گرفتار شدند وہر دو شہید گشتند وہزیمت ایشان ۲۴ ربیع الاول ۶۳۸ھ بود وشہادت سلطان رضیہ روز سہ شنبہ ۲۵ ربیع الآخر ۶۳۸ھ بود"

اس کے بموجب لڑائی کے ایک ماہ بعد سلطانہ کی شہادت وقوع پذیر ہوئی۔شہادت کے متعلق ابن بطوطہ کی ایک روایت یہ ہے کہ "رضیہ راستہ میں سو گئی کسی کسان نے اس کی پوشاک تلے زری اور موتی ٹکی انگیا دیکھ لی رجانا کہ عورت ہے مار کر کپڑے اتار لئے اور لاش زمین میں گاڑ دی پتہ چلنے پر اس کی لاش دلی سے چند میل کے فاصلہ پر جمنا کے کنارے دفن کی گئی۔ وہاں زائروں کا ہجوم رہتا تھا۔

اسماعیلیوں کا دہلی میں فساد

پچھلے صفحات میں یہ بتایا جا چکا ہے کہ ۶۲۵ھ میں شمس الدین التمش نے سندھ کا پورا علاقہ ناصر الدین قباچہ سے چھین لیا تھا اور اس پر اپنے حاکم مقرر کر دئے تھے۔ناصر الدین سے پہلے یہاں کے مالک سومری تھے جو مذہباً اسمٰعیلی شیعہ تھے جن کو محمد غوری نے ملتان و سندھ سے بیدخل کر دیا تھا۔ انھوں نے جب دیکھا کہ ان کا پایۂ تخت ٹھٹھہ ان سے چھن گیا اور سمندر تک غیروں کا قبضہ ہوگیا تو مجبوراً جنوب مشرق کی طرف ہٹ آئے اور یہاں ایک نیا مرکز[1] قائم کر کے اور محمد تور نامی سومرہ کو اپنا سردار بنا کر حکومت شروع کر دی۔

---

[1]:۔ اسمٰعیلیوں کو ایک مرکز پر رہنا بہت محبوب ہے۔ اُن کا جب ایک مرکز تباہ ہوتا ہے تو فوراً دوسرا مرکز تیار کر لیتے ہیں جیسا کہ مصر، یمن، گجرات، خراسان میں بارہا ہوا۔سندھ میں بھی ایسا ہی ہوا۔ان کا نیا مرکز محمد طور میں تھا جس کو محمد تور سومرہ نے آباد کیا۔ اس کو سندھی زبان میں "مہاتم تور" کہتے

(باقی مضمون صفحہ ۲۵۶ پر)

پاس نئے مرکز سے انھوں نے نورالدین ترک نامی ایک داعی کو دہلی بھیج کر انقلاب پیدا کرنے کی آخری کوشش کی جس طرح انھوں نے کبھی ملتان و منصورہ پر سازش کے ذریعہ قبضہ کر کے اپنی حکومت کی بنیاد ڈالی تھی۔ اسی طرح انھوں نے اب دہلی میں اپنی قدیم روش کا اعادہ کرنا چاہا۔ اسمٰعیلیوں نے یہ سمجھ کر کہ دہلی کے تخت پر ایک عورت قابض ہے اور ملک میں خانہ جنگی برپا ہے غالباً انقلاب آسانی سے ہو جائے گا۔ چنانچہ نورالدین نے ایک جماعت فراہم کر کے ۱۸ رجب یوم جمعہ ۶۳۴ھ مطابق ۵ مارچ ۱۲۳۷ء کو ایک ہزار کی تعداد میں مسلح ہو کر جامع مسجد پر حملہ کیا جہاں شہر کے سب چیدہ چیدہ مسلمان نماز جمعہ کو واسطے جمع تھے۔ اس وقت مسلمان خاموشی کے ساتھ خطبہ سن رہے تھے کہ اچانک ان لوگوں نے اندر گھس کر قتل عام شروع کر دیا۔ بہت سے مسلمان شہید ہو گئے۔ شہر والوں نے جب شور و غوغا سنا تو کئی امرا شہر مثلاً امیر امام ناصر شاعر اور نصیر الدین ایتم وغیرہ مسلح ہو کر اپنے سپاہیوں کے ساتھ موقع پر پہونچ گئے۔ اب ایک طرف سے مسلح سپاہیوں نے اور دوسری طرف سے عام مسلمانوں نے ان کی پتھروں اور اینٹوں سے تواضع شروع کر دی یہاں تک کہ ان کا ایک ایک شخص اس فتنہ میں مارا گیا اور امن قایم ہو گیا۔ نورالدین ترک کے ہمراہی زیادہ تر سندھی اور گجراتی تھے کچھ گنگا اور جمنا کے دوآبہ کے باشندے بھی تھے لیکن یہ سب اپنے مقصد میں ناکامیاب رہے[۱]۔

(۷) سلطان معز الدین بہرام شاہ بن التتمش
۲۱ اکتوبر ۱۲۴۰ء تا ۱۰ مئی ۱۲۴۲ء

سلطان بہرام شاہ نے اپنے مراسم تخت نشینی ۲۷ رمضان ۶۳۸ھ مطابق ۳۰ مارچ ۱۲۴۱ء

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۵۵ سے ہیں۔ اس کی جگہ پر آج کل "لگر پار کر" نامی گانوں آباد ہے۔ (موٴلف)

(۱)۔ طبقات ناصری صفحہ ۱۸۹، تاریخ سندھ صفحہ ۳ از سید ابو ظفر صاحب۔ فرشتہ نے اس شورش کا ذکر التتمش کے دور حکومت میں کیا ہے جو صاحب طبقات ناصری کی روایت کے مقابل صحیح نہیں مانا جا سکتا۔ (موٴلف)

کو ادا کئے۔ عہد رکن الدین و رضیہ میں جو اختلافات اُمرائے سلطنت کے درمیان پیدا ہو گئے تھے انھیں بہرام شاہ بھی دور نہ کر سکا۔ اُمراء کی آپس کی نا اتفاقی سے حکومت کو بڑے نقصانات اُٹھانا پڑے کیونکہ اس سے مغلوں کو ہندوستان پر حملہ آور ہونے کی جرأت ہوئی اور سلاطین دہلی کی فاتحانہ رفتار کم و بیش پچاس سال کے لئے مدھم پڑ گئی۔ تخت نشینی کے بعد ہی اُمرائے سلطنت میں سازشیں شروع ہو گئیں۔ سب سے پہلے بہرام شاہ کے وزیر سنقار نے اس کو قتل کرنے کی سازش کی لیکن سلطان کو بر وقت اطلاع ہو گئی۔ سنقار گرفتار کر لیا گیا پھر اُمراء چہلگان کی سفارش سے اُس کو بدایوں کا گورنر بنا کر دہلی سے باہر بھیج دیا۔ وہ وہاں سے بادشاہ کی اجازت کے بغیر دہلی کی طرف آیا اس پر بادشاہ نے اُس کو قتل کرا دیا۔ یہ بات اُمراء چہلگان کو بُری معلوم ہوئی۔

اُمراء چہلگان (شمسی) کی بد دلی کا ایک سبب قاضی شمس الدین کا قتل ہے۔ یہ ایک نامور فقیہ تھا جس کی لوگ بڑی عزت کرتے تھے۔ بہرام شاہ نے ایوب نامی ایک درویش کے کہنے سے اس کو قتل کرا دیا جس سے شہر میں سخت برہمی پیدا ہو گئی۔ اِدھر بادشاہ کے نئے وزیر خواجہ مہذب الدین نے جو بادشاہ کا دشمن ہو گیا تھا موقع سے فائدہ اُٹھایا اور اُن سرداران لشکر کو جو مغلوں کے دفعیہ کے لئے لاہور کی طرف بڑھ رہے تھے بدگمان کر دیا۔ یہ بدگمانی اس قدر بڑھی کہ سرداران لشکر نے دہلی واپس آ کر شاہی قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ بادشاہ نے قاضی منہاج الدین مصنف طبقات ناصری کو جس کو اُس نے حال ہی میں دہلی کا قاضی القضاۃ بنایا تھا باغیوں کو سمجھانے کے لئے بھیجا مگر وہ باز نہ آئے بالآخر ۳½ ماہ کے محاصرہ کے بعد بہرام شاہ کو گرفتار کر لیا گیا اور پانچ دن کے بعد ۵ (مئی ۱۲۴۲ء) کو قتل کر دیا۔

مغلوں کا حملہ اور لاہور کی تباہی ۱۲۴۱ء

چنگیز خاں (المتوفی رمضان ۶۲۴ھ / ۱۲۲۷ء)

کے زمانہ ہی سے مغلوں کا ہندوستان پر دانت تھا انھیں لڑائی چھیڑنے کے لئے بہت سے حیلے مل سکتے تھے کیونکہ شمس الدین کے زمانہ سے سلطنت دہلی خراسان وسیستان اور مکران وغزنی کے اُن امیرزادوں کا مامن بن گئی تھی جو کسی طرح چنگیز خانی سیلاب سے بچ کر ہندوستان چلے آئے تھے۔ اس کے علاوہ چونکہ افغانستان پر اُن کا پورا تسلط تھا اس لئے سندھ وپنجاب ہروقت اُن کی زد میں تھے اِدھر اُمراء ہند کی نااتفاقی نے مغلوں کو ہندوستان پر حملہ آور ہونے کی جرأت دلائی۔ بہر کیف ۶۳۹ھ ۱۲۴۱ء میں غور و ہرات کے مغل سرداروں نے ایک بڑی فوج مرتّب کی اور طائر نامی سپہ سالار کے ماتحت دریائے سندھ کو عبور کرکے ملتان کی طرف پیش قدمی کی۔ ملتان سرحد کا سب سے بڑا جنگی مرکز اور آباد شہر تھا۔ یہاں کا عامل کبیر خاں ایاز تھا جو حکومت دہلی سے ناراض تھا اور اپنی خود مختاری کا اعلان کرچکا تھا۔ مغلوں نے اُس کی جنگی تیاریوں کا حال سُن کر اپنا رُخ لاہور کی طرف پھیر دیا اس طرح سلطنت ہند سے مغلوں کی پہلی لڑائی جہلم کے بجائے راوی کے کناروں پر واقع ہوئی۔

لاہور اُن دنوں نہایت بارونق تجارتی شہر تھا لیکن ملتان وسندھ کے الحاق کے بعد اس کی جنگی اہمیت کم ہوگئی تھی اس لئے مغلوں کے اِس اچانک حملے کے وقت قلعہ میں جنگی اسلحہ اور سازوسامان اِس قدر کافی نہ تھا کہ حملہ آوروں کا جم کر مقابلہ کیا جاسکے۔ اِس کے علاوہ سب سے بڑی خرابی یہ ہوئی کہ شہر کے بہت سے ذی اثر باشندوں نے مدافعت میں حصّہ لینے سے انکار کردیا[۱]۔ یہ رنگ دیکھ کر چند روز ہی کی لڑائی میں لاہور

---

[۱]:۔ انکار کی وجہ یہ تھی کہ یہاں کے سوداگروں کو وسط ایشیاء کے ممالک سے تجارت کرنے کے لئے مغلوں سے اجازت لینا پڑتی تھی۔ اِس سلسلے میں انھیں مغل حکام سے وہ تحریری سندیں مل گئیں تھیں جن میں حفظِ جان ومال کا وعدہ درج تھا۔ اس قسم کی تحریریں ترکی اصطلاح میں "پائزہ" کہلاتی تھیں۔ (طبقات ناصری ص ۶۵۵ از راورٹی)

کے عامل ملک قراقش کو شہر کی مدافعت سے ناامیدی ہوگئی۔ دہلی ایک طرف بھٹنڈہ یا سامانہ کی جنگی چھاونیوں سے بھی کوئی فوجی مدد وقت پر نہ پہونچ سکی اور ادھر مغلوں کی منجنیقوں[1] نے پیہم سنگ باری کرکے قلعہ کی فصیلوں میں رخنے ڈال دئے اور وہ ان میں داخل ہوکر شہر کے اندر تک آنے لگے۔ آخر ایک رات عاملِ لاہور یعنی ملک قراقش اپنے ملازمین کے ساتھ شہر سے باہر آیا اور دشمنوں کا حصار توڑ کر نہایت بہادری کے ساتھ لڑتا بھڑتا دہلی کی طرف چلا گیا۔ اُس کی جرأت یقیناً قابلِ تعریف تھی لیکن اِدھر تو اِس واقعے نے محصورین کو شکستہ دل کر دیا اور اُدھر محاصرین کے حملوں میں زیادہ شدت آگئی۔ اِس نازک موقع پر اسلامی فوج کے دو گروہوں نے مدافعت کا بیڑہ اُٹھایا اور کوتوال شہر (آق سنقر) اور امیر آخور (دین دار محمدؐ) کی ماتحتی میں اُس وقت تک برابر لڑتے رہے جب تک کہ ان میں کا ایک متنفس زندہ رہا۔ اس کے بعد مغلوں نے شہر میں گھس کر نہ سوداگروں کے پائزوں کی پرواکی اور نہ عورتوں بچّوں کے آہ وزاری کی بلکہ قتلِ عام کر دیا اور شہر کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔

لاہور کی مصیبت کی اطلاع جب دہلی پہونچی تو تھوڑی دیر کے لئے اُمراء آپس کے اختلافات بھول گئے۔ قصر ابیض میں ایک عام جلسہ ہوا جس میں قاضی منہاج الدین[2] مؤلف

ع۱۔ تیر اندازی کی طرح اس فن میں بھی مغلوں کو کمال حاصل تھا قلعہ شکن توپ کی اِس پیش روینی منجنیق کی اہمیت کو وہ بخوبی سمجھتے تھے۔ چنگیز خاں کے لشکر میں دس ہزار سپاہی صرف منجنیق چلانے پر مقرر تھے (مؤلف)

ع۲۔ ہندوستان آنے سے پہلے خراسان وہرات کے علاقوں میں چنگیزی طوفان کی تباہ کاریاں منہاج الدین سراج نے اپنی آنکھوں سے دیکھی تھیں بلکہ بعض لڑائیوں میں وہ شریک بھی رہ چکا تھا لہٰذا اِس جلسہ میں تقریر کرنے کے لئے اُسی کو منتخب کیا گیا۔ (مؤلف)

طبقات ناصری نے نہایت معرکہ آرا تقریر کی۔ جوش کے عالم میں لوگوں نے ازسرِنو بادشاہ کی اطاعت کا حلف اُٹھایا اور مغلوں کے مقابلہ کے لئے بہت جلد ایک بڑا لشکر فراہم ہوگیا۔ لیکن امدادی افواج ابھی دریائے بیاس کے کنارے قصبۂ سلطان پور تک پہونچ پائی تھیں کہ مغلوں نے ۲۲ر دسمبر ۱۲۴۱ء کو لاہور تباہ و برباد کر کے غزنی کا راستہ لیا۔ ان میں اب اتنا دم خم باقی نہیں رہا تھا کہ مسلمانوں کی تازہ دم امدادی افواج کا مقابلہ کرتے کیونکہ طبقات ناصری[ع۱] کی روایت کے بموجب مجاہدین کی وجہ سے اُن کا کوئی سپاہی ایسا نہ تھا جو بالکل زخمی نہ ہوا ہو۔ ان کے تیس چالیس ہزار سپاہی مارے گئے اور اُن کا سردار بھی کام آچکا تھا۔

مغل گو لاہور سے آگے نہ بڑھ سکے لیکن اسی ایک حملے نے تمام شمالی ہند کو چونکا دیا۔ سلاطین دہلی کے منصوبۂ کشور کشائی پر اتنا اثر پڑا کہ آئندہ نصف صدی تک اُنھیں اپنی حدود حکومت کو جنوب میں نربدا سے آگے بڑھانے کی جرأت یا فرصت نہ ہوئی اور اس طرح تمام برّاعظم ہندوستان کا ایک مرکزی حکومت کے ماتحت سیاسی اتحاد بہت دنوں کے لئے ملتوی ہوگیا۔ تسخیر لاہور کا ایک اور اہم نتیجہ یہ ہوا کہ مغلوں کو پنجاب کی ملکیت کا دعویٰ پیدا ہوگیا اور وہ بار بار اس ملک پر حملے کرتے رہے جن کا ذکر اپنی جگہ پر کیا جائے گا۔ امیر تیمور کے حملے نے اس حق کی تجدید و توثیق کی اور اسی کو بابر نے اپنے حملہ کا حیلہ بنایا اور آخر کار ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کی بنیاد رکھ دی۔ گویا ساتویں صدی ہجری میں طائر مغل کو جو آرزو لاہور لائی تھی وہ دسویں صدی ہجری میں پوری ہوگئی۔

(۷) سلطان علاء الدین مسعود بن رکن الدین فیروز شاہ
۱۰ مئی ۱۲۴۲ء تا ۱۰ جون ۱۲۴۶ء

بہرام شاہ کی معزولی میں اعز الدین بلبن جو تاریخ میں کشلو خاں کے نام سے مشہور ہے پیش پیش تھا۔ پہلے اسی کی بادشاہی کا اعلان ہوگیا تھا لیکن باقی اُمراء نے شمس الدین کے مقبرہ میں جمع ہو کر فیصلہ کیا کہ جہاں تک ممکن

ع۱: طبقات ناصری ص۳۹۳، ص۳۹۴

ہو بادشاہی اسی مرحوم سلطان کی اولاد میں رہنی چاہیئے۔ اس لئے علاء الدین مسعود کا انتخاب عمل میں آیا۔ کشلو خاں نے کثرت رائے کا احترام کیا اور سلطان مسعود کے ہاتھ پر بیعت کرلی۔ اس کی نیک نفسی اور اطاعت گزاری کی نئے بادشاہ نے بڑی قدر کی اور اجمیر، مانڈو و ناگور کے اقطاع کا اس کو حاکم بنا دیا۔ مسعود کے عہد حکومت کے دیگر واقعات حسب ذیل ہیں:-

(۱) بدایوں کے گورنر نے کٹھیر کے راجپوت باغیوں کی سختی کے ساتھ گوشمالی کی۔

(۲) بنگال میں بڑا خلفشار برپا تھا۔ بنگال کے امراء نے کڑا مانکپور پر حملہ کیا لیکن تیمور خاں قران حاکم اودھ نے قاضی منہاج الدین کو درمیان میں ڈال کر بنگالیوں کو بہت کچھ سمجھایا بجھایا اس پر وہ مع اپنے سردار طغرل کے واپس لوٹ گئے۔ ۱۲۴۴ء میں طغرل نے جے پور واقعہ کٹک جس کو جاج نگر بھی کہتے ہیں حملہ کیا۔ یہ حملہ وہاں کے راجہ کو سزا دینے کی غرض سے کیا گیا تھا۔ کیونکہ اس نے ۱۲۴۳ء میں جنوبی بنگال کے چند اضلاع کو لوٹ لیا تھا۔ راجہ نے بڑی بہادری سے مقابلہ کیا۔ طغرل کو شکست ہوئی۔ راجہ نے طغرل کا لکھنوتی تک تعاقب کیا۔

(۳) صوبہ دار بنگال پر دوسری مصیبت یہ نازل ہوئی کہ مارچ ۱۲۴۵ء میں مغلوں نے براہ تبت دریائے برہم پتر کو عبور کر کے بنگال پر تاخت کی اور اس کے ایک حصہ کو تاراج کر ڈالا۔ یہ سن کر بادشاہ نے تیمور خاں قران کو ایک زبردست فوج دے کر اس کی مدد کو بھیجا۔ تیمور خاں نے ۳۰ اپریل ۱۲۴۵ء کو بنگال میں پہونچ کر مغلوں کو شکست دیکر بھگا دیا۔ اس کے بعد اس نے طغرل سے مطالبہ کیا کہ لکھنوتی اس کے سپرد کردے۔ طغرل نے انکار کیا اس پر لڑائی ہوئی لیکن قاضی منہاج الدین نے دونوں کے درمیان پڑ کر صلح کرادی۔ لکھنوتی پر تیمور خاں قران کا قبضہ ہوگیا۔ طغرل کو معہ مال و اسباب دہلی جانے کی اجازت مل گئی۔ دہلی میں اس کا خیر مقدم کیا گیا اور تیمور خاں کی جگہ اودھ کی گورنری پر اس کا تقرر

ہو گیا جہاں وہ بحیثیت گورنر ۹ مارچ ۱۲۴۷ء کو انتقال کر گیا۔

(۴) نومبر ۱۲۴۵ء میں مغلوں نے منکوخاں کی سرکردگی میں ملتان پر حملہ کیا۔ مغلوں کا ہندوستان پر شمال کی طرف سے یہ دوسرا حملہ تھا اس مرتبہ وہ سیستان سے آئے اور افغانستان کے جنوب سے نکل کر سیدھے سندھ میں داخل ہو گئے تھے۔ کبیر خاں ایاز کی وفات (۶۳۹ھ/۱۲۴۱ء) کے بعد یہاں کا حاکم حسن قرلغ[1] تھا۔ مغلوں نے ملتان سے حسن قرلغ کو نکال کر اُچھ کا محاصرہ کیا۔ اِس مرتبہ دہلی کا بادشاہ مقابلہ کے لئے تیار تھا کیونکہ اُس نے تخت نشین ہو کر فوج کی ازسرِنو تنظیم کی تھی اور اُس کے حکم سے نئے حاجب غیاث الدین بلبن نے جس کو الغ خاں بھی کہتے ہیں پہلی مرتبہ وہ لشکر جرار تیار کیا تھا جس کی مستعدی و قواعد دانی کچھ عرصہ بعد دور دور کے ملکوں میں مشہور ہو گئی۔ چنانچہ دہلی کی فوج جب اُچھ کے قریب پہونچی اور اُس نے چاہا کہ شمال کی طرف سے بڑھ کر مغلوں کو گھیرے میں لے لے تو مغل سپہ سالار منکوخاں جو چنگیز خاں کے خاص رفیقوں میں سے تھا اِس چال کو سمجھ گیا اور بروقت اپنی فوج کو مرعوب ہو کر ہٹا لے گیا۔ دہلی کی امدادی فوجوں کے قریب پہونچنے سے پہلے شہر اوچھ کی مدافعت محمد[2] صالح کوتوال نے بڑی جوانمردی سے کی اور کئی ہفتے مغلوں کو لڑائی میں اُلجھائے رکھا۔

مغلوں کے مقابلہ میں بادشاہ کو یہ کامیابی راس نہیں آئی کیونکہ صعوبات سفر کی تلافی اُس نے عیش و عشرت کے ایسے مشاغل سے کرنا چاہی جو اکثر انسان کی عقل و اخلاق کو بگاڑ دیتے ہیں۔ عیاش بادشاہ عام طور پر بد مزاج، شکی اور ظالم ہو جایا کرتے ہیں مسعود نے بھی بعض فرومایہ مصاحبوں کی شہ سے احمقانہ حرکات شروع کیں۔

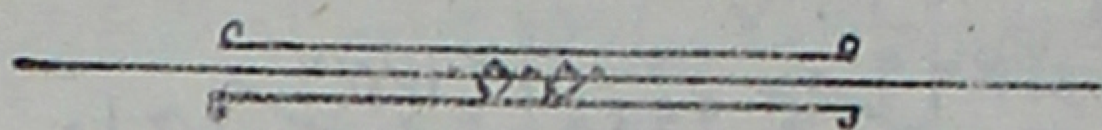
---

[1] ۱:۔ قرلغ ترک افغانستان پر قابض تھے یہاں سے جب انھیں مغلوں نے خارج کیا تو سندھ میں آئے اور موقع لگتے ہی ملتان کے حاکم بن بیٹھے۔ (مؤلف)

[2] ۲:۔ اُوچھ کے گورنر تاج الدین ابوبکر بن ملک کبیر خاں ایاز کا انتقال ہو چکا تھا اور اس کی

(باقی صفحہ ۲۶۳ پر)

اُمراء کو بلاوجہ گرفتار یا قتل کرنا اُس کی عادت میں داخل ہو گیا اس کے علاوہ بیہودہ مشاغل اور شکار کی طرف اِس درجہ میلان ہوا کہ ملکی کاروبار میں ابتری اور سلطنت میں خرابی پیدا ہونے لگی یہاں تک کہ امیروں نے بالاتفاق اُسے معزول و محبوس کر کے خاندان شمسی کے ایک اور شہزادے ناصر الدین محمود کو بادشاہی کے لئے منتخب کر لیا۔ مسعود کی مدت حکومت ۴ سال ایک ماہ ہے۔



بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۶۲ = جگہ اُس کے باپ کا ایک غلام خواجہ مخلص الدین وہاں کا حاکم تھا۔ (طبقات ناصری صفحہ ۱۹۸ از راورٹی) جو غالباً اپنے مستقر پر موجود نہ تھا اس لئے مدافعت کے فرائض کوتوال شہر کو انجام دینا پڑے۔ (مؤلف)

باب پنجم ۔ استحکام سلطنت

فصل اوّل (۸) سلطان ناصرالدین محمود بن التمش

۱۰ ؍ جون ۱۲۴۶ء تا ۱۸ ؍ فروری ۱۲۶۶ء

تخت نشینی سلطان مسعود نے تخت نشین ہو کر پہلا کام یہ کیا تھا کہ اپنے دونوں چچاؤں کو قید خانہ سے نکال کر جلال الدین کو قنوج کا اور ناصرالدین کو بہرائچ کا حاکم بنا دیا تھا۔ ناصرالدین محمود کو جس وقت تخت حکومت پیش کیا گیا تو وہ بہرائچ کا حاکم تھا۔ ناصرالدین محمود طبعاً نہایت مرنجان و مرنج اور متقی و پرہیز گار بادشاہ تھا۔ اس کی شرافت و فیاضی اور عدل و رعایا پروری میں کسی کو کلام نہیں۔ اُس کے ایثار و کسر نفسی نے ہر شخص کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا اُس کی ہر دلعزیزی کی بدولت اُس کی تخت نشینی کی رسم بڑے تزک و احتشام کے ساتھ ۲۳ محرم ۶۴۴ھ کو دہلی میں منائی گئی۔ سلطان کی خدمت میں منہاج سراج نے ۲۸ اشعار پر مشتمل ایک قصیدہ پیش کیا جس کا پہلا شعر یہ ہے۔ [۱]

آں شہنشاہے کہ حاتم بذل و رستم کوشش ست ناصرِ دنیا و دیں محمود بن التمش است

خوش قسمتی سے اُس کو وزیر نہایت ہوشمند، مدبر اور یکتائے روزگار ملا اس لئے اُس کے عہد حکومت کی تاریخ محض اس کے وزیر الغ خاں (غیاث الدین بلبن) کے کارناموں کی سرگذشت ہے اور اِسی لئے الغ خاں کی وفاداری اور اپنی ماتحتی پر قناعت زیادہ ستائش کی مستحق ہے۔ بلبن کا طرز عمل خواہ مصلحت اندیشی پر مبنی ہو یا فرض شناسی پر

---

[۱] :- پورے قصیدہ کے لئے ملاحظہ ہو طبقات ناصری صہ ۲۰۲ تا صہ ۲۰۵ ۔

اس میں کلام نہیں کہ اس سے بلبن کی نیکنامی میں چار چاند لگ گئے۔ وہ رشتے میں ناصرالدین کا خسر تھا۔

حکومت کی مشکلات

اُس کے سامنے اس وقت دو مرحلے درپیش تھے ایک تو ملک کو مغلوں کے حملوں سے بچانا اور دوسرے اندرون ملک امن و امان قائم رکھنا۔ ملک کے اندرونی امن کو تباہ کرنے والے دراصل دو گروہ تھے ایک اُمرا چہلگان کی جماعت دوسرے شورش پسند ہندو رؤسا واُمراء۔ اس لئے بادشاہ اور اُس کے وزیر کی مشکلات کو سمجھنے کے لئے ان چالیس غلاموں اور ہندو سرداروں کی حیثیت کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے۔ اور وہ یوں ہے کہ محمد غوری اور اُس کے جانشینوں نے ملک پر فوجی قبضہ تو کرلیا تھا لیکن اُن کے پاس اتنے تربیت یافتہ افسر اور سپاہی نہ تھے کہ وہ مفتوحہ علاقوں کا انتظام براہ راست اپنے ہاتھ میں لے لیتے لہٰذا انھوں نے ملک کو کئی حصوں میں تقسیم کرکے اُن قلعوں اور گڑھیوں پر جہاں سے پورے صوبہ کی نگرانی ہوسکتی تھی خاص اپنے معتبر آدمی متعین کردئے۔ ان افسروں کے ساتھ ایک مستقل فوج رہتی تھی ان کا کام مال گذاری کا وصول کرنا تھا۔ ہندوؤں کا پُرانا دیہاتی اور پنچائتی نظام بدستور باقی رکھا گیا اسی طرح ہندو رئیسوں اور راجاؤں کی مملکت کا نظم ونسق انھیں کے ہاتھ میں چھوڑ دیا گیا۔ اس طرح رعایا اور بادشاہ کے درمیان مسلمان افسروں اور ہندو اُمراء کی جماعت حائل تھی۔

التتمش کے چالیس خرید کردہ غلاموں نے ایک جماعت "خوانین شمسی" کے نام سے بنالی تھی جن کو اُمرائے چہلگان بھی کہتے ہیں۔ بلبن بھی انھیں میں سے ایک تھا ان کی سازشوں کا حال پچھلے صفحات میں بتایا جاچکا ہے۔ انھیں بلبن کی ترقی ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی ان کی بغاوتوں اور ریشہ دوانیوں سے بہت شورش پھیل گئی۔

ہندو رؤسا نے بھی بدنظمی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے خود مختار بننے کی کوششیں کیں۔
ان سب کو گردوپیش کے حالات سے بھی مدد ملی۔ اُس زمانہ میں جنگلات کثرت سے تھے
جن میں چھپ کر مختلف صوبوں کو راستے جاتے تھے لہٰذا بادشاہ سے سرکشی کر بیٹھنا اور راستہ
میں شاہی فوجوں کو روک لینا نہایت آسان تھا۔ یہ آسانی اسلئے اور بھی تھی کہ جن
ہتھیاروں سے شاہی فوجیں مسلح ہوتی تھیں وہی ہتھیار عوام الناس کے پاس بھی
ہوتے تھے۔ غرضکہ اندرونی ہنگامہ آرائی سے مغلوں کے حوصلے اور بھی بڑھ گئے۔
اور انھوں نے بار بار شمالی و مغربی سرحد پر تاخت شروع کردی۔ آئندہ سطور میں
مغلوں کی روک تھام اور اندرونِ ملک امن کے قیام کے لئے جو کچھ کیا گیا
مذکور ہوگا:۔

باغیوں کے خلاف مہمات

(۱) ۱۲ نومبر سنہ ۱۲۴۶ء کو بادشاہ بلبن کو ساتھ لیکر پنجاب کے باغیوں کو مطیع کرنے کے لئے
نکلا۔ سنہ ۱۲۴۱ء میں جب مغلوں نے لاہور کو تاراج کیا تو گھکروں و نیز دیگر پہاڑی قوموں
نے مغلوں کی ہر طرح سے مدد کی تھی۔ دہلی میں طوائف الملوکی کی وجہ سے ان باغیوں کی
اب تک تادیب نہیں کی جاسکی تھی۔ ناصر الدین نے خود بمقام سوہدرہ کنار راوی قیام
کیا اور بلبن کو فوج دیکر آگے بڑھایا۔ بلبن نے گھکروں نیز کوہ نمک کے علاقے کے
راجہ جیپال کی سرکوبی کی۔ وہ جہلم کے کنارے تک سب کو مطیع و منقاد بنا کر بادشاہ کی خدمت
میں حاضر ہو گیا جو اُس وقت دریائے چناب کے کنارے خیمہ زن تھا۔ واپسی میں عید الضحیٰ
کی نماز جالندھر میں پڑھی اور محرم سنہ ۶۴۵ھ مطابق جون سنہ ۱۲۴۷ء میں دہلی واپس لوٹ
آیا۔ چار مہینے دہلی میں قیام کرنے کے بعد پھر باغیوں کی تادیب کے لئے نکلا۔

(۲) دہلی سے پہلے پانی پت آیا پھر یہیں سے دوآبہ [illegible] کی بغاوت کا حال سن کر بلبن بڑا قنوج کے
قریب ایک قلعہ میں باغیوں نے محصور ہو کر [illegible] آخر کار مغلوب ہو گئے فروری سنہ ۱۲۴۸ء تک

بلبن معہ بادشاہ باغیوں سے دوآبہ کو پاک و صاف کرتا ہوا کڑا مانکپور پہونچا۔ اس طرف ایک ہندو راجہ
دلکی ملکی کو مطیع بنایا جو باغی ہو گیا تھا۔ غرضکہ دوآبہ کی اس مہم سے فراغت پاکر ۸ اپریل ۱۲۴۸ء تک
تمام شاہی فوجیں دہلی واپس آگئیں۔ واپسی میں قنوج کے مقام پر بادشاہ کے بھائی جلال الدین
نے جو کہ اس وقت بدایوں کا گورنر تھا حاضری دیکر ازراہ حسد بلبن کی شکایت کی کہ وہ خود مختار
ہونا چاہتا ہے۔ اس پر بادشاہ نے کچھ توجہ نہ کی اس لئے جلال الدین اس خیال سے کہ جب
بلبن کو اس کا پتہ چلے گا تو وہ اس سے بدلہ لے گا ڈر کر مغلوں کے پاس ترکستان چلا گیا۔

(۳) ۱۲۴۹ء کے شروع میں بادشاہ نے بلبن کو فوج دیکر میواتیوں کے فتنہ کو فرو کرنے
کے لئے بھیجا۔ اس نے میوات[۱] سے آگے بڑھ کر مارچ ۱۲۴۹ء میں رن تھمبور کی بغاوت کو بھی دبا
دیا۔ دہلی واپس آنے پر بادشاہ نے بلبن کو وزیر اعظم اور اس کے بھائی سیف الدین ایبک
عرف کشلی خاں کو اس کی جگہ امیر حاجب (چیف سکرٹری) بنایا۔ بلبن کا یہ عروج امراء
چہلگان کو بہت برا لگا۔

(۴) جنوری ۱۲۵۰ء میں بادشاہ دوآبہ اور کٹھیر کے باغیوں کو سزا دینے کے لئے پھر دہلی سے

ع۱۔ دہلی کے جنوب کا وہ علاقہ جس میں قدیم زمانہ سے میو قوم آباد ہے میوات کہلاتا ہے۔ اس علاقہ میں اس وقت
گوڑگانوں کا ضلع، الور اور بھرت پور کی راجپوت ریاستیں اور صوبجات متحدہ آگرہ و اودھ کے ایک ضلع
متھرا کا کچھ علاقہ شامل ہے۔ تمام علاقوں کی طرح میوات کے جغرافیائی حدود بھی اکثر بدلتے رہے ہیں قدیم اور
اصلی میوات کا رقبہ موجودہ علاقہ سے ضرور کچھ مختلف تھا۔ ایک انگریز مصنف مسٹر پی ڈبلیو پاؤلٹ
نے جو کسی زمانہ میں ریاست الور کا اسسٹنٹ آفیسر تھا قدیم میوات کی حدبندی اس طرح کی ہے۔
"قدیم علاقہ میوات اندازاً اس خط منحنی کے اندر واقع ہے جو شمالاً ڈیگ (واقع ریاست بھرتپور)
سے ریواڑی کے عرض البلد کے کسی قدر اوپر تک پھیلا ہوا ہے۔ غرباً ریواڑی سے نیچے طول البلد کے
اس نقطہ تک جو شہر الور سے چھ میل کے فاصلہ پر مغرب میں اور الور کے اندر بارہ چشمہ کے جنوب
میں واقع ہے۔ یہ خط پھر شرقاً گھوم کر ڈیگ سے مل جاتا ہے اور قریب قریب اس خطہ کی جنوبی سرحد بناتا ہے۔

نکلا اور مارچ ۱۲۵۰ء تک سب کو مطیع و مغلوب کرکے دہلی واپس پہونچا۔ اسی سال ناگور کے گورنر اعزالدین بلبن عرف کشلو خاں نے ملتان و اُچھ کے بارے میں درخواست کی کہ دونوں صوبے اُس کی جاگیر میں دیدئے جاویں۔ یہ دونوں صوبے اختیار الدین گریز کے قبضہ میں تھے جس نے کرلغ ترکوں کو وہاں سے نکال کر قبضہ کیا تھا۔ بادشاہ نے درخواست

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۶۷:- (الور گزیٹر ۱۹۰۸ء)

انگریز مورخین کا خیال ہو کہ میو آرین نسل کی بجائے ہندوستان کی قدیم غیر آرین نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ آئین اکبری میں انھیں جادو راجپوت بتایا گیا ہے جو مسلمان ہو کر میواتی کہلائے۔

تاریخ فیروز شاہی میں میوات کا سب سے پہلے نام شمس الدین التتمش کے تذکرہ میں آتا ہے۔ دہلی کی ترکی سلطنت کے ابتدائی دور میں میواتی بہت ہی تکلیف دہ عنصر بن گئے تھے۔ جن کی وجہ سے حکومت کو اُن کے خلاف سخت تادیبی کارروائیاں کرنا پڑیں۔ میو قوم نے اسلام کب اور کن اثرات کے تحت قبول کیا اس کے بارے میں تاریخیں خاموش ہیں۔

یہ ایک نہایت بہادر اور شریف النسل قوم ہے۔ اِس کے اندر جو نقائص اور اخلاقی کمزوریاں تھیں وہ اسی نوع کی تھیں جو جہالت، بے ترتیبی، متمدن دنیا سے بے تعلقی اور مذہب سے بے خبری کے باعث شریف اور بہادر قوموں میں پیدا ہو جایا کرتی ہیں۔ ماحول کی خرابی نے ان کے محاسن اور فطری صلاحیتوں کا رُخ بدل دیا تھا۔ قومی دلیری اور بے باکی نے لوٹ مار اور غارتگری کی شکل اختیار کرلی تھی۔ شجاعت اور فطری بہادری نے کوئی اور مناسب میدان نہ پاکر خانہ جنگی اور خون ریزی کو اپنا مظہر بنایا۔ فطری غیرت اور حمیت کا کوئی جائز استعمال نہ رہا تو حمیت جاہلیت اور نفسی عزت و ناموس اور خود تراشیدہ معیار شرافت کی حفاظت میں صرف ہوئی۔ عالی حوصلگی اور بلند ہمتی کا کوئی شایان شان مصرف نہ رہا تو برادری کی چھوٹے چھوٹے کاموں میں اس نے اپنے جوہر دکھائے۔ ذہانت اور چستی و چالاکی کو شریفانہ مواقع نہ ملے تو مجرمانہ وارداتوں میں اس نے ہاتھ کی صفائی اور ہنرمندی دکھائی۔ غرض محاسن اور فطری صلاحیتوں کا ماحول کی خرابی کی وجہ سے رُخ غلط تھا ورنہ قوم فطری جوہر سے محروم نہ تھی جیسا کہ جلد سوم

اس شرط پر منظور کی کہ وہ یعنی کشلو خاں اپنی سابقہ جاگیر ناگور وغیرہ بدلہ میں اختیار الدین کو دیدے۔ اس شرط کو کشلو خاں نے نہیں مانا اور زبردستی ملتان واچھ سے گریز کو نکال کر قبضہ کر لیا۔ ابھی قبضہ مکمل نہیں ہوتے پایا تھا کہ اس پر کریغ ترکوں نے حملہ کر دیا اس لئے اس کو مجبوراً ناگور واپس لوٹ آنا پڑا۔ چونکہ بھٹنڈا کے حاکم شیر خاں سنقار (بلبن کے چچا زاد بھائی) نے ملتان وغیرہ سے کریغ ترکوں کو خارج کر کے اپنا نائب اختیار الدین گریز کو مقرر کر دیا اس لئے بادشاہ نے خوش ہو کر دسمبر ۱۲۵۰ء میں ملتان کا صوبہ بھی شیر خاں کے سپرد کر دیا۔

(۵) ۱۲۵۱ء میں کشلو خاں کو سزا دینے کے لئے بادشاہ ناگور گیا۔ کشلو خاں ناگور سے بھاگ کر اچھ پہونچا جہاں سے شیر خاں نے اس کو گرفتار کر کے دہلی بھیج دیا۔ بادشاہ نے اس پر رحم کھا کر اس کی خطاؤں کو معاف کر دیا اور اس کے بعد بدایوں کا صوبیدار بنا دیا۔

(۶) گوالیار، چندیری اور مالوہ کے ہندوؤں نے پھر سرکشی کا اظہار کیا اس لئے ماہ شعبان ۶۴۹ھ مطابق اکتوبر ۱۲۵۱ء کو ناصر الدین نے چندیری کے راجہ چاہڈ آچاریہ پر حملہ کیا۔ راجہ نے دو لاکھ پیادے اور چار ہزار سوار فراہم کر کے بادشاہ کا مقابلہ کیا۔ راجہ ہار گیا اور گرفتار کر لیا گیا۔ اس کے بعد ناصر الدین مع الغ خاں ربیع الاول ۶۵۰ھ مطابق جون ۱۲۵۲ء میں دہلی واپس آ گیا۔

(۷) بلبن کی ترقی اکثر امراء چہلگان نیز خود محمود کی ماں کو گراں گذر رہی تھی۔ سب نے بلبن کے خلاف شکائتیں کرنا شروع کر دیں۔ محمود کا بھائی جلال الدین صرف بلبن ہی کی وجہ سے باغی ہو کر مغلوں کے پاس پناہ گزیں تھا۔ ادھر بادشاہ کے ایک منہ لگے نومسلم خواجہ سرا عماد الدین ریحانی نے بلبن کے خلاف بادشاہ کے کان بھرنا شروع کئے۔ آخر کار بادشاہ نے بدظن ہو کر بلبن کو عہدۂ وزارت سے معزول کر کے ۱۲۵۲ء کے

آخر میں ہانسی اور پھر ناگور کا گورنر مقرر کیا اور اُس کی جگہ قلمدان وزارت عماد الدین ریحانی کے سپرد کیا گیا۔ بادشاہ کا یہ طرز عمل بلبن کے بہی خواہوں کو بہت بُرا لگا انھوں نے بلبن کو مشورہ دیا کہ وہ بغاوت کر کے خود بادشاہ بن جائے لیکن اُس نے انتہائی ضبط و تحمل اور فرماں برداری کا ثبوت دیا یعنی یہ کہ بادشاہ کے احکامات کی بے چون وچرا تعمیل کی جو لائق صد ستائش ہے۔

(۸) ۱۲۵۳ء میں مغلوں نے ہندوستان پر چھاپہ مارا لیکن ملتان کے گورنر شیر خاں سنقار نے اُن کو شکست دیکر بھگا دیا اور غزنی تک اُن کا تعاقب جاری رکھا۔ مغلوں کے بار بار حملوں کو روکنے اور اُن کو ذلت آمیز شکستیں دینے کی وجہ سے شیر خاں کا شمار بہت بڑے آدمیوں میں ہے۔

(۹) ۱۲۵۴ء واقعات کے لحاظ سے بہت اہم ہے۔ اسی سال بلبن نے ناگور سے نکل کر بوندی اور رن تھمبور پر حملہ کیا اور راجپوت باغیوں کو شکست دی۔ ادھر بادشاہ نے کٹھیر کی بغاوت کو فرو کیا۔ وہ بروز پنجشنبہ ۱۳ ماہ محرم ۶۵۲ھ مطابق فروری ۱۲۵۴ء کو میاں پور کے گھاٹ پر دریائے گنگا کو عبور کر کے پہاڑ کے دامن میں سفر کرتا ہوا دریائے رام گنگا کے کنارے پہونچا پھر بذریعہ دریا سفر کر کے کٹھیریا کانٹھ[۱] کے مقام پر باغیوں سے صف آرا ہوا اور انھیں ۱۶ ماہ صفر ۶۵۲ھ کو شکست دی۔ ۱۹ ماہ صفر کو لشکر شاہی بدایوں پہونچا۔ یہاں ۹ روز قیام کرنے کے بعد براہ کول (علی گڑھ) ۲۶ ماہ ربیع الاوّل ۶۵۲ھ مطابق ماہ مئی ۱۲۵۴ء دہلی واپس پہونچ گیا۔

ماہ اکتوبر ۱۲۵۴ء میں بادشاہ کو معلوم ہوا کہ اُس کا بھائی جلال الدین اور بلبن کا چچازاد بھائی شیر خاں سنقار[۲] ترکستان سے مددگار فوجیں لیکر نواح لاہور تک آپہونچے ہیں۔ دہلی

۱: کانٹھ بہت پُرانا قصبہ ہے۔ یہ شہر شاہجہانپور سے ۸ میل جانب جنوب و مغرب واقع ہے۔

۲: شیر خاں سنقار بلبن کے برطرف ہونے اور عماد الدین ریحانی کے بیجا تشدد سے ناراض ہو کر

(باقی صفحہ ۲۷۱ پر)

کے حالات اس وقت بہت دگرگوں ہو رہے تھے۔ عمادالدین ریحانی کے اقتدار کا یہ عالم تھا کہ اکثر اُمراء اُس کے شر سے کانپتے تھے اُس نے بدمعاشوں کا ایک گروہ اکھٹا کر رکھا تھا جو اُمراء کی جان و مال کے لئے وبال تھا۔ منہاج الدین سراج کا کہنا ہے کہ "وہ خود ان کفیں بدمعاشوں کی ڈر کی وجہ سے ۶ ماہ تک نماز جمعہ کے لئے مکان سے باہر نہیں نکلا۔"

اُمراء نے آخرکار گھبرا کر بلبن سے استدعا کی کہ وہ دہلی آکر اپنے سابق عہدہ پر کام کرے اس کے لئے انھوں نے سازش کر کے اپنی فوجوں کا اجتماع بھٹنڈہ میں کیا۔ بادشاہ اُن کے مقابلہ کے لئے دہلی سے نکلا۔ اُمراء کی یہ سرکشی دراصل بغاوت نہیں بلکہ ریحانی کے خلاف ایک طرح کا احتجاج تھا چنانچہ اُمراء بادشاہ کے مقابل نہیں آئے۔ بلکہ طرح دیتے رہے۔ آخرکار بادشاہ نے بڑے غور و خوض کے بعد اُمراء کے مطالبہ کو درست سمجھا اس لئے ریحانی کو بدایوں کا گورنر (۵ دسمبر ۱۲۵۴ء میں) بنا کر دہلی سے ہٹا دیا اس پر بدل اُمراء نے بادشاہ کا شکریہ ادا کیا اور ۳۰ دسمبر ۱۲۵۴ء تک سب نے معافی مانگ لی۔ ۲۰ جنوری ۱۲۵۵ء سے بلبن نے پھر اپنے پرانے عہدہ پر کام کرنا شروع کر دیا۔ سلطان نے اپنے بھائی جلال الدین کی اشک شوئی اس طرح کی کہ اُسے صوبۂ لاہور کا نیم خود مختار حاکم بنا دیا۔

(۱۰) ۱۲۵۶ء میں بادشاہ کے خلاف ایک دوسری سازش ہوئی اس میں بیانہ کے حاکم قتلغ خاں کا (جس نے محمود کی ماں سے شادی کر لی تھی) بہت بڑا ہاتھ تھا

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۷۰ ۔ مغلوں کے پاس ترکستان چلا گیا تھا وہ معہ جلال الدین امدادی فوجیں لیکر اکتوبر ۱۲۵۴ء میں لوٹ آیا۔ اسے بادشاہ کی کسر نفسی کہو یا انصاف و ایمانداری کہ اُس نے بہت جلد بلبن سے مصالحت کر لی اور یہ کہہ کر حکومت اُسی سونپ دی کہ "میں تجھے اپنا نائب بناتا ہوں ۔۔۔۔ تو کوئی ایسا کام نہ کیجو کہ کل خدا کے حضور میں اس کا جواب نہ بن پڑے اور مجھے اور تجھے اُس دربار میں خجل ہونا پڑے"۔

(تاریخ ہند جلد دوم ص ۱۴۴ از سید ہاشمی صاحب، منتخب التواریخ ص ۸۹)۔

لیکن بادشاہ کو بروقت سازش کا علم ہو گیا اُس نے اپنی ماں اور قتلغ خاں کو اودھ کی صوبیداری پر بھیج دیا اور اِدھر ریحانی کو بدایوں سے ہٹا کر بہرائچ کا حاکم بنایا۔ ریحانی اور قتلغ خاں نے بادشاہ کے خلاف سازش کی۔ سب سے پہلے عماد الدین ریحانی سے سرکشی کے آثار نمایاں ہوئے اُس کی سرکوبی کے لئے بادشاہ نے سنجار چشت کو بھیجا جس کو راستہ میں قتلغ خاں نے نظر بند کر لیا لیکن وہ کسی نہ کسی طرح قید سے نکل بھاگا اور بہرائچ پہونچ کر ریحانی کو شکست دے کر قتل کر دیا۔ بادشاہ قتلغ خاں کو سزا دینے کے لئے دہلی سے روانہ ہوا اس عرصہ میں قتلغ خاں اودھ سے روانہ ہو کر بدایوں تک آ پہونچا تھا لیکن شاہی فوجوں کا دباؤ پڑنے سے پنجاب کی طرف اِس اُمید پر روانہ ہو گیا کہ اس کو جلال الدین کے دربار میں جگہ مل جائے گی۔ بادشاہ بھی ۱۵ مئی ۱۲۵۶ء تک دہلی واپس لوٹ آیا۔

(۱۱) قتلغ خاں نے اُس علاقہ پر قبضہ کر لیا جو آج کل ضلع دہرہ دون کے نام سے مشہور ہے۔ اُس نے پہاڑی ہندوؤں کو ملا کر سرمور میں سامان جنگ فراہم کیا اس کام میں سرمور کے راجہ رن پال نے اُس کو بہت امداد دی۔ بادشاہ نے مارچ ۱۲۵۷ء میں باغیوں کو شکست دے کر سرمور پر قبضہ کر لیا لیکن قتلغ خاں بچ کر نکل گیا اور ہاتھ نہیں آیا۔ وہ کوہستان ہمالیہ سے نکل کر شمالی پنجاب کے کسی قلعہ چتور میں چلا گیا۔

اِسی سال کشلو خاں حاکم ملتان نے بغاوت کی اور ناصر الدین محمود کو اپنا بادشاہ ماننے کی بجائے ہلاکو خاں مغل کو اپنا شہنشاہ تسلیم کیا۔ جب شاہی فوجیں سرمور کی مہم سے واپس آئیں تو بادشاہ انھیں لے کر کشلو خاں کے مقابلہ کو روانہ ہوا جو کہ بیاس ندی کے کنارے تک اپنی فوجیں لے کر آ پہونچا تھا اور جس کا مددگار قتلغ خاں بھی تھا۔ دونوں مخالف سرداروں کی فوجیں بادشاہ اور بلبن کو دھوکا دے کر دہلی تک آ گئیں انھیں اُمید تھی کہ دہلی والے اُن کی مدد کریں گے لیکن انھیں مایوسی ہوئی۔ اسی

اثناء میں بلبن معہ بادشاہ کے باغیوں کا سُراغ لگاتا ہوا آپہونچا اس پر دونوں سردار شوالک پہاڑوں کی طرف بھاگ گئے جہاں سے ۲۲ جون ۱۲۵۷ء کو کشلو خاں اُوچھ کی طرف روانہ ہوگیا۔
دسمبر ۱۲۵۷ء میں کشلو خاں مغل سپہ سالار نوعین سالین کی ماتحتی میں کثیر التعداد مغلوں کو لے کر ملتان کے راستہ سے ہندوستان پر حملہ آور ہوا مغل ستلج کے کنارے تک آپہونچے اس مرتبہ اتنا خوف و ہراس پھیل گیا تھا کہ مسلمانوں میں جوش پیدا کرنے کے لئے شعراء کو قومی نظمیں لکھنے پر مامور کیا گیا۔ بادشاہ نے تمام جاگیرداروں کو مدد کے لئے طلب کیا یہ بہت نازک موقع تھا کیونکہ بعض جاگیرداروں نے (اودھ اور کڑا کے جاگیرداروں نے خاص طور پر) مدد دینے میں تساہل برتا اور دوآبہ و میوات میں بغاوت کے آثار پائے جاتے تھے۔ بہر صورت ناصر الدین جنوری ۱۲۵۸ء میں بلبن کو لے کر دشمن کے مقابلہ پر روانہ ہوگیا۔ دشمن سلطانی رعب میں آکر بلا مقابلہ واپس لوٹ گیا۔ بادشاہ ستمبر ۱۲۵۸ء تک دہلی واپس لوٹ سکا۔ اسی سال ماہ فروری میں ہلاکو خاں نے بغداد کو تہ و بالا کیا اور خلیفہ عباسی مستعصم باللہ کو شہید کر دیا۔

(۱۲) ۱۲۵۹ء میں ہندوؤں نے گوالیار و بیانہ کی طرف سر اُٹھایا سلطان نے خود جاکر اِس فتنہ کو فرو کیا اور اسی سال اس نے اودھ اور کڑا کے جاگیرداروں کو ان کی غفلت و کاہلی کی سزا دے کر معاف کر دیا۔

(۱۳) ۱۲۶۰ء میں میوات کے میواتیوں کی سرکشی انتہا تک پہونچ چکی تھی۔ رہزنی، قتل، ڈکیتی اور سرقہ کے یہ لوگ شدید ترین مجرم تھے ان کی جرأت اتنی بڑھ گئی تھی کہ دہلی کی فصیل کے نیچے سے پانی بھرنے والی عورتوں تک کو اُٹھا لیجاتے تھے۔ بلبن اُن کو سزا دینے کے لئے ۲۹ جنوری ۱۲۶۰ء کو روانہ ہوا اور اچانک ایک ہی منزل کر کے قلب میوات میں پہونچ گیا۔ کامل ۲۰ یوم دارو گیر کا سلسلہ گرم رہا۔ ہر میواتی کے سر کی قیمت ایک ٹنکہ اور زندہ کی دو ٹنکہ مقرر کر رکھی تھی۔ اِس مہم سے ۹ مارچ کو بلبن واپس لوٹا اور اپنے ساتھ ۲۵۰ میواتی جن میں اُن کے سرغنہ بھی شامل تھے ۱۴۲ گھوڑے اور ۲۱ لاکھ ٹنکہ دہلی کو لایا۔ میواتیوں کو قتل کرا دیا۔

اِسی سال جاسوسوں کی مدد سے میواتیوں پر دوبارہ چھاپہ مارا اور اس مرتبہ اس نے ۱۲ ہزار بدمعاشوں کو کیفر کردار کو پہونچایا۔

مغل سفیر کی آمد

اِسی سال ہلاکو خاں کا سفیر سلطان ناصر الدین محمود کی خدمت میں دہلی حاضر ہوا۔ اِس زمانہ میں سلطان پرانی دہلی کی سکونت چھوڑ کر جمنا کے کنارے کلوکھری کے محل میں آگیا تھا۔ سفارت اِسی جگہ باریاب ہوئی۔ سفیر کی آمد پر دہلی میں شان و شوکت کی نمائش و اظہار کا خصوصی اہتمام کیا گیا تھا۔ خاں اعظم الغ خاں پچاس ہزار سوار با ساز و یراق اور دو لاکھ پیادے زرق برق لباس اور مجلّی ہتھیاروں سے آراستہ و مسلح اور دو ہزار جنگی ہاتھی اور تین ہزار عراوۂ آتشبازی ہمراہ لے کر دہلی سے استقبال کے لئے نکلا شاہی محل کے دروازے تک دورویہ مسلح پیادے و سواروں کی بیس بیس صفیں ایستادہ کیں اُن کے عقب میں عماری دار ہاتھیوں کی قطاریں تھیں اِس جنگی ساز و سامان کے علاوہ محل کے دروازے پر چند قیدیوں کی لاشیں لٹک رہی تھیں۔ غرض سفیر اِس راستے سے گذر کر جب ایوان شاہی میں پہونچے تو وہاں اور بھی زائد مرعوب کن نظارہ دیکھا۔ تمام دربار سونے چاندی اور جواہرات کے نمائشی و آرائشی سامان سے جگمگا رہا تھا۔ معمر و نیک سلطان کے تخت کے ایک پہلو پر سادات و مشائخ عظام کی صف تھی۔ دوسری جانب اُن بیس بیس بادشاہوں اور شاہزادوں کی قطار تھی جو خراسان و ایران اور آذربائیجان وغیرہ ممالک سے مغلوں کے ڈر سے بھاگ کر ہندوستان میں بطور پناہ گزیں شاہی مہمان تھے۔ ایک قطار بڑے بڑے اُمراء نامدار و عمال سلطنت کی تھی جن میں ہندو رانا، راجہ مہاراجہ اور رائے زادگان بھی شامل تھے۔ منہاج سراج نے اِس واقعہ کو نظم کیا ہے[۱]۔

---

[۱] منہاج الدین سراج کی نظم کے اشعار حسب ذیل ہیں:-

(۱) زہے جشنے کز آں اطراف چوں خلد بریں گشتہ　　خہے بزمے کز و اکناف عدل راستیں گفتہ

(باقی صفحہ ۲۷۵ پر)

ہلاکو خاں کے سفیر پر اس شان و شوکت اور رعب و داب کا بڑا گہرا اثر پڑا چنانچہ سفیر کے واپس پہونچنے پر ہلاکو خاں نے ہندوستان پر حملہ آور ہونے کا خیال ترک کر دیا اور کچھ عرصہ تک ہندوستان مغلوں کے حملوں سے محفوظ رہا۔

سلطان کی سیرت و خصلت

ناصر الدین محمود کے آخری چھ سال کا پتہ نہیں چلتا جن کا حال صاحب طبقات ناصری تحریر نہیں کر سکا۔[1] غالباً یہ سال نہایت امن و امان اور اطمینان سے گذرے۔ ۱۱ جمادی الاول ۶۶۴ھ مطابق ۱۸ فروری ۱۲۶۶ء کو اس نیک دل سلطان کا اس دار فانی سے انتقال ہو گیا۔[2] اس جیسے درویش صفت بادشاہ دہلی کے تخت پر بہت کم بیٹھے ہیں۔ یہ بادشاہ اگر

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۷۴)

(۲) ز ترتیب نہاد و رسم و آئیں و نشاط او — تو گفتی عرصۂ دہلی بہشت ہشتمیں گشتہ

(۳) زفر ناصر الدین شاہ محمود ابن التتمش — ملک نزدش دعا خواندہ فلک پیشش زمیں گشتہ

(۴) شہنشاہے کہ در عالم بفیض فضل ربانی — سزائے چتر شاہی لائق تخت و نگیں گشتہ

(۵) چو خاقانان کیں کی ور چو سلطانان دیں پرور — بدل ماحی کفر است و بجاں حامی دیں گشتہ

(۶) مبارک باد بر اسلام ایں بزم شہ عالم — کزیں ترتیب ہندستاں بسی خوشتر ز چیں گشتہ

(۷) ہمیں از جملہ شاہاں دہر بندہ زور گاہش — چو منہاج سراج از جاں دعاگوئے کمیں گشتہ

(طبقات ناصری ص ۳۱۹)

ع۱:- ان چھ سال کا حال ملحقات طبقات ناصری کے نام سے عین الدین بیجاپوری نے لکھا تھا۔ اس کتاب کو فرشتہ نے دیکھا ہے اور اس سے فائدہ اٹھایا ہے۔ لیکن اب یہ کتاب نایاب ہے۔

ع۲:- عصامی و ابن بطوطہ کی روایت کی بنا پر بعض مورخین کا خیال ہے کہ سلطان ناصر الدین کی وفات میں ایک حد تک بلبن کا بھی ہاتھ ہے لیکن یہ شبہ بعض وجوہ کی بنا پر ناقابل اعتبار ہے۔ کیونکہ

(باقی صفحہ ۲۷۶ پر)

ایک طرف شجاع و جفاکش تھا تو دوسری طرف عابد شب زندہ دار اور زاہد خوش اطوار بھی تھا۔ چھ مہینے میں ایک قرآن مجید اپنے ہاتھ سے لکھ لیتا تھا اور سال بھر میں دو۔ انھیں کے ہدیہ سے سال بھر تک اپنی گذر کرتا تھا۔ اس کے ایک ہی بیوی تھی اور وہی اُسے اپنے ہاتھ سے کھانا پکا کر کھلاتی تھی۔ ملازمہ رکھنے سے انکار کر دیا تھا۔ کیونکہ اپنی کمائی میں اتنی گنجائش نہیں دیکھتا تھا کہ ایک ملازمہ کے اخراجات برداشت کر سکے۔ رہا خزانہ اُسے وہ رعایا کی امانت سمجھتا تھا اور اس میں سے ایک کوڑی بھی اپنی ذات پر صرف کرنا حرام سمجھتا تھا۔

اس کی نیک دلی کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ایک مرتبہ اُس نے اپنے ہاتھ سے نقل کی ہوئی کتاب ایک امیر کو دکھائی۔ امیر نے اس میں بعض غلطیاں بتائیں جن کو بادشاہ نے درست کر دیا لیکن جب امیر چلا گیا تو بادشاہ نے انھیں ویسا ہی کر دیا جیسا کہ پہلے تھا۔ اس پر لوگوں نے سبب پوچھا تو فرمایا کہ مجھے معلوم تھا کتاب غلط نہیں ہے لیکن ایک خیر خواہ کا دل دکھانے کی بجائے میں نے اِس کو مناسب سمجھا کہ حروف کو کاٹ دوں اور اُن کو دوبارہ صحیح بنا دینے کی محنت کو اپنے اوپر گوارا کر لوں۔

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۷۵ — اول تو اس عہد کے نامور ادیب و مورخین مثلاً منہاج سراج، برنی، امیر خسرو وغیرہ خاموش ہیں۔ اس کے علاوہ از روئے قیاس بلبن کو کیا ضرورت تھی کہ وہ ناصر الدین کو زہر دے۔ سلطان مسعود اور ناصر الدین دونوں اس کے داماد تھے اور ناصر الدین کی لڑکی اس کے بیٹے بغرا خاں کو منسوب تھی اس طرح شاہی گھرانے سے چند در چند تعلقات کی بنا پر وہ بادشاہت کا از خود مستحق تھا۔ علاوہ ازیں ناصر الدین نے اولاد ذکور نہ ہونے کی بنا پر بلبن کو اپنی زندگی ہی میں اپنا جانشین مقرر کر دیا تھا (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو طبقات ناصری کا دیباچہ ص ۶۹ نیز متن ص ۱۱۶ انڈیا ودنگ، فاؤنڈیشن آف مسلم رول ان انڈیا ص ۱۵۲ از ڈاکٹر حبیب اللہ

۱ء:۔ فرشتہ ص ۱۷، طبقات اکبری ص ۴۲ ۔ ع ۲ ۔ طبقات اکبری ص ۴۷ ۔

مذہب کا وہ حد درجہ احترام کرتا اور عظمت نبوی کے خیال سے ہر وقت کانپتا رہتا تھا۔ ایک مرتبہ اُس نے اپنے ایک ندیم محمدؐ نامی کو تاج الدین کہہ کر پکارا۔ ندیم تین دن تک نہیں آیا تو سلطان نے اس کو طلب کرکے وجہ دریافت کی۔ اُس نے کہا کہ سلطان ہمیشہ اس کا نام لیکر پکارا کرتا تھا اس دن خلاف معمول تاج الدین کہہ کر آواز دی، سمجھا کہ سلطان کچھ برہم ہے اس لئے مضطرب ہو کر گھر چلا گیا۔ اس پر سلطان نے قسم کھا کر اس کو یقین دلایا کہ "میں تم سے مطلق رنجیدہ نہیں ہوں اس دن تمہارا نام نہ لینے کی وجہ یہ تھی کہ میں باوضو نہ تھا اور بغیر طہارت کامل کے لفظ محمدؐ میں اپنی زبان سے ادا نہ کرسکتا تھا"[1]

فصل دوم

(۹) سلطان غیاث الدین بلبن فروری ۱۲۶۶ء تا جنوری ۱۲۸۷ء

تخت نشینی و ابتدائی حالات

سلطان ناصر الدین محمود کی وفات کے بعد ناصر الدین یا التمش دونوں کی اولاد ذکور میں سے کوئی بھی ایسا نہ رہا جو بار حکومت کو اپنے کاندھوں پر اٹھا سکے۔ اس لئے سلطنت کو طوائف الملوکی سے بچانے نیز سلطان مرحوم کی وصیت کا لحاظ کرکے امرائے سلطنت نے بلبن کو اپنا بادشاہ منتخب کر لیا۔ اس کو سلطان التمش کی لڑکی منسوب تھی۔ سلطان التمش نے ۴۰ غلام خریدے تھے ان میں سے بلبن بھی ایک تھا[2]۔ بلبن سے پہلے اُس کا ایک بھائی کشلی خاں سلطان کی ملازمت میں داخل تھا۔ بلبن شاہی سقّہ گیری سے لیکر داروغہ مطبخ، میر شکار، حاجب، گورنر اور پھر ناصر الدین محمود کے عہد میں وزارت

۱؎ فرشتہ صفحہ ۷۲۔

۲؎ بلبن کا باپ البری قبیلے کا ایک ترک سردار تھا جس کے قبضہ میں دس ہزار سوار تھے۔ مغلوں کے حملہ کی وجہ سے خاندان تباہ ہوگیا اور بلبن کو انقلاب روزگار کی وجہ سے غلام بننا پڑا (طبقات ناصری صفحہ ۲۸۱ و فرشتہ صفحہ ۷۳)

غلطی سے جلیل القدر منصب پر فائز ہوا۔ لیکن سلطان مرحوم کی زندگی تک بلبن سلطنت کے نظم ونسق میں وہ ضبط و باقاعدگی پیدا نہ کرسکا جو اُس کے عہد بادشاہی کی خصوصیت ہو اُس کی ایک وجہ تو ظاہر ہے کہ وہ تمام اختیارات رکھنے کے باوجود بادشاہ وقت کا ماتحت عہدہ دار تھا دوسرے سلطنت کے مختلف اقطاع پراُن "ملوک شمسی" کا تسلط تھا۔ جو بلبن کے ہم قوم وہم حشم تھے اور جو التتمش کے بعد اس درجہ سرکش ہوگئے تھے کہ انھیں مرکزی سلطنت کا باجگذار رکھنا اور خود مختار بادشاہ نہ ہونے دینا ہی بلبن کا بڑا کارنامہ ہو

اِن چالیس ترک غلاموں میں جو چہلگانِ شمسی کہلاتے ہیں بعض غلام عمر و اقتدار کے لحاظ سے بلبن سے بھی بڑے تھے[1] اور حرف "انا ولاغیری" (یعنی جو میں ہوں وہ دوسرا نہیں) تو ہر ایک کی زبان پر تھا۔[2] انھیں غلاموں نے طاقتور ہو کر اُن آزاد امراء و شاہزادوں کو بھی اُمور سلطنت سے بیدخل کر دیا جو چنگیز خانی سیلاب سے بچ کر دہلی چلے آئے تھے اور جن کی وجہ سے درگاہ سلطان شمس الدین درگاہ محمودی و سنجری معلوم ہوتی تھی۔[3]

بلبن کے اصول حکومت

اِس میں شبہ نہیں کہ بلبن نے مرکزی حکومت میں دخل پاتے ہی اپنی قوت اِس قدر بڑھالی کہ کسی کو بھی دربار دہلی سے انحراف کرنے کی بہ مشکل جرأت ہو سکتی تھی پھر بھی ملوک شمسی کی انانیت اور مقامی ہندو روسار کی باغیانہ اسپرٹ کو دبانے کے لئے (تاکہ ملک میں بدامنی نہ پیدا ہونے پائے) اُس کو مجبوراً بعض عجمی شعائر[4] پر عمل کرنا پڑا جس کو بعض مورخین نے اُس کے اُصول حکومت میں داخل کرکے اُس کو بدنام کرنے کی کوشش

ع۱:۔ اعزالدین کشلو خاں وغیرہ کا حال پیچھے لکھا جا چکا ہے۔ تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو طبقات ناصری طبقہ صفحہ ۲۸۱ تا ۲۸۴

ع۲:۔ ضیائے برنی صفحہ ۲۵   ع۳:۔ ضیائے برنی صفحہ ۲۷، فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۷۵   ع۴:۔ عجمی شعائر میں جاہ و حشمت کی نمود و نمائش اور عدم مساوات شامل ہیں (مولف)

کی ہے حالانکہ بلبن ایرانی اکاسرہ کی تقلید میں خود پرستی و عظمت نمائی کے طور و طریق کو اسلامی تعلیمات کے نہ صرف منافی بلکہ شرک سمجھتا تھا۔ اور اپنے افعال کے جواز

ع۱ :۔ بلبن نے اپنی بادشاہی کے لئے عجمی شعائر عظمت و جلال کو بلا سوچے سمجھے یا محض خود پسندی کی بنا پر اختیار نہیں کیا تھا بلکہ اسلئے کہ لوگوں کے دلوں پر بادشاہ کا رعب و دبدبہ مستولی ہو جائے تاکہ مفسدوں کو فتنہ و فساد کی اور ظالموں کو کمزوروں کو ستانے کی ہمت و جراءت نہ ہو سکے (ملاحظہ ہو برنی ص۳۱، ص۳۲) وہ بارہا کہتا تھا کہ "رعایا در عصر بادشاہی بے حرمت و حشمت و هول و هیبت زندقہ بار آرد و تمرد و طغیان رو نماید هندوان سرتابی ها کنند و مسلمانان از کثرت فسق و فجور و بسیاری زنا و لواطت و شراب خوردن و ناکردنی هائے دیگر بدبخت شوند" (ضیاء برنی ص۳۵) یعنی وہ بادشاہ جو رعب و داب اور شان و شوکت نہیں رکھتا اس کی رعایا میں الحاد و سرکشی بڑھتی ہے۔ ہندو بغاوت کرتے ہیں اور مسلمان فسق و فجور و دیگر افعال شنیعہ کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اس لئے وہ شاہانہ تزک و احتشام کا خاص طور سے لحاظ رکھتا تھا۔

اس کے شاہانہ رکھ رکھاؤ کی ضیائے برنی نے نہایت دلکش تصویر کھینچی ہے لکھتا ہے کہ "جس وقت اس کا دربار آراستہ ہوتا یا سواری چلتی تو صدہا نقیب و چاؤش، پیادہ و شمشیر ہنگ، امرا و فوجی سردار اس کے گرد و پیش ہوتے تھے۔ ملک سیستان کے دیو ہیکل نوجوانوں کو بیش قرار تنخواہیں دیکر خاص طور سے اس کام کے لئے نوکر رکھا گیا تھا کہ وہ ننگی تلواریں کندھوں پر رکھے بادشاہ کی خواصی میں رہیں۔ اور جب اس شان محمودی اور شوکت سنجری کے ساتھ بادشاہ برآمد ہوتا یا سوار ہو کر چلتا تو نقیب و چاؤش قدم قدم پر صدائے بسم اللہ اس زور سے بلند کرتے کہ بازار و جنگل گونج جاتے تھے اور آواز دو دو کوس تک سنائی دیتی تھی۔ اس نظارہ سے تماشائیوں کی آنکھیں چکاچوندھ ہو جاتی تھیں اور حاضرین کے قلوب دہل جاتے تھے جو سو سوا اور دو دو سو کوس سے چل کر محض یہ تماشا دیکھنے کے لئے دہلی آتے تھے۔ بلکہ بعض اوقات

(باقی مضمون صفحہ ۲۸۰ پر)

میں یہ حجت پیش کرتا تھا کہ "اگر بادشاہ کا اعتقاد صحیح اور نیت درست ہو اور اس قسم کے افعال سے اس کا مدعا محض حق کی حمایت اور عدل و امن کا قیام ہو تو وہ عنداللہ ماخوذ

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۷۹ :- نئے آدمی جو حضور میں باریاب ہوتے تھے خواہ وہ کہیں کے سفیر ہوں یا ہندوستان ہی کی کسی ریاست کے راجہ یا راجکمار تو وہ "خاکبوس" یعنی سلام کے وقت خوف سے گر پڑتے یا بیہوش ہوجاتے تھے۔" (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو تاریخ فیروز شاہی صفحہ ۳۰ تا ۳۲ از ضیائے برنی)

بلبن نے وقار بادشاہی و داب و آداب پادشاہی کی مبالغہ کی حد تک محافظت کی۔ برنی کا کہنا ہے کہ "۲۰ سالہ دور حکومت میں بلبن کے محل سرا کے خادموں و ملازموں نے بھی اس کو کبھی بغیر ٹوپی و موزے کے نہ دیکھا۔ اس مدت میں اگر ۲۰ سال عہد وزارت کے بھی شامل کر لئے جائیں تو ۴۰ سال کے عرصہ میں اس نے کسی رئیس و بازاری و مطرب و سفلہ و مسخرہ کو شرف ہمکلامی نہیں بخشا اور اپنی حرکات و سکنات نیز قول و فعل سے کوئی ایسی بات ظاہر ہونے دی جو شاہی وقار کو کم کرتی۔ اس نے بادشاہی کے زمانہ میں نہ کسی سے مزاح کیا اور نہ کسی کو مزاح کی اجازت دی اسی طرح دربار میں نہ وہ کبھی قہقہہ مار کر ہنسا اور نہ کسی کو جرأت تھی کہ اس کے سامنے ہنسے۔ اس زمانہ کا ایک مشہور و معروف رئیس فخر باونی کو اس امر کی ہمیشہ تمنا رہی کہ بادشاہ سے بالمشافہ گفتگو کرنے کا اسے موقع مل جائے اس کے لئے اس نے بادشاہ کے مصاحبین و مقربین کی خدمت میں نذرانے پیش کئے تاکہ وہ بادشاہ سے سفارش کر کے گفتگو کا موقع بہم پہونچائیں لیکن نتیجہ کیا نکلا؟ بادشاہ نے ملک علاء الدین کشلی خاں "باربک" کے ذریعہ منع کر دیا اور انکار کے وجوہ بیان کئے جو اس زمانہ کی اخلاقی و سیاسی فضا کو دیکھتے ہوئے بالکل صحیح ہیں۔

{ (ملاحظہ ہوں صفحات ۳۳ تا ۳۶ از برنی، صاحب طبقات اکبری نے رئیس کا نام فخر آمانی تحریر کیا ہے۔ ملاحظہ ہو ص۷۹ جلد اول) کم

بلبن کے زمانہ میں قریباً ۱۵ بادشاہ اور شاہزادے دہلی کے اندر پناہ گزین تھے۔ یہ سب مغلوں

(باقی مضمون صفحہ ۲۸۱ پر)

سے بری ہے"[1]

حقیقت یہ ہے کہ بلبن جو کچھ کہتا تھا ویسا ہی سمجھتا تھا اور اسی کے مطابق عمل بھی کرتا تھا اس لئے اس کے اصولِ حکومت میں ہمیں صرف دو چیزیں نظر آتی ہیں جن پر اس کی حکومت کا مدار تھا یعنی بادشاہ کو عادل و منصف ہونا چاہیئے اور اس کا ذاتی کیریکٹر اتنا بلند ہونا چاہیئے کہ جو دوسروں کے لئے نمونہ بن سکے۔ یہی دو چیزیں ایسی ہیں جو کسی حکومت کے استحکام و مضبوطی کی ضامن بن سکتی ہیں۔

(۱) عدل و مساوات

برنی نے بلبن کے عدل و انصاف کو بہت کچھ سراہا ہے لیکن ملازمتوں کے سلسلہ میں بظاہر وہ میزان عدل سے ہٹا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اس نے ملازمتوں کی تقسیم میں دو عملی رنگ کیوں اختیار کیا؟ اس کے اسباب پر بحث کرنے کے بعد بلبن کے عدل و انصاف کے دیگر واقعات پر تبصرہ کیا

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۸۰ کے ستائے ہوئے تھے اور مختلف ممالک سے بھاگ بھاگ کر دہلی میں آئے ہوئے تھے۔ بلبن کو اپنے ان مہمانوں پر بڑا فخر تھا اس نے ان کے نام پر محلے آباد کرائے جو سمرقندی، کاشغری، ختائی، رومی، غوری، خوارزمی وغیرہ نام سے پکارے جاتے تھے۔ پناہ گزیں بادشاہوں اور شہزادوں کی اس قدر و منزلت کے باوجود انھیں دربار میں بیٹھنے کی اجازت نہ تھی سب مودبانہ صفیں باندھے ہوئے کھڑے رہتے اور کھڑے ہی کھڑے بشرط اجازت عرض و معروض کرتے تھے۔ صرف دو عباسی شہزادے ایسے ضرور تھے جنھیں دربار میں بیٹھنے کی اجازت تھی اور جو بغداد سے پناہ لینے کی خاطر ہندوستان کی طرف آنکلے تھے۔

بلبن کو دربار کے رکھ رکھاؤ کا اتنا زیادہ خیال تھا کہ جب اس کے محبوب شہزادے محمد (خان شہید) کے شہید ہونے کی خبر آئی تو وہ فرط غم سے نڈھال ہو گیا لیکن کیا مجال کہ دربار کے اوقات میں کوئی شخص اس کے حرکات و سکنات سے اس کے اس غم کا اندازہ لگا سکے جس نے اس کو بالآخر گھلا گھلا کر بستر مرگ پر پہونچا دیا۔ [1]۔ برنی صفحہ ۱۰۳، صفحہ ۱۰۳۔

جائے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ اُس پُر آشوب زمانہ میں جبکہ ہندوستان کا سیاسی مطلع ابر آلود تھا ایک طرف وحشی مغلوں کے لشکر بادل کی صورت میں چھائے ہوئے تھے اور دوسری طرف مقامی ہندو و مسلم اُمراء کے باغیانہ عزائم بجلیوں کی شکل میں کوندر ہے تھے بلبن کو اس قسم کے شریف النفس مجاہدین کی ضرورت تھی جو باطل کے مقابلہ میں سینہ سپر ہو سکیں اور جن پر حکومت کو پورا پورا اعتماد اور بھروسہ ہو۔ اِس قسم کی جماعت میں ظاہر ہے کہ نو مسلموں کو شامل نہیں کیا جا سکتا تھا کیونکہ وہ آزمودہ کار سپاہی نہیں تھے اور انھوں نے ابھی حال میں اخلاق و معاشرت کے جس گرے ہوئے ماحول کو خیر باد کہہ کر اسلام میں قدم رکھا تھا اس کی بنا پر ذمہ دار عہدے انھیں اس وقت تک تفویض نہیں کئے جا سکتے تھے جب تک کہ اُن کی سیرتیں اسلامی سانچے میں نہ ڈھل جائیں ایسی حالت میں نہ صرف بلبن بلکہ سلطان ایلتتمش جیسے پاکباز و نیک نفس بادشاہ کو بھی انھیں افراد پر اعتماد کرنا پڑا جو نسلاً مسلمان تھے اور جن پر ابھی ہندوستان کی اخلاقی و معاشرتی حالت نے خراب اثر نہیں ڈالا تھا۔ اس کو اگر برنی کے الفاظ میں دوہرایا جائے تو "وہ (بلبن) حسب و نسب اور قوم و خاندان کی شرافت کا خاص طور پر لحاظ رکھتا تھا اور اجلاف و کم اصل لوگوں کو اعلیٰ عہدے نہیں دیتا تھا۔ چنانچہ اُس نے اپنے عہد حکومت کے شروع ایام میں جبکہ اقطاع امروہہ کی حکومت ملک امیر علی سرجاندار کو عطا کی تو اِس سلسلے میں ایک ایسے متصرف کی تلاش ہوئی جو اصیل ہو۔ اُس زمانہ میں ملک علاءالدین کشلی خاں امیر حاجب تھا اور ملک نظام الدین بزغالہ وکیلدر کے عہدہ پر فائز تھا دونوں نے کمال مہیار کو بجہت خواجگی امروہہ بارگاہِ حکومت میں پیش کیا لیکن بلبن کو جب یہ معلوم ہوا کہ یہ نو مسلم ہے تو وہ بہت جھلّایا اور وکیلدر، نائب وکیلدر، امیر حاجب، نائب امیر حاجب اور خاص حاجب

اِن پانچوں اعلیٰ عہدہ داروں کو بلا کر متنبہ کیا کہ "ایں زماں مولاٴزادہ کم اصلی و کم بضاعتی گزیدند"
اس لئے اگر آئندہ اس قسم کے کارداروں کا تم نے میرے سامنے ذکر بھی کیا تو میں تمہیں ایسی
سزا دوں گا جو دوسروں کے لئے باعثِ عبرت ہو۔ اس کے بعد ایک مجلس میں عادل خاں اور
تمر خاں سے مخاطب ہو کر بلبن نے کہا کہ تمہیں میرے آقا سلطان شہید شمس الدین التتمش
کا وہ واقعہ یاد ہے کہ انھوں نے ایک مرتبہ اقطاع قنوج کی حکومت اپنے پسرِ کلاں شہزادہ
ناصر الدین کو دی اور خواجگی قنوج کے عہدہ پر جمال الدین مرزوق کو نامزد کیا لیکن جمال الدین
کے بارے میں جب یہ معلوم ہوا کہ یہ کم اصل ہے تو سلطان مرحوم نے نہ صرف جمال الدین کو بلکہ
تفحّص کر کے ۳۳ اور کم اصلوں کو اُن کے عہدوں سے معزول کر دیا۔ ان میں کوئی خواجہ و متصرف
تھا تو کوئی مشرف و برید کے ذمہ دار عہدوں پر سرفراز تھا[1]۔

بلبن و التتمش کا یہ طریق عمل جو بظاہر اسلامی عدل و مساوات کے منافی معلوم ہوتا
ہے اُن حضرات کے لئے خاص طور سے قابل غور ہے جو یہ کہتے ہیں کہ اکثر ہندوؤں نے عہدوں
کے لالچ میں آکر اسلام قبول کر لیا تھا۔ نو مسلم کا لفظ برنی نے عمومیت کے طور پر استعمال کیا
ہے جس طرح دوسرے مقام پر لفظ ہندو۔ بلبن کے عہد حکومت میں نو مسلم زیادہ تر جاہل اور
نیچے طبقہ کے لوگ تھے جن کو ذمہ دار عہدے صرف اِس بنا پر نہیں دئے جا سکتے تھے کہ انھوں نے
اپنا مذہب تبدیل کر دیا تھا۔ ملازمت کے لئے اصل چیز ذاتی قابلیت و شرافت ہے۔
یعنی اُن کی تربیت و خاندانی روایات عمدہ و بہتر ہونی چاہئیں۔ بہر حال بعض سیاسی
و معاشرتی وجوہ کی بنا پر سلطان التتمش و بلبن نے مجبوراً نو مسلموں کو ذمہ دار عہدوں سے
الگ رکھا ورنہ اسلام میں مسلم و نو مسلم کی حیثیت مساوی ہے۔ برنی نے جن گرے ہوئے
الفاظ میں نو مسلموں کو یاد کیا ہے اُن سے دھوکا نہ کھانا چاہئے۔ اُس نے بلبن کا حال
کم و بیش ۷۵ سال بعد ۷۵۸ھ میں لکھا ہے جبکہ دہلی کے تخت پر حکومت کرتے ہوئے

---

[1] ضیائے برنی ص ۳۶ تا ص ۳۹

مسلمانوں کو ۱۵۰ سال سے زائد ہو چکے تھے اس عرصہ میں نومسلموں کی معاشرتی و اخلاقی حیثیت پر اسلامی تعلیمات نے بہت کچھ اچھا اثر ڈالا ہوگا لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ قدیم شرفا کی اولاد روبہ تنزل ہو گی کیونکہ از روئے حساب ۱۰۰ سال کے اندر ۴ نسلیں بدلتی ہیں اور تیسری نسل پہلی سے یقیناً خراب ہوتی ہے جس کی زندہ مثال خود برنی کی اپنی ذات ہے کہ اس کے بزرگ کیا تھے اور وہ کیا تھا۔ اس کے زمانہ میں نومسلم اپنی اعلیٰ صلاحیتوں و قابلیتوں کی وجہ سے حکومت کے اونچے سے اونچے عہدوں پر مقرر کئے جا رہے تھے لیکن برنی اور اس جیسے دیگر شریف خاندانوں کے افراد اپنی نااہلیت کی وجہ سے کس مپرسی کے عالم میں تھے ظاہر ہے کہ یہ تبدیلی اس کی ذہنی و روحانی کوفت کا کتنا بڑا سبب ہو گی یہی وجہ ہے کہ جب اس کا بس نہیں چلتا تو بزعم خود اپنے کو شریف سمجھ کر نومسلموں کو رذیل، کم اصل، اور لئیم وغیرہ خطابات سے موسوم کر کے اپنے دل کی بھڑاس نکالتا ہے اور ان کے وزن کو گھٹانے کی کوشش کرتا ہے۔

اس سلسلہ میں برنی کے طرز تحریر سے ایک اور چیز کا بھی پتہ چلتا ہے اور وہ یہ کہ ہندوستان کے نومسلم اسلامی مساوات کی رو سے حکومت کے ہر شعبہ میں حکمراں طبقے کے دوش بدوش کام کرنا اپنا حق سمجھتے تھے اس لئے ملازمتوں کے لئے ان کی مانگ کا اثر براہ راست ترکوں پر پڑتا تھا اور یہ بات ان (ترکوں) کو کھٹکتی تھی۔ اس لئے وہ حکومت میں نومسلموں کو برابر کا شریک کرنا نہیں چاہتے تھے کیونکہ اس سے ان کی معیشت و ملازمت پر اثر پڑتا تھا یہی وجہ ہے کہ جب ایک نومسلم جمال الدین مرزوق کو سلطان التمش نے خواجگی قنوج کے عہدہ پر نامزد کیا تو شہزادہ ناصر الدین حاکم قنوج کے نائب (وزیر زادہ) خواجہ عزیز پسر بہروز نے اس کو خلعت دئے جاتے وقت پیچھے سے کانٹا مارا اور اس کی اہانت کے لئے بلند آواز سے یہ شعر پڑھا۔

بدست دوں مدہ خامہ کہ گردوں را مجال افتد   سیہ سنگی کہ در کعبہ است سازد سنگ استنجا

اِس کا نتیجہ آپ کو بتایا جا چکا ہے۔ اسی طرح ملک اعزالدین باربک اور ملک قطب الدین حسن غوری وکیلدر نے ازراہِ حسد التتمش سے وزیر اعظم نظام الملک جنیدی کی چغلی کھائی کہ وہ نسلاً جولاہہ ہے لیکن بادشاہ پر اس کا کوئی اثر مرتب نہیں ہوا[1]۔

بہر حال التتمش کی طرح بلبن نے بھی ذمہ دار عہدوں کی تقسیم میں اِس امر کو ہمیشہ ملحوظ رکھا کہ حکومت نااہلوں اور غیر ذمہ دار لوگوں کے ہاتھ میں نہ جانے پائے تاکہ ان کو رعایا پر بے جا ظلم و تشدد اور حکومت میں اختلال پیدا کرنے کا موقع مل سکے۔ بادشاہوں کی نجات کے لئے جو اعمال[2] ضروری ہیں وہ اُسے ازبر یاد تھے وہ اپنی مخصوص مجلسوں میں اپنے لڑکوں و نیز اراکین سلطنت کو جمع کر کے اُن اعمال کی طرف توجہ دلایا کرتا تھا اور رقّتِ قلب کے ساتھ کہا کرتا تھا کہ "شما کہ فرزندان و نزدیکان من آید پائے برہوش نہید کہ اگر ظلمِ شما بر عاجزی مرا معلوم شود من شمارا سزائے آں برسانم و بیشتر آں باشد کہ من قاتل مظلوم را زندہ نگذارم، نزدیکیِ شما و حقوق خدمتِ شمامرا در انصاف ستانی مانع نباشد"[3] یعنی مجھ سے تمہارا تقرب اور حقوقِ خدمت میرے حق دادرسی میں مانع نہیں آسکتے اگر مجھے تمہارے ظلم کا علم ہو جائے تو غیر ممکن ہے کہ میں تمھیں عبرتناک سزا دوں اور بیشتر تو تم یہی دیکھو گے کہ مظلوم کا قاتل زندہ نہیں رہنے

ع ۱: ضیائے برنی ص ۳۸ و ۳۹

ع ۲: سلطان بلبن کہا کرتا تھا کہ "میں نے شمس الدین التتمش کے یہاں مجلس وعظ میں دومرتبہ سید نورالدین مبارک غزنوی کی زبان سے سنا ہے ۔۔۔۔ کہ چار چیزوں سے نجات اُخروی حاصل کی جاسکتی ہے (۱) بادشاہ کا اعتقاد درست ہو اور وہ امر بالمعروف کے رواج دینے اور نہی عن المنکر کے مٹانے کی کوشش کرے ۔۔۔

(۲) مسلمانوں میں فسق و فجور نہ پھیلنے دے اور عمدہ قسم کے پیشوں میں مشغول ہونے کی ترغیب دے۔

(۳) احکامِ شرع کے نفاذ کے لئے متقی و پرہیزگار نیز خدا ترس و دیندار لوگوں کا انتخاب کرے۔

(۴) دادرہی و انصاف ستانی میں کسی کی رو رعایت نہ کرے تاکہ بقہر و غلبہ و سطوت پادشاہی ظلم

(باقی صفحہ ۲۸۶ پر)

پائے گا۔ چنانچہ مظلوم کی دادرسی اور عدل کرنے کے وقت کسی دنیاوی مصلحت یا مروت کی اُسے ذرہ برابر پرواہ نہ ہوتی تھی۔ آج بھی تاریخ کے صفحات اِس امر کی شہادت دیتے ہیں کہ وہ جو کچھ کہتا تھا اُسی کے مطابق عمل بھی کرتا تھا۔ برنی نے اِس ضمن میں دو نہایت نصیحت آمیز و عبرت خیز واقعات کا تذکرہ کیا ہے ان میں سے پہلا یہ ہے کہ "ملک بق بق پدر قیرابیگ شاہی باڈی گارڈ کا افسر اعلیٰ (سرجانداراں) تھا اُسے حد درجہ شاہی تقرب حاصل تھا۔ بادشاہ نے اُس کو اپنے عہد کے سب سے زیادہ وسیع صوبہ بدایوں کا گورنر بنا دیا تھا اور اُس کو اجازت دیدی تھی کہ وہ ذاتی طور پر چار ہزار سواروں کا دستہ ملازم رکھ سکے اس لئے وہ ایک نہایت عالیجاہ امیر بھی تھا۔ اُس نے ایک مرتبہ غصّہ کی حالت میں اپنے ایک فراش کو تازیانہ سے اتنا پٹوایا کہ وہ ہلاک ہوگیا کچھ عرصہ کے بعد بلبن غالباً دورہ کے سلسلے میں بدایوں گیا اُس وقت فراش کی بیوی نے حضور میں نالش کی بلبن کو جب واقعہ کی تصدیق ہوگئی تو اُس نے حکم دیا کہ اِس عورت کے سامنے کھڑا کر کے مجرم صوبیدار کے اتنے دُرّے مارے جائیں کہ وہ ہلاک ہوجائے۔ اِس حکم کی تعمیل ہوئی اور ساتھ ہی بدایوں کا برید یعنی ڈاک کا عہدیدار بھی جس نے اِس واقعہ کی اطلاع نہیں کی تھی سولی پر لٹکا دیا گیا۔ اسی طرح ملک ہیبت خاں حاکم اودھ نے ایک شخص کو بیجا طور پر قتل کرا دیا تھا۔ مقتول کی بیوی نے بادشاہ سے دادرسی چاہی۔ بلبن نے اپنے سامنے ہیبت خاں کے پانسو دُرّے (کوڑے) لگوائے اور اُس کے بعد مستغیثہ سے کہا کہ "ایں قاتل بندۂ من بود من بتو بخشیدہ ام ایں را بزخم کارد بدستِ خود بکش" یعنی یہ قاتل آج تک میرا غلام تھا اب یہ تیرا غلام ہے اس کو تو اپنے ہاتھ سے قتل کر دے۔ ہیبت خاں نے منّت و سماجت

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۸۵: "ظالماں بر نمیداز د" وغیرہ وغیرہ (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہوں صـ۴۱ تا صـ۴۴ از برنی) ؎۱: تاریخ فیروز شاہی صـ۴۲ از برنی۔

کرکے لوگوں کو اپنا سفارشی بنایا اور اُس عورت کو بیس ہزار تنکہ (بطور خوں بہا) دیکر اس کی غلامی سے آزادی حاصل کی اور پھر گوشہ نشین ہوکر اپنی بقیہ زندگی گذار دی۔[1]

ان واقعات سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ بلبن کس مزاج اور کس قماش کا آدمی تھا۔

راجہ شیو پرشاد صاحب نے اپنی تاریخ میں بلبن کی بابتہ کتنا موزوں فقرہ لکھا ہے کہ "وہ اپنا نام اور کام دونوں اپنی یادگار چھوڑ گیا"[2] جس طرح بچوں پر ماں، باپ کی شفقت ومحبّت ہوتی ہے۔ اسی طرح مظلوموں وعاجزوں کے لئے اُس کی محبّت وشفقت مشہور ہے۔ برنی لکھتا ہے کہ "درباب مظلومان وعاجزاں پدری و مادری کردے و ازاں کہ پسراں ومقربان وخواصاں وکارداراں و والیاں ومقطعان، اورا ازمزاج انصاف ستانی وداددہی سلطان بلبن روشن بود زہرہ نبودے کہ ایشاں باغلام وکنیزک وسوار وپیادہ خود زیادتی کنند"[3] یعنی اُس کے عدل وانصاف کی وجہ سے کسی کی اتنی ہمّت نہ تھی کہ وہ اپنے ماتحتوں پر ذراسی بھی زیادتی کرسکے۔ حضرت امیر خسروؒ بھی برنی کے بیان کی تائید کرتے ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں ؎

غیاث الدین ودنیا شد براورنگ — زبہرِ عونِ مظلومانِ دل تنگ

خرام پیل نپسندید بر مور[4] — شہے بود اوکہ ازبخشائش وزور

اُس نے اپنے عمّال حکومت کی نگرانی ونیز ملک کی عام حالت سے باخبر رہنے کے لئے معتبر بریدوں کی ایک جماعت کو مملکت کے ہر چھوٹے بڑے شہر وقصبہ میں متعین کر رکھا تھا۔ یہ ایک طرح کا محکمۂ جاسوسی[5] تھا۔ یہ محکمہ صوبجاتی حکومتوں کے اثر و اقتدار سے باہر تھا۔ اِس محکمہ کے افراد براہ راست شہنشاہ کو جوابدہ تھے۔ ان

۱: برنی ص۴۰ و ۴۱۔ ۲: تاریخ آئینہ نما ص۲ و آئینہ حقیقت نما ص۲۸۲۔ ۳: تاریخ فیروز شاہی ص۴۲ از ضیائے برنی۔ ۴: ملاحظہ ہو مثنوی دولرانی قلمی در کتب خانۂ حبیب گنج ضلع علی گڑھ

۵: آج کل دنیا کی تمام متمدن حکومتوں میں جاسوسی کا محکمہ قائم ہے اور اُس سے طرح طرح کے

(باقی مضمون صفحہ ۲۸۸)

جاسوسوں کے خوف سے کسی مقطع، والی یا عامل کو اتنی جرأت و ہمت نہ تھی کہ وہ رعایا کے کسی فرد پر دست تظلم دراز کرسکے۔

(۲) ذاتی خصائل

عہد جوانی میں بلبن اپنی فیاضی کی بدولت بلاشبہ ایک مسرف اور عیش پسند امیر زادہ نظر آتا ہے لیکن تاج شاہی سر پر رکھتے ہی اُس نے تمام لغو مشاغل کو خیرباد کہہ کر وہ اعتدال و تقویٰ اختیار کیا جو اُس کے آقا سلطان شمس الدین التتمش کا امتیازی وصف سمجھا جاتا تھا۔ بادشاہ ہونے کے بعد بلبن کے اندر اِس طرح کی یکایک واچانک تبدیلی دُنیا کے اُن تمام غیر مسلم افراد کے لئے ضرور ایک معمہ سے کم نہیں جو حیات بعد الممات کے قائل نہیں اور جو مرنے کے بعد اپنے کو کسی کے سامنے جوابدہ نہیں سمجھتے لیکن ایک مسلمان کے لئے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کیونکہ اُس کا عقیدہ یہ ہے کہ مرنے کے بعد ایک وہ بھی دن آنے والا ہے جب کہ خدا عزوجل کے سامنے اس کو اپنے اعمال کا حساب دینا ہے۔ اس صورت میں اپنے اعمال ہی کیا کم ہیں جو دوسروں کے اعمال کی ذمہ داری بھی اپنے سر لیلی جائے۔ بلبن نے بتوفیق ایزدی اس بات کو سمجھا اور خوب سمجھا اُس کے نزدیک دُنیا میں نبوت کے بعد

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۸۷) یہ کام لئے جاتے ہیں لیکن بلبن کی طرح کوئی حکومت بھی اس سے اپنے حکام کے اعمال کی نگہداشت کا کام نہیں لیتی اور نہ اس کی ضرورت سمجھتی ہے کیونکہ حکام کے اعمال کو ذاتی (نجی) اور سرکاری دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے اگر کوئی حاکم ذاتی طور پر کتنا ہی بدچلن، فاسق و فاجر اور بد معاملہ ہو، رات کو کلب میں بیٹھ کر شرابیں پیتا ہو اور اپنے احباب کے ساتھ فلاش و برج کے ذریعہ مہذب جوا کھیل کر اپنا دل بہلاتا ہو تو کوئی ہرج کی بات نہیں۔ حکومت اُس سے کوئی تعرض نہیں کرتی بشرطیکہ وہ سرکاری فرائض کو قانون کے مطابق ٹھیک طور سے انجام دیتا ہو، اب اِس کا اندازہ آپ خود لگائیے کہ ایک ایسا حاکم جس کے ظاہر و باطن میں کوئی یکسانیت و مطابقت نہ ہو کیا وہ عدالت کی کرسی پر بیٹھ کر اُسی تدین و بے لوثی کے ساتھ سرکاری کام کو کرسکے گا جو وہ بصورت دیگر انجام دیتا؟ (مؤلف)

بادشاہت کا درجہ ہے جو ایک بڑی جسیم و عظیم نعمت ہے۔ وہ شہزادہ محمدؒ کو وصیت کرتے وقت آگاہ کرتا ہے کہ "دیکھو "الناس علیٰ دین ملوکھم" کی حقیقت کو ہمیشہ اپنے پیش نظر رکھنا اگر بادشاہ اور اُس کے اعوان و انصار و ولات و عمال وغیرہ دیندار و خدا ترس ہوں گے تو اس کے تمام ملک میں خرد و بزرگ، مرد و زن، پیر و جوان عدل احسان، خیرات و حسنات، طاعت و عبادت، امانت و دیانت اور راستی و راستکاری کو اپنا شعار بنائیں گے ورنہ بصورت دیگر سب کے سب فاسق و فاجر بن جائیں گے۔ ظاہر ہے کہ ان کے اعمال کی تمام تر ذمہ داری بادشاہ پر عائد ہو گی جن کا اُسے روز قیامت جواب دینا ہوگا اور وہ بڑا سخت دن ہوگا"[1] اس کے بعد ہدایت کرتا ہے کہ "خلیفہ دوم سیدنا عمر رضؓ اور (خلیفہ بنو امیہ) عمر ابن عبدالعزیز کی زندگی کو اپنے لئے نمونہ عمل بناؤ"[1]، اِسی طرح شہزادہ بغرا خاں کو صوبہ بنگال کی حکومت تفویض کرتے وقت نیک اعمال کی طرف یہ کہہ کر توجہ دلائی کہ "سب سے مشکل کام آخرت کا ہے وہاں جو تمھیں جواب دہی کرنا پڑیگی اُس سے غافل نہ رہنا"[2] وغیرہ وغیرہ

اُس نے اپنے دونوں بیٹوں کو وقتاً فوقتاً جو کچھ بھی وصیتیں و نصیحتیں کیں وہ اُن پر خود بھی کاربند تھا اُس کو اوباش و بدچلن نیز فاسق و فاجر سے خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان بڑی سخت نفرت تھی چنانچہ ایک مرتبہ شہزادہ بغرا خاں کو جو اوائل عمر میں شراب کا عادی تھا بہت سخت پکڑا اور پھر اِسی پر بس نہیں کیا بلکہ تنبیہ کے بعد "برایں پسر بریداں گماشت و در کار تتبع بسیار کرد او ہم راست ایستاد و لا یعنیہا ترک داد"[3] یعنی اُس کی دیکھ بھال کے لئے جاسوس مقرر کئے یہاں تک کہ وہ راہ راست پر آگیا اور بیہودہ مشاغل کو ترک کر دیا۔

ع۱:۔ تاریخ فیروز شاہی ص۶۷ تا ۷۰، از ضیائے برنی

ع۲:۔ " " " " ص۹۳، ۹۴

ع۳:۔ ضیائے برنی ص۸۱

غرضکہ بلبن نے ملک کی اخلاقی حالت کو بہت بلند کرنے کی کوشش کی جس کے لئے اُس نے سب سے پہلے اپنا نمونہ پیش کیا۔ وہ خود نہایت عابد و زاہد اور متقی و پرہیزگار شخص تھا۔ بادشاہ ہونے کے بعد ہر قسم کے لایعنی مشاغل سے توبہ کرلی اور برنی کی روایت[۱] کے بموجب طاعت و عبادت اور روزہ و نماز میں حد سے زیادہ انہماک برتتا۔ وہ نماز جمعہ و جماعت کے اہتمام میں نیز نماز اشراق و چاشت و اوابین و تہجد کی ادائیگی میں ذوق و شوق کے ساتھ حصہ لیتا تھا۔ راتیں خواہ وہ کسی موسم کی ہوتیں قیام میں گذارتا اور معمولات و ورد و وظائف سفر و حضر دونوں میں فوت نہ ہونے دیتا۔ کھانا کھانے کے وقت دینی مسائل پر علماء سے گفتگو کرتا اور جمعہ کی نماز کے بعد اُن کے[۲] مکان پر حاضری دیتا۔ اور اُن کے وعظ و نصائح کو کمال انکسار و ادب کے ساتھ سنتا تھا۔ بعض اوقات یہ بھی ہوتا تھا کہ وہ نہایت جاہ و جلال کے ساتھ سوار ہو کر کہیں جا رہا ہے راستہ میں دیکھتا کہ کسی مسجد میں وعظ ہو رہا ہے فوراً سواری پر سے اُتر کر عام مجمع میں جا کر بیٹھ جاتا اور ذکر و اذکار سے متاثر ہو کر زار زار رونے لگتا۔ نماز جمعہ کے بعد بزرگانِ دین کے مزارات پر حاضری دیتا اور اکابرین کی نماز جنازہ میں شرکت کرنا بھی اُس کے معمولات میں داخل تھا۔ برنی[۱] کے بیان کی تائید مؤلف طبقات اکبری نے چند اشعار کے ذریعہ کر کے دریا کو کوزہ میں بند کیا ہے اِس سے بلبن کے صاحب دل ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ لکھتا ہے ؎

فرکیخسروی از ینجا خاست	کہ جہاں زا بعدل و علم آراست
روزِ خلوت گلیم پوشیدی	بہ نماز و نیاز کوشیدی
روی بر ریگ و دل چو دیگ بجوش	دل سخن گستر و زباں خاموش

ع[۱]:۔ ضیائے برنی صـ ۴۶،۴۲ ۔ ع[۲]:۔ دہلی میں اُس وقت بڑے بڑے نامور علماء و مشائخ جمع تھے برنی نے مولانا برہان الدین بلخی، قاضی شرف الدین ولوالجی، مولانا سراج الدین سنجری اور مولانا نجم الدین دمشقی کے نام گنائے ہیں۔ جس طرح بلبن علماء و مشائخ کی قدر کرتا تھا اسی طرح لشکر کے قاضیوں کی بھی بڑی عزت

(باقی مضمون صفحہ ۲۹۱ پر)

تابدیدی دلش بدیدۂ راز   دیدنیہای ایں نشیب و فراز[1]

با ایں ہمہ وہ باغیوں و مجرموں کے لئے نہایت سخت تھا۔ وہ ان کو ایسی قابلِ عبرت سزائیں دیتا تھا جس سے سوسائٹی کا معیار بلند رہے اور بداخلاقیاں رعایا کا مزاج نہ بن سکیں اس کی اِس اصلاح پسند سخت گیری پر نکتہ چینوں نے بے رحمی و نامشروعیت کا بھی شبہ کیا ہے لیکن یہ اعتراض نگاہ کی کمی اور اخلاقی معیار کی پستی سے پیدا ہو سکتا ہے کیونکہ ؎

نکوئی با بداں کردن چنانست   کہ بد کردن بجائے نیک مرداں

لیکن اِسی کے ساتھ ساتھ محتاجوں کی امداد اور بیکسوں کی دستگیری اور ویران علاقوں کو آباد کرنے میں اُس کی رعایا پروری ضرب المثل تھی "ضعیفوں اور بیوہ و یتیموں کا اُس سے زیادہ ہمدرد اور خبر گیراں سردار ہندوستان بھر میں کوئی نہ تھا۔ اپنے غریب اور زخمی یا بیمار سپاہیوں کے ساتھ اُس کی مہربانی مشہور تھی کہ سفر کے دشوار گذار مقامات پر بادشاہی سواریاں اُن کے لئے وقف کردی جاتی تھیں اور جب تک وہ اُس مقام سے بہ آرام نہ گزر جاتے وہ آگے قدم نہ بڑھاتا۔ اور اِس سلسلہ میں بعض وقت اس کو اُس مقام پر دس اور بارہ بارہ دن تک قیام کرنا پڑتا۔ اور اس کو وہ بخوشی برداشت کرتا"[2]

برنی کے اِس بیان کی تصدیق ایک کتبہ سے بھی ہوتی ہے جو کہ نیم سنسکرت اور نیم مقامی زبان ہریانہ میں لکھا ہوا پالم کے مقام پر دستیاب ہوا ہے۔ کتبہ کا سن ۱۳۳۷ بکرمی مطابق ۱۲۸۰ء عیسوی ہے۔ اِس کتبہ میں گذشتہ سلاطین دہلی کی بیحد تعریف و توصیف کی گئی ہے۔ بلبن کے لئے خاص طور سے لکھا ہے کہ اس کی رعایا پروری کو دیکھ کر وشنو دیوتا کو اب اِس کی فکر نہیں رہی کہ وہ دُنیا کی دیکھ بھال کریں اس لئے وہ بشرام (آرام) کرنے کے لئے شیر ساگر (دودھ کا سمندر) کو چلے گئے ہیں"۔ اِسی کتبہ میں آگے چل کر دارالسلطنت دہلی

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۹۰ = کرتا تھا۔ یہ سب اپنی دینداری و تقویٰ کے لئے مشہور تھے (برنی صفحہ ۴۶)

[1]: طبقات اکبری صفحہ ۸۲ ج ۱   [2]: ضیائے برنی صفحہ ۴۵

کا کچھ حال عمدہ الفاظ میں لکھا ہے[1]۔

ملکی خدمات

(۱) اُمرائے چہلگانی و اقطاعداران شمسی

بلبن کے اُصول سلطنت کو سمجھ لینے کے بعد اب ہمیں اُس کے اُن احسانات کا ذکر کرنا ہے جو اُس نے ملکی خدمات کے سلسلہ میں انجام دئے۔ پچھلے سطور میں یہ بتایا جا چکا ہے کہ بلبن جو تخت و تاج کا مالک ہونے سے پہلے بھی امارت و سرداری کے مرتبہ پر فائز اور مختلف صوبوں کی حکومت پر قریباً ۲۰ سال مامور رہ چکا تھا بیحد عقلمند، ذی ہوش اور باریک بین شخص تھا اُس کو یہ بات بخوبی معلوم تھی کہ سلطان ایلتتمش کی وفات کے بعد ملوک شمسی نے با اقتدار ہو کر کس طرح بغاوتیں کی ہیں وہ ان بغاوتوں میں اپنے ماتحت ہندو راجاؤں کو بھی شریک کر لیتے تھے جیسا کہ قتلغ خاں نے سرمور کے راجہ دیپال سنگھ کو بغاوت میں اپنا شریک کر لیا تھا۔ چنانچہ اُس نے ۶۶۴ھ میں تخت نشین ہوتے ہی سب سے پہلے اپنی توجہ اِن اُمرائے چہلگانی کا اثر و اقتدار مٹانے میں صرف کی تا کہ اُن سے حکومت کو جو خطرات لاحق ہیں وہ باقی نہ رہیں۔ اِس کے لئے اُس نے مشروع و نا مشروع دونوں طریقوں سے کام لیا۔ بعضوں کو تلوار کے زور سے اور بعضوں کو زہر کی مدد سے موت کی نیند سُلا دیا اور جو باقی رہے وہ بے دست و پا ہو کر رہے۔

"ملوک شمسی" کی طرح ایک اور جماعت بھی تھی جو "اقطاعداران شمسی"[2] پر مشتمل تھی۔

۱؎ Epigraphia Indo-Moslemica 1913-14 PP 35-45 Palam inscription.

بحوالہ ایڈمنسٹریشن آف سلطنت آف دہلی از قریشی ص ۲۰۴ تا ۲۱۴

۲؎ شمس الدین التتمش نے تقریباً دو ہزار فوجی جوانوں کو دہلی کے اطراف میں زمینیں تقسیم کر دی

(باقی مضمون صفحہ ۲۹۳ پر)

اُن کے اُس نے تین حصّے کئے (۱) وہ لوگ جن کے پاس جاگیر تھی لیکن بڈھے ہونے کی وجہ سے فوجی خدمت انجام نہیں دے سکتے تھے اُن کی بابتہ دیوانِ عرض کو حکم دیا کہ ان کی جاگیریں ضبط کر کے خالصہ میں شامل کر لی جاویں اور اُس کی بجائے ۴۰ یا پچاس تنکہ اُن کے گذارے کے لئے مقرر کر دئے جائیں۔ (۲) دوسرے وہ لوگ جو ادھیڑ عمر کے ہیں اُن کی تنخواہیں اُن کے حسب استعداد مقرر کر دی جائیں۔ گانوں انھیں کے پاس رہنے دئے جائیں لیکن خرچ کے بعد جو رقوم بچیں وہ سرکاری خزانہ میں داخل کی جائیں۔ (۳) وہ اقطاعدار جو فوت ہو چکے تھے اور اُن کی جاگیر پر اُن کی نابالغ اولاد یا اُن کی بیوائیں قابض تھیں اُن کے بارے میں حکم ہوا کہ جائداد اُن سے لیلی جاوے اور اُن کے گذارے کے بقدر تنخواہ مقرر کر دی جاوے۔

بلبن کے اِن احکامات سے اقطاعداروں میں بڑی بے چینی پیدا ہوئی سب نے مل کر بلبن کی خدمت میں ایک عرضداشت پیش کی اور ملک الامراء فخر الدین کوتوال کو اپنا سفارشی بنایا اس پر بلبن نے رحم[1] کھا کر اپنے احکامات واپس لے لئے لیکن اقطاعدارو کو آئندہ کے لئے نصیحت ہو گئی اور وہ برابر جلال الدین خلجی کے عہد حکومت تک فوجی خدمت کرتے رہے۔

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۹۲ یہ تھیں ظاہر ہے کہ یہ اقطاع فوجی خدمت کے لئے دئے گئے تھے۔ التمش کے بعد یہ اقطاعدار جاگیروں کو اپنی ملکیت سمجھنے لگے اور فوجی خدمت سے گریز کرنے لگے۔ بلبن نے تخت نشین ہو کر لاہور کی طرف جاتے وقت ان کی خدمات طلب کیں لیکن چونکہ یہ لوگ دیوانِ عرض سے ملے ہوئے تھے اُس کو رشوت وغیرہ دیکر بچ گئے۔ بلبن نے واپس آکر ان اقطاعداروں کے لئے وہ احکامات نافذ کرنا چاہے جو اوپر مذکور ہوئے (مؤلف)

[1] ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سلطان فطرتاً رحیم تھا۔ رحم کے موقعوں پر بشرطیکہ اس سے انصاف کا خون نہ ہوتا ہو اس کا دل بھر آتا تھا اور وہ معاف کر دیا کرتا تھا۔ چنانچہ اس موقع پر بھی ایسا ہی ہوا۔ وہ رو پڑا اور حکم دیا کہ ان لوگوں کی تنخواہ (جاگیر) بدستور سابق باقی رہے اور کچھ بھی واپس نہ لیا جاوے (طبقات اکبری ص۸۶)

(۲) امن وامان قائم رکھنے کے بعض طریقے

(۱) سلطانی ارادے

مولانا ضیاء الدین برنی نے بڑی تفصیل کے ساتھ بلبن کی سرحدی پالیسی کا تذکرہ کیا ہے اِس سلسلہ میں سب سے پہلے سلطانی ارادوں پر روشنی ڈالی ہے۔ لکھا ہے کہ اُس کے وفادار اُمراء[۱] نے بار بار تقاضہ کیا کہ مالوہ اور گجرات کے اُن علاقوں پر دوبارہ چڑھائی کیجئے جو شاہان سلف کی کمزوری سے سلطنت دہلی کے ہاتھ سے نکل چکے ہیں۔ اس پر بلبن نے ہمیشہ انکار کیا اور کہا اگر میں دوسرے ملکوں پر چڑھائی کروں تو اُس سے دو عظیم خطرات کے پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔ اول یہ کہ میری غیر حاضری سے منگول دہلی پر قابض ہو جائیں گے اور ہندوستان کی سلطنتِ اسلامیہ کا شیرازہ منتشر ہو جائے گا۔ دوسرے یہ کہ اگر میں نئے صوبجات کو فتح کر کے دہلی سلطنت میں شامل کروں تو ہر صوبہ کے انتظام کے لئے کم از کم ۱۲ ہزار فوج ایک نہایت متدین و عاقل صوبیدار کے زیر تحت وہاں رکھوں اور تم دیکھتے ہو کہ لائق و تجربہ کار اشخاص کی اِس وقت کمی ہے۔ ۱۲ ہزار فوج کے متعلقین، ملازم اور شاگرد پیشہ سب مل کر کم و بیش ایک لاکھ کے قریب ہوتے ہیں۔ ان سب کو اگر میں اپنے سے جدا کر کے نئے مقبوضہ کے انتظام کے لئے باہر بھیج دوں تو اس سے دو خرابیوں کے پیدا ہونے کا اندیشہ ہے اوّل یہ کہ ایک لاکھ آدمیوں کے نکل جانے سے اجتماعی قوت کمزور ہو جائے گی۔ جس کے مضبوط رکھنے کی اس وقت جبکہ سرحد پر منگولوں کی فوجیں منڈلا رہی ہیں اشد ضرورت ہے۔ دوسرے یہ کہ ان ایک لاکھ وفاداروں کی جماعت مرکز سے دور دراز فاصلہ پر پہونچ جانے کے بعد

---

(۱)۔ وفادار اُمراء میں عادل خاں اور تمر خاں کا نام برنی نے بتایا ہے یہ دونوں عالی جاہ امیر اُمراء چہلگان میں سے تھے۔ (برنی صفحہ ۲۴، ۵۰)۔

ممکن ہے کہ خودسری کا خیال اپنے دماغ میں لائے اور پھر اُن کی تادیب کے لئے مجھے اُن پر فوج کشی کرنا پڑے تو اس طرح مسلمانوں کا جو خون ناحق بہے گا وہ میری گردن پر ہوگا اور اس سے خود اپنی طاقت بھی کمزور ہوجائے گی اس طرح دوہرا نقصان ہے۔ رہا فتوحات کا سوال تو تم جانتے ہو کہ آج جبکہ دنیا کا کوئی بادشاہ دہلی کی حکومت کا مقابلہ نہیں کرسکتا تو پھر ہندوستان کے رانا اور راجہ کس شمار و قطار میں ہیں۔ میرے چھ سات ہزار جوان اُن کی ایک لاکھ تعداد کے لئے کافی ہیں۔ اس موقع پر برنی کے الفاظ یہ ہیں "من یکو میدانم کہ پیش لشکر دہلی ہیچ بادشاہ دست استادن نتواند کرد نکیف رایان و رائگان ہندوان و آنکہ غیر الشاں یک لک پایک و دھانک بود کجا تاب لشکر من توانند آورد و از برائے نہب و تاراج ایشاں شش ہفت ہزار سوار دہلی کافیست[۱]"

دبدبۂ سرکار ان تمام وجوہ کی بنا پر میں اپنے دائرہ حکومت کو وسیع کرنے کے بجائے اس میں ہر قسم کی انتظامی خوبیاں پیدا کرنا اور نقائص کو دور کرنے میں مصروف رہنا زیادہ اچھا سمجھتا ہوں اِس مقصد کے حصول کے لئے اُس نے سب سے پہلے اپنی فوجی قوت کو مضبوط کیا اور اس کے لئے اُس نے عمدہ عمدہ گھوڑے[۲] اور ہاتھی فراہم کئے۔ جو اس کو آسانی سے مل گئے۔ فوج کو مضبوط کرنے کے بعد ضرورت

ع۱:۔ ضیائے برنی ص۵۲۔ بلبن کا یہ اندازہ ایک تاریخی حقیقت بن گیا جبکہ علاء الدین خلجی نے قلیل فوج لے کر دولت گری پر چھاپہ مارا اور کامیابی حاصل کی (مؤلف)

ع۲:۔ عربی النسل گھوڑوں کے لئے بھروچ (واقعہ سندھ) اور گجرات کے علاقے اور ہندی النسل گھوڑوں کے لئے بھٹنڈہ، سامانہ اور دامن کوہ شوالک کے علاقے مشہور تھے اور یہ سب بلبن کی مملکت میں داخل تھے۔ اسی طرح بنگال کے ہاتھی مشہور تھے جو بنگال کے گورنر اس کو فراہم کیا کرتے تھے۔ اہمیت کے لحاظ

باقی مضمون صفحہ ۲۹۶ پر)

اس امر کی تھی کہ اس کو ہر وقت کیل کانٹے سے درست اور چست و چالاک رکھا جائے اور اس کے لئے سیر و شکار سے بہتر کوئی صورت نہیں تھی۔ بلبن کا یہ معمول تھا کہ موسم سرما میں کوشک لعل سے آخر شب میں رخصت ہو کر ریواڑی[1] تک اور بعض دفعہ اس سے بھی آگے شکار کھیلنے کے لئے نکل جاتا اور بعد نماز عشاء دہلی واپس آتا۔ دہلی کی اردگرد چالیس کوس تک شاہی شکارگاہیں اور جنگلات تھے۔ شکار میں کئی ہزار فوج بھی شامل ہوتی تھی۔ مدعا اِس شکار اور سفر سے صرف یہ تھا کہ فوج اور گھوڑے جفاکش رہیں اور ضرورت کے وقت میدان جنگ میں کام آسکیں۔ مغلوں کے بادشاہ ہلاکو خاں کو بلبن کے جب شوقِ صید افگنی کی خبر پہونچی تو وہ چلا اٹھا "شکار کے دھوکے میں نہ رہنا۔ بلبن بڑا کار آزمودہ سپاہی ہے۔ اس کا یہ شکار محض سیر و تفریح کی غرض سے نہیں بلکہ کچھ زیادہ پر معنی مشغلہ ہے" اور حقیقت بھی یہی تھی ابھی بہت دن نہ گذرے تھے کہ اس پر معنی مشغلہ کے اظہار کا موقع پیش آگیا اگرچہ اس کا پہلا نشانہ مغل نہیں تھے بلکہ میوات و دوآبہ گنگ و جمن کے ڈاکو تھے۔

(ج) فوجی نظام بلبنی انتظامات کے سلسلے میں برنی نے فوجی تنظیم و ترتیب کا ذکر نہیں کیا لیکن آگے چل کر کیقباد کا حال لکھتے وقت ادھر اشارہ کیا ہے[2]۔ اس کے پاس باقاعدہ تنخواہ دار فوج تھی جو ہر وقت کیل کانٹے سے تیار رہتی تھی۔ فوج کی تعداد میں اختلاف ہے لیکن یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ پایہ تخت میں اس کے پاس ڈیڑھ لاکھ سپاہ ہر وقت موجود رہتی تھی۔ جاگیرداروں، گورنروں اور

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۹۵ = ۵۰۰ سے گھوڑے ایک ہاتھی کے برابر سمجھے جاتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ جب بنگال کے حاکم تتر خاں نے اس کو ۶۳ ہاتھی ہدیتاً پیش کئے تو بلبن نے ان کی خوشی میں ایک دربار منعقد کیا (مولف)

ع۱:۔ دہلی سے ۵۰ میل کے فاصلہ پر اجمیر کی سمت میں بی بی اینڈ سی آئی آر کا مشہور جنکشن ہے۔

ع۲:۔ ضیائے برنی صہ ۱۴۵ ملاحظہ ہو۔

ماتحت ہندو رؤساء کی امدادی فوجیں اس کے علاوہ تھیں۔ ہر فوجی سپاہی کو ۶ ماہ کے بعد میعادی رخصت دیجاتی تھی تنظیم و ترتیب کے لحاظ سے ۱۰ سپاہیوں کا افسر سرخیل ہوتا تھا۔ اور دس سرخیل کا ایک امیر لشکر یا سپہ سالار اور دس امیر لشکر پر ایک ملک یا امیر ہوتا تھا۔ دس ملک پر ایک خان حاکم ہوتا تھا۔ اس طرح ایک خان دس ہزار سپاہیوں کا افسر اعلیٰ ہوتا تھا۔" ان عہدہ جات کے علاوہ اور بھی عہدے تھے مثلاً خان خاناں اور خاقان وغیرہ۔

باقاعدہ فوجوں کے علاوہ اُس زمانہ میں ہر مسلمان فوجی سپاہی ہوتا تھا جس پر حکومت کی مدد کرنا ضروری ہوتا تھا اس طرح اندرونی و بیرونی خطرات کا مقابلہ کرنے کے لئے وقت ضرورت پر ایک کثیر التعداد فوج جمع ہو جاتی تھی۔ یہی وہ فوجی نظام و انتظامات تھے جن کی وجہ سے ہندوستان ایک عرصہ تک امن و امان کی زندگی گذارتا رہا۔

(۳) میوات و دوآبہ سے رہزنی کا استیصال یہ بتایا جا چکا ہے کہ ہندوؤں کے آخری زمانہ میں ملک کے اندر بڑا انتشار پھیلا ہوا تھا جس کی وجہ سے قومیں کی قومیں رہزنی و قزاقی کو اپنی جائز وجہ معاش سمجھنے لگی تھیں۔ مسلمانوں کی فتح نے جب اس طوائف الملوکی کا خاتمہ کیا تو اسی کے ساتھ رہزنی میں بھی کمی ہو گئی لیکن پورے طور سے اس کا استیصال نہ ہو سکا۔ گھنے جنگلوں اور دشوار گزار پہاڑی علاقوں میں وحشی قبائل کے بہت سے گروہ آباد تھے جن کا پیشہ رہزنی تھا۔ اگر بہ نظر انصاف دیکھا جائے تو آج بھی جبکہ انتظام حکومت میں بہت سی آسانیاں پیدا ہو گئی ہیں ہندوستان سے رہزنی کا کلی استیصال نہیں ہوا ہے اور کم آباد حصوں میں بعض اوقات بڑے بڑے ڈاکوؤں کی خبریں سننے میں آتی ہیں۔ اس لئے اُن دنوں میں جبکہ شمالی ہند کی آبادی کم تھی اور بہت سے علاقوں میں بڑے بڑے جنگل اور خوفناک بن کھڑے تھے، یہاں کے موروثی قزاقوں کا سدباب کرنا کچھ آسان بات

نہ تھی۔ لہٰذا کم سے کم شمالی ہند پر بلبن کا یہ بہت بڑا احسان ہے کہ سب سے پہلے اُسی نے وسیع پیمانہ پر اس کام کا بیڑا اٹھایا اور دہلی کے شمال سے ملک اودھ تک بڑے بڑے جنگل کٹوا کر ہزار ہا قزاقوں کو تہ تیغ کیا اور جابجا مستحکم قلعے اور تھانے بنا کر چھوٹی چھوٹی چھاؤنیاں قائم کر دیں۔ ان تھانوں میں افغانوں کو مامور کیا اور ان کی وجہ معاش کے لئے یہ علاقے بطور جاگیر کے اُن میں تقسیم کر دئے۔

(ا) ڈاکوؤں کی تادیب کے لئے بلبن نے سب سے پہلے میوات (الور، متھرا، بھرتپور) کے علاقہ کو منتخب کیا کیونکہ یہ علاقہ دہلی سے متصل تھا اور یہاں کے ڈاکوؤں کی چیرہ دستیاں پایہ تخت دہلی کے باشندوں پر اثر انداز ہوتی تھیں۔ میواتیوں کی سنہ ۱۲۶۰ء میں بھی گوشمالی کی جا چکی تھی لیکن اب ان کی جرأت یہاں تک بڑھ گئی تھی کہ دن دھاڑے دہلی کی شہر پناہ کے نیچے آکر ڈاکے مارتے، رات کو شہر میں چوری اور قتل کی وارداتیں کرتے اور بھاگ جاتے تھے۔ بیرون دہلی کی تمام سرائیں انھوں نے اُجاڑ دیں۔ سوداگروں کے لئے تجارت کرنا دشوار کر دیا۔ اکثر ایسا بھی ہوتا تھا کہ ان ڈاکوؤں کے جتھے دن دوپہر شہر کی فصیل کے نیچے آکر پانی بھرنے والی عورتوں کے کپڑے اُتار لے جاتے اور مویشیوں کو ہنکا لے جاتے تھے۔ ان ڈاکوؤں کا اتنا خوف طاری تھا کہ ظہر کی نماز کے بعد ہی سے دہلی کی مغربی شہر پناہ کے دروازے بند کر دئے جاتے تھے۔ بلبن نے تخت نشین ہوتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ میوات کے ڈاکوؤں کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر تہ تیغ کیا۔ ان کی بیوی بچوں کو لونڈی غلام بنا لیا۔ جنگلات کٹوا ڈالے۔ گوپال گیر میں قلعہ تعمیر کرایا اور شہر دہلی کی حفاظت کے لئے پولیس کی چوکیاں چاروں طرف قائم کرا دیں۔ اس طرح ایک سال کی جد و جہد کے بعد سنہ ۱۲۶۸ء تک میوات کے علاقہ میں امن و امان بحال ہو گیا اور مسدود راستے جاری ہو گئے۔

(ب) میوات کی مہم سے فارغ ہونے کے بعد بلبن نے دوآبہ کی طرف رُخ کیا جہاں کے ڈاکوؤں نے دہلی و بنگال کے راستوں کو ایک عرصہ سے بند کر رکھا تھا۔ ان کی رہزنی

اور قتل و غارت گری سے علاقے کے علاقے ویران ہو گئے تھے۔ جلالی[1]، پٹیالی[2]، کمپل[3] اور بھوجپور[4] چوروں اور ڈاکوؤں کے مرکز تھے اُس زمانہ میں یہ تمام علاقے جنگلات سے گھرے ہوئے تھے۔ بلبن نے اِس علاقے میں کئی مہینے تک مقیم رہ کر جنگلات اور ڈاکوؤں سے دوآبہ کو صاف کرایا۔ اور ڈاکوؤں کے مرکزوں میں عالیشان قلعے اور مسجدیں تعمیر کرا کر افغانوں و مسلمانوں کو آباد کرایا۔ ابھی وہ قلعے اور تھانوں کے انتظام میں مصروف و مشغول تھا کہ کٹھیر کے علاقے سے مفسدوں کے فساد کی خبریں آنا شروع ہوئیں۔ ان مفسدوں نے امن پسند رعیت کو تباہ و برباد کر دیا اور اتنی طاقت پکڑ لی کہ امروہہ و بدایوں کے صوبیداروں کو اُن کے مقابلہ کی ہمت نہ رہی۔

(ج) بلبن نے کنپل و پٹیالی سے دہلی واپس جا کر قدرے آرام کیا[5] اور پھر نئی فوجیں لے کر کٹھیر کی طرف متوجہ ہوا۔ یہاں آکر بڑی سختی کے ساتھ مفسدوں کی سرکوبی کی اور اُن کے کشتوں کے پشتے لگا دئے۔ اُس نے عورتوں اور بچوں کے سوا کسی متنفس کو زندہ نہ چھوڑا۔ غرضکہ چند سال کی پیہم کوششوں کے بعد امروہہ، سنبھل، بدایوں و گنور

ع ۱:۔ جلالی آج کل ضلع علی گڑھ میں واقع ہے۔ اِن چاروں مقامات کو راقم الحروف نے خود جا کر دیکھا ہے۔

ع ۲:۔ پٹیالی پرانا قصبہ ہے امیر خسرو یہیں پیدا ہوئے تھے ضلع ایٹہ کی تحصیل ہے لیکن غدر تک علاقہ ایٹہ کا صدر مقام تھا کنارِ گنگ واقع ہے۔

ع ۳ و ۴:۔ کمپل اور بھوجپور ضلع فرخ آباد میں ہیں کمپل کسی زمانہ میں دروپدی کے والد بزرگوار راجہ پانچال کا صدر مقام تھا یہیں دروپدی کا سوئمبر ہوا تھا پرانے آثار اب بھی موجود ہیں کسی زمانہ میں گنگا کے کنارے آباد تھا جہاں ہندوؤں کے نہانے دھونے کے لئے شاہانِ مغلیہ (فرخ سیر وغیرہ) نے پختہ گھاٹ اور بسرانتین بنوائیں۔ آج کل یہ قصبہ تحصیل قایم گنج میں آباد ہے۔

ع ۵:۔ مہموں سے فارغ ہو کر جب سلاطین دہلی شہر میں داخل ہوتے تھے تو اُن کا باشندگان شہر استقبال کرتے تھے۔ شہر کو آراستہ کر کے جشن منایا جاتا تھا۔ دہلی میں یہ رسمیں بلبن کے زمانہ سے جاری ہوئیں (مؤلف)

وغیرہ میں امن وامان قائم ہوگیا اور اِس طرح ہندوستان خاص کو ڈاکوؤں، رہزنوں اور مفسدوں سے بالکل پاک وصاف کردیا گیا۔ ضیائے برنی شہادت دیتا ہے کہ "ڈاکوؤں کا شر اور رہزنوں کی بلا ہندوستان کے راستوں سے دور ہوگئی اور ہمارے زمانہ تک کہ بلبنی قلعوں کی تعمیر اور تھانوں کے استحکام کو تین پشتیں گذر چکی ہیں ہندوستان کے راستے جاری ہیں اور رہزنی کلیتاً موقوف ہوگئی ہے"[1]

۴۔ شمالی ومغربی سرحدات کا انتظام

(۱) دفاعی مشکلات

ڈکیتی ورہزنی کا یہ استیصال جس کے بغیر کوئی حکومت اندرونی انتظامات کے لحاظ سے قابل تعریف نہیں کہلائی جاسکتی بلبن کا (اُس زمانہ کو دیکھتے ہوئے) ایک بہت بڑا کارنامہ ہے لیکن اُس کے تدبّر اور حسن انتظام کا سب سے اچھا ثبوت وہ انتظامات ہیں جو اُس نے ہندوستان کو مغلوں کی بلا سے محفوظ رکھنے کے لئے ترتیب دیئے۔ دفاعی مشکلات کو سمجھنے کے لئے یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اُس زمانہ میں دہلی کی حکومت آج کی طرح کوہستان سلیمان کی قدرتی فصیل سے کوئی فائدہ نہیں اُٹھاسکتی تھی کیونکہ دریائے جہلم کے پار مغرب میں جو پہاڑی علاقہ ہے وہ اُس زمانہ میں بہت کم آباد اور ناقابلِ زراعت تھا اور سامان رسد کی قلت کی وجہ سے وہاں کسی بڑی چھاؤنی[2] کا بننا ایک امر محال تھا۔ دوسرے اس علاقے کے نیم متمدن اور جنگجو قبائل جو باعتبار قومیت "کھوکھر" کہلاتے تھے ہندوستان کی دشمنی پر ہمیشہ تلے رہتے تھے اور جو کوئی حملہ آور دریائے سندھ

---

[1]:- برنی نے اکثر جگہ بلبن کے انتظامات کو سراہا ہے۔ رہزنی کے دفعیہ کے لئے ملاحظہ ہوں صفحات ص۵۵ تا ص۵۹ از تاریخ فیروز شاہی۔

[2]:- آج کل ریل نیز دیگر ذرائع کی وجہ سے یہ دشواری باقی نہیں ہے (مؤلف)

کو عبور کر کے ہندوستان میں داخل ہوتا تھا یہ قبائل لوٹ مار کے لالچ میں بلامنت اُس کے مددگار بن جاتے تھے۔ تیسرے یہ کہ ساتویں صدی ہجری میں افغانستان کے پہاڑوں میں اتنی کثیر جنگی آبادی پرورش پاتی تھی۔ کہ غزنی وغیرہ کو مرکز جنگ بنا کر شمالی ہند کو فتح کرنے کی تیاریاں کرنا کچھ دشوار نہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ بابر و اکبر کے عہد سے پہلے جب تک افغانستان کشور ہند کا بیرونی مورچہ نہ بنا، ہندوستان خاص کے رہنے والوں کو کبھی بیرونی حملوں کے خوف سے نجات نہ ملی۔

ان دفاعی مشکلات کے علاوہ ایک وقت اور تھی اور وہ یہ کہ اُس زمانہ میں ہندوستان کے اندر مسلمانوں کی تعداد کم تھی اور جو تھے بھی وہ اگرچہ زیادہ تر سپاہی پیشہ تھے لیکن تعداد میں اتنے کم تھے کہ مغلوں کے سیلاب کو بمشکل روک سکتے تھے، اور خاص کر اس صورت میں جبکہ حملہ آوروں کا مقصد لوٹ مار کے سوا اور کچھ نہ تھا وہ قزاقوں کی طرح جدھر سے میدان خالی پاتے گھس آتے تھے اور جب گھرنے کا اندیشہ ہوتا تو اتنی ہی تیزی کے ساتھ فرار ہو جاتے تھے۔ یہ نہایت جری اور بلا کے لڑنے والے تھے شجاعت میں ان سے دُنیا کے اندر صرف ترک ہی بازی لے جا سکتے تھے جنھوں نے اپنی قلت تعداد اور پیہم ناکامیوں کے باوجود مغلوں کے دل پر اپنی شمشیر زنی کا سکّہ بٹھا دیا تھا اسے ہندوستان کی خوش قسمتی سمجھنا چاہیے کہ فتنۂ مغول کے زمانہ میں یہاں بھی اسی قوم کے افراد حکومت کرتے تھے۔

۴۔ (ب) لاہور کی دوبارہ تعمیر۔ سلطان ناصرالدین محمود کے عہد میں ان خوفناک مغل حملہ آوروں کو روکنے کی دشوار خدمت ملک شیر خاں سنقار (سنقر) کے سپرد ہوئی تھی جو بلبن کا چچا زاد بھائی تھا اُس نے جس مستعدی و خوبی سے یہ خدمت انجام دی اُس کی ہر ایک نے تعریف کی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ سنہ ۱۲۴۱ء میں لاہور کے تاراج و مسمار ہو جانے کے بعد شمالی پنجاب

کو مغلوں کے ناگہانی حملوں سے بچانا محال ہو گیا تھا اور چناب کے پار تمام علاقے کو پامال کر دینے سے مغلوں کا مقصد بھی یہی تھا کہ سلطنت دہلی اِس حصہ میں کوئی بڑا جنگی مرکز قائم نہ کرنے پائے اِس مقصد میں کھوکھروں کی غارت گر قوم بلا منت اُن کی حلیف ہو گئی۔ اور جب تک بلبن نے اِن غداروں کو سخت سزائیں نہ دیں لاہور کا علاقہ ویران و بے چراغ رہا اور سرحد کا سب سے بڑا دفاعی مرکز بہت دور جنوب میں ہٹ کر دیپالپور میں قائم کرنا پڑا۔ اِس سے دیپالپور کی رونق و منزلت تو ضرور بڑھ گئی لیکن لاہور کو خراب حالت میں چھوڑے رکھنے کے معنی یہ تھے کہ گویا سلطنت دہلی شمالی و مغربی پنجاب کی حفاظت کا ذمہ لینے سے ہچکچاتی ہے۔

الغرض ۱۲۷۰ء میں شیر خاں سنقر کے مرنے کے بعد جس نے ۱۲ سال تک سد سکندری بن کر مغلوں کے بار بار حملوں کو روکا تھا اور جس کے نام سے منگول لرزتے تھے بلبن نے لاہور کی طرف توجہ کی۔ اِس عرصہ میں وہ میوات و دوآبہ کی مہمات سے فارغ ہو چکا تھا۔ اُس نے پہلے جہلم و چناب کے دوآبہ میں بسنے والی سرکش قوموں کی سرکوبی کی۔ بعدہٗ دو برس کے بعد لاہور جا کر شہر و قلعہ کی از سرِ نو تعمیر کی۔ اُس نے سلطنت کی طرف سے بہت سے معمار اِس کام پر مقرر کر دیئے کہ وہ نواحِ لاہور کے دیہات میں رعایا کے مکانات بنائیں پھر غالباً یہاں کے قدیم باشندوں کو جو متفرق اور نہایت شکستہ حال ہو گئے تھے لا لا کر بسایا اور ان اضلاع میں نئے سرے سے زندگی پیدا کی کیونکہ گذشتہ تیس سال تک ویران رہنے کی وجہ سے یہاں کے دیہات میں رہنے کے گھر تو درکنار پانی پینے کے لئے کنوئیں تک باقی نہیں رہے تھے۔ اُس نے سرحد پر نئے قلعے بنوائے اور پرانوں کو مرمت کرا کر مضبوط کر دیا اور ان میں قابل افسروں کے ماتحت مستقل تربیت یافتہ فوجیں تعینات کیں۔

(ج) <u>سندھ و ملتان کا انتظام</u>۔ اقطاع لاہور کو آباد کرنے کے ساتھ ساتھ

بلبن نے ممالک سندھ و ملتان پر خاص توجہ کی جو حقیقت میں ملک پنجاب کا بازو تھے۔ ان صوبجات پر اُس نے سلطنت کے بہترین اشخاص کو حاکم مقرر کیا اور اُن کا صدر صوبہ دار اپنے بڑے بیٹے شہزادہ محمدؐ کو بنایا جو اس سے پہلے کول (علی گڑھ) کا حاکم تھا۔ دریائے جہلم سے لے کر ساحلِ بحر تک تمام علاقہ شہزادہ محمدؐ کی نگرانی میں تھا اور اس کا مستقر ملتان تھا۔ اِس شہزادہ کی علم دوستی[1] اور اعلیٰ اخلاق کی مدح و ثنا میں مورخین اور ہمعصر شعراء[2] نے ورق کے ورق تحریر کئے ہیں۔ لیکن اس کی انتظامی و جنگی قابلیت کی شاید بہترین سند یہ ہے کہ بلبن جیسا سخت گیر و نکتہ چین بادشاہ بھی دل سے اُس کی خوبیوں کا معترف تھا اور اسی لیے اس کو "قآن ملک" کا خطاب عطا فرمایا تھا۔

شہزادہ محمدؐ نے بارہ تیرہ سال تک نہایت کامیابی کے ساتھ سرحدات کی حفاظت

ع۱:- شہزادہ محمدؐ نہایت قابل، صاحب علم اور علماء کا قدردان تھا۔ شیخ سعدیؒ کو اپنے دربار میں لانے کے لیے دو مرتبہ سفیر روانہ کئے لیکن شیخ موصوف اپنی پیرانہ سالی کی وجہ سے ارادہ کر کے رہ گئے اور معذرت چاہ لی۔ شہزادہ کی تہذیب و متانت کا یہ حال تھا کہ جب دربار میں بیٹھتا تو گو کبھی کبھی دن کا دن گذر جاتا تھا لیکن زانو نہیں بدلتا تھا۔ اس کی مجلس میں ہمیشہ شاہنامہ، دیوان خاقانی، انوری اور خمسہ نظامی کے اشعار پڑھے جاتے تھے۔ اُس نے ایک بیاض تیار کی تھی جس میں اپنے مذاق کے موافق بیس ہزار شعر انتخاب کر کے درج کئے تھے۔ ان اشعار کے انتخاب پر حسن دہلوی اور امیر خسرو بھی داد دیتے تھے۔ ارباب ذوق اس کی نقلیں لیتے تھے یہ بیاض ایسی نادر چیز تھی کہ جب شاہزادہ کا انتقال ہوا تو سلطان غیاث الدین نے اپنے خاص دوات دار امیر علی کو دی۔ امیر علی کے بعد امیر خسرو کے ہاتھ آئی۔ (شعر العجم جلد ۲ صفحہ ۱۰۱)

ع۲:- امیر خسرو اور حسن دہلوی شہزادہ کے دربار سے منسلک تھے جن کے انتخاب پر شیخ سعدیؒ نے اُس کو مبارکباد دی تھی۔ شہزادہ کے دربار میں ایسے ایسے اہل کمال جمع تھے جن کی وجہ سے بلبن کو بھی اُس کے دربار پر رشک ہوتا تھا۔

کی اِس تمام مدّت میں مغلوں کی کسی بڑی جماعت کو چناب کے عبور کرنے کی جرأت نہ ہوئی اور اگر انھوں نے سرحد کی طرف آنے کا ارادہ بھی کیا تو شہزادہ خود مقام مخدوش پر پہونچ جاتا تھا اور آخر کار اِسی مدافعت کا حق ادا کرنے میں اس کی جان گئی اور وہ ۶۸۴ھ / ۱۲۸۵ء میں شہید ہو گیا۔ مغل اپنے پچھلے نقصانات کا انتقام لینے کے لئے بڑے ساز و سامان کے ساتھ ہندستان آئے ان کا سردار تیمور یا تمر خاں اپنے زمانہ کا بڑا مشہور اور آزمودہ کار سپہ سالار تھا لیکن بلبن کے دفاعی انتظامات کی بدولت اول تو مغل کسی بڑے شہر پر حملہ نہ کر سکے اور دوسرے کھلے میدان کی دونوں لڑائیوں میں انھیں ہندی افواج نے شکست دی اور یہ محض اتفاق کی بات تھی کہ فتحمند شہزادہ کو قلیل جماعت کے ساتھ اپنے تعاقب میں آتا دیکھ کر انھوں نے اُسے گھیر لیا۔ موقع تھا کہ وہ میدان سے بچ کر نکل جاتا لیکن شہزادہ محمدؒ نے شجاعت کے جوش میں احتیاط کو بزدلی جانا اور بے شبہہ وہ اپنی بہادری سے یہ لڑائی بھی جیت جاتا کہ ناگہاں ایک تیر نے اُس کا کام تمام کر دیا۔ اس طرح وہ خود شہید ہوا[1]

---

[1] ۔ مغلوں کے سپہ سالار تیمور خاں کو شکست دینے کے بعد اُس کا تعاقب کیا۔ چونکہ ظہر کی نماز نہیں پڑھی تھی اِس لئے ایک تالاب کے کنارے اپنی مختصر سی جمعیت کے ساتھ جس میں صرف پانچسو آدمی شامل تھے نماز میں مشغول ہو گیا۔ مغلوں کو موقع مل گیا انھوں نے دو ہزار کی جمعیت کے ساتھ حملہ کیا سلطان محمدؒ نے نماز سے فارغ ہو کر تاتاریوں کا مقابلہ کیا اور گو بار بار اُن کو شکستیں دیں لیکن اتفاق سے ایک تیر آ کر لگا اور وہ زخم کھا کر شہید ہو گیا۔

امیر خسروؒ اور حسن دہلوی بھی اِس معرکہ میں شریک تھے۔ دونوں گرفتار کر کے بلخ لیجائے گئے جہاں وہ دو برس تک قید رہے۔ امیر خسروؒ نے شہزادہ کی شہادت پر نہایت پُر اثر دو مرثیے لکھے جن کو لوگ پڑھ کر اپنے مقتول عزیزوں پر نوحہ کرتے تھے ان میں ایک مرثیہ بہت بڑا ہے اس میں لڑائی کی تمام کیفیت لکھی ہے اخیر کے بند جہاں شہزادہ کی شہادت کا ذکر ہے نہایت پُر اثر ہیں۔ مرثیہ کے چند اشعار درج کئے جاتے ہیں۔

(باقی مضمون صفحہ ۳۰۸ پر)

ہوگیا اس کے ساتھیوں میں سے بعض مارے گئے اور کچھ مغلوں کے ہاتھوں میں گرفتار ہوگئے۔ انھیں اسیروں میں حضرت امیر خسروؔ بھی تھے جو اس شہزادے کے محبوب مصاحبوں میں تھے۔ یہ دو برس تک بلخ میں قید رہنے کے بعد بمشکل چھوٹ کر ہندوستان آئے۔

سلطان محمدؔ کی شہادت کے بعد جس کو ”خان شہید“ بھی کہتے ہیں بلبن نے مولتان کا والسرائے اس کے بیٹے کیخسرو کو مقرر کیا جو اپنے باپ کی طرح علم دوست، شجاع و فیاض تھا۔

۴۔(د) مرکزیت کا استحکام اور طغرل کی بغاوت

اپنے پیشرو سلاطین قطب الدین و التمش کی طرح بلبن کو بھی اس امر کا از حد خیال تھا کہ ہندوستان کو ایک مرکز پر متحد رکھا جائے اور دہلی کی مرکزیت

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۳۰۴)

واقعہ است ایں یا بلا از آسماں آمد پدید — آفت است ایں یا قیامت در جہاں آمد پدید

راہ در بنیادِ عالم داد سیلِ فتنہ را — رخنہ کا مسال در ہندوستاں آمد پدید

مجلسِ یاراں پریشاں شد چو برگِ گل زباد — برگ ریزی گوئی اندر بوستاں آمد پدید

بسکہ آب از چشم خلقے شد رواں در چار سو — پنج آبے دیگر اندر مولتاں آمد پدید

تا چہ ساعت بد کہ شاہِ مولتاں لشکر کشید — تیغ کافر کش برائے کشتنِ کافر کشید

انچہ حاضر بود لشکر، لشکرِ دیگر نہ جست — زاں کہ رستم را نشاید منتِ لشکر کشید

او دریں تدبیر آگہ نے کہ تدبیرِ فلک — صفحۂ تدبیر را خطِ مشیت در کشید

تا چہ ساعت بد کہ کافر بر سرش لشکر کشید — جوق جوق از آب بگزشتند و ناگہ در رسید

بند نہم میں شہزادہ محمد کی جوانمرگی اور اہل ملتان کے رنج و غم کا اس طرح ذکر کیا ہے ؎

مہر و مہ بر روئے آں فرخ بقا بگریستند — روز و شب بر سال آں اندک بقا بگریستند

خلقِ ملتاں، مرد و زن موئیہ کناں و مُو کناں — کو بکو و سو بہ سو و جا بجا بگریستند

از خروش گریہ و بانگِ دہل شب کس نہ خفت — بس کہ در ہر خانۂ اہل عزا بگریستند

(تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو منتخب التواریخ جلد اول صفحہ ۱۳۳ تا صفحہ ۱۵۱)

کو مستحکم کیا جاوے اس کا تحریری ثبوت اس کی وہ نصیحتیں ہیں جو بنگالے کی بغاوت کو فرو کرنے کے بعد اپنے چھوٹے بیٹے بغرا خاں کو وہاں کا صوبیدار بناتے وقت کی تھیں۔

بغاوت کے اسباب کو برنی[1] نے تفصیل کے ساتھ تحریر کیا ہے اس میں فرشتہ نے اتنا اور اضافہ کیا ہے کہ "۶۷۸ھ ۱۲۷۹ء میں بادشاہ اس قدر علیل ہوا کہ مہینہ بھر تک محل سے باہر نہ آسکا اور دور کے شہروں میں اس کی وفات کی خبر مشہور ہوگئی"[2]۔ لکھنوتی میں ان دنوں بلبن کا ایک غلام ملک طغرل صوبہ دار تھا جس کی انتظامی قابلیت اور شجاعت و سخاوت مسلمہ تھی۔ اسی زمانہ میں ریاست جاج نگر[3] کے ساتھ اس کی جنگ ہوئی جس میں اس کو بیشمار مالِ غنیمت ہاتھ لگا۔

غرض کچھ تو فتحیابی کے غرور اور کچھ لکھنوتی کے بغاوت پسند مصاحبوں کے اغوا سے طغرل بغاوت پر آمادہ ہوگیا۔ بظاہر اُسے یہ بھی اطمینان تھا کہ بوڑھے بادشاہ کو رہزنوں کے استیصال اور مغلوں کے حملے روکنے کے لئے پنجاب کے دفاعی انتظامات میں اتنا انہماک ہے کہ وہ بنگالے پر فوج کشی نہیں کر سکے گا۔ بہرحال بلبن کو جب بنگالے کے سلطنت دہلی سے انقطاع تعلق کرنے کی اطلاع ملی تو بلبن پر رنج و غضب

ع [1]:۔ ضیائے برنی صـ ۸۲ تا صـ ۸۳ ۔ ع [2]:۔ فرشتہ صـ ۷۹

ع [3]:۔ الفنسٹن اور بعد کے اکثر یورپی مورخین نے جاج نگر کے متعلق دھوکا کھایا ہے وہ اسے لکھنوتی کے مشرق میں موجودہ آسام کے قریب کا علاقہ سمجھ کر طرح طرح کی غلطیاں کرتے ہیں۔ حال میں ڈاکٹر ٹیلاح ایین اور میجر راورٹی نے تحقیق کر کے اس قدیم ریاست کی حدود متعین کی ہیں۔ اس ریاست میں مہاندی سے لے کر گوداوری تک کا علاقہ شامل تھا جو بعد میں جنوبی گونڈوانہ کہلایا اور اب صوبجات متوسط کا مشرقی حصہ ہے اس کے اور مسلمانوں کے مشرقی صوبوں کے درمیان "گڈھہ کٹنگہ" نامی علاقہ حائل تھا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ کہیں کہیں ریاست جاج نگر کی حدیں مہاندی کے پار شمال تک پھیلی ہوئی تھیں اور اس قرب کی وجہ سے لکھنوتی کے صوبیداروں سے اس ریاست کی اکثر لڑائیاں ہوتی رہتی تھیں۔ (ملاحظہ ہو طبقات ناصری فٹ نوٹ صـ ۵۸۷ تا صـ ۵۹۴ از راورٹی)

کی وجہ سے کھانا پینا حرام ہو گیا اور اس کے غصّہ کو اس واقعہ نے اور بھی بڑھا دیا کہ وہ طغرل جواب مغیث الدین کے لقب سے اپنی خود مختار بادشاہت کا اعلان کر رہا تھا خود بلبن کا دست پروردہ اور معتمد علیہ غلام تھا۔

طغرل کی بغاوت کو فرو کرنے کے لئے بلبن نے ایتگین موئے دراز کو جس کو امین خاں بھی کہتے ہیں نامزد کیا۔ امین خاں مدّت سے اودھ کا صوبیدار تھا اور نہایت کار آزمودہ سپاہی تھا اُس کی مدد کیلئے دہلی سے تمر خاں شمسی اور ملک تاج الدین پسر قتلغ خاں شمسی کو فوجیں دے کر روانہ کیا لیکن ان سب کو طغرل کے مقابلہ پر شکست ہوئی۔ کچھ فوج کو رشوت دے کر دشمن نے اپنی طرف ملا لیا باقی فوج کو واپسی کے وقت راستے میں ہندو رُوساء نے ٹھکانے لگا لیا۔ بلبن کو اِس ہزیمت کا اتنا ملال تھا کہ درباری اس کے غم و غصّہ کی وجہ سے اس سے بات کرتے ہوئے ڈرتے تھے۔ امین خاں کو اُس نے پھانسی دے کر ایودھیا دروازہ پر لٹکا دیا۔

دوسری مہم ملک طرغی کے ماتحت روانہ کی گئی لیکن اُس کا حشر بھی امین خاں کی طرح ہوا۔ اِس شکست نے بادشاہ کی آتشِ غضب کو گویا خجالت کا تیل چھڑک کر اور بھی بھڑکا دیا اور ستر سال سے زیادہ عمر ہونے کے باوجود اس مرتبہ فوج کی سپہ سالاری اُس نے خود اپنے ہاتھ میں لی۔ اُس نے نہ درازیٔ سفر کی پرواہ کی اور نہ موسم کی خرابی کو خاطر میں لایا بلکہ دہلی سے جو نکلا تو فیض آباد (ایودھیا) تک منزل بمنزل برابر کوچ کرتا چلا گیا۔ اور پھر یہاں چند روز ٹھہر کر جو روانہ ہوا تو سخت بارشوں کو بھی خاطر میں نہ لایا اور صرف

ع ۱:۔ دہلی سے پہلے بلبن سامانہ و سنام کی طرف گیا اور یہاں سے بغرا خاں کو اپنے ساتھ لیا۔ سامانہ و سنام کا حاکم ملک سونج کو مقرر کیا اور اس کو ہدایت کی شہزادہ محمد کی نگرانی میں کام کرے۔ یہیں سے ایک فرمانِ نیابت ملک الامراء فخر الدین کوتوال دہلی کو بھیجا اور مرکز کے تمام اُمور کا اُس کو مختار کل بنا دیا (برنی صفحہ ۸۵)۔

مجبوری سے کہیں کہیں ٹھہرتا ہوا بہت جلد لکھنوتی پہونچ گیا۔ اس کے لشکر میں سپاہی اور بہیرو بنگاہ کے لوگ مل کر کل دو لاکھ آدمی تھے۔ لکھنوتی پہونچنے سے پہلے طغرل فرار ہو چکا تھا اس لئے بغیر کسی مقابلہ کے بنگالہ پر قبضہ ہو گیا لیکن بلبن نے چونکہ عہد[1] کر لیا تھا کہ جب تک وہ طغرل کو گرفتار کر کے قرار واقعی سزا نہیں دے لے گا اس وقت تک دہلی واپس نہیں جائے گا۔ اس لئے اس کو جب یہ پتہ لگا کہ طغرل جاجنگر کی طرف بھاگ گیا ہے تو وہ اس کی تلاش میں سنارگانوں[2] کی طرف آیا۔ یہاں اُس نے ایک ہندو راجہ دنوج[3] رائے سے عہد و پیمان لیا کہ وہ طغرل کو خشکی یا تری کے راستے سے فرار ہونے میں مدد نہیں دے گا۔ اس کے بعد حدود جاج نگر میں ساٹھ ستر کوس تک بڑھتا چلا گیا لیکن طغرل کا پتہ پھر بھی نہیں چلا اس پر اُس نے ملک باربک بیکترس کو ستر اسّی ہزار سوار دیکر حکم دیا کہ وہ لشکر سلطانی سے دس بارہ کوس آگے آگے چلے اور روزانہ کچھ منتخب سواروں کو بر طریق زبان گیری دس بارہ کوس آگے بھیج کر دشمن کا پتہ چلائے۔ اس طرح جاجنگر کے کوہ و بیابان کا چپہ چپہ چھان مارا۔ آخر کار کئی مہینے کی تگ و دو اور پیہم جستجو کے بعد فوج ہراول کے ایک دستے نے جو محمد شیر انداز حاکم کول (علی گڈھ) اور اُس کے بھائی ملک مقدر کی ماتحت تھا طغرل کا پتہ لگا لیا۔ یہ کل ۳۰-۴۰ آدمی تھے اور طغرل کی تلاش میں اِدھر اُدھر سرگرداں تھے کہ ان کی کچھ بنیوں سے مڈھ بھیڑ ہوئی جو طغرل کو رسد وغیرہ دے کر واپس لوٹ رہے تھے۔ ڈرانے اور دھمکانے سے انھوں نے طغرل کا صحیح پتہ بتا دیا جو کہ قریب ہی ایک میل کی

ع[1]:۔ بلبن جو ارادہ کر لیتا تھا اس کو ضرور تکمیل تک پہونچاتا تھا۔ اس کے ارادہ کا حال جب اس کی سپاہیوں کو معلوم ہوا تو سب نے سمجھ لیا کہ اب شاید دہلی کی صورت دیکھنے کو نہیں ملے گی اس لئے لوگوں نے اپنے عزیزوں کو دہلی وصیتیں لکھ کر بھیج دیں تھیں اور اُن کے اعزا و اقربا بھی ان کی واپسی سے نا اُمید تھے۔

ع[2]:۔ سنارگانوں دریائے میگھنا کنارے موجودہ شہر ڈھاکہ کے قریب آباد تھا۔ دریا نے اس کا وجود مٹا دیا۔

ع[3]:۔ سر وولزلے ہیگ نے راجہ کا نام "بھونج" تحریر کیا ہے (ملاحظہ ہو کیمبرج ہسٹری ج ۳)۔

فاصلہ پر ایک تالاب کے متصل پڑاؤ ڈالے پڑا ہوا تھا۔ دونوں سرداروں نے اپنے
افسر اعلیٰ ہیکترس کو اطلاع دی لیکن شاہی لشکر کے وہاں پہونچنے تک طغرل کی بھاگ
جانے کا اندیشہ تھا اس لئے یہی چھوٹا سا گروہ جان پر کھیل کر طغرل کی لشکرگاہ میں گھس
گیا اور طغرل طغرل پکارتا ہوا اس کے شاہی خیمہ تک پہونچ گیا۔ یہ ناگہانی شور و غوغا
سُن کر طغرل کے اوسان جاتے رہے اور وہ کمال بدحواسی کے عالم میں گھوڑے کی ننگی
پیٹھ پر سوار ہو کر بھاگ نکلا لیکن ملک محمد تیر انداز نے اس کو اپنے تیر کا نشانہ بنا لیا اور
ملک مقدر نے پھرتی سے اُس کا سر کاٹ کر اپنے دامن میں چھپا لیا اور وہیں تالاب کے
کنارے بیٹھ کر منہ ہاتھ دھونے لگا تاکہ طغرل کے سپاہیوں کو اس کی اطلاع نہ ہو۔
پیچھے سے طغرل کے باڈی گارڈ اس کو ڈھونڈھتے اور "خداوند عالم، خداوند عالم" پکارتے
ہوئے آپہنچے لیکن اسی اثناء میں شاہی ہراول کی فوج نے آکر طغرل کے تمام ساتھیوں کو
گھیر لیا۔ بہت کم لوگ ایسے تھے جو فرار ہو سکے یا لڑائی میں کام آئے ورنہ سب کے سب
گرفتار کر لئے گئے۔ بلبن انھیں لیکر لکھنوتی واپس آیا یہاں پہونچ کر دہلی کے وہ سردار یا
سپاہی جو پچھلی لڑائیوں میں طغرل کے ساتھ مل گئے تھے علیحدہ کر دئے گئے کہ انھیں دہلی
پہونچ کر سزا دی جاوے گی۔ لیکن اہل بنگال میں سے جس شخص نے طغرل کے اعلان
خود مختاری کے بعد خفیف سی بھی رفاقت ظاہر کی تھی انھیں بادشاہ نے چن چن کر
گرفتار کیا اور سرِ عام سولی پر لٹکوا دیا۔ مورخ برنی جس کا دادا سپہ سالار حسام الدین
جو لکھنوتی کا کوتوال تھا اس مہم میں بادشاہ کے ہمرکاب تھا بیان کرتا ہے کہ "لکھنوتی کے
بڑے بازار میں جو کم و بیش ایک میل لمبا تھا دو رویہ سولیاں نصب کر دی گئی تھیں اُن
پر دو تین دن تک صدہا آدمی روزانہ چڑھائے جاتے تھے یہاں تک کہ ایک قلندر
"سلطان درویش"، نامی کو بھی نہیں چھوڑا اُس کا طغرل سے صرف اتنا تعلق تھا کہ
ایک مرتبہ اُسے طغرل نے تین من سونا اس لئے دیا تھا کہ وہ قلندروں کی جماعت کے لئے

بجائے لوہے کے سونے کے آلات تیار کرادے![1]

بلبن کی اِس سخت تادیب وسیاست کے سلسلہ میں جو بات یاد رکھنے کے قابل ہے وہ یہ ہے کہ اُس نے اپنے چھوٹے بیٹے بغرا خاں (محمود) سے جسے وہ آئندہ لکھنوتی کا وائسرائے بنانا چاہتا تھا دریافت کیا کہ اے محمود تو نے بھی میری سزا دیکھی؟ جب اُس نے عرض کیا کہ دیکھی تو بادشاہ نے فرمایا کہ "یاد رکھو ہند وسندھ، گجرات ومالوہ یا لکھنوتی وسنارگانوں کا کوئی حاکم جب کبھی بادشاہ دہلی سے بغاوت کرے گا تو اس کی اور اُس کے عزیز واقربا اور اعوان و انصار کی یہی سزا ہوگی جو آج طغرل اور اس کے رفقاء کی ہوئی ہے[2]" اس کے علاوہ دہلی روانہ ہوتے وقت جو چند ہدایتیں[3] بطور دستور العمل تحریر کرا کے بیٹے کے حوالہ کیں ان میں پہلی ہدایت یہی کہ " چوں اقلیم لکھنوتی بدو مفوض شد فرمانبردار بادشاہ دہلی باشد وبا او مکابرہ نکند وبیکبار نگسلد خواہ بادشاہ دہلی خویش وبرادر او باشد وخواہ بیگانہ وغیرہ ...... زیرا کہ لکھنوتی با آنکہ ملکی دور ودراز است از مضافات دہلی است[4]" یعنی جب اقلیم لکھنوتی اُسے ملے تو وہ ہمیشہ بادشاہ دہلی کا فرماں بردار رہے اور اس سے روگردانی نہ کرے خواہ بادشاہ دہلی کوئی بیگانہ آدمی ہو یا اُس کا کوئی خویش وبرادر ..... کیونکہ لکھنوتی کا ملک کتنے ہی بعید فاصلے پر سہی مضافات دہلی میں داخل ہے۔

بنگال سے واپسی غرضکہ بہت سے پند ونصائح کے بعد بغرا خاں کو پیار کیا اور روتے ہوئے اس کو رخصت کیا۔ بغرا خاں لکھنوتی کی جانب چلا گیا

ع[1]:۔ ضیائے برنی صـ ۹۱، ۹۲

ع[2]:۔ ضیائے برنی صـ ۹۳

ع[3]:۔ پند ونصائح کے لئے ملاحظہ ہو تاریخ فیروز شاہی از ضیائے برنی صـ ۹۵ تا صـ ۱۰۶

ع[4]:۔ ضیائے برنی صـ ۹۵

اور خود کوچ در کوچ دہلی کی طرف چلا آیا۔ دریائے سرجو کے کنارے پہونچکر چند روز قیام کیا۔ وہ جہاں جہاں سے گذرا راستہ میں لوگوں نے اس کا بڑا شاندار استقبال کیا اور خوشیاں منائیں اور جب وہ بدایوں سے گذر کر گنور[۱] کے نواح میں داخل ہوا تو شہر دہلی کے جملہ اکابر و خوانین دریائے گنگا کے کنارے اُس کے استقبال کو موجود تھے۔ سب نے حسب حیثیت نذرانے پیش کئے اور انعام میں خلعت[۲] پائے۔ دہلی پہونچکر ہر گھر میں خوشی منائی گئی کیونکہ اہالیان شہر اپنے اُن عزیزوں سے جو بادشاہ کے ہمراہ مہم پر گئے تھے اور جن کے واپسی سے وہ نا اُمید ہو چکے تھے اب ۳ سال کے بعد انھیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ اس طرح یہ مہم ۱۲۸۳ء میں جا کر ختم ہوئی۔

بادشاہ نے پایۂ تخت میں مراجعت کے بعد قیدیوں کو قید سے آزاد کیا۔ بقایا لگان کی معافی کا عام اعلان کرایا اور بہت کچھ صدقات غرباء میں تقسیم کرائے۔ علماء و مشائخ کی خدمت میں حاضر ہو کر اُس نے ہر ایک کو تحائف پیش کئے اور کئی روز تک بھوکوں کو کھانا کھلایا۔ جشن کے مراسم سے فراغت پا چکنے کے بعد اُس نے فرمان جاری کیا کہ بدایوں دروازے لیکر تا لپت تک دو رویہ سولیاں گڑوا دیجائیں تاکہ اُن قیدیوں کو جن کو وہ اپنے ساتھ لکھنوتی سے لایا تھا لوگوں کو عبرت دلانے کے لئے پھانسی دلوائے۔ ان قیدیوں میں سے اکثر صاحب اہل و عیال تھے اور اکثر کے بال بچے دہلی ہی میں تھے انھوں نے جا کر قاضی لشکر کو اپنا شفیع بنایا۔ قاضی

---

[۱] ۔ گنور ضلع بدایوں کا ایک مشہور قصبہ ہے اور آج کل تحصیل گنور کا صدر مقام ہے۔ بدایوں سے بجانب گوشہ شمالی و مغرب ۴۵ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔

[۲] ۔ چونکہ امیر الامراء فخر الدین کوتوال شہر نے نیابت کے فرائض نہایت حسن و خوبی کے ساتھ انجام دئے تھے اس لئے بادشاہ نے اپنا پیراہن خاص اس کو عنایت فرمایا اور لکھنوتی ہی سے یہ فرمان جاری کیا کہ آئندہ مُراسلات میں اس کو برادر ملک الامراء تحریر کیا جائے۔ یہ وہ عزت افزائی تھی کہ جس پر ہر ایک کو رشک ہوتا تھا (موئف)۔

لشکر نے جو نہایت شریف اور پاک باطن بزرگ تھے سلطان کے سامنے جاکر ملزموں کی موثر الفاظ میں وکالت کی۔ قاضی موصوف کی باتوں سے بادشاہ بہت متاثر ہوا اور پھانسی کی سزا کو دوسری نرم سزاؤں سے بدل دیا۔ ملزموں میں سے اکثر کو معاف کر دیا جو ذرا کچھ اہمیت رکھتے تھے ان کو ایک مدت معینہ کے لئے قریب کے قصبات میں جلاوطن کر دیا۔ جو ملزم شہر دہلی کے بااثر لوگوں میں تھے اُن کو کچھ عرصہ کے لئے قید کر دیا۔ بقیہ بڑے بڑے باغی عمال و عہدیداروں کو پھنسیوں پر چڑھا کر شہر میں تشہیر کرا دیا۔

آخری ایام حکومت و موت

فتح کی تہنیت کے لئے جیسے جیسے طغرل پر کامیابی کی خبر مشتہر ہوتی گئی دور و نزدیک سے لوگ بادشاہ کی خدمت میں آتے رہے چنانچہ ملتان سے شہزادہ محمد بھی جس کو سلطان جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتا تھا دہلی حاضر ہوا اور گذشتہ ۳ سال کا جمع کردہ مال و اسباب شاہی کارخانجات میں داخل کیا۔ بادشاہ نے کچھ عرصہ اس کو اپنی خدمت میں رکھا اس کے بعد بڑے اعزاز و اکرام کے ساتھ ملتان رخصت کیا۔ وہاں پہونچکر تھوڑے ہی دنوں کے بعد اُسے وہ حادثہ پیش آیا جس کا پچھلے صفحات میں ذکر کیا جا چکا ہے۔

شہزادہ محمد کی شہادت ایک ایسا حادثۂ جانکاہ تھا جس کا ہر جگہ سوگ منایا گیا۔ سلطان پر اس کا سب سے زیادہ اثر ہوا اور لیکن سلطنت کی موت نے اس کو از خود رفتہ بنا دیا لیکن دربار کے اوقات میں اُس کا صبر و استقلال اُس کے غم کے جذبات کو ابھرنے نہیں دیتا تھا وہ لوگوں پر یہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتا تھا کہ اس پر شہزادہ کی غیر متوقع موت کا کچھ بھی اثر نہیں مگر محل کے اندر پہونچکر کپڑے پھاڑنا، سر پر خاک ڈالنا اور فرط غم سے بیہوش ہو جانا اس کے لئے ایک معمولی سی بات ہو کر رہ گئی۔ اس پر امیر خسرو کے مرثیہ نے اور اضافہ کر دیا۔ مغلوں کی قید سے رہائی پانے کے بعد جب پہلی مرتبہ مرثیہ کو دربار میں سنایا تو کوئی درباری ایسا نہ تھا جو زار و قطار روتا نہ ہو بادشاہ روتے روتے

بیدم ہوگیا۔ آخر کار اسی غم نے اس کی صحتِ جسمانی کو اندر سے گھلا گھلا کر نہایت ابتر کر دیا۔
جب بادشاہ کی صحت جواب دینے لگی تو اُس نے بنگال سے بغرا خاں کو طلب کیا اور
اس کو دربار میں رہنے کا حکم دیا وہ دو تین مہینے بادشاہ کی خدمت میں رہا اس عرصہ
میں بادشاہ کی طبیعت بھی کچھ سنبھل گئی۔ یہ دیکھکر کہ اب اس کے دربار میں حاضر رہنے کی
چنداں ضرورت نہیں۔ اور پھر ادھر بنگال کی یاد آئی اس لئے ایک دن بادشاہ کی بلا اجازت
شکار کے بہانے سے بنگال کی طرف چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد بادشاہ پھر بیمار پڑ گیا۔
اور جب مرض میں شدت پیدا ہوئی تو اس نے انتقال سے تین دن پہلے ملک الامراء کوتوال
دہلی اور وزیر اعظم حضرت خواجہ حسین بصری و نیز دیگر مقرب درگاہ اراکین سلطنت کو مجتمع کر کے
وصیت کی کہ شہزادہ محمدؒ کے بیٹے کیخسرو کو آئندہ تخت حکومت ملے مگر اس شہزادے سے
غالباً محل کے ملازمین خوش نہ تھے اور بظاہر انھیں کی مخالفت سے اراکین سلطنت نے
اسے اپنے باپ کی جگہ ملتان روانہ کر کے کیقباد کی بادشاہی کا اعلان کر دیا۔

سلطان بلبن کی موت ایک ایسا حادثہ تھا جسے لوگ ایک عرصہ تک نہیں بھلا سکے
اُمراء و اراکین سلطنت چالیس دن تک فرش پر سوئے اور امیر الامراء کوتوال دہلی جس
کو بلبن سے خصوصی تعلق تھا چھ مہینے تک فرش پر سویا۔ ایصالِ ثواب کی خاطر لوگوں نے
ایک عرصہ تک خیرات و صدقات کا سلسلہ جاری رکھا۔

بلبن کی اولاد ذکور میں خان شہید اور بغرا خاں کا تذکرہ کیا جا چکا ہے ان کے
علاوہ اولاد اناث میں ایک لڑکی موسومہ "بی بی ہزیرہ" تھیں جو حضرت خواجہ فریدالدین
گنج شکرؒ کو منسوب تھیں ان سے چھ لڑکے اور سولہ لڑکیاں ہوئیں[۱]۔ خان شہید کے ایک
لڑکا کیخسرو تھا اور بغرا خاں کے تین لڑکے معزالدین کیقباد، کیکاؤس اور شمس الدین فیروز
تھے جن میں اوّل الذکر دہلی کا شہنشاہ ہوا اور آخر الذکر بنگال کا حاکم۔

ع[۱]:- خزینۃ الاصفیاء صدا ۳۰۱

فصل سوم

(۱۰) سلطان معز الدین کیقباد جنوری ۱۲۸۷ء تا ۱۳؍ جون ۱۲۹۰ء

بلبن کے انتقال کے بعد کیقباد سریر آرائے سلطنت ہوا۔ یہ ۱۷۔ اٹھارہ سال کا نہایت خوش خلق و پاکیزہ جمال شہزادہ تھا۔ اپنے دادا کی زیر نگرانی تعلیم و تربیت پائی تھی لوگوں کی اس سے بڑی اُمیدیں وابستہ تھیں لیکن نااہل مصاحبوں کی صحبت نے اسے خراب کر دیا۔ اور اخلاق و شرافت کے تمام آداب کو بالائے طاق رکھ کر خوب گل کھیلے اور رنگ رلیاں منائیں۔ اس کی عیّاشی نے نہ صرف خود اس کی صحت اور حکومت برباد کر دی بلکہ پایۂ تخت دہلی میں عام بداخلاقی پھیلا دی کیونکہ بادشاہ کا عیش و عشرت کی طرف میلان طبع دیکھکر ڈوم، ڈھاری اور کہر و باختہ طوائفیں، بھانڈ اور مسخرے ہزاروں کی تعداد میں دہلی پہونچ گئے اور الناس علی دین ملوکھم کے بموجب خواص و عوام سب اسی رنگ میں رنگ گئے۔ غرضکہ شاہد و شراب کی کثرت نے سارے شہر کو خرابات بنا دیا۔ ان رنگ رلیوں میں جنکی برنی نے نہایت واضح تصویر کھینچی ہے کام کا ہوش نہ بادشاہ کو تھا اور نہ درباریوں کو۔ سلطنت کی باگ ملک نظام الدین کے ہاتھ میں آگئی تھی جو ظاہرا "دادبک" ورنہ درحقیقت "نائبِ ملک" یعنی مختار کار بن گیا تھا اور بادشاہ کی یہ غفلت و مدہوشی دیکھ کر خود تخت شاہی حاصل کرنے کی فکر میں لگا ہوا تھا۔

نظام الدین نے بادشاہ کو بہکایا کہ کیخسرو اُس کا شریک سلطنت ہے جب تک وہ زندہ ہے اُس وقت تک اس کی حکومت و بادشاہت کو استحکام حاصل نہیں ہو سکتا چنانچہ ایک بہانہ سے اس کو ملتان سے بلایا گیا جب وہ رہتک تک آگیا تو حالت نشہ میں بادشاہ سے اس کے قتل کا فرمان حاصل کر کے وہیں قتل کرا دیا۔ شہزادہ کیخسرو کے

قتل سے تمام اُمرائے بلبنی خائف ہو گئے اور انھوں نے سلطنت کے کاموں میں دلچسپی لینا چھوڑ دیا۔ صرف ایک وزیر ممالک خواجہ خطیر کا اثر بادشاہ پر باقی تھا اور وہ اس کو کبھی کبھی زمانہ کے نشیب و فراز سے آگاہ کرتا رہتا تھا۔ اس کو بھی کسی بہانہ سے گدھے پر چڑھا کر سارے شہر میں تشہیر کرایا۔ اس طرح وہ بادشاہ پر روز بروز قابو پاتا چلا گیا۔ اندر حرم سرا میں نظام الدین کی بیوی جو ملک الامراء فخر الدین کوتوال شہر کی لڑکی تھی اور جس کو سلطان ماں کہہ کر پکارتا تھا تمام کارخانہ جات شاہی پر حاوی تھی اس طرح اندر و باہر ہر طرف نظام الدین کا طوطی بول رہا تھا۔

اب اُس نے ایک ایک کر کے اُمرائے سلطنت کی خبر لینا شروع کی۔ سب سے پہلے نومسلم مغل اُمراء کی جماعت کو جو باہم متحد و متفق تھے دعوت کے بہانہ کوشک شاہی میں بلا کر قتل کرایا۔ اس کے بعد ملتان کے عامل ملک شاہک اور برن کے حاکم ملک توزکی کو جو کہ عرضِ ممالک کا عہدہ رکھتا تھا بہانے تراش کر تہ تیغ کیا۔ جب نوبت یہاں تک پہونچی تو ملک الامراء فخر الدین کوتوال نے اس کو بُلا کر اُن خطرات سے آگاہ کیا جو ارکانِ دولت کے قتل سے پیدا ہو سکتے ہیں اور۔ اس کو نصیحت کی کہ طلبِ ملک کے سودائے خام کو اپنے دماغ سے نکال دے اور اگر ایسا نہیں کرے گا تو پھر "حیات را خیر باد کن و خطیرہ خود را عمارت فرما"[۱]، یعنی اپنی زندگی سے ہاتھ دھولے اور اپنا مقبرہ اپنے ہاتھ سے تعمیر کر۔

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اُس پر اپنے شفیق و مہربان خُسر کی نصیحتوں کا کوئی اثر نہیں ہوا اور وہ اپنے کام میں برابر لگا رہا بغرا خاں کو اپنے بیٹے کی بے راہ روی کی تمام خبریں پہونچ رہی تھیں اُس نے سلطان ناصر الدین کا لقب اختیار کر کے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا اور خطبہ و سکّہ اپنے نام کا جاری کیا۔ اپنے بیٹے کو راہ راست پر لانے کے لئے پند و نصائح سے لبریز مکتوبات تحریر کئے لیکن کیقباد کو چونکہ مستی جوانی، مستی بادشاہی، مستی ہوا پرستی، اور مستی

۱:۔ ضیائے برنی ص ۱۳۸

شراب نے بیخود بنا رکھا تھا اس لئے کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ اس پر اُس نے اشتیاق آمیز خطوط لکھ کر بیٹے کو ملنے کے واسطے بلایا لیکن یہ ملاقات مغلوں کے ناگہانی حملہ کی وجہ سے کچھ دنوں کے لئے ملتوی ہو گئی۔

مغلوں کا حملہ

مغلوں کے حملہ کا برنی نے اپنی تاریخ میں کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ بعد کے مورخین نے لکھا ہے کہ غزنی کے مغل حاکم تیمور خاں یا تمر خاں کی زیر سرکردگی مغلوں نے پنجاب پر چھاپہ مارا لاہور کو لوٹ مار کے تباہ کر دیا اور راستے کی تمام بستیوں میں تباہی و بربادی مچاتے ہوئے یہ لوگ سامانہ تک بڑھ آئے لیکن بادشاہ کی ۳۰ ہزار فوج نے جس میں ابھی بلبن کے عہد کی چستی وچالاکی موجود تھی ملک محمد بق بق اور خان جہاں کی ماتحتی میں مغلوں کو لاہور کے نواح میں گھیر کر ذلت آمیز شکست دی۔ بہت سے قتل کر دئے گئے اور ایک ہزار مغل گرفتار کر کے دہلی لائے گئے جنھیں نمائش کے طور پر لوگوں کو دکھانے کے لئے تمام صوبجات میں تقسیم کر دیا گیا۔ منگولوں کی اس شکست اور اُن کے کریہہ المنظر ہونے کا نقشہ حضرت امیر خسرو نے خوب کھینچا ہے۔

ملاقات

کیقباد جریدہ باپ سے ملاقات کرنے کے لئے جانا چاہتا تھا لیکن نظام الدین کے کہنے سننے اور ورغلانے سے اتنے جاہ وحشم کے ساتھ روانہ ہوا کہ گویا باپ پر حملہ آور ہونے کے لئے جا رہا ہے۔ جب دریائے گھاگھرا کے کنارے پہونچا جو اُس وقت دہلی و بنگال کی حکومتوں کے درمیان حدِ فاصل کا کام دیتا تھا تو پڑاؤ ڈال دیا۔ باپ نے جب یہ سُنا کہ اتنے ساز و سامان اور لاؤ لشکر کے ساتھ کیقباد دریائے گھاگھرا کے کنارے مقیم ہے تو خود بھی بیشمار فوج کے ساتھ لکھنوتی سے چل کر دریا کے دوسری طرف خیمہ زن ہو گیا۔ اس دوران میں نامہ و پیام برابر جاری رہے بالآخر ملاقات کی ٹھہری۔ کیقباد کے مصاحبوں کی ضد کی وجہ سے بغرا خاں کو پہلے سلام کے لئے آنا پڑا۔ جب وہ "مقام زمین بوس" پر پہونچا اور سلام کے لئے سر کو زمین پر جھکایا اور اس طرح تین جگہ مراسم زمین بوسی ادا کرتا

ہوا شاہی تخت کے قریب پہونچا تو کیقباد سے باپ کی ذلت دیکھی نہیں جاسکی۔ وہ فوراً تخت سے اُتر کر باپ کے قدموں پر جا کر گر گیا۔ باپ نے اس کو اُٹھا کر سینہ سے لگا لیا اور اس کے آنکھوں اور رخساروں کو بوسہ دیا۔ یہ منظر نہایت جانگداز تھا ہر شخص کی آنکھوں میں آنسو جاری تھے اور سب زار و قطار رو رہے تھے۔ کچھ عرصہ تک مجمع پر خاموشی طاری رہی اس کے بعد دونوں پر سیم و زر و جواہرات نچھاور کئے گئے اور شعرا[1] نے قصائد پڑھے۔ جب تک یہ کاروائی جاری رہی کیقباد نہایت مودبانہ طریقہ سے دوزانو ہو کر باپ کے سامنے تخت پر بیٹھا رہا۔ بغرا خاں کی نشست کیقباد کے دائیں جانب تھی اِس کے بعد دونوں اُٹھ کر خاص کمرہ میں چلے گئے جہاں بہت دیر تک دونوں میں گفتگو ہوتی رہی۔ اس طرح باپ بیٹوں میں کئی ملاقاتیں ہوئیں۔

---

[1]: حضرت امیر خسرو نے باپ بیٹے کے اتحاد و مصالحت پر ایک قصیدہ لکھا ہے جس کے چند شعر یہ ہیں۔

زہے ملک خوش چوں دو سلطاں یکے شد — زہے عہد خوش چوں دو پیماں یکے شد

پسر بادشاہے، پدر نیز سلطاں — کنوں ملک بیں چوں دو سلطاں یکے شد

ز مہر جہانداری و پادشاہی — جہاں را دو شاہِ جہاںباں یکے شد

یکے ناصر عہدِ محمودِ سلطاں — کہ فرمانش در چار ارکاں یکے شد

دگر شہ معز جہاں کیقبادے — کہ در ضبطش ایران و توراں یکے شد

بعد کو کیقباد کی خواہش سے حضرت امیر نے چھ مہینہ کی مدت میں "قرآن السعدین" لکھی جس میں باپ بیٹے کی مراسلت و ملاقات کا حال تفصیل سے لکھا ہے اُس وقت امیر خسروؒ کی عمر ۳۶ برس کی تھی اور سنہ ہجری ۶۸۸ تھا اس لحاظ سے ملاقات ۶۸۸ ہجری کے شروع میں ہوئی ہوگی۔ اپنی عمر اور مثنوی کے سنہ تحریر کے بارے میں لکھا ہے ؎

ساختہ گشت از روش خامہ — از پس شش مہ چنیں نامہ

در رمضاں شد بہ سعادت تمام — یافت قرآں نامہ سعدین نام

(باقی مضمون صفحہ ۳۱۸ پر)

انھیں ملاقاتوں میں سے کسی ایک ملاقات کے وقت بغراخاں نے کیقباد سے کچھ کار آمد باتیں کہیں جن سے اُس زمانہ کے شہزادگان کی تعلیم و تربیت اور معیار حکومت کا اندازہ ہوتا ہے اس لئے مؤلف انھیں نہایت اختصار کے ساتھ عامۃ الناس کے فائدہ کی غرض سے تحریر کرنا مناسب سمجھتا ہے۔ بغراخاں نے کیقباد سے کہا کہ "جب میں نے اور برادر بزرگ خان شہید نے مفردات لغت اور خطاطی کی تعلیم میں مہارت حاصل کرلی تو ہمارے اساتذہ نے سلطان سے دریافت کیا کہ صرف و نحو اور فقہ میں کس چیز کو پہلے پڑھایا جاوے اور کون تعلیم دے، بادشاہ نے فرمایا کہ مورخان دانا کتاب "آداب السلاطین و تالیف مآثر السلاطین" کو جس کو ہمارے آقازادگان کی تعلیم کے لئے بغداد سے لایا گیا ہے تعلیم دیں۔ اور روزہ و نماز و وضو وغیرہ کے جو ضروری مسائل ہیں وہ انھوں نے خود پڑھ لئے ہیں۔ لہٰذا ہم نے کتاب السلاطین کو خواجہ تاج الدین بخاری سے جو سلطان شمس الدین کے ندیم تھے از اول تا آخر پڑھا جب کتاب کو ہم نے ختم کرلیا تو سلطان کی خدمت میں پیش کئے گئے۔ بادشاہ التمش نے خوش ہو کر خواجہ تاج الدین کو دوگانوں اور ایک لاکھ جیتل بطور انعام عطا فرمائے[1]۔

اِس کتاب کے پہلے اسباق میں میں نے پڑھا ہے کہ جمشید نے اپنے لڑکوں سے کہا "وہ بادشاہ جس کے ماتحت دس خان[2] نہ ہوں بادشاہ کہلائے جانے کا مستحق نہیں اور اگر اِس سے زائد جمعیت و حیثیت رکھتا ہو تو پھر کیا کہنا نورٌ علیٰ نور۔ اِس کے علاوہ اُس کے خزانہ میں اتنی رقم ہر وقت موجود رہنا چاہئے کہ اگر اس پر کوئی دشمن حملہ آور ہو تو اس کے مقابلہ کے لئے اُسے کام میں لاسکے یا اگر ملک پر قحط کی بلا نازل ہو تو رعایا کی حفاظت اور اس کی مشکلات کو دور کرنے کے لئے اسے خرچ کرسکے۔ وہ بادشاہ ہی کیا جو مصیبت

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۱۷

آنچہ بہ تاریخ ز ہجرت گذشت	بود سن ششصد و ہشتاد و ہشت
سال من امروز اگر برسی	راست بگویم ہمہ شش بود و سی

[1] ضیائے برنی ص۱۴۵۔ [2] ایک خان کے پاس ایک لاکھ کی جمعیت ہونی چاہئے اسکی ترتیب یہ ہے۔

(بقیہ مضمون صفحہ ۱۱۹ پر)

و پریشانی کے وقت رعایا کی مدد نہ کر سکے اور رعایا کو بھوک پیاس سے ہلاک ہو جانے دے بلکہ از روئے انصاف بادشاہ وہ ہے کہ "ایک آدمی در پادشاہی او گرسنہ و برہنہ نخسپد"[۱]
یعنی اُس کی مملکت میں کوئی شخص بھوکا اور ننگا نہ سونے پائے (نہ رہنے پائے)"۔

اِس ملاقات کے بعد جب بغرا خاں اپنے قیام گاہ کو واپس آنے لگا تو کیقباد نے اس سے درخواست کی کہ دہلی میں چونکہ کوئی ایسا تجربہ کار و دانا و البستگانِ دولت میں نہیں ہے جو مجھکو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کے لیے پند و نصیحت کر سکے اس لئے اگر آپ از راہِ شفقتِ پدری چند نصیحتیں کہ جن میں دین و دنیا دونوں کی بھلائی مضمر ہو فرمائیں تو بہتر ہے۔ بغرا خاں نے کہا کہ لکھنوتی سے چل کر یہاں تک آنے کا میرا مقصد بھی یہی تھا کہ کچھ نصیحتیں کروں۔ اب آخری ملاقات کے وقت مجھے جو کچھ کہنا ہے تم سے کہوں گا۔ چنانچہ رخصتی ملاقات کے وقت سلطان ناصر الدین (بغرا خاں) نے نظام الدین و قوام الدین کی موجودگی میں کیقباد سے کہا "اے جان پدر! دنیا کے اندر کوئی باپ ایسا نہیں ملے گا جو یہ نہ چاہتا ہو کہ اس کا بیٹا اُس سے زیادہ لائق و فائق نہ ہو۔ مجھے جب یہ معلوم ہوا کہ اراکین سلطنت نے تمھیں بادشاہ منتخب کیا ہے تو میں سمجھا کہ لکھنوتی کے ساتھ ساتھ دہلی کی حکومت بھی میرے قبضہ میں آگئی اسلئے تیری قوتِ پادشاہی کے بھروسہ پر بنگالہ کے اندر اپنے نام کا خطبہ و سکہ جاری کیا"۔

"لیکن دو سال سے برابر تمہارے عیش و عشرت اور غفلت و بے خبری کی اطلاعات نے مجھے حیران کر دیا۔ افسوس کہ تم نے پادشاہت کی قدر نہ جانی اگر اس کی حقیقت و قدر

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۳۱۹: دس سواروں کا مالک سرخیل کہلاتا ہے اور دس سرخیل کا حاکم سپہ سالار ہوتا ہے دس سپہ سالار ایک امیر کے ماتحت ہوتے ہیں اور دس امیر ایک ملک کے اور دس ملک کا حاکم اعلیٰ خان ہوتا ہے۔ اس طرح ایک خان کے ماتحت ایک لاکھ کی جمعیت ہوئی۔

[۱] ضیائے برنی ص ۱۴۷۔

وقیمت سے واقف ہوتے تو اتنی غفلت نہ برتتے۔ اے فرزندِ من! تمہارے دادا مرحوم ومغفور مجھ سے کہا کرتے تھے کہ جہانداری کے لئے پانچ چیزوں کی ضرورت ہے اوّل عدل و احسان دوم رعیت کی پرورش اور جاہ وحشم کی استقامت۔ سوم خزانوں کا جمع کرنا۔ چہارم وابستگانِ دولت کے حقوق کی نگہداشت اور اُن کی پرورش۔ پنجم دور و نزدیک کے تمام اہلِ مملکت سے باخبر رہنا۔ لیکن اِن پانچ چیزوں میں سے میں تم کو کسی ایک پر بھی عامل نہیں پاتا بلکہ ان دو سال کے اندر تم میں بعض بُری عادتیں پیدا ہو گئی ہیں۔ ان کو ترک کر کے اُمورِ سلطنت کی طرف متوجہ ہو کیونکہ آئندہ تمام خوشیوں کا دارومدار انھیں کی سرانجام دہی پر منحصر ہے۔ اب میں تم سے چند باتیں کہہ کر رخصت ہوتا ہوں جو سراسر تمہارے فائدے کے لئے ہیں۔ ان میں سے پہلی بات یہ کہنا ہے کہ بادشاہت کو عزیز رکھو لیکن اپنی جان کو بادشاہت سے بھی زائد عزیز جانو اس لئے اپنی جان کو سلامت رکھنے کے لئے عیش وطرب سے باز آؤ اور بُری عادتوں کو ترک کر دو۔ دوسری بات یہ ہے کہ ملوک و اُمراء کے قتل سے احتراز کرو ورنہ لوگوں کے دلوں سے تمہارا اعتماد جاتا رہے گا۔ دشمنوں کو بھی اپنے احسان وکرم اور عقل وحکمت کے زور سے دوست بنانے کی کوشش کرو اور اپنے سلطنت کے لئے ان دو[1] کے علاوہ دو اور تجربہ کار وزیر مقرر کرو اور انھیں الگ الگ کام[2] تفویض کر کے اُن پر اعتماد کرو۔ تیسری بات یہ ہے کہ جب تم چاروں ارکینِ سلطنت کا انتخاب کر لو تو ان میں سے کسی ایک کے ساتھ اتنی خصوصیت نہ برتو کہ بقیہ تین کو تم سے بدگمانی پیدا ہو اس لئے جو کام کرو وہ چاروں

ع[1]:۔ ان دو سے مراد نظام الدین وقوام الدین ہیں جو کہ اِس مخصوص مجلس میں موجود تھے۔

ع[2]:۔ چار وزیر اور اُن کے چار کام (۱) وزیر ممالک (۲) وزیر رسل ورسائل یعنی برید ممالک (۳) دیوان عرض یا وزیر عرض ممالک (۴) وزیر انشاء (پرائیویٹ سکرٹری)۔ برنی کا حاکم ملک تو زکی کے قتل کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ کیقباد نے عرض ممالک کا عہدہ خالی چھوڑ رکھا تھا ورنہ بغراخاں مشورہ نہ دیتا۔

کی موجودگی میں اور اُن سب کے صلاح و مشورہ سے۔ چوتھی بات جو تم سے کہنا ہے وہ یہ ہے کہ روزہ و نماز کی پابندی کرو بہت سی آفات سے نجات پا جاؤ گے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم نے نماز ترک کردی ہے اور بعض بددیانت دنیا دار علماء نے تمھیں ماہ رمضان میں کھانے کی اجازت دیدی ہے۔ کیا تم بھول گئے تمھارے جد امجد جن کی تم خدمت میں رہے ہو کتنے کبیر سن تھے لیکن اس کے باوجود انھیں روزہ و نماز اور فرض و نوافل میں کس درجہ انہماک تھا۔ وہ اگر کہیں سن لیتے تھے کہ ہم دونوں بھائی (خان شہید و بغراخاں) نماز کے وقت سوتے رہے اور نماز باجماعت ادا نہیں کی تو ایک ایک مہینہ تک ہم سے ناراض رہتے تھے اور کلام نہیں کرتے تھے۔ میں نے بارہا بزرگوں کی زبان سے یہ سنا ہے کہ جو ماہ رمضان کے روزے نہیں رکھتا وہ جوان موت مرتا ہے اور جو نماز نہیں پڑھتا اس کو دائرہ اسلام سے خارج سمجھنا چاہیئے اس لئے بہر صورت تمھیں روزہ و نماز کی پابندی کرنا چاہئے اور اس کے لئے بہتر یہ ہے کہ تم کسی دیندار، خدا طلب بزرگ کو اپنے پاس رکھو تاکہ تمھیں اچھے کاموں کی طرف رغبت ہو" آخری بات الوداعی رخصت کے لئے بیٹے کو گلے لگاتے وقت چپکے سے کہی کہ نظام الدین کو جلد از جلد اپنے سے دور کردو ورنہ وہ موقع پاتے ہی تمھیں تخت سے اُتار دیگا۔

اِس ملاقات کا اتنا فائدہ تو ضرور ہوا کہ نوجوان بادشاہ نظام الدین سے بدگمان ہوگیا ورنہ باپ کے سمجھانے سے زہد و تقویٰ اختیار کرنے کی جو قسمیں اُس نے کھائی تھیں وہ چند ہی روز بعد توڑ دیں اور پھر اپنی پرانی روش پر آگیا۔ اس نے دہلی آکر نظام الدین کو ملتان کا گورنر بنایا۔ لیکن نظام الدین کچھ نہ کچھ بہانہ کرکے اپنی روانگی کو ٹالتا رہا اس پر کیقباد نے اس کو زہر دیکر مروا ڈالا۔ برنی نے نظام الدین کی (تخت سلطنت کے حصول کے لئے) حرص و آز پر مذمت کرتے ہوئے اس کی انتظامی قابلیت کی داد دی ہے اور یہ صحیح بھی ہے کیونکہ اُس کے مرتے ہی تمام معاملات میں ابتری پیدا ہونا

(بقیہ نوٹ بر صفحہ ۳۲۲)

شروع ہو گئی۔

نوجوان بادشاہ نے عہدہ جات کو از سر نو اُمراء میں تقسیم کیا۔ ملک ایتمر سرخہ کو وکیلدر کا عہدہ دیا اور ملک ایتمر کچھن کو "باربک" بنایا۔ یہ دونوں ترک نژاد بلبنی امیر تھے۔ قوام الدین کو غالباً بدستور دیوان انشاء کے عہدہ پر قائم رکھا۔ اور سامانہ سے ملک جلال الدین فیروز خلجی کو بلا کر اقطاع برن کا گورنر مقرر کیا اور "عرض ممالک"[ع۱] کا عہدہ اور سیاست خاں کا خطاب دیا۔

جلال الدین خلجی کا تقرر ترک امیروں کو بُرا معلوم ہوا کیونکہ وہ خلجی قبیلہ کے زور پکڑنے سے گھبراتے تھے اور اُن کی قوت کو سلطنت کے لئے مخدوش سمجھتے تھے

اسی دوران میں بادشاہ پر کثرتِ شراب نوشی کی وجہ سے فالج کا دورہ پڑا اور وہ صاحب فراش ہو گیا اس پر ترک اُمراء نے مشورہ کر کے اس کو معزول کر کے کیلوکھڑی کے محل میں نظر بند کر دیا اور اُس کے شیر خوار بچے شمس الدین کیکاؤس کی بادشاہت کا ۶۸۸ھ / ۱۲۸۹ء میں اعلان کر دیا[ع۲]۔ اسی ضمن میں انھوں نے چاہا کہ ان عہدہ داروں کو بھی جو خالص ترک نہ تھے مناصب جلیلہ سے الگ کر دیا جائے۔ اس فہرست میں سب سے اوپر "عرضِ ممالک" جلال الدین خلجی کا نام تھا۔ اِس سازش کی جلال الدین کو بروقت اطلاع مل گئی۔

جلال الدین نہایت آزمودہ کار سپہ سالار تھا اس کی تمام عمر مغلوں سے نبرد آزمائی میں گذری تھی اس کے بیٹوں کی شجاعت بھی مشہور تھی۔ شہر کے باہر بہار پور میں اس کے ماتحت پچاس ہزار سے زیادہ جنگجو سوار فروکش تھے اُن کا ایک دستہ لیکر جلال الدین کے بیٹے ایک دن اچانک شہر میں گھس آئے اور شمس الدین کو پکڑ کر لے گئے۔ اُن کا تعاقب کرتے ہوئے ایتمر سرخہ مارا گیا اور دوسرے ترک سردار ایتمر کچھن کو جلال الدین نے جبکہ وہ مصالحت کی غرض

فٹ نوٹ صفحہ ۳۲۱ :- ملاحظہ ہو تاریخ فیروز شاہی ص ۱۶۸ از ضیائے برنی ۔ ع۱ :- عارض یا عرض ممالک فوج کے مہیا اور مرتب کرنے والے عہدہ دار کو کہتے تھے۔ ع۲ :- حضرت امیر خسرو کے بیان سے معلوم ہوتا ہے شمس الدین نے صرف ۲ ماہ حکومت کی۔ (باقی مضمون صفحہ ۳۲۳ پر)

سے آیا ہوا تھا قتل کرا دیا۔ ادھر خلجیوں کے اشارے سے ایک شخص نے جس کے باپ کو
کیقباد نے قتل کرا دیا تھا محل میں گھس کر مفلوج و معزول بادشاہ کو جو بستر مرگ پر دم توڑ رہا تھا
بچھونے میں دم گھوٹ کر اور لپیٹ کر لاش کو جمنا کی ریتی میں پھینک دیا۔ شہر کے لوگوں کو خلجیوں
کی یہ زبردستی نہایت ناگوار گذری اور اُن کا بہت بڑا گروہ لڑنے مرنے پر آمادہ ہو گیا لیکن کوتوال
شہر نے بہ مشکل سمجھا بجھا کر بلوائیوں کو منتشر کر دیا ادھر بہت سے عہدیداروں نے بہار پور کے
پڑاؤ پر جا کر جلال الدین کی اطاعت قبول کر لی۔ اس طرح دہلی کی سلطنت ترکوں کے قبضہ
سے نکل کر خلجیوں کے قبضہ میں آگئی۔ خلجی بھی غلام سلاطین کی طرح ترکی النسل ہیں۔ لیکن ان کو
افغانستان میں علاقہ گرم سیر میں ایک عرصہ تک رہنے کی وجہ سے بعض مورخین نے افغانی شمار
کیا ہے۔ بلکہ انھیں افغانوں کی قوم غلزئی قرار دیا ہے۔ خلجی قبیلہ کے لوگ شہاب الدین غوری
کے زمانے سے ہندوستان میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ اور بڑے بڑے عہدوں
پر فائز تھے۔ ان کی شجاعت و لیاقت کے تاتاری سردار بھی قائل تھے۔ اس قبیلہ کے ایک
شخص اختیار الدین بن بختیار نے بہار و بنگال فتح کر کے سلطنت دہلی کو وسیع کیا تھا۔ گو ۱۲۹۰ء
تک بنگال میں اُن کی قوت و زور کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ لیکن خاص مرکزِ سلطنت یعنی دہلی میں اُن
کا اب تک زور و اقتدار قائم تھا۔

فصل چہارم

(۱) سلطان جلال الدین فیروز شاہ خلجی ۱۳؍جون ۱۲۹۰ء تا ۱۹؍جولائی ۱۲۹۶ء

جلال الدین نے ۷۰ سال کی عمر میں تخت پر قدم رکھا۔ اپنی عمر کا بیشتر حصہ مغلوں کے

(بقیہ فٹ نوٹ از صفحہ ۳۲۲)

دو ماہے داد زاں پس صورت خواب — چراغِ کیقبادی شمس الدین تاب

(مثنوی دول رانی قلمی کتب خانہ حبیب گنج) لیکن ملا عبدالقادر بدایونی نے شمس الدین کیکاؤس کی مدت
حکومت "سہ ماہ و چند روز" تحریر کی ہے۔ (ملاحظہ ہو منتخب التواریخ جلد اول صفحہ ۱۶۶)

(بقیہ فٹ نوٹ بر صفحہ ۳۲۴)

رو کنے میں گذارا۔ یہ نہایت بہادر، صاف طبیعت اور خدا ترس آدمی تھا۔ میدان جنگ میں لڑتا تو دشمن کے کشتوں کے پشتے لگا دیتا۔ لیکن ویسے کسی کے پھوڑے کو دیکھتا تو گھبرا جاتا۔ رحم اور عفو کا مادہ اس کے دل میں کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ دشمنوں کو ان پر احسانات کر کے اپنا بنا لیا اور خطا کاروں کو ہمیشہ معاف کر دیا۔ خلاف شرع کام سے بچتا تھا اور مسجد میں عام نمازیوں کی طرح نماز با جماعت ادا کرتا تھا۔ رفیق القلب بیحد تھا۔ جب کیلو کھڑی سے پہلی مرتبہ دہلی گیا اور بلبن کے کوشک سلطانی کی طرف بڑھا تو محل کے دروازے ہی پر گھوڑے سے اتر پڑا۔ بلبن کو یاد کر کے بہت رویا اور بہت دیر تک افسوس کرتا رہا۔

مؤلف طبقات اکبری نے اس واقعہ کو ذرا تفصیل سے درج کیا ہے جس سے سلطان کے تقویٰ و دینداری پر روشنی پڑتی ہے۔ لکھتا ہے۔ "احمد چپ نے پوچھا کہ یہ (کوشک لعل) محل آپ کا ہے اس لئے گھوڑے سے کیوں اتر پڑے۔ اس پر بادشاہ نے جواب دیا کہ یہ محل میرے ولی نعمت کا ہے اس کا احترام مجھ پر فرض ہے اور چونکہ یہ محل سلطان بلبن نے بادشاہ ہونے سے پہلے تعمیر کرایا تھا اس لئے یہ ان کی اولاد کی ملک ہے۔ اس میں قیام نہیں کر سکتا۔ یہ سن کر احمد چپ نے کہا کہ امور ملکداری میں اس قدر تقویٰ کی گنجائش نہیں ہے۔ سلطان نے برمحل جواب دیا "من از برائے مصلحتِ ملک چند روزہ چگونہ از قواعد اسلام بیروں آیم، و بر خلاف نفس الامر کارے کنم" یعنی چند روزہ بادشاہت کی مصلحت کی خاطر میں قوانین اسلام سے کیوں روگردانی کروں اور حقیقت الامر کے خلاف کوئی کام کیوں کروں؎ کجا عقل با شرع فتویٰ دہد   کہ اہل خرد دیں بدنیا دہد[۱]

فٹ نوٹ صفحہ ۳۲۳ = (۱) سلطان جلال الدین بن یغرش خلجی کا اصل نام ملک فیروز اور شائستہ خاں یا شائستی خاں خطاب (ملاحظہ ہو البدایونی ج ا ص ۱۶۶ نیز فتوح السلاطین ص ۱۹۹)

(۱) طبقات اکبری ص ۱۱۸، فرشتہ نے بھی انھیں الفاظ میں اس واقعہ کو مختصراً درج کیا ہے۔ ملاحظہ ہو فرشتہ ص ۸۹

عہدہ جات کی تقسیم

فیروز کے دربار کی حالت سلاطین غلامان کے دربار سے بہت زائد مختلف تھی۔ کیونکہ امرائے شمسی کا زور بلبن نے کم کردیا تھا۔ سلطنت پر ترکی اُمراؤ کے یک طرفہ حقوق کا استحقاق ختم ہو چکا تھا۔ جلال الدین کے تخت نشین ہونے کے بعد ترکی اُمراء کا اختلاف نسلی امتیاز کی بنا پر کچھ دنوں ضرور قائم رہا۔ جس کی وجہ سے جلال الدین کو اپنا دربار کیلوکھری[۱] میں کچھ دنوں کے لئے جمانا پڑا لیکن یہ اختلاف عارضی تھا۔ جلال الدین کی نرمی نے سب کو رام کرلیا۔ اس نے عہد بلبنی کے معززین کو ان کے عہدوں پر قائم رکھا۔ سلطان بلبن کے بھتیجے ملک چھجو المخاطب بہ کشلیخاں[۲] کو کڑہ کا صوبیدار بنایا۔ ناصر الدین بغراخاں کو بنگال کی حکومت پر بدستور قابض رہنے دیا ایک دوسرے بلبنی امیر حاتم[۳] خاں کو اودھ کا گورنر بنایا۔

سلطان کے تین بیٹے تھے۔ سب سے بڑا محمد خاں المخاطب خانخاناں۔ دوسرا ارکلی خاں اور تیسرا قدر خاں۔ ان تینوں میں ارکلی خاں نہایت شہ زور۔ بہادر اور قابل سپہ سالار تھا

ع۱:۔ کیلوکہری۔ کیقباد نے جمنا کے کنارے (موجودہ ہمایوں بادشاہ کے مقبرہ کے جانب جنوب ایک میل کے فاصلہ پر) ایک عالی شان قصر تیار کیا جس کے گرد وہ ایک نیا شہر بسانا چاہتا تھا اس محل کا نام کیلوکہری رکھا نام امیر خسرو کا تجویز کیا ہوا ہے بادشاہ نے امیر خسرو سے فرمائش کی کہ محل کا نام ایسا تجویز کیا جائے جس میں اس کی بادشاہی کا اور اس کا ذکر بھی ہو اور خدا کا نام بھی آجائے وہ نام ایسا ہو جس کو ہندو رعایا بھی سمجھ سکے کیلوکہری نام میں یہ سب باتیں آجاتی ہیں۔ لفظ "کے" میں کیقباد کا ذکر تھا اور "لوک" میں بادشاہی کا۔ اور ہری خدا کا نام ہے (نظامی نیسری ص۱۷)

ع۲:۔ مختلف تاریخوں میں اسکے مختلف نام ہیں پانچ نام راقم الحروف کی نظر سے گذرے ہیں یعنی کتلوخاں، کشلیخاں، کشلوخاں علاء الدین محمد اور ملک چھجو۔ یہ بلبن کے زمانہ میں "باربک" کے عہدہ پر فائز تھا۔ اس کی لڑکی سلطان کیقباد کو منسوب تھی۔ اپنے زمانہ کا نہایت اولوالعزم، مخیر اور اہل کمال کا قدردان امیر تھا۔ ع۳:۔ اصلی نام امیر علی، سخاوت کی وجہ سے حاتم خاں مشہور ہوا۔ بلبن کا نہایت معتمد علیہ غلام اور شاہی

بادشاہ نے اپنے بھائی یغروش خاں کو افواج شاہی کا حاکم اعلیٰ مقرر کیا اور اپنے دوسرے بھائی شہاب الدین مسعود خلجی کے دونوں بیٹوں علاء الدین اور الماس بیگ (الغ خاں) سے اپنی لڑکیوں کی شادی کی۔ سلطان کا ہمشیر زادہ ملک احمد حبیب خلجی (ملک احمد چپ) بڑا عقلمند اور تجربہ کار شخص تھا۔ بادشاہ نے اُس کو وزارت وندیمی کا مرتبہ عطا کیا تھا۔

بادشاہ کا حلم وخداترسی

(۱) کڑا اور اودھ کے ہندو روساء بہت زیادہ چالاک وعقلمند تھے۔ وہ وہاں کے صوبیداروں کے دربار میں زیادہ دخیل تھے۔ جب سلطان بلبن اور سلطان کیقباد اس نواح میں آئے تو انھوں نے نذر لانے وتحفے دے دے کر اپنا رسوخ اور بھی بڑھالیا تھا۔ اب جبکہ انقلاب سلطنت ہوا اور سلطان بلبن کے متعلقین اس نواح کے صوبیدار مقرر ہوئے تو اظہار وفاداری کے طور پر ملک چھجو کو غالباً انھوں نے بار بار توجہ دلائی کہ سلطنت دہلی کے اصلی وارث آپ ہیں یہ باتیں ملک چھجو کو بالطبع اچھی معلوم ہوئیں۔ اخیر نتیجہ یہ ہوا کہ کڑا اور اودہ کے دونوں صوبیدار مل گئے۔ ملک چھجّو نے سلطان مغیث الدین کا لقب اختیار کر کے کڑہ میں تاج شاہی سر پر رکھا اور اپنے نام کا خطبہ وسکہ جاری کیا۔ اپنے ساتھ ہندو سرداروں کا ایک ہجوم بے پناہ لے کر دہلی کی طرف روانہ ہوا۔ جلال الدین بھی دہلی سے آگے بڑھا۔ بدایوں سے آگے دس بارہ کوس کے فصل پر ارکلی خاں کا ملک چھجّو کے لشکر سے مقابلہ ہوا اس موقعہ پر برنی کے الفاظ یہ ہیں۔

"ارکلیخاں، با لشکر مقدمہ آب گلاب نگر عبرہ کردند وازاں طرف لشکر ملک چھجّو بیشتر آمد و درلشکر ملک چھجّو راوت وپایک ہندوستانی مانند مور وملخ گرد آمدہ بود"۔ [ع۱]

اس عبارت سے چھجو کی فوج کا اندازہ ہوسکتا ہے لیکن پہلے ہی حملے میں پوری فوج منتشر ہوکر بھاگ گئی۔ چھجو نے ایک ہندو مقدم کے یہاں پناہ لی جس نے اسے دو دن کے بعد

ع۱:۔ ضیائے برنی صہ ۱۸۲ کلکتہ۔

جلال الدین کے سپرد کردیا۔ تمام قیدی بدایوں میں جلال الدین کے سامنے پیش کئے گئے جلال الدین انھیں دیکھ کر ملول ہوا۔ بجائے باغیوں کو سزا دینے کے انھیں سراہا اور تعریف کی کہ انھوں نے بہت اچھا کیا جو اپنے مالک (چھجو) کا حق نمک ادا کیا پھر سب کو رہا کردیا[1]۔ البتہ ملک چھجو کو ملتان بھیج دیا۔ کہ وہاں نظر بند رہے۔ بادشاہ کی اس نرمی پر ملک احمد حبیب نے ٹوکا بھی لیکن بادشاہ نے اُس کا کوئی اثر نہیں لیا۔ سلطان نے ملک احمد کو مخاطب کرکے کہا کہ میں مرد مسلمان ہوں۔ اپنی زندگی کے ستر سال مسلمانوں میں رہ کر گذارے ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ مسلمانوں کا خون میری گردن پر ہو اور پھر تم سیاست کرنے کے لئے اُن اُمرائے نامدار وعالی تبار پر اصرار کرتے ہو جن کے مقابلہ میں ابھی چند سال پیشتر تک میری کوئی حقیقت نہیں تھی۔ جب ہم (یعنی میں اور برادر کلاں شہاب الدین) بلبن کے دور حکومت میں شاہی دربار میں حاضری دینے کے لئے جایا کرتے تھے تو اس امر کے متمنی رہتے تھے کہ امیر علی سرجاندار "سلام مارا علیک گوید"، اور بہت سے اُمرا جنھیں میں نے اس وقت معاف کردیا ہے ایسے ہیں کہ جن کے ساتھ ہمارا مدتوں ساتھ رہا ہے اسلئے یہ کیونکر ہوسکتا ہے کہ آج جبکہ خدائے برتر و بزرگ نے مجھے اپنے کرم سے بادشاہت کے مرتبہ پر فائز کیا ہے ان لوگوں کو بھول جاؤں اور اُن پر بجائے احسان و کرم کے سیاست کو کام میں لاؤں[2]۔

(۲) ایک مرتبہ ایک ہزار کے قریب ڈاکو اور ٹھگ پکڑ کر دہلی لائے گئے۔ اُن میں سے کسی ایک کو بھی سزا نہیں دی گئی۔ بلکہ سب کو کشتیوں میں سوار کراکر دریا جمنا و گنگا کے ذریعہ بنگال میں لیجاکر چھوڑ وا دیا گیا۔

(۳) بادشاہ کی نرمی کا اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ کہ ایک مرتبہ ناراض امراء

۱؎:- برنی ص ۱۸۳، فرشتہ جلد اول ص ۹۱، طبقات اکبری ص ۵۸۔

۲؎:- ضیائے برنی ص ۸۶-۱۸۴

کی پارٹی نے ایک دعوت میں تاج الدین کوچی (یہ امرائے چہلگان میں سے تھا) کے ہاتھ پر بادشاہ کو قتل کر ڈالنے کی بیعت کی۔ بادشاہ کو علم ہو گیا۔ پوری پارٹی کو بلا بھیجا۔ بہت کچھ سخت و سست کہنے کے بعد صرف یہ سزا دی کہ انھیں ایک سال کے لئے دربار میں آنے کی ممانعت کر دی۔

(۴) لیکن بادشاہ کے حلم و بردباری کی سب سے زیادہ عجیب و غریب داستان وہ ہے جس کو مولانا ضیاء الدین برنی نے تمام کمال نقل کیا ہے لکھتے ہیں کہ "ایک زمانہ میں جلال الدین سامانہ کا گورنر تھا اُس کے دیوان نے مولانا سراج الدین ساوی کے مقبوضہ گاؤں سے مطالبہ وصول کرنے میں سختی کی جس کی شکایت مولانا نے موصوف نے جلال الدین کے سامنے پیش کی لیکن بعض وجوہ کی بنا پر شنوائی نہیں ہوئی اس پر سراج الدین نے جو ایک مسلم الثبوت شاعر بھی تھے جلال الدین کی ہجو میں ایک طویل مثنوی تحریر کی جو ہر طرف "خلجی نامہ" کے نام سے مشہور ہو گئی۔ جب سراج الدین کو معلوم ہوا کہ حکومت نے اُن کی یاوہ گوئی پر نوٹس لیا ہے اور انھیں سزا دیگی تو یہ رُوپوش ہو گئے۔ اسی طرح جلال الدین نے ایک مرتبہ کیتھل کے اطراف میں منڈاہروں کے گانوں پر حملہ کیا اس حملہ میں ایک منڈاہری نے جلال الدین کو بُری طرح زخمی کر دیا۔ زخموں کے نشان آخر عمر تک چہرہ پر نمایاں رہے۔ وہ منڈاہری بھی رُوپوش ہو گیا۔ اور حکومت ان دونوں سے انتقام نہ لے سکی لیکن جب جلال الدین سریر آرائے سلطنت ہوا تو یہ دونوں خود بخود بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ بادشاہ کو جب معلوم ہوا کہ دو آدمی سیاست کئے جانے کے لئے دروازے پر کھڑے ہیں تو وہ باہر آیا اُس نے مولانا سراج الدین کو گلے سے لگا لیا اور نہ صرف اُن کا گانوں انھیں واپس دلایا بلکہ ایک گانوں اپنی طرف سے اضافہ کیا اور انھیں اپنا ندیم خاص بنا لیا۔ اسی طرح اُس ہندو منڈاہری کی شجاعت و بہادری کو بہت کچھ سراہا اور ایک لاکھ جیتل اُس کا وظیفہ مقرر کر کے اپنا وکیلدر بنا لیا اور ملک خورم کا خطاب عطا فرمایا۔ کرّہ میں

(فٹ نوٹ صفحہ ۳۲۹ پر)

جلال الدین کے ساتھ یہ بھی مارا گیا۔ سلاطین دہلی ہندو رعایا کے قلوب کو کس طرح مسخر کیا کرتے تھے اس کے لئے یہ مثال قابلِ غور ہے۔

سیدی مولیٰ کا قتل

ان تمام باتوں کے باوجود سیدی مولیٰ کا خون سلطان کے سر پر ہے اور غالباً سختی و بیرحمی کا یہی ایک واقعہ ایسا ہے جو سلطان کی فطری شرافت و رحمدلی کے برخلاف سرزد ہوا۔ سیدی مولہ کے بارے میں مختلف روایتیں ہیں۔ ضیاء برنی انھیں حضرت شیخ فریدالدین گنج شکرؒ کا مرید و خلیفہ بتاتا ہے اور آج کل کے بعض مورخین انھیں ملاحدہ کا نمایندہ تصور کرتے ہیں۔ جس طرح بہت سے علماء و مشائخ اور صوفیاء کرام چنگیزی فتنے سے محفوظ رہنے کے لئے اسلامی ممالک سے ہندوستان کی طرف چلے آئے اسی طرح بہت سے حسن بن صباح کے پیرو قلعۂ الموت کے تباہ ہونے پر صوفیاء کرام کے لباس میں ہندوستان میں آکر پناہ گزیں ہو گئے اور حضرت سیدی مولیٰ ان میں سے ایک ہیں۔ بہر حال برنی سے جو روایت ہم تک پہونچی ہے وہ یہ کہ سیدی مولیٰ ایک درویش تھے جو سلطان بلبن کے عہد میں ولایت ملک بالا سے شہر دہلی میں آئے ان کے طریقے عجیب و غریب تھے اگرچہ نماز پڑھتے تھے لیکن اسلافِ کرام کی طرح نماز باجماعت ادا نہیں کرتے تھے اور نہ جمعہ کی نماز کے لئے مسجد میں آتے تھے۔ ویسے مجاہدہ و ریاضت بہت کرتے تھے۔ جامہ اور چادر پہنتے اور چاول کی روٹی معمولی سالن سے کھاتے تھے۔ اہل و عیال اور دُنیا داری کے جھگڑوں سے پاک تھے۔ نہ کسی سے کچھ طلب کرتے اور اگر کوئی کچھ دیتا بھی تو اُسے قبول نہ کرتے۔ لیکن اُن کے اخراجات اتنے تھے کہ لوگوں کو حیرت ہوتی تھی اور ان کا خیال تھا کہ وہ علم کیمیا جانتے ہیں۔ اُنھوں نے ہزاروں روپیہ خرچ کر کے ایک خانقاہ بنوائی تھی۔ اس خانقاہ میں بڑی مقدار میں کھانا پکتا تھا اور مسافروں کو دونوں وقت ملتا تھا۔ کھانا ایسا ہوتا تھا کہ اُس زمانہ کے خوانین و ملوک کو بھی میسر نہ تھا۔

کھانے کی تیاری میں ہزاروں من میدہ روزانہ خرچ ہوتا تھا، پانچسو جانور ذبح کئے جاتے تھے دو تین سو من شکر اور سو دو سو من نبات (مصری) خریدی جاتی تھی۔ خانقاہ کے سامنے ہزاروں آدمیوں کا ہجوم رہتا تھا جس سے امیر و غریب سب مستفیض ہوتے تھے" خانقاہ کا تبرک ایک مرتبہ برنی نے بھی کھایا تھا "خرچ کے پورا کرنے کے لئے نہ بظاہر کوئی گاؤں تھا اور نہ ان کو شاہی وظیفہ ملتا تھا اور نہ وہ کسی سے فتوح قبول کرتے تھے لیکن اس کے ساتھ ہی کیفیت یہ تھی کہ جب کسی سے کوئی چیز خریدتے یا کسی کو کچھ رقم دینا چاہتے تو کہتے کہ جاؤ فلاں پتھر یا اینٹ کے نیچے جا کر اتنے نقرئی ٹنکے لیلو۔ وہ جاتا تو واقعی اینٹ یا پتھر کے نیچے یا طاق میں طلائی اور نقرئی سکے مل جاتے۔ یہ سکے ایسے ہوتے جیسے ٹکسال سے بالکل نئے نکلے ہوں۔

خانقاہ کے اخراجات سلطان جلال الدین خلجی کے عہد میں اور بھی زائد بڑھ گئے تھے۔ سلطان کا بڑا لڑکا خان خاناں ان کا معتقد ہو گیا تھا وہ اپنے کو سیدی مولہ کا بیٹا کہتا تھا۔ امراء و حکام کی آمد و رفت ان کے پاس بڑھ گئی تھی۔ قاضی جلال کاشانی نے جو قاضی القضاۃ تھا لیکن فتنہ انگیز تھا سیدی سے تعلقات پیدا کئے وہ دو دو تین تین راتیں خانقاہ میں بسر کرتا اور وہاں کے لوگوں کی گفتگو میں شریک رہتا اس گفتگو میں بلبن کے عہد کے موالی زادے جو امراء و ملوک کی اولاد سے تھے لیکن انقلاب سلطنت کی وجہ سے اقطاع و بلے ختم ہو گئے تھے شرکت کرتے ...... لوگ سمجھتے کہ ان اکابر کی آمد و رفت محض حصول برکت کے لئے ہوتی ہے لیکن معلوم ہوا کہ قاضی جلال کاشانی، خان زادے ملک زادے، ہرنح تن اور ہتھیا پایک کے کوتوال نے ارادہ کیا کہ جمعہ کے روز جب نماز کے لئے سلطان کی سواری نکلے تو اس پر حملہ کر دیا جاوے اور سیدی کو خلیفہ بنا کر ان کا نکاح سلطان ناصر الدین کی لڑکی سے کر دیا جاوے اور قاضی جلال کو قاضی خاں کا عہدہ اور ملتان کا اقطاعدار مقرر کیا جائے۔ اسی طرح اور اقطاعات آپس میں تقسیم

کرلئے جائیں۔ ان بیکار لوگوں میں سے ایک شخص جو مشورہ میں شریک تھا۔ اس نے ان سے منحرف ہو کر یہ تمام خبریں سلطان تک پہونچا دیں۔ سیدی اور ان کے ساتھی متہم کر کے سلطان کے سامنے لائے گئے۔

سلطان نے واقعہ کی تفتیش کرنا چاہی تو سب نے انکار کر دیا۔ اس زمانہ میں یہ رواج نہ تھا کہ انکار کرنے والوں سے لات اور ڈنڈے کے ذریعہ اقرار کرایا جاتا چنانچہ دب کے لئے حکم جاری کیا گیا۔ سلطان اور دوسرے لوگوں کو سازش کا پورا یقین تھا لیکن سازش کرنے والے منکر تھے اور گواہ صرف ایک تھا اس کے علاوہ اور کوئی ثبوت نہ تھا لہٰذا اُن پر کوئی حکم نافذ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس لئے بہارپور کے میدان میں آگ روشن کی گئی۔ سلطان ملوک اور خوانین کے ساتھ وہاں پہونچا ایک کوشک خاص نصب کیا گیا سلطان نے شہر کے تمام اکابر علماء و مشائخ کا محضر طلب کیا۔ اس میدان میں شہر کے خواص و عوام بھی جمع ہوئے۔ سلطان نے حکم دیا کہ سازش کرنے والوں کو آگ میں ڈال دیا جائے تاکہ جھوٹ اور سچ روشن ہو جائے لیکن متدین علماء نے منع کیا اور کہا کہ دب مشروع ہے اس لئے آگ کے ذریعہ جھوٹ و سچ کی تمیز نہیں کی جا سکتی اور شہادت ایک شخص کی ہے جو ناقابل سماعت ہے اس لئے سلطان نے دب کا ارادہ ترک کر دیا۔ پھر بھی سلطان نے انتظاماً قاضی جلال کو جو فتنہ کا سرغنہ تھا دہلی سے ہٹا کر بدایوں کا قاضی بنا دیا۔ خانزادوں اور ملک زادوں کو جلاوطن کر دیا اور اُن کی املاک ضبط کر لیں۔ برنجتن اور ہتھیا پایک کے کوتوال کو سزا دی۔ اس کے بعد سیدی مولٰی کو باندھ کر سلطان کے کوشک کے پاس لایا گیا سلطان نے اُن سے خود مباحثہ کیا اس مجمع میں شیخ ابوبکر طوسی حیدری بھی اپنی حیدری جماعت کے ساتھ موجود تھے۔ سلطان نے اُن سے خطاب کر کے کہا "اے درویشان! انصاف من از یں مولی بستانید" اس پر بجری نامی ایک حیدری نے بڑھ کر سیدی کو استرے سے زخمی کر دیا۔ ارکلی خاں نے کوشک کے اوپر سے

فیل بانوں کو اشارہ کیا۔ ایک ہاتھی سیدی مولی کی طرف دوڑا اور اُن کو پاؤں تلے مسل ڈالا جس روز سیدی مولی کا قتل ہوا ایک سیاہ آندھی آئی اور ہر طرف تاریکی چھا گئی۔ اس قتل کے بعد ملک میں طرح طرح کے فتور پیدا ہو گئے۔ اس سال دہلی میں بارش نہیں ہوئی۔ قحط پڑ گیا۔ غلہ ایک جتیل میں ایک سیر ملنے لگا۔ کوہ شوالک کی طرف کے لوگ قحط کے سبب مع عورتوں و بچوں کے دہلی چلے آئے۔ بیس بیس تیس تیس آدمی ایک جگہ رہتے اور بھوک سے بیتاب ہو کر اپنے کو جمنا میں غرق کر دیتے تھے۔ ادنیٰ لوگ سلطان اور اُمراء کے صدقات پر زندگی بسر کرتے تھے"[1] سیدی مذکور شہادت سے ایک ماہ قبل مندرجہ ذیل دو اشعار اکثر پڑھا کرتے تھے اور ہنستے تھے ؎

در مطبخ عشق جز نکو را نکشند	لاغر صفتان زشت خو را نکشند
گر عاشق صادقی زکشتن مگریز	مردار بود ہر آنچہ اُو را نکشند[2]

فتوحات

راجپوتانہ

ملک چھجو کی بغاوت سے فارغ ہونے کے بعد ۶۸۹ھ میں بادشاہ نے راجپوتانہ و مالوہ کی طرف توجہ کی جہاں کے راجپوتوں نے سلطان کیقباد کی عیاشی سے فائدہ اُٹھا کر منڈاور و رنتھنبور پر قبضہ کر لیا تھا۔ منڈاور راجپوتانہ میں مسلمانوں کی مغربی سرحد کی جنگی چوکی تھی۔ اجمیر پر مسلمانوں کا مستقل قبضہ ہونے کے بعد راجپوتانہ کے دوسرے مقامات کی جنگی اہمیت گھٹ گئی لیکن رنتھنبور کا معاملہ دوسرا تھا جس کی وجہ سے مسلمانوں نے اس کو بار بار فتح کیا۔ جلال الدین نے مشرقی راجپوتانہ اور شمالی مالوہ کا دورہ کیا اور بڑے بڑے سرکشوں کو سزا دیتا ہوا رنتھنبور پہونچ گیا جہاں شاہی فوجوں نے باغیوں کو

---

[1] ضیائے برنی ص ۲۰۸ تا ص ۲۱۲، فتوح السلاطین ص ۲۱۲

[2] منتخب التواریخ جلد اول ص ۱۷۱

پہلے ہی سے گھیر رکھا تھا۔ساباط اور گرگچ بن چکے تھے۔منجنیقیں نصب ہو چکی تھیں لیکن جلال الدین کو اس وسیع و مستحکم قلعہ کا معائنہ کرنے کے بعد تردد پیدا ہو گیا کہ قلعہ کی تسخیر میں نہ معلوم کتنے مسلمانوں کی جانیں جائیں گی۔وہ بالطبع نہایت حلیم و نیک دل تھا اور بادشاہ ہونے کے بعد باغیوں اور خونیوں تک کے قتل سے احتراز کرنے لگا تھا اس موقع پر بھی جذبہ خداترسی غالب آ گیا اور محاصرہ اٹھانے کا حکم دے دیا بعض امراء نے اس فیصلہ کی مخالفت کی اور ہر چند عرض کیا کہ ایسی رعایت کرنے سے نتیجہ خراب ہوگا اور آئندہ سرکشوں کی جرأت بڑھ جائیگی۔اس پر بادشاہ نے اسلام کی تعلیم اور کشت و خون سے تاامکان بچنے کی تعریف میں ایک لمبی چوڑی تقریر کی اور فوج کو واپس لے کر دہلی چلا آیا۔[1]

مغلوں کا حملہ اسلامی جہاد کو سلطان دفاعی جنگ سمجھتا تھا اس کا بھی موقع بہت جلد آ گیا ۶۹۱ھ میں ۱½ لاکھ فوج لیکر ہلاکو خاں کے پوتے یا نواسے عبداللہ خاں اور الغو خاں نے ہندوستان پر حملہ کیا اور سنام تک بڑھ آئے جہاں افواج دہلی نے اُن کا مقابلہ کیا اور کئی دن کی لڑائیوں میں اپنی جنگی برتری ثابت کردی۔یہ لوگ اب پہلے کی طرح کافر و بت پرست نہ تھے بلکہ بہت کچھ دین اسلام سے بھی واقف ہو چلے تھے اور بہت سے لوگ مسلمان ہو گئے تھے۔لہذا جلال الدین اپنی یقینی کامیابی کے باوجود اُن سے مصالحت پر آمادہ ہو گیا اور الغو خاں کو مسلمان کر کے اس کی ساتھ اپنی بیٹی بیاہ دی۔الغو خاں مع چند بڑے بڑے مغل سرداروں کے بادشاہ کی خدمت میں رہ گیا۔نو مسلم مغلوں کی یہ جماعت کیلوکھڑی، غیاث پور اور اندرپرست میں آباد ہو گئی۔بادشاہ نے اُن کے روزینے مقرر کر دیئے۔دو سال کے بعد بہت سے مغل آب و ہوا کی ناموافقت کی وجہ سے اپنے وطن کو لوٹ گئے جو باقی رہ گئے اُن کی یہیں شادی بیاہ ہونے لگے لوگ ان کو نو مسلم کہہ کر پکارتے تھے۔

---

[1]: تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ضیائے برنی ص ۲۱۳ تا ص ۲۱۸

مالوہ وراجپوتانہ

اِسی سال منڈور اور جھابن کے سرکش ہندوؤں کی گوشمالی کی گئی۔ جبکہ سلطان منڈور گیا ہوا تھا۔ اُس کے بھتیجے علاء الدین حاکم کڑہ نے سلطان سے بھیلسہ پر فوج کشی کی اجازت مانگی۔

علاء الدین دراصل اپنی بیوی اور خوشدامن ملکۂ جہاں کے تسلط سے سخت عاجز تھا[ع۱] اور اپنی مجبوری و بیکسی کا حال کسی سے کہہ بھی نہیں سکتا تھا۔ سلطان سے بھی شکایت نہیں کر سکتا تھا۔ لہٰذا وہ اسی فکر میں رہتا تھا کہ دہلی کی حدود سلطنت سے دور رہے۔ اس کے لئے سب سے زیادہ آسان بات بنگال کا بغرا خاں سے چھین لینا تھا۔ مگر اس کے مشیروں نے اس کی توجہ کو بھیلسہ اور دکن کی طرف پھیر دیا اُس کو دہلی کی فتح کے سبز باغ دکھائے جس کے لئے بیش از بیش روپیہ کی ضرورت تھی چنانچہ حصولِ زر کے لئے پہلے بھیلسہ کو منتخب کیا گیا برنی کے الفاظ یہ ہیں:۔

"وہمدراں سال کہ علاء الدین مقطع کڑہ شدہ وآنجا رفتہ بسے کارداراں و مقرباں ملک چھجو کہ مایۂ آں فتنہ شدہ بودند . . . . . . در دماغ سلطان علاء الدین ساندند کہ در کڑہ لشکر بسیار و مستعد و مرتب میتواں کرد و ممکن است کہ از کڑہ دہلی بدست آید۔ زر می باید۔ کہ اگر بر ملک چھجو زر می بودے ملک دہلی بدست او آمدے"[ع۲]

بھیلسہ پر چڑھائی کرنے والی فوج میں ہندو مسلمان دونوں شامل تھے بھیلسہ نہایت آسانی سے فتح ہو گیا۔ اور بہت کافی مال غنیمت ہاتھ لگا۔ یہیں پر اُس کو دیوگیری کی دولت کا پتہ چلا اور بتانے والے بھیلسہ ہی کے باشندے تھے۔ تاریخ فیروز شاہی میں لکھا ہے۔

"در انچہ علاء الدین در بھیلسہ رفتہ خبر بسیارے مال و پیل دیوگیر در سمع او افتادہ

ع۱:۔ فتوح السلاطین صد ۲۲۱ ، بدایونی صد ۱۷۳ جلد ۱

ع۲:۔ ضیاء برنی صد ۲۲۰

رفتن دیوگیر از آنجائیاں پرسید و در خاطر کرد۔ [1]

بھیلسہ کی تسخیر سے سلطان بہت مسرور رہوا اور خوش ہو کر علاءالدین کو اودھ بطور جاگیر دیدیا۔ سلطان کو اپنے اوپر مہربان دیکھ کر علاءالدین نے عرض کیا کہ اگر آپ اجازت دیں تو دو ایک سال اودھ وکڑا کا خراج نہ بھیجوں اور اس روپیہ سے جنگی قوت بڑھا کر چندیری پر حملہ کروں۔ چندیری پر حملہ کی اجازت مانگنا اور اس کے لئے تیاری کرنا صرف ایک بہانہ تھا۔ فرشتہ و برنی کے الفاظ اس جگہ قابل غور ہیں۔ دونوں کے الفاظ الگ الگ ہیں لیکن مفہوم ایک ہے یعنی یہ کہ وہ (سلطان علاءالدین) ملکۂ جہاں اور اپنی بیوی کے دائرۂ ظلم وستم سے دور رہنے کے لئے ایک ایسی جگہ کا متلاشی تھا جہاں وہ مقیم رہ سکے۔ برنی کے الفاظ یہ ہیں۔

"ومیخواہد کہ از جفائے ملکۂ جہاں وحرم خود دور دست رود واقلیمے ودیارے فروگیرد وہمانجا باشد وبیش درین جانب و درین دیار نیاید" [2]

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ علاءالدین کو بھیلسہ سے اتنی رقم ہاتھ نہیں لگ سکی جو وہ اپنے مشیران کار کے مشورے کے مطابق حصول تخت دہلی کے لئے کافی سمجھتا اسی لئے اس نے دہلی کے حدود سلطنت سے باہر چلا جانا ہی مناسب سمجھا کیونکہ اس سے دو فائدے تھے اول یہ کہ دور رہنے سے ملکۂ جہاں کے ظلم وستم سے بچا رہے گا۔ اور دوسرے یہ کہ بھیلسہ کے مفتوحین کے بتلانے کے بموجب دکن سے اگر روپیہ کافی ہاتھ آگیا تو پھر اسے ایک موقع دہلی کے تخت کے حاصل کرنے کے لئے کڑا رہتے ہوئے مل سکے گا۔

چنانچہ ۱۲۹۴ء میں کڑا مانکپور سے آٹھ ہزار منتخب سواروں کو لیکر اور اپنی جگہ برنی کے چچا علاءالملک کو اپنا قائم مقام بنا کر دیوگری کی طرف چل پڑا لیکن شہرت

---

[1] :۔ ضیاء برنی ص۲۲۳

[2] :۔ ضیاء برنی ص۲۲۱

یہ دی کہ وہ چندیری پر حملہ کرنے جارہا ہے۔ نوسو میل کا راستہ دو مہینے میں طے کر کے ملک
مرہٹ میں داخل ہوا۔ راستہ میں جو رجواڑے پڑے اُن میں یہ مشہور کرتا گیا کہ
وہ بادشاہ دہلی کا ایک سردار ہے۔ اس کے خوف سے دہلی کو چھوڑ کر کے جنوبی تلنگانہ
(راج مہندری) کے راجہ کے یہاں ملازمت کی غرض سے جارہا ہے۔ اس لئے کسی
نے اُس کو راستہ میں ذرا بھی نہیں روکا ایلچ پور پہونچکر اس نے دو دن قیام کیا اور
پھر دیوگری کی طرف روانہ ہوگیا۔ دیوگری کے راجہ راجچندر (رام دیو) نے شہر سے ۱۲ میل
کے فاصلہ پر لاسورا نامی مقام پر صرف تین ہزار آدمیوں کو لے کر جو نہایت عجلت میں
فراہم کئے گئے تھے مقابلہ کیا ریاست کی اصلی فوج اس کے لڑکے شنکر دیو اور اس
کی بیوی کی ہمراہ کسی تیرتھ کے لئے گئی ہوئی تھی۔ راجہ کو لڑائی میں شکست ہوئی
اور وہ دیوگری میں محصور ہوگیا۔ محاصرہ سخت تھا۔ محاصرہ کے دوران میں محصورین
کو یہ معلوم کر کے نہایت افسوس ہوا کہ جو بوریاں سامان رسد کی فراہمی کے لئے
لاسورا سے واپسی کے وقت قافلے والوں سے جلدی میں چھین کر رکھ لی گئی تھیں۔
ان میں بجائے غلّے کے نمک ہے اس لئے راجہ نے علاء الدین سے صلح کر لی علاء الدین
کو مالِ غنیمت میں اب تک ۳۰ یا ۴۰ ہاتھی۔ کئی ہزار گھوڑے ۲۰۰ من سونا۔ چاندی
وغیرہ ہاتھ لگ چکے تھے۔ یہ سب سامان اپنے ساتھ لے جانے کی راجہ نے اجازت
دیدی۔ دیوگری آنے سے پندرھویں دن بعد علاء الدین روانہ ہی ہونے والا
تھا کہ شنکر دیو تیرتھ سے واپس آگیا۔ اور لڑائی نئے سرے سے چھڑ گئی۔ کیونکہ اس کے
نے باپ کی شرائط کو ماننے سے انکار کر دیا۔ علاء الدین نے ایک ہزار فوج قلعہ والوں
کو مصروف جنگ رکھنے کے لئے الگ کو کے بقیہ فوج سے شنکر دیو پر شہر سے تین
میل کے فاصلہ پر حملہ کیا اور بالآخر اُس پر فتح پائی اب علاء الدین نے اپنی شرائط
جو دوبارہ پیش کیں وہ زیادہ سخت تھیں۔ نئی صلح کے بموجب راجہ نے سلطان

علاء الدین کو چھ سو من سونا۔ ایک ہزار من چاندی۔ سات من موتی دو من جواہرات اور چار ہزار ریشمین کپڑے نذر کئے اور اس مال و دولت کے علاوہ ایلیچپور کا علاقہ علاء الدین کو دینا منظور کیا۔ اِس چھوٹے سے علاقہ کو علاء الدین نے اپنے لئے مخصوص کر لیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اتنے دور دراز علاقہ میں ہندو ریاستوں کے درمیان اپنی آزادی کو قائم رکھنے کی اپنے اندر اہلیت سمجھتا تھا۔ علاء الدین کو دکن سے جو دولت حاصل ہوئی وہ محمدؐ بن قاسم کے زمانہ سے لیکر غوری کے عہد تک کی مجموعی مال غنیمت سے بدرجہا زائد تھی۔ لیکن یہ دولت[1] کبھی بجز اِس کے کہ جنوبی ہند سے شمالی ہند میں آگئی ہندوستان کے حدود سے باہر ہرگز نہیں گئی۔

جلال الدین کا قتل

سنہ ۱۲۹۵ء کے اواخر میں جلال الدین بسلسلہ سیر و شکار گوالیار میں مقیم تھا کہ اُس کو اپنے بھتیجے کے کڑا پہونچنے کی اطلاع ملی۔ درباریوں نے اور خاص کر ملک احمد حبیب نے بادشاہ کو سمجھایا کہ آگے بڑھ کر فوراً علاء الدین کے مال و دولت پر قبضہ کر لینا چاہئیے ورنہ نتیجہ خراب نکلے گا۔ بادشاہ علاء الدین کے کڑا سے اتنے عرصہ غیر حاضر رہنے کی وجہ سے ناراض بھی تھا۔ لیکن علاء الدین کے بھائی الغ خاں نے جو سلطان کا داماد تھا اور "آخور بک" کے عہدہ پر سرفراز تھا۔ علاء الدین کی غیبت میں بادشاہ کو بہت کچھ ہموار کر لیا تھا۔ علاء الدین کی فرماں برداری کا یقین دلایا۔ اور بادشاہ کو یہ بھی باور کرا دیا کہ وہ حضور کے ڈر کی وجہ سے اور اپنی حماقت پر متاسف ہونے کی وجہ سے دربار میں حاضر ہونے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ اگر اس کو حاضری

---

[1] :۔ ابن بطوطہ جو حملہ دیوگیر سے چالیس سال بعد ہندوستان آیا ہے۔ اِس دولت کے حاصل ہونے کا یہ سبب بتلاتا ہے کہ علاء الدین کے گھوڑے نے دوران سفر میں جنگل کے اندر ایک مقام پر ٹھوکر کھائی اور گھوڑے کے سم سے ایک زنجیر جو دبی ہوئی تھی برآمد ہوئی رکھو دنے پر اس مقام سے خزانہ برآمد ہوا جو علاء الدین کے ہاتھ لگا۔ وَاللّٰہُ اعلم

کے لئے مجبور کیا گیا۔ تو وہ یا تو زہر کھائے گا یا کسی دوسرے ملک کو چلا جائے گا۔ اس نے بادشاہ سے عرض کیا کہ جہاں پناہ اگر خود بنفسِ نفیس کڑہ تشریف لے چلیں تو نہایت مناسب ہوگا بادشاہ درباریوں کے منع کرنے کے باوجود اپنے وفادار سپہ سالار ملک احمد حبیب کو لیکر کڑا کی طرف چل پڑا۔ یہ سفر ڈبائی واقع ضلع بلند شہر سے گنگا میں بذریعہ کشتیوں کے کیا گیا شاہی بارجہ جب کڑا اور مانکپور کے درمیان پہونچا۔ جہاں علاء الدین استقبال کے لئے آیا ہوا تھا۔ تو علاء الدین نے استقبال کے لئے اپنے بھائی الغ خاں [ع۱] کو بھیجا۔ خود نہیں آیا۔ بادشاہ کو اس پر اعتراض بھی ہوا لیکن اس سے الغ خاں نے یہ بہانہ کر دیا کہ وہ حضور کے استقبال کی تیاریوں میں مصروف ہے اس لئے غیر حاضر ہے اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی گوش گذار کر دیا کہ حضور چند مخصوص خدام کو لیکر دریا پار تشریف لے چلیں، علاء الدین حضور سے بہت خائف ہے اگر اس نے ساتھ میں زیادہ بھیڑ بھاڑ دیکھی تو اس کی پریشانی اور خوف میں اضافہ ہو جائے گا۔ نتیجہ یہ ہوا بادشاہ کی فوج دریا کے اسی طرف رہ گئی۔ بادشاہ چند خدام کو لیکر علاء الدین سے دریا پار جاکر ملا۔ علاء الدین قدموں پر گر پڑا بادشاہ نے بہت محبت آمیز لہجہ میں علاء الدین کو سرزنش کی [ع۲] اور پھر علاء الدین کو لیکر اپنی کشتی کی طرف شفقت آمیز باتیں کرتا ہوا چلا۔ علاء الدین نے قتل کا اشارہ کیا۔ فوراً اس کے ایک ساتھی محمد سلیم نے تلوار کے دو ہاتھ مارے اور بادشاہ کو زخمی کر دیا۔ بادشاہ اپنی کشتی کی طرف بھاگا۔ لیکن دوسرے قاتل اختیار الدین نے پیچھے سے مسلسل کئی وار کئے اور بادشاہ کا خاتمہ کر دیا۔ یہ واقعہ ۱۷ رمضان ۶۹۵ھ۔

ع۱۔ الغ خاں نے دہلی میں بادشاہ کو علاء الدین کا ایک مکتوب دکھایا جو اس کے پاس کڑہ سے آیا تھا اس میں لکھا تھا کہ اگر بادشاہ نے شاہی کر و فر کے ساتھ دہلی سے کڑہ کا رخ کیا تو وہ معہ مال و اسباب و خزانہ کسی دوسرے ملک کی طرف چلا جائیگا چونکہ بادشاہ کا ارادہ کڑہ جانے کا ہو چکا تھا اسلئے الغ خاں کو کچھ دن پہلے کڑہ بھیج دیا کہ وہ وہاں جاکر علاء الدین کو سمجھائے اور باہر جانیکے ارادے سے باز رکھے اس کے بعد خود جریدہ کڑہ کی طرف

(باقی صفحہ ۳۳۹ پر)

سنہ ۶۹۵ھ مطابق ۲۹ جولائی سنہ ۱۲۹۶ء بروز جمعرات بوقت ظہر کا ہے اسی دن علاء الدین نے نے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ ملک احمد حبیب اپنی فوج کے ہمراہ جو براہ خشکی سفر کرتی ہوئی کڑہ پہونچی تھی یہ حالت دیکھ کر دہلی واپس لوٹ آیا۔

جلال الدین پر ایک نظر

سلطان جلال الدین بڑے عظمت و اقتدار اور جاہ و جلال کا بادشاہ تھا اُس کے ساتھ ہی ساتھ نہایت صاحبِ مذاق، رنگین طبع اور خوش صحبت تھا۔ شعر بھی کہتا تھا۔ بدایونی نے اِس کے دو شعر[۱] نقل کئے ہیں جن سے اُس کی رنگینی طبع کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ اس کے احباب اور شریک صحبت بھی حسب قدر تھے سب قابل، اہل فن اور موزوں طبع و رنگیں مزاج تھے

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۳۳۸ = روانہ ہوا اس لئے الغ خاں کڑہ میں پہلے سے موجود تھا۔ (مولف) ع۲: تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو ضیائے برنی ص ۲۳۴ – ع۳ :- صاحب طبقات اکبری اور فرشتہ نے سلطان جلال الدین کو واقعہ قتل کو اس عہد کے ایک مجذوب فقیر شیخ کرک کے ارشاد گرامی پر محمول کر کے اس انداز سے لکھا ہے جس سے دھوکا ہوتا ہے کہ سلطان مرحوم علاء الدین کے درپئے آزار تھا۔ حالانکہ ضیائے برنی کی تشریحات سے جو زائد قابلِ اعتماد ہیں یہ صاف ظاہر ہے کہ سلطان مرحوم کی بزرگانہ محبت و شفقت علاء الدین کے حال پر آخر تک باقی رہی۔ مجذوب فقیر کی طرف جو روایت منسوب کی جاتی ہے وہ یہ ہے "کڑہ میں جلال الدین کی آمد کے وقت علاء الدین (عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ علاء الدین پریشان ہے حالانکہ بظاہر پریشان ہونے کی کوئی وجہ نہ تھی) ایک مجذوب فقیر شیخ کرک کے پاس حاضر ہوا شیخ نے حالتِ جذب میں سر کو اوپر اُٹھا کر کہا سہ کہ ہر کس کہ بکند با تو جنگ + سر در کشتی تن در رنگ" (طبقات اکبری ص ۱۳۶، فرشتہ ص ۱۰۱) قابلِ غور امر یہ ہے کہ کیا جلال الدین جنگ کے ارادے سے کڑہ آیا تھا؟۔

ع۱ :- آں زلف پریشانت ژولیدہ نمی خواہم | داں روئے چو گلنارت تفسیدہ نمی خواہم
بے پیرہنت خواہم یک شب بکنار آئی | ہاں بانگ بلند است ایں پوشندہ نمی خواہم

(منتخب التواریخ جلد ۱ ص ۱۸۲ از بدایونی)

مثلاً تاج الدین کوچی، ملک فخر الدین، ملک اعز الدین، ملک نصرت، ملک جبیب، ملک کمال الدین، ملک سعد الدین وغیرہم انیس اور ہم صحبت تھے۔

اسی طرح اکثر بڑے بڑے اہل کمال ندیمی کے لئے انتخاب کئے تھے چنانچہ تاج الدین عراقی، حسن دہلوی، امیر خسرو، موید جاجرمی، اختیار الدین وغیرہ ندماء خاص تھے۔ ان کے علاوہ ساقی، مغنی اور مطرب بھی وہ لوگ تھے جو زمانہ میں انتخاب تھے مثلاً امیر خاصہ، حمید، نظام، محمد شاہ، بہروز وغیرہ۔

اِن تمام مختلف المذاق صاحب کمال لوگوں کی فہرست دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ جلال الدین کا دربار ہر لحاظ سے نہایت آراستہ و پیراستہ تھا جس کو اگر اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو بظاہر کئی باتیں قابل اعتراض معلوم ہوتی ہیں مثلاً دربار میں مغنی و مطرب کی موجودگی اور جام شراب[۱] کا دور۔ لیکن جلال الدین کی درباری زندگی کو نظر انداز کر کے جب ہم اُس کی پرائیویٹ زندگی پر نظر ڈالتے ہیں تو ایک دوسری کیفیت دکھائی دیتی ہے۔ وہ مطلق العنان بادشاہ ہونے کے باوجود معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اپنے اعمال و افعال کا کسی بڑی طاقت کے سامنے جواب دہ سمجھتا ہے اسلئے اپنے ہر کام میں نہایت احتیاط برتتا ہے مثلاً ایک مرتبہ اُس کے دل میں آیا کہ اُسے خطبہ میں المجاہد فی سبیل اللہ کے لقب سے یاد کیا جاوے جس کا وہ ہر طرح سے مستحق ہے کیونکہ اس کی پوری زندگی مغلوں کے خلاف غزوات میں گذری ہے اور وہ بے شمار لڑائیاں اُن سے لڑ چکا ہے۔ اس کا اظہار اُس نے ملکۂ جہاں کے سامنے کیا۔ ملکۂ جہاں نے بادشاہ کی خواہش کو علماء و مشائخ نیز اراکین سلطنت کے سامنے پیش کیا جبکہ وہ شہزادہ قدر خاں[۲] کی شادی کے سلسلہ میں

۱۔ "شراب" عربی لفظ ہے جو خمر اور غیر خمر دونوں کیلئے عام ہے۔ خمر کو بھی شراب کہتے ہیں اور بینیذ وغیرہ کو بھی شراب کہہ سکتے ہیں پس جو لفظ دو معنوں میں استعمال ہوتا ہو اس سے بلا قرینہ کوئی مخصوص معنی مراد نہیں لئے جا سکتے (مولف) ۲۔ جلال الدین کا تیسرا بیٹا قدر خاں تھا اسکی شادی سلطان کیقباد کی لڑکی کیساتھ ہوئی تھی۔

مبارک باد دینے کے لئے آئے ہوئے تھے۔ بات چونکہ معقول تھی اسلئے سب نے اس کو پسند کیا کہ آئندہ جمعہ سے خطبہ کے اندر بادشاہ کو المجاہد فی سبیل اللہ کے لقب سے موسوم کیا جائے۔ بادشاہ کو جب اس فیصلہ کا علم ہوا تو اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور خوانین شہر کو بلاکر فیصلہ مسترد کرا دیا اور اُن سے مخاطب ہو کر کہا کہ میں نے بیشک ملکہ جہاں سے خواہش ظاہر کی تھی کہ مجھے المجاہد فی سبیل اللہ کے لقب سے یاد کیا جائے لیکن اس کے بعد تین چار روز تک جب میں نے اپنے دل کے گوشوں کو ٹٹولا تو معلوم ہوا کہ یہ محض نفس کا فریب ہے مجھے یاد نہیں کہ اللہ کی راہ میں میں نے کبھی جہاد کیا ہو یا کوئی ایک تیر بھی جہاد کی نیت سے دشمن کی طرف پھینکا ہو۔ کفار سے لڑائیاں بیشک لڑا اور عمر بھر لڑتا رہا۔ لیکن اُن سب میں اپنی ناموری اور اپنے حاکم وقت کی خوشنودی کا خیال ہمیشہ مدِنظر رہا اسلئے میں اِس قابل نہیں کہ مجھے "اللہ کا سپاہی" کہا جائے۔ صدور شہر نے بادشاہ کو راضی کرنے کے لئے بہت کچھ کہا سُنا لیکن وہ نہیں مانا اسلئے کہ دوسروں کی بہ نسبت وہ خود اپنے نفس کی کیفیات سے زائد واقف تھا[1]۔

اِس قسم کے اور بھی واقعات ہیں جن کی وجہ سے مورخین اُسے بالاتفاق منکسر المزاج مانتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ منکسر المزاجی بغیر خوف خدا کے پیدا نہیں ہوتی جو ایک آمرو مطلق العنان بادشاہ کے لئے ایک بڑی نعمت شمار کرنا چاہئے۔ انکسارِ نفس کے علاوہ جلال الدین کے اندر کئی ایک اور بھی ایسی خوبیاں ہیں جو اُسے دوسروں سے ممتاز کرتی ہیں مثلاً اخلاق و مروّت یا صاحب حیثیت ہو کر اپنی گذشتہ فرومائیگی کو فراموش نہ کرنا۔ یہ خوبیاں ایک درویش باخدا کے اندر تو تلاش کی جا سکتی ہیں لیکن ایک دنیا دار یا سطوت شہنشاہ کے اندر ان کا پایا جانا لائق صد ستائش ہیں۔ ذرا غور کیجئے کُگڑھ کے باغی جن کی گردنیں طوق وسلاسل سے گراں بار ہیں اُس کے سامنے

---

[1] ضیائے برنی صہ ۱۹۶

کھڑے ہیں - ان میں بڑے بڑے جلیل القدر بلبنی اُمراء وملوک ہیں جو جلال الدین کے مقابلہ میں آج بیکس و بےبس ہیں - جرم یقیناً اِس نوعیت کا ہے کہ اُن کی گردنیں تلوار سے اُڑا دی جائیں لیکن کیا کیا جائے بادشاہ کی آنکھوں میں مروّت ہے اور اُسے اپنی پہلی زندگی یاد ہے جبکہ وہ سامانہ کا حاکم تھا - عہد گورنری میں جب وہ اپنے بڑے بھائی شہاب الدین کے ساتھ اِن جلیل القدر اُمراء سے دہلی میں ملا کرتا تھا تو اس امر کی تمنا کیا کرتا تھا کہ وہ اُس کے سلام کا جواب ہی دیدیں تو بڑی بات ہو - چنانچہ پچھلی زندگی کا یاد آنا تھا کہ "تعزمن تشاء و تذل من تشاء" کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر گیا - آبدیدہ ہو کر حکم دیتا ہے کہ باغی رہا کر دئے جائیں اور اُن کے شایانِ شان خاطر و مدارات کی جاوے -

تاریخ میں مروّت و اخلاق کی ایسی قابلِ تعریف مثالیں شاید کم نظر سے گذریں گی - اسی طرح سازشی جماعتوں اور ٹھگوں وڈاکوؤں کے گروہوں کو معاف کر دینے کی مثالیں بھی تاریخ میں نہ ہونے کے برابر ہیں - ممکن ہے کہ اس کی رحمدلی و خدا ترسی کو ایک طرح کی بزدلی پر محمول کیا جاوے اس لئے یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ یہ وہی جلال الدین ہے جو وحشی مغلوں کے مقابلہ میں صف آرا ہو کر انہیں بار بار زک دے چکا ہے بلکہ اخیر دفعہ جب وہ ۱½ لاکھ کی تعداد میں ہندوستان پر حملہ آور ہوئے تو ضعیف العمر ہونے کے باوجود اُس نے ان کا اس بے جگری سے مقابلہ کیا کہ مغلوں کو صلح کر لینے ہی میں اپنی عافیت نظر آئی - اسی طرح سازش کرنے والے اُمراء کو مخاطب کر کے جلال الدین کا یہ کہنا کہ دیکھوں تم میں ایسا کون سا بہادر ہے جو میرا مقابلہ کر سکتا ہے آئے اور تلوار اُٹھا کر دیکھ لے - ان الفاظ میں مبالغہ نہیں بلکہ حقیقت ہے -

گھریلو زندگی میں جلال الدین ایک شفیق باپ اور غمگسار چچا کی حیثیت سے دکھائی پڑتا ہے - بلکہ آخر میں اُس کی شفقت و محبت ہی نے اس کو شہادت کے درجہ

پر فائز کیا۔ بہر حال یہ تمام گوناگوں خوبیاں جن کا وہ حامل تھا غالباً اس لئے تھیں کہ اُس نے اپنے زمانہ کے صوفیاء کرام کی صحبت سے فیض اُٹھایا تھا۔ اس کو حضرت خواجہ بوعلی قلندرؒ سے بڑی عقیدت تھی۔ وہ اُن کے حلقۂ ارادت[1] میں بھی شامل ہوگیا تھا اسلئے یہ شاید انہیں کی صحبت کا اثر تھا کہ اس میں حلم، نرمی اور خدا ترسی کے اوصاف بدرجہ اتم موجود تھے[2]۔

(۲) سلطان رکن الدین ابراہیم جولائی ۱۲۹۶ء تا ۱۸ دسمبر ۱۲۹۶ء

سلطان جلال الدین کی شہادت کے بعد ملکۂ جہاں نے جو ایک ناقص العقل عورت تھی اِس کا انتظار نہیں کیا کہ اس کا منجھلا لڑکا ارکلی خاں جو ہر طرح بادشاہی کے لائق تھا ملتان سے آکر حکومت کے انتظامات کو اپنے ہاتھ میں لے۔ اُس نے نہایت عجلت میں اپنے چھوٹے بیٹے رکن الدین ابراہیم کو دہلی کے تخت پر بٹھادیا۔ اس نے کیلوکھڑی کی رہائش ترک کر کے دہلی کے اندر کوشک سبز میں اپنی سکونت اختیار کی۔ وہ مشکل سے پانچ مہینہ حکومت کر سکا اس کے بعد علاء الدین نے اس کو شکست دیکر ملتان کی طرف بھگا دیا اور خود دہلی کا شہنشاہ بن بیٹھا۔

ع[1]:- خزینۃ الاصفیاء ج ۱ ص ۳۲۷

ع[2]:- ضیائے برنی ص ۲۰۷

باب ششم ۔ عروج سلطنت

۱۲۹۶ء تا ۱۳۵۱ء

فصل اوّل (۳) سلطان علاء الدین خلجی بن شہاب الدین

دسمبر ۱۲۹۶ء تا ۲ جنوری ۱۳۱۶ء

تخت نشینی ویسے تو علاء الدین نے اپنی خود مختاری کا اعلان جولائی ۱۲۹۶ء میں کر دیا تھا۔ لیکن اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ دہلی کی طرف بڑھ سکے کیونکہ ارکلی خاں میں حکومت کی پوری اہلیت و صلاحیت تھی نیز جلالی اُمراء اُس کی مدد پر تھے اس لئے علاء الدین نے ارادہ کر لیا تھا کہ وہ کڑہ سے بنگال کی طرف چلا جائے لیکن اُس کی مشکل کو اس کی قدیم دشمن ملکہ جہاں نے ابراہیم کو تخت نشین کر کے آسان کر دیا۔ علاء الدین کو جب یہ معلوم ہوا کہ ارکلی خاں ملتان سے دہلی نہیں آئیگا تو وہ بڑا خوش ہوا اور ماہ صفر ۶۹۶ھ مطابق نومبر ۱۲۹۶ء میں کڑہ سے دہلی کی جانب روانہ ہو گیا۔

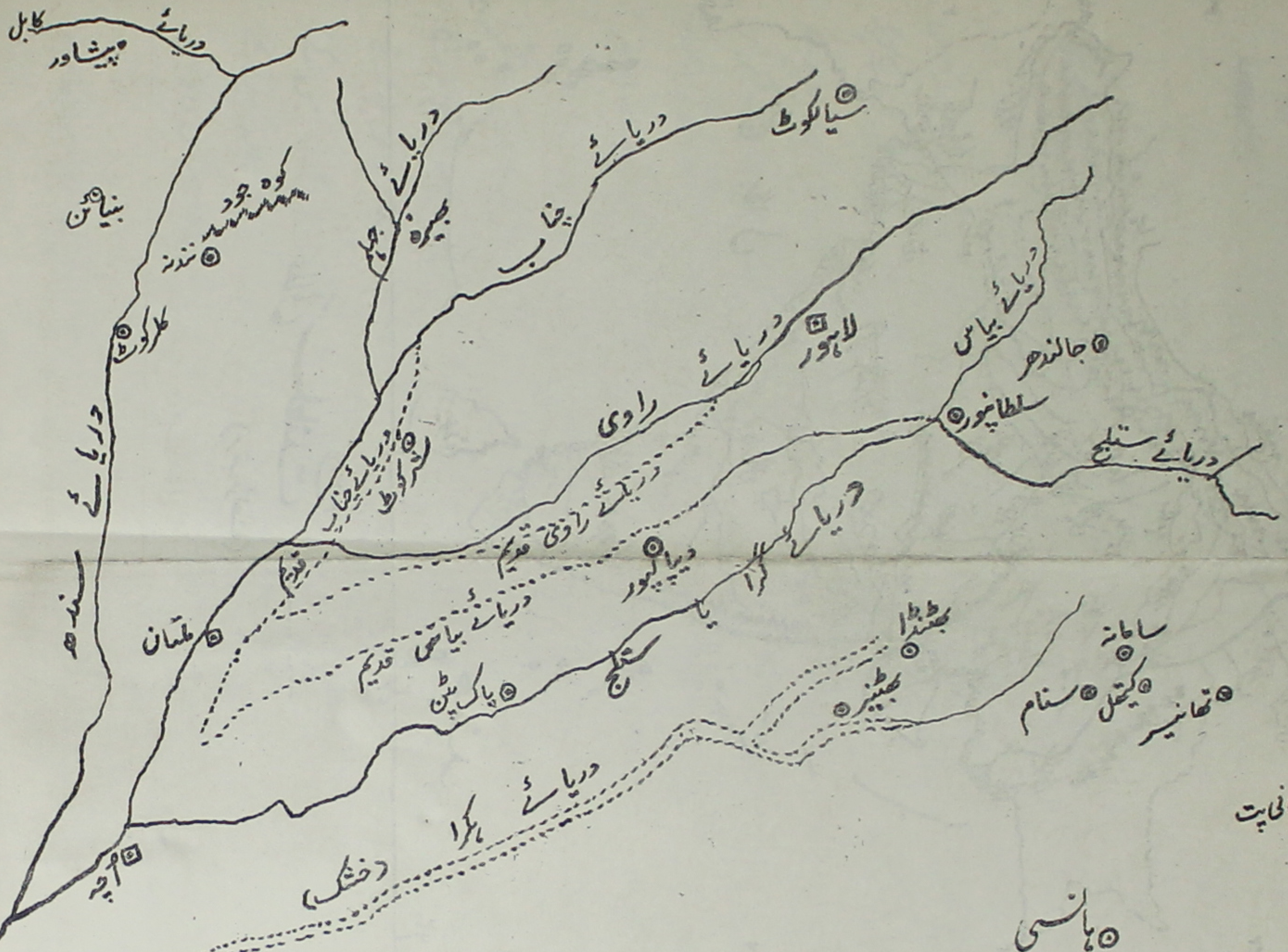
جلال الدین کے واقعہ شہادت نے عوام و خواص دونوں کو علاء الدین سے متنفر بنا دیا تھا۔ اُس نے اِس واقعۂ کو لوگوں کے دلوں سے فراموش کرنے نیز اپنی طرف راغب کرنے کے لئے دکن کی دولت کو بیدریغ لٹانا شروع کر دیا۔ چنانچہ دہلی آتے وقت اُس نے ہر ہر منزل پر پانچ پانچ من سونے کے پھول ایک چھوٹی منجنیق کے ذریعہ بکھیرنا شروع کر دئے اس کے علاوہ جو لوگ فوج میں آکر بھرتی ہوتے تھے انہیں صدہا روپیہ بطریق انعام دیا جاتا تھا۔ اِس زرپاشی نے عوام النّاس ہی کو نہیں بلکہ عمائدین دہلی کو بھی رام کر لیا جس کا ذکر آگے آتا ہے۔

غرضکہ اس طرح جب وہ بدایوں تک پہونچا تو اس کے پاس ۵۶ ہزار سوار اور ۶۰ ہزار

مقابل صفحہ ۲۰۰

علائی سلطنت ۱۳۱۶ء

(مرتبہ مؤلف)



شمالی مغربی صوبجات سنہ ۱۲۲۱ء تا ۱۲۹۰ء (مقابل صفحہ ۲۳۰)

پیادے فوج میں داخل ہو چکے تھے۔ علاء الدین نے یہاں کچھ دنوں قیام کیا اس کے بعد براہ گنور برن کی طرف بڑھا برن میں اس کی وہ فوج بھی آکر اس سے مل گئی جو کڑہ سے ظفر خاں کی ماتحتی میں براہ کول سفر کر رہی تھی۔ رکن الدین ابراہیم نے جن اُمرا[1] کو لاؤ لشکر کے ساتھ علاء الدین کا مقابلہ کرنے کے لئے برن کی طرف بھیجا تھا۔ وہ سب روپیہ کے لالچ میں آکر اس سے مل گئے۔ علاء الدین نے بعض اُمرا کو بیس اور تیس من اور بعض کو پچاس من تک سونا انعام میں دیا اسی طرح ہر ملک کو ۳ ہزار تنکہ نقد دئے گئے۔ ان حالات کی اطلاع ملکۂ جہاں نے اپنے منجھلے بیٹے ارکلی خاں کو دی اور اپنی غلطی پر اظہار تاسف کرتے ہوئے اُسے ملتان سے دہلی آنے کی دعوت دی لیکن ارکلی خاں نے آنے سے انکار کر دیا اِس دوران میں علاء الدین برن سے چل کر دہلی کے مقابل دریائے جمنا کے کنارے تک پہونچ چکا تھا اور منتظر تھا کہ دریا کا سیلاب کم ہو تو دہلی پر حملہ کیا جائے۔ اُسے جب معلوم ہوا کہ ارکلی خاں نے دہلی آنے سے انکار کر دیا ہے تو شادی کے باجے بجوائے۔ اور بڑی خوشی منائی۔ آخر کار دریا کا زور کم ہونے پر "گذر گاہ کاٹھ" سے جمنا کو عبور کر کے صحراء جودہ میں قیام کیا اور یہیں ابراہیم کے لشکر سے اُس کا مقابلہ ہوا۔ لیکن دست بدست جنگ کی نوبت نہیں آئی کیونکہ آدھی رات کیوقت ابراہیم کے لشکر کا بایاں بازو (میسرہ) علاء الدین سے جا کر مل گیا۔ اس پر ابراہیم خائف ہو کر بلا مقابلہ کئے ہوئے آخری شب میں دہلی واپس لوٹ آیا اور کچھ زر و جواہرات اور شاہی حرم کو لیکر ملتان کی طرف فرار ہو گیا۔ اُمراء میں ملک قطب الدین علوی اور ملک احمد حبیب نے اُس کا ساتھ دیا۔

دوسرے دن علاء الدین نے صحراء سیری میں آکر قیام کیا اور یہیں بروز دوشنبہ ماہ ذی الحجہ ۲۲ سنہ ۶۹۵ھ[2] کو رسم تخت نشینی بڑے دھوم دھام سے منائی۔ عیش و طرب کے جس قدر

---

[1]:۔ برنی نے کئی ملوک و اُمراء کے نام گنائے ہیں مثلاً تاج الدین کوچی، امیر علی دیوانہ، اماجی اخور بک، ملک عثمان امیر اخور، ملک امیر کلاں، ملک عمر سرخہ، اور ملک ہرن مار، (ص ۲۴۴) [2]:۔ ملاحظہ ہو خزائن الفتوح قلمی در کتبخانہ حبیب گنج علی گڈھ

سامان ممکن تھے کمال دریا دلی سے مُہیا کئے گئے۔ بادشاہ کی طرف سے وسیع پیمانے پر لوگوں کی میہمانی اور مدارات کا اہتمام ہوا۔ قدیم عمائد و اُمرار کے مناصب و جاگیرات میں اضافے ہوئے۔ نئے عہدے[۱] تقسیم کئے گئے۔ مستحقین کو بہت سا روپیہ صدقہ و خیرات میں تقسیم ہوا اور ہر طبقے کے افراد کو حسب مراتب اتنا انعام ملا کہ محتاج فارغ البال اور فارغ البال مالا مال ہو گئے اور ان رنگ رلیوں میں انھیں یہ بات بھی یاد نہ رہی کہ جس شخص کی اطاعت گذاری کا آج حلف اُٹھا رہے ہیں اسی کو چند روز پہلے صلواتیں سُنایا کرتے تھے۔

تخت نشین ہونے کے بعد علاء الدین کے دل میں صرف ایک خلش باقی تھی اور وہ ارکلی خاں وغیرہ کی طرف سے تھی۔ لیکن وہ بھی بہت جلد دفع ہو گئی اُس نے الغ خاں و ظفر خاں کو ملوک و اُمرار کے ساتھ تیس چالیس ہزار سوار دیکر ملتان کی مہم پر روانہ کیا۔ انھوں نے ملتان پہونچکر شہر کا محاصرہ کر لیا۔ اہالیان شہر نے دو ماہ کے بعد لڑنے سے انکار کر دیا اس پر سلطان مرحوم کے لڑکوں نے شیخ الاسلام حضرت شیخ رکن الدین رح کو درمیان میں ڈال کر جان بخشی کے وعدہ پر اطاعت قبول کر لی۔ علاء الدین نے اس وعدہ کی خلاف ورزی نہیں کی لیکن نصرت خاں کو توال شہر کو دہلی سے بھیج کر ارکلی خاں، رکن الدین ابراہیم الغو خاں مغل کو راستہ میں اندھا کرا کے ہانسی کے قلعہ میں نظر بند کرا دیا اور ملک احمد حبیب کو اندھا کرا کے نیز ملکۂ جہاں کو معہ شاہی مستورات کے دہلی لا کر قید کر دیا البتہ ارکلی خاں کے تمام لڑکے قتل کرا دئے گئے۔ یہ سب سنہ جلوس کے پہلے سال کے واقعات ہیں۔ دوسرے سال یعنی سنہ ۶۹۶ھ میں کڑہ سے مورخ برنی کے چچا علاء الملک کو بلا کر شہر دہلی کا کوتوال مقرر

---

[۱]: خواجہ خطیر الدین کو وزارت کا عہدہ دیا لیکن دوسرے سال یہی عہدہ نصرت خاں کو تفویض ہوا۔ قاضی صدر الدین کو قاضی ممالک بنایا۔ عمدۃ الملک کو دیوان انشار سپرد کیا اور اس کے دونوں لڑکوں حمید الدین اور اعز الدین کو بھی ذمہ دار عہدوں پر مقرر کیا۔ نصرت خاں کو کوتوال شہر بنایا۔ دادبکی ملک فخر الدین کوچی کو ملی اور ظفر خاں کو عارض ممالک کا عہدہ سپرد ہوا۔ اسی طرح اور اُمرا کو بھی اچھے اچھے عہدے دئے گئے۔ (باقی صفحہ ۳۴۷ پر)

کیا اور وزارت کا عہدہ نصرت خاں جلیسری کو دیا۔

مغلوں کا پہلا حملہ ۶۹۶ھ میں بلبن کے حُسنِ انتظام کی وجہ سے مغلوں کے حملوں میں کمی واقع ہوگئی تھی لیکن اس کے جانشین کیقباد کی غفلت اور فیروز خلجی کی نرم پالیسی نے حکومت کا ڈھیر بگاڑ دیا تھا اسلئے مغل ہندوستان کی سیاسی بدنظمی سے فائدہ اُٹھا کر پھر حملے کرنے لگے۔ پہلے حملہ کے فوری اسباب کیا تھے اس کی کسی مورخ نے تصریح نہیں کی ہو سکتا ہے کہ انھوں نے شہزادہ الغو خاں کے ساتھ بُرا برتاؤ کئے جانے کی وجہ سے علاء الدین پر حملہ کیا ہو۔ بہر حال ابھی علاء الدین کو تخت پر بیٹھے مشکل سے چند ماہ گذرے تھے کہ مغلوں نے پنجاب کو فتح کرنے کے ارادے سے حملہ کیا اور دریائے سندھ کو عبور کر کے پنجاب خاص میں گھس آئے علاء الدین نے حملہ آوروں کو روکنے کے لئے اپنے سب سے زیادہ بہادر اور معتمد علیہ سپہ سالار الغ خاں اور ظفر خاں روانہ کئے انھوں نے مغلوں کے ٹڈی دل کو جالندھر سے آگے بڑھ کر روکا۔ مغلوں کی تعداد ایک لاکھ کے قریب بیان کی گئی ہے اور غالباً ابھی تک اتنی بڑی تعداد سے اہل دہلی کھُلے میدان میں نہیں لڑے تھے لیکن بلبن کے زمانہ کی ہیبت مغلوں کے دلوں پر ابھی تک چھائی ہوئی تھی جس نے بڑا کام کیا اور جنگ کے نتیجے سے بھی ثابت کر دیا کہ سرداروں کی قابلیت اور سپاہیوں کی جانبازی حریف سے کسی طرح کم نہ تھی چنانچہ فرشتہ کی روایت[۱] کے بموجب تقریباً ۱۲ ہزار مغل سپاہی مارے گئے اور انہیں سخت شکست ہوئی[۲]۔

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۳۴۶ ؏ برنی کے الفاظ یہ ہیں "خلق خیان فرلیفۂ زر گشت کہ نام قبح فعل سلطان علاء الدین وکفران نعمت او بزبان کسے نمیرفت واز ذوق گرفتن زر، مردماں را پروائی ہیچ کارے نمانده بود" (برنی ص ۲۴۸)

۲؎:۔ تاریخ فتحیابی از روئے خزائن الفتوح ۲۲ ربیع الآخر ۶۹۷ھ بروز پنجشنبہ ہے۔

۱؎:۔ فرشتہ ص ۱۰۲

جلالی اُمراء پر عتاب

اس کامیابی نے علاء الدین کی سطوت و شوکت کو دوبالا کر دیا۔ اسے اب کسی کا ڈر باقی نہیں رہا تھا اسلئے اُن جلالی اُمراء کو سزا دینے کے لئے جنھوں نے سال گذشتہ اپنے آقا سے نمک حرامی کر کے علاء الدین کا ساتھ دیا تھا نصرت خاں کو مامور کیا تاکہ ان سے وہ روپیہ وصول کرے جو بطریق رشوت ان کو دیا گیا تھا۔ اس میں قدیم اُمراء پر بڑی بڑی سختیاں ہوئیں۔ طبقہ اعلیٰ کے بہت کم خاندان[1] ایسے تھے جو نصرت خاں وزیر کے جبر و تشدّد سے محفوظ رہے ورنہ قدیم اُمراء کا تمام مال و اسباب ضبط کر لیا گیا۔ اُن کی جاگیریں چھین لی گئیں اور بعض نہایت سخت سزائیں دی گئیں۔ جس کی وجہ سے طبقہ اُمراء میں دوبارہ بیزاری کی لہر دوڑ گئی مگر بادشاہ نے اس کی کوئی پرواہ نہیں کی اس کو فوجی تیاریوں کے لئے روپیہ کی سخت ضرورت تھی۔ نصرت خاں نے کم و بیش ایک کروڑ روپیہ کا مال اُمراء جلالی سے وصول کر کے شاہی خزانہ میں داخل کیا۔

گجرات پر حملہ[2]

اس روپیہ سے ایک بڑی فوج تیار کر کے اُلغ خاں اور نصرت خاں کو سپہ سالار بنا کر گجرات کی تسخیر کے لئے روانہ کیا۔ گجرات کا دارالسلطنت انہلواڑہ قطب الدین ایبک کے عہد حکومت میں فتح ہو چکا تھا لیکن پورے جزیرہ نمائے گجرات پر مسلمانوں کا تسلط نہیں ہوا تھا اس لئے اِس اکیلے شہر پر بھی اسلامی حکومت

ح ۱:۔ برنی کی روایت کے بموجب صرف تین خاندان ایسے تھے جو بچ گئے ایک ملک قطب الدین علوی کا، دوسرا نصیر الدین شحنہ پیل اور تیسرا خاندان ملک امیر جمالی کا۔ یہ تینوں خاندان آخر تک جلال الدین کے لڑکوں کے مددگار رہے تھے اور نہ انھوں نے علاء الدین سے ایک حبہ رشوت کا لیا تھا (ضیائے برنی ص ۲۵۱)۔ ملک قطب الدین علوی کے مزید حالات کے لئے ملاحظہ ہو تاریخ فیروز شاہی ص ۲۰۲ از ضیائے برنی۔

ح ۲:۔ گجرات پر حملہ کی تاریخ خزائن الفتوح میں نظر سے گذری۔ حضرت امیر خسروؒ تحریر فرماتے ہیں ؎

یعنی کہ چہار شنبہ وز اول جمادبیست   تاریخ سال ششصد و ہشت و نود شدہ

۲۰۔ جمادی الاول ۶۹۸ھ بروز چارشنبہ۔

غالباً زیادہ عرصہ تک برقرار نہیں رہ سکی کیونکہ گجرات کے شاداب علاقے سے قطع تعلق ہوتے ہی اس کے ہر طرف راجپوتانہ کا ویران ریگستانی علاقہ رہ گیا اور حکومت دہلی کے لئے یہ بات نہایت دشوار ہوگئی کہ وہاں کوئی بڑی چھاونی بنا کر اُسے اپنے دوسرے مقبوضات سے کمک پہونچانے کا انتظام کردیتی۔ گو یہ بات کہیں صراحت کے ساتھ تحریر نہیں ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ قطب الدین کے بعد ہی اسلامی فوجوں کو یہاں سے واپس بلانا پڑا اور اس شہر پر بھی گجرات کے راجاؤں کا دوبارہ قبضہ ہوگیا تھا۔

بہرحال علائی فوج جب گجرات پہونچی تو وہاں کا راجہ کرن تاب مقاومت نہ لاکر فرار ہوگیا اور دیوگری کے راجہ رام چندر یا رامدیو کے پاس جاکر پناہ گزیں ہوگیا۔ وہ اتنی بدحواسی کے عالم میں بھاگا تھا کہ ساتھ میں نہ اپنی بیوی کنولا دیوی کو اور نہ اپنے خزانے کو ہمراہ لیجاسکا چنانچہ کنولا دیوی کو دہلی بحفاظت تمام پہونچادیا گیا جہاں سلطان علاء الدین نے اُس کو اپنے نکاح میں لے کر بانوئے سلطنت اور ملکۂ جہاں بنادیا۔

انہلواڑہ پر (جس کو اب پٹن کہتے ہیں) قبضہ کرنے کے بعد نصرت خاں کچھ اور کھمبایت کی طرف گیا اور وہاں کے ساہوکاروں سے خوب روپیہ وصول کیا۔ یہیں اُس نے ایک نیچ قوم کے برواری ہندو کو جسے خوجہ بنا کر ایک ہندو ساہوکار نے اپنا غلام بنا رکھا تھا اس کے مالک سے زبردستی چھین لیا۔ یہی وہ غلام تھا جو علاء الدین کی خدمت میں پہونچکر ملک کافور بنا اور پھر رفتہ رفتہ ہزار دیناری اور بالاخر وزیر ممالک بن گیا۔

گجرات و کھمبایت کی فتح اور وہاں کے انتظامات سے فارغ ہوکر جب الغ خاں اور نصرت خاں دہلی کی طرف واپس ہوئے تو راستہ میں جالر (جھالر) کے مقام پر مالِ غنیمت پر فوجیوں سے جھگڑا ہوگیا۔ چونکہ اکثر وبیشتر سپاہیوں کے پاس مالِ غنیمت خمس سے زائد تھا اسلئے سرداران لشکر نے سپاہیوں کی تلاشی کا حکم دیا اس سلسلہ میں سپاہیوں پر بڑی سختیاں کی گئیں انہیں زدوکوب کیا گیا اور بُری طرح پیٹا گیا اس پر نو مسلم مغل سپاہی یکدل

ہو کر بغاوت پر آمادہ ہو گئے اور دو تین ہزار سواروں نے بغاوت کر کے وزیر نصرت خاں کے بھائی ملک اعز الدین کو قتل کر ڈالا۔ اس کے بعد الغ خاں کے خیمہ کی طرف بڑھے لیکن الغ خاں موقع کی نزاکت کو دیکھ کر نصرت خاں کے خیمہ کی طرف چلا آیا تھا۔ باغیوں نے خیمہ میں داخل ہو کر علاء الدین کے ہمشیر زادے کو الغ خاں کے دھوکے میں قتل کر دیا۔ اس عرصہ میں وفادار سپاہی نصرت خاں کی بارگاہ کے سامنے جمع ہو گئے۔ اُن کی مدد سے بلوائیوں کو منتشر کر دیا گیا۔ یہ لوگ آوارہ ہو کر رن تھمبور کے راجہ ہمیر دیو کے پاس چلے گئے۔ مال غنیمت کی فراہمی کے احکامات کو منسوخ کر دیا گیا اور پھر بغیر کسی حادثے کے دونوں ہراول لشکر معہ مال غنیمت دہلی پہونچ گئے۔

بلوائیوں سے انتقام

علاء الدین نے نومسلم مغل اُمراء و سپاہیوں کے بلوہ کی خبر سُنتے ہی اُن کے اہل و عیال کو دہلی میں قید کر دیا یہ نئی بدعت تھی جو علاء الدین کی خودسری کی وجہ سے ہندوستان کی تاریخ میں پہلے پہل ظہور میں آئی ورنہ باغیوں کے عورتوں اور بچوں سے حکومت تعارض نہیں کیا کرتی تھی۔ نصرت خاں نے دہلی پہونچکر جوش انتقام میں عورتوں اور بچوں کو جلادوں کے سپرد کر دیا جنھوں نے بڑی ذلت کے ساتھ ان کو قتل کر ڈالا۔ مورخ برنی نے اس پر بڑی حیرت و نفرت کا اظہار کیا ہے کیونکہ یہ ظالمانہ فعل بالکل نئے طرز کا تھا اور احکامات اسلامی کے سراسر خلاف چنانچہ لکھتا ہے کہ "این ظلم در ہیچ دینی و مذہبی نہ کردہ اند کہ او کرد و ہرچہ ازیں بابت ہا از و در وجود می آمد خلق دہلی در تعجب و حیرت می شدند و لرزہ در سینۂ خلائق می افتاد"[۱]

مہم سیوستان

۶۹۶ھ کے شروع میں جبکہ گجرات کی تسخیر کے لئے فوجیں روانہ کی گئیں۔ علاء الدین نے ایک فوج ظفر خاں کے ماتحت سیوستان (واقع سندھ) بھیجی۔ سیوستان سندھ کا ایک حصہ اور سلطنت دہلی کا ایک جُز تھا جہاں عرصہ سے ایک

---

[۱] ضیائے برنی ص ۲۵۳

غیر مسلم راجہ جھیلدیو یا صلدی نامی مغلوں کی شہ پاکر خود مختار بن بیٹھا تھا۔ مغلوں نے بلوچستان کے راستہ سے آکر راجہ کی مدد کی لیکن ظفر خاں کی فراست وشجاعت کے سامنے ان کی ہمتیں پست ہوگئیں اور بالآخر ایک سخت معرکہ آرائی کے بعد ظفر خاں نے راجہ اور اُس کے بھائی نیز مغل سرداروں کو گرفتار کرکے دہلی روانہ کردیا اور خود بھی بیشمار مال غنیمت لیکر بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوگیا۔ اِس مہم کو جس بیباکی، صفدری ودلاوری کے ساتھ ظفر خاں نے انجام دیا تھا اس کی بنا پر علاء الدین کو اِس رستم ثانی سے رقابت پیدا ہوگئی اور وہ اِس فکر میں لگ گیا کہ اس کو دفع کرنے کے لئے یا تو اسے لکھنوتی کی مہم پر روانہ کردے یا پھر زہر دیکر ہلاک کردے یا اندھا کرکے بیکار کردے۔ مگر اس کی نوبت نہیں آنے پائی کیونکہ علاء الدین کو مغلوں سے مقابلہ پیش آگیا۔

مغلوں کا دوسرا حملہ ۶۹۸ھ کے اخیر میں ماوراءالنہر کے مغل شہزادے قتلغ خواجہ نے بڑے ساز وسامان اور لاؤلشکر کے ساتھ دہلی پر حملہ کیا جس نے چنگیز خانی سیلاب کی یاد کو تازہ کردیا۔ اس مرتبہ مغل خونخوار قزاقوں کی طرح نہیں آئے بلکہ وہ اِس اطمنان سے بڑھ رہے تھے گویا خاص اپنے ملک میں سفر کررہے ہیں۔ راستے میں انھوں نے کسی شہر کو تاراج وپامال نہیں کیا بلکہ سیدھے باگ اُٹھائے دہلی تک چلے آئے اور شمال میں دریا کے کنارے تک پہونچ کے تین طرف سے شہر کی ناکہ بندی کرلی۔ اِس مرتبہ وہ حکومت اسلامی کو فتح کرنے کے ارادے سے آئے تھے یہی موقع ہے جبکہ مختلف اقطاع کی سپاہ اور مضافات شہر کے پناہ گزینوں کی وجہ سے دہلی میں اتنے آدمی بھر گئے کہ تل رکھنے کی جگہ باقی نہ رہی اور اجناس حد سے زائد گراں ہوگئیں۔

کچھ تو پناہ گزینوں کی آمد کی وجہ سے اور کچھ مغلوں کی دلیری کے سبب اُمرائے دہلی پریشان ومتفکر ہوگئے ان میں سے ایک نے خلوت میں بادشاہ کو صلاح بھی دی کہ جس طرح ممکن ہو روپیہ دے کر اس بلا کو ٹال دیا جائے لیکن علاءالدین خلجی نے اس مشورہ کو

قبول نہیں کیا اور مغلوں سے دو دو ہاتھ کرنے کی ٹھان لی۔ اس کا یہ فیصلہ کچھ تو اپنی فطری شجاعت کی بنا پر اور زائد تر اپنی فوج کے اوپر اعتماد و بھروسہ کی وجہ سے تھا جس کے لڑانے والے ظفر خاں، الغ خاں، رکن خاں اور غازی ملک جیسے آزمودہ کار سپہ سالار تھے جنھوں نے پہلے بھی مغلوں کو شکستیں دے کر نام پیدا کیا تھا۔

مغلوں کی فوج ۲۰ تمن[1] (۲ لاکھ) تھی اور دہلی کی سپاہ میں بقول فرشتہ[2] تین لاکھ صرف سوار تھے۔ ہندوستان میں اس سے پہلے اور نہ بعد کو پایۂ تخت دہلی کے زیر حصار اتنی بڑی لڑائی ہوئی جس میں فریقین کی فوجوں کا شمارہ لاکھ تک پہونچا ہو بلکہ جنگ مہابھارت کی افسانوی حیثیت سے قطع نظر پانی پت کی تیسری لڑائی کے سوا پوری تاریخ ہند میں اور کسی جنگ کا پتہ نہیں چلتا جس میں لڑنے والوں کا شمار مذکورۂ بالا تعداد کے قریب پہونچ گیا ہو۔ علاء الدین نے شہر سیری کو علاء الملک کی سپردگی میں دیکر پھاٹکوں کو بند کرا دیا اور خود شہر سے باہر نکل کر کیلی (غالباً مہرولی) کے صحرا میں اپنی فوجوں کو لڑنے کے لئے ترتیب دیا۔ اس موقع پر یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ دہلی کے حربی ماہروں نے ہندوستان کے جنگی ہاتھیوں کو سدھا کر جس قدر کارآمد شے بنا دیا تھا اس سے اسلامی حکومت کے فن حرب میں ترقی کا ثبوت ملتا ہے۔ پیل و اسپ کا متحدہ حملہ روکنا غنیم کو دشوار ہو جاتا تھا۔ گو مغل حملہ آور اس "بلائے سیاہ" سے ناواقف نہ تھے اور ان کی جرأت و گزیر پائی میں بھی کوئی کلام نہیں ہو سکتا لیکن جس وقت "ظفر خاں" جو کہ شجاعت میں رستم ثانی تھا فوج میمنہ کو لیکر آگے بڑھا اور اس کے جنگی ہاتھیوں کے خوفناک حملے کے ساتھ ہی سواران دہلی گھوڑے اڑا کر دشمن پر جا پڑے تو مغلوں کا بایاں بازو یعنی "میسرہ" اپنی جگہ پر قائم نہ رہ سکا۔ اس کی صفیں ٹوٹ گئیں اور اُن کے پیچھے ہٹتے ہی ظفر خاں نے اس طرح گھیر کر دبا یا کہ وہ مغلوں کے قلب سے جدا ہو کر دور

---

[1]۔ برنی صـ ۲۵۳ [2]۔ فرشتہ صـ ۱۰۴

ہوتا چلا گیا۔

مغل سرداروں نے اب یہ کوشش کی کہ جس طرح ممکن ہو اس گھیرے سے اپنی صفیں نکال کر اصلی لشکر سے جا ملیں لیکن ظفر خاں کے پیہم حملوں نے انہیں صف بندی اور جم کر لڑنے کی قطعی فرصت نہ دی۔ دیر تک یہی صورتِ جنگ قائم رہی مغل سپاہی ظفر خاں کی شکل دیکھ کر سہمے جاتے تھے جو ہر خطرناک مقام پر سب سے آگے نظر آتا تھا۔ برنی کی روایت[۱] یہ ہے کہ وہ مغلوں کی فوج کو بھگاتا اور مارتا ہوا چھتیس میل تک پیچھے ہٹا لایا۔ اس موقع پر علاء الدین کی فوج میسرہ نے جو الغ خاں کے ماتحت تھی اس کی کوئی مدد نہیں کی۔ اس کو چونکہ ظفر خاں سے حسد تھا اسلئے وہ خاموش اپنی جگہ پر کھڑا تماشا دیکھتا رہا۔ اس بات کو مغلوں کے ایک بہادر سردار "طرغی" نامی نے بھانپ لیا اور یہ دیکھ کر کہ ظفر خاں کی پشت پر کوئی مددگار فوج نہیں ہے تو پیچھے سے آکر اس کو گھیر لیا۔ ظفر خاں دشمن کے نرغہ میں گھر کر گھوڑے سے گرا۔ اس پر بھی وہ دشمن سے برابر لڑتا رہا۔ قتلغ خواجہ نے اس کو پیام دیا کہ اگر وہ اطاعت قبول کرے تو مغلوں کا شہنشاہ علاء الدین سے زیادہ اُس کی قدر کرے گا۔ لیکن اُس نے کوئی توجہ نہ دی اور آخرکار پیادہ لڑتا ہوا مارا گیا۔

ظفر خاں کی شہادت سے اگرچہ علاء الدین کے دل کی کھٹک جاتی رہی لیکن شمشیر زنی کا مغلوں کے اوپر سکہ بیٹھ گیا جسے ہمعصر مورخ نے شاعرانہ آب و تاب کے ساتھ بیان کیا ہے[۲]۔ ویسے بھی مغل سپہ سالار کو حریف کی کثرت سپاہ دیکھ کر اپنی فتح سے مایوسی ہو گئی اور وہ راتوں رات دہلی سے تیس میل ہٹ گیا اور پھر جس قدر جلد ممکن ہوا لمبی لمبی منزلیں کرتا ہوا اپنی فوج کو ہندوستان سے واپس لے گیا۔

۱:- ضیائے برنی صفحہ ۲۶۰

۲:- برنی نے لکھا ہے کہ مغلوں کے گھوڑے جب پانی پیتے پیتے ٹھٹک رہتے تھے تو جانور کو مخاطب کر کے کہتے تھے کہ پانی کیوں نہیں پیتا کیا تو نے ظفر خاں کو دیکھ لیا ہے (برنی صفحہ ۲۶۱)۔

نئے منصوبے

ہندوستان میں اِس فتح کی گھر گھر خوشیاں منائی گئیں۔ سرکاری طور پر بھی بہت دن تک خوشی کے جشن اور عیش و طرب کے جلسے ہوتے رہے۔ حکومت علائی کی وقعت پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی اور خود بادشاہ کے دل میں اپنی اقبال مندی دیکھ کر ناز و غرور کے جذبات پیدا ہونے لگے۔ وہ محض ان پڑھ سپاہی زادہ تھا اور اگر اتنی بڑی سلطنت اور قوت و ثروت پا کر خوشی میں آپے سے باہر ہو گیا تو کچھ حیرت کی بات نہ تھی۔ ارباب دول کے خود غرض خوشامدی ایسے موقعوں کی تاک میں رہتے ہیں انھوں نے اور بھی بڑھاوے دینے شروع کئے اور جس طرح شہنشاہ اکبر سے ایک نیا دین جاری کرنے کی حماقت سرزد ہوئی اسی طرح علاء الدین بھی اِس خبط میں مبتلا ہوا تھا مگر اس کے درباریوں نے اس کو سنبھال لیا۔ فیلتن کوتوال علاء الملک نے اس کو سمجھایا کہ "مذہب جاری کرنا پیغمبروں کا منصب ہے جو خدا کے منتخب برگزیدہ بندے ہوتے ہیں اُن کی کامیابی کا دار و مدار قوت و شوکت پر نہیں بلکہ تائید ربی پر ہوتا ہے۔ بادشاہوں کو خواہ وہ کتنے ہی بڑے کیوں نہ ہوں مذہب کے معاملات میں دخل دینا زیب نہیں دیتا۔ دیکھئے چنگیز خاں کتنے رعب و داب اور طنطنہ کا بادشاہ تھا پھر بھی اُس نے کوئی نیا مذہب جاری نہیں کیا اور آج بہت سے مغل مسلمان ہیں"۔ علاء الدین کی سمجھ میں آگیا اور وہ اپنے ارادے سے باز رہا لیکن سکندر اعظم کی طرح تمام دنیا کو فتح کرنے کے بارے میں علاء الملک نے یہ مشورہ دیا کہ ابھی تو سلطنت دہلی کے استحکام کے لئے ہی بہت کچھ کرنا ہے۔ مغلوں کے حملے جاری ہیں۔ ہندوستان ہی کے اندر رنتھنبور، میواڑ، چندیری اور مالوہ وغیرہ فتح کرنا ضروری ہیں اور پھر اگر بادشاہ کشورکشائی کے لئے ہندوستان سے باہر جائے تو اُس کی غیبت میں ارسطو کی طرح نہ کوئی ایسا قابل وزیر ہے جو ملک کے انتظام کو سنبھال سکے اور نہ اُس زمانہ کی طرح رعایا مطیع و فرمانبردار ہے آج تو حالت یہ ہے کہ رعایا کے نہ قول کا اعتبار ہے اور نہ فعل کا اس صورت میں

ملک کے اندر انتشار پھیل جائیگا اور فتنہ وفساد کے سوکھے چشمے جاری ہوجائیں گے"[۱]۔ بادشاہ کی سمجھ میں یہ بات بھی آگئی اور اُس نے کشور کشائی کے لئے ہندوستان سے باہر جانے کا ارادہ ترک کردیا لیکن ۱۲۹۸ء میں مغلوں کے دوسرے حملہ کو دفع کرنے کے بعد سکندر ثانی کا خطاب اپنے لئے تجویز کیا اور یہی خطاب سکوں اور خطبوں میں داخل ہوا۔

مہم رن تھمبور

جلال الدین خلجی کی نرم پالیسی کی وجہ سے رن تھمبور کی دیواروں تک شاہی فوجیں پہونچکر واپس آگئیں اور اُس کی تسخیر کچھ دنوں کے لئے ملتوی ہوگئی لیکن علاء الدین خلجی دوسرے قسم کا بادشاہ تھا وہ رن تھمبور کی اہمیت کو سمجھتا تھا اس لئے مغلوں کے دوسرے حملہ کو دفع کرنے کے بعد اُس نے انغ خاں حاکم بیانہ کو رن تھمبور پر چڑھائی کرنے کا حکم دیا۔ رن تھمبور پر حملہ آور ہونے کی اصل وجہ یہ تھی کہ مہم گجرات کے باغی محمد شاہ و کابہرو وغیرہ کو وہاں کے راجہ نے پناہ دی تھی[۲]۔ علاء الدین نے نصرت خاں حاکم کڑہ کو لکھا کہ وہ انغ خاں کی پوری پوری مدد کرے چنانچہ ۱۲۹۹ء میں انغ خاں اور نصرت خاں نے جاکر پہلے قلعہ جھاین[۳] کو فتح کیا اس کے بعد رن تھمبور کا محاصرہ کرلیا۔ اِس محاصرہ میں نصرت خاں ایک پتھر کے لگنے سے مارا گیا۔ اور انغ خاں کو بھی ناکام ہوکر جھاین واپس لوٹ آنا پڑا۔ یہ خبر سُن کر علاء الدین خود امدادی فوجیں لیکر روانہ ہوگیا۔

ع۱:۔ علاء الملک کی راست گفتاری سے بادشاہ بہت متاثر ہوا اور خوش ہوکر علاوہ خلعت فاخرہ کے دس ہزار تنکہ اور دو گانوں انعام میں دئے اور انغ خاں، ظفر خاں، نصرت خاں اور الپ خاں ان چاروں نے جو گفتگو میں شریک تھے تین تین چار چار ہزار تنکہ مع گھوڑوں کے اسکی خدمت میں پیش کئے۔ ترتیب زمانی کے لحاظ سے علاء الدین کے دماغ میں یہ نئی باتیں مغلوں کے دوسرے حملہ سے پہلے پیدا ہوئی تھیں جبکہ ظفر خاں زندہ تھا (ملاحظہ ہو برنی ص۲۷۱)

ع۲:۔ ملاحظہ ہو ضیائے برنی ص۲۸۳، فتوح السلاطین ص۲۶۱ و ص۲۴۵، طبقات اکبری ص۱۵۴، فرشتہ ص۱۰۸، ع۳:۔ ملاحظہ ہو صفحہ ۱۹۱

(باقی مضمون صفحہ ۳۵۶ پر)

آکت خاں کی بغاوت[1]

راستہ میں تلپت کے مقام پر بادشاہ شکار کھیلنے کے لئے رُک گیا۔ ایک دن شکار کھیلتا ہوا لشکر گاہ سے دور نکل گیا۔ اور رات ہو جانے کی وجہ سے ایک گانوں میں ٹھہر گیا۔ صبح ہونے پر اُس نے کھیدے کا حکم دیا۔ کھیدے کے لئے جمعیت منتشر ہو گئی اور اس کے پاس صرف چند آدمی باقی رہ گئے۔ بادشاہ اطمینان کے ساتھ موڑہ پر بیٹھا ہوا تھا کہ اتنے میں اُس کا بھتیجا آکت خاں جو وکیلدری کے عہدہ پر فائز تھا مع چند نو مسلم مغل سپاہیوں کے نمودار ہوا اور تیروں سے بادشاہ پر حملہ کر دیا اس کا ارادہ تھا کہ جس طرح علاء الدین نے اپنے چچا کو مار کر تخت حاصل کیا ہے اسی طرح وہ بھی اپنے چچا علاء الدین کو مار کر تخت حکومت کا مالک بن جائے۔ یہ زمانہ موسم سرما کا تھا اسلئے بادشاہ موٹے قسم کے کپڑے پہنے ہوئے تھا اُس نے موڑہ پر تیروں کے وار روکے اور اس کے ایک غلام "مالک" نامی نے اس کو اپنی آڑ میں لے لیا پھر بھی بادشاہ کے بازو پر دو تیر لگے جن کی وجہ سے وہ زخمی ہو گیا اتنے میں حملہ آور اور بھی قریب آگئے اور ممکن تھا کہ بادشاہ کا خاتمہ کر دیں کہ اس کے غلام چلا پڑے "بادشاہ مرگیا، بادشاہ مرگیا"۔ آکت خاں نے عجلت میں بادشاہ کو مردہ خیال کر کے وہیں چھوڑ دیا اور خود مع باغی سواروں کے لشکر گاہ میں پہونچکر اپنے

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۳۵۵۔ جس طرح پرتھوی راسو میں چاند بردائی نے محمد غوری اور پرتھوی راج کی لڑائی کا ایک من گھڑت سبب تحریر کیا ہے ٹھیک اسی طرح ہمیر مہا کاویہ میں علاء الدین اور راجہ ہمیر دیو کی جنگ کا ایک افسانوی قصہ تراش کر مؤلف نے پوری عمارت تیار کی ہے۔ رقصہ نہایت لغو اور شرافت کے معیار سے گرا ہوا ہے اور جو عقلاً و نقلاً کسی اعتبار سے قابل قبول نہیں۔ ع[3] اس قلعہ کے بن جانے سے رن تھمبور کی جنگی قوت اور بھی بڑھ گئی تھی۔ اس کے محل وقوع کا صحیح پتہ نہیں چلتا۔ غالباً ویران و برباد ہو گیا۔

ع[1]:۔ آکت خاں کا پورا نام سلیمان شہ اکتخاں ہے (ملاحظہ ہو تاریخ فرشتہ صـ۱۰۶)

بادشاہ ہونے کا اعلان کر دیا۔ اِدھر علاء الدین کو جب ہوش آیا۔ تو اُس نے یہ ارادہ کیا کہ وہ کسی طرح الغ خاں کے پاس جھاین پہونچ جائے تاکہ وہاں سے حصول سلطنت کے لئے دوبارہ کوشش کرے مگر اُس کے ایک سردار ملک حمید الدین نے جو نائب وکیلدر تھا۔ بادشاہ کو اس کے ارادے سے باز رکھا اور اس کو لشکر گاہ میں واپس لوٹ چلنے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ علاء الدین لشکر گاہ کی طرف چل پڑا۔ ابھی وہ فاصلے پر تھا کہ اُمراء سلطنت کی نظر چتر شاہی پر پڑی جس سے اُن کو علاء الدین کے زندہ ہونے کا یقین ہو گیا اور سب کے سب آکت خاں کو چھوڑ کر علاء الدین سے آکر مل گئے۔ آکت خاں یہ رنگ دیکھ کر گھوڑے پر سوار ہو کر افغانپور کی طرف بھاگا مگر ملک اعز الدین یغاں خاں اور نصیر الدین نور خاں نے اس کا تعاقب کر کے سر کاٹ لیا اور علاء الدین کے سامنے لا کر پیش کیا بادشاہ نے اس سر کو سارے لشکر میں تشہیر کرایا اور پھر دہلی بھیج دیا تاکہ لوگ عبرت حاصل کریں۔ آکت خاں کے چھوٹے بھائی قتلغ خواجہ کو بھی بادشاہ نے قتل کرا دیا۔ اور اس کے علاوہ جتنے باغی تھے سب کو تلاش کر کے تہ تیغ کرایا[1]۔

رن تھمبور کا حشر

اِس حادثہ کی وجہ سے بادشاہ کو رن تھمبور پہونچنے میں دیر لگی لیکن بادشاہ کی روانگی کا حال سُن کر الغ خاں نے جھاین سے نکل کر رن تھمبور کا دوبارہ محاصرہ کر لیا تھا۔ علاء الدین کی آمد نے گو محاصرین کی ہمتیں بڑھا دیں پھر بھی قلعہ کے فتح کرنے میں ایک سال[2] کا عرصہ لگا اور ۱۳۰۱ء کے اخیر میں

---

[1] ۱۔ مولانا عصامی نے جو برنی کے ہمعصر ہیں فتوح السلاطین میں اس بغاوت کا ذکر چتوڑ کی تسخیر کے سلسلہ میں کیا ہے اور باغی کا نام سلیمان شاہ تحریر کیا ہے (ملاحظہ ہوں ص ۲۶۹ تا ص ۲۷۱) لیکن عصامی کی روایت کو برنی کے مقابلہ میں ترجیح نہیں دی جا سکتی کیونکہ برنی نے عہد علائی کی مستند روایات کو اپنے بزرگوں سے سُنا ہے جن کو حکومت کے معاملات سے زیادہ صحیح واقفیت تھی۔ [2] ۲:۔ رن تھمبور کی تسخیر میں علاء الدین کو کتنا عرصہ لگا اور قلعہ کب فتح ہوا اس کی کسی مورخ نے تصریح نہیں کی۔

(باقی مضمون صفحہ ۳۵۸ پر)

ہمیر دیو کے دو غدّار سرداروں رن پال اور کرشن پال کی مدد سے قلعہ فتح ہو سکا۔
راجہ ہمیر دیو جو پرتھی راج کی نسل سے تھا مارا گیا اور اُس کا بہادر نومسلم منگل سردار "محمد شاہ" نامی میدانِ جنگ میں زخمی پایا گیا۔ علاء الدین نے اپنے اس باغی[1] نومسلم مغل سردار کو دیکھ کر پوچھا کہ "اگر تیرا علاج کرا دیا جائے تو اچھا ہو کر میرے ساتھ کیا سلوک کرے گا" زخمی سردار نے جواب دیا کہ "تندرست ہو کر تجھکو قتل کروں گا اور تیری جگہ ہمیر دیو کے لڑکے کو ہندوستان کا بادشاہ بناؤں گا،" اس پر علاء الدین نے اس کو ہاتھی کے پیر سے کچلوا دیا۔ مگر پھر اُس کی بہادری کا خیال کر کے اُس کی لاش کو فوجی اعزاز و اکرام کے ساتھ دفن کرا دیا۔

رن تھمبور کو فتح کرنے کے بعد اُس نے اُن تمام غدّار ہندوؤں کو جنھوں نے اپنے راجہ[2] سے بیوفائی کی تھی یہ کہہ کر قتل کرا دیا کہ "جس نے اپنے مالک سے وفا نہیں کی وہ ہم سے کب وفا کرے گا"، یہی سلوک اُس نے اُن تمام جلالی اُمراء کے ساتھ برتا تھا جنھوں نے رکن الدین ابراہیم کا ساتھ چھوڑ کر علاء الدین کی موافقت کی تھی۔ بہرحال رنتھمبور کی حکومت اپنے بھائی الغ خاں کو سپرد کرنے کے بعد خود دہلی چلا آیا۔ اُس کے پیچھے پانچ

بقیہ مضمون صفحہ ۳۵۷ :- برنی نے "حاجی" کی بغاوت کے سلسلہ میں ایک جگہ اشارہ کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مہم ۳ سال میں سر ہوئی اسلئے ۱۳۰۱ء قیاسی ہے۔

ع[1] :- گجرات کی مہم میں واپسی کیوقت یہ سردار باغی ہو کر راجہ ہمیر دیو کے پاس ملازم ہو گیا تھا۔

ع[2] :- راجہ ہمیر دیو بہادروں کی کتنی قدر کرتا تھا اور خود بھی کتنا بہادر اور آن بان کا راجہ تھا اس کا اندازہ اِس سے ہو سکتا ہے کہ اُس نے اپنی پناہ میں آئے ہوئے مہمان یعنی محمد شاہ کو دشمن کے سپرد کرنے کے بجائے اسکو گوارا کر لیا کہ اپنی عزت و آبرو اور جان و مال کو اپنی آن پر قربان کر دے چنانچہ نیائے چندر شاعر نے ہمیر مہا کاویہ میں اِس کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ

"ہمیر دیو نے اپنی پناہ میں آئے ہوئے محمد شاہ کی خاطر دھرم (نیتی) کو نباہنے کے لئے اپنی جان و مال اور

(باقی مضمون صفحہ ۳۵۹)

مہینے کے بعد بیمار ہو کر دہلی آتے ہوئے راستہ میں الغ خاں کا انتقال ہوگیا اُس کی جگہ اور خطاب الپ خاں کو مرحمت ہوئے جو سلطان کا سالہ تھا۔

بدایوں، اودھ اور دہلی کی بغاوتیں

رن تھمبور کے طویل محاصرہ کے دوران میں چار فساد برپا ہوئے جن سے قیاس ہوتا ہے کہ کم سے کم اعلیٰ طبقہ کا ایک گروہ علاء الدین سے بیزار تھا۔ ان میں سے ایک بغاوت کا ذکر کیا جا چکا ہے جو سلطان کے بھتیجے آکت خاں نے کی۔ دو بغاوتیں بدایوں اور اودھ میں سلطان کے دو ہمشیر زادوں امیر عمر اور منگو خاں سے ظہور میں آئیں۔ لیکن ان دونوں بغاوتوں کو مقامی جاگیرداروں نے دبا دیا اور باغیوں کو گرفتار کر کے علاء الدین کے پاس رن تھمبور بھیج دیا۔ بادشاہ نے ان دونوں کو اندھا کرا دیا اور اُن کے ساتھیوں کو قلعہ کی دیوار کے نیچے بڑی اذیت کے ساتھ قتل کرایا تاکہ محصورین رن تھمبور کو عبرت ہو۔

یہ فتنہ فرو ہوتے ہی ایک اور نئے فتنہ نے سر اُٹھایا اور یہ دہلی کے اندر "حاجی" کی بغاوت تھی۔ حاجی ملک الامراء فخر الدین کوتوال قدیم کا ایک پروردہ غلام تھا جو ترقی کر کے علاء الدین کے زمانہ میں خالصہ برتول کا امیر شحنہ بن گیا۔ یہ بڑا فتنہ پرور اور بیباک سرشت کا آدمی تھا۔ اُس زمانہ میں دہلی کا کوتوال "ترمذی" نامی ایک شخص تھا جس کی جبر و تشدد سے شہر کی مخلوق بیزار تھی سیری کا کوتوال علاء الدین ایاز پدر احمد ایاز تھا۔ ترمذی کی جائے رہائش بدایوں دروازہ میں تھی اس کے آگے صحرا سیری کا میدان تھا جس میں چند چھپر پڑے ہوئے تھے جہاں دیوانِ وزارت کی طرف سے حساب و کتاب اور رعایا سے پوچھ گچھ ہوتی تھی۔ حاجی مولا (غلام) نے یہ سمجھ کر کہ بادشاہ رن تھمبور کے مخمصہ میں گرفتار ہے اور دہلی کی رعایا کوتوال سے بیزار ہے موقع سے فائدہ اُٹھانا

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۵۵: بیوی و بچے اور بھائی سب کو قربان کر کے اپنا نام اَمر کر لیا جو رہتی دنیا تک بطور افسانہ یادگار رہیگا) ع۲: فرشتہ ج۱ ۱۰۵

چاہا اُس نے اپنی طرفدار ایک جماعت بنا کر رمضان المبارک کے مہینہ میں ایک دن دوپہر کے وقت جبکہ مئی وجون کی گرمی کی وجہ سے شہر کی سڑکیں سنسان پڑی ہوئی تھیں ترمذی کوتوال کے مکان پر پہونچکر اسے دھوکے[1] سے قتل کر دیا۔ اس کے بعد سیری کے کوتول علاء الدین ایاز کو بھی قتل کرنے کی تدبیر کی لیکن وہ دھوکہ میں نہیں آیا۔ اُس نے شہر کے پھاٹک بند کرادئے اور محصور ہو بیٹھا۔ حاجی نے اس کے بعد کوشک لعل میں پہونچکر ایک عَلوی کو جو ماں کی طرف سے سلطان التمش سے نسبت رکھتا تھا۔ زبردستی تخت پر بٹھا دیا۔ جیل کو توڑ کر قیدیوں کو رہا کر دیا۔ شاہی خزانہ لوٹ لیا اور عمائدین شہر کو عَلوی کی اطاعت کے لئے مجبور کیا۔

حاجی وعَلوی کا طوفانِ بے تمیزی سات یا آٹھ دن تک رہا۔ چوتھے دن امیر کوہ ملک حمید الدین نے اپنے لڑکوں اور رشتہ داروں کی مدد سے شہر کے غربی دروازے بھنڈارکل پر قبضہ کر لیا اور پھر رفتہ رفتہ شہر کے وفادار باشندوں نیز اطراف کے جاگیرداروں کی مدد سے اِس بغاوت کو فرو کر دیا۔ حاجی مارا گیا اور بدنصیب سید کا سر اُتار کر علاء الدین کے پاس رنتھمبور بھیج دیا گیا۔

یہ چاروں بغاوتیں جو یکے بعد دیگرے ہوئیں علاء الدین کو ہوشیار وچوکنا کر دینے کے لئے کافی تھیں اُسے یقین ہو گیا کہ اُس کے نظامِ حکومت میں کچھ نہ کچھ خرابی ضرور ہے اس کے لئے اُس نے اپنے مشیرانِ سلطنت سے دن ورات مشورے کئے اور آخر میں وہ جس نتیجہ پر پہونچے اُس کا ذکر انتظام سلطنت کے ضمن میں کیا جائیگا۔

ع[1]:۔ حاجی دوپہر کے وقت جبکہ شہر کی مخلوق اپنے گھروں میں آرام کر رہی تھی اور گرمی کی وجہ سے سڑکوں پر آمد ورفت بند تھی کچھ ردّی کاغذات لئے ہوئے ترمذی کے مکان پر پہونچا اس وقت ترمذی آرام کر رہا تھا اطلاع ہونے پر سادہ لباس میں باہر نکل آیا۔ اُس کو دیکھتے ہی حاجی نے پہرہ دینے والے سپاہیوں سے کاغذات کیطرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ شاہی فرمان ہے۔ اسمیں ترمذی کے قتل کا حکم ہے۔ چنانچہ سپاہیوں نے ترمذی کو قتل کر ڈالا۔ (ضیاء برنی صفحہ ۲۷۹)

چتوڑ کی فتح

۷۰۰ھ تا ۷۰۲ھ یعنی ۱۳۰۳ء تک سلطان علاء الدین شمالی ہند میں ایسے آئین و قوانین نافذ کرچکا تھا جس سے سرکشی و بدامنی کا خطرہ جاتا رہا۔ اس لئے اُس نے گجرات و مالوہ کو صحیح طور پر سلطنت دہلی کا جزو بنانے کا تہیہ کرلیا اس کے لئے جنوبی راجپوتانہ کی فتح ضروری تھی کہ جس کے فتح کئے بغیر دونوں مملکتوں کے راستے غیر محفوظ رہتے تھے۔

جس قدر تاریخی یا نیم تاریخی شواہد موجود ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ جنوبی راجپوتانہ میں چتوڑ کی ریاست سب سے زیادہ معزز سمجھی جاتی تھی جو مسلمانوں کی زد سے اب تک محفوظ چلی آتی تھی اور جس کے راجہ نے ابھی تک اطاعت قبول نہیں کی تھی۔ علاء الدین نے ۸ جمادی الآخر ۷۰۲ھ روز دوشنبہ[1] چتوڑ پر لشکر کشی کی اور ۷ ماہ کے اندر اس کو فتح کرکے اپنے بڑے بیٹے خضر خاں کو وہاں کا گورنر مقرر کیا اور چتوڑ کا نام خضرآباد رکھا۔ اسی جگہ خضر خاں کو ولی عہد سلطنت مقرر کیا اور چتوڑ کے راجہ رتن سین کو قید کرکے دہلی لے آیا۔ بعد کو راجہ کا بھانجہ آرسی (مالدیو) خود بخود بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور مصاحبین سلطانی میں داخل کیا گیا۔

فرشتہ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ چتوڑ مفتوح تو ضرور ہوگیا تھا لیکن سرکشی و بغاوت کا قطعی طور پر سدباب نہیں ہو پایا۔ چتوڑ سے بھاگے ہوئے راجپوتوں نے پہاڑوں اور جنگلوں کو اپنا مرکز قرار دیکر راجہ رتن سین کی رانی پدمنی[2] کو اپنا حاکم بنالیا ادھر خضر خاں نے عیش و عشرت میں پڑکر راجپوتوں کو رام کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اِس زمانہ میں علاء الدین مغلوں کے حملوں سے دہلی کو بچانے کی فکروں میں پھنسا ہوا تھا۔ مغلوں سے فارغ ہوتے کے

---

[1] یہ تاریخ خزائن الفتوح سے اخذ کی گئی ہے۔ حملہ کیلئے ۸ جمادی الآخر ۷۰۲ھ بروز دوشنبہ دہلی سے روانگی عمل میں آئی اور چتوڑ کو ۱۱ محرم ۷۰۳ھ بروز دوشنبہ مسخر کرلیا گیا (ملاحظہ ہو خزائن الفتوح قلمی در کتب خانہ حبیب گنج)۔

[2] رانی پدمنی کے حسن و عشق کی داستان سب سے پہلے ملک محمد جائسی نے "پدماوت" میں تحریر کی جو محض افسانہ ہے اس کی حقیقت کچھ بھی نہیں ورنہ برنی اسے ضرور تحریر کرتا۔ بعد کے مورخین نے اِس کو حقیقت سمجھ کر بڑے آب و تاب کے ساتھ بیان کیا ہے (مؤلف)

بعد اُس نے راجہ کے بھانجے آرسی سے چتوڑ کی شورش کے دبانے کا مشورہ کیا اور اس کے مشورہ کے مطابق رانی پدمنی کو دعوت دی کہ وہ رتن سین کے پاس دہلی چلی آئے اور عزت کی زندگی بسر کرے لیکن راجپوت سرداروں نے یہ چال چلی کہ بجائے پدمنی کے مسلح راجپوتوں کو چند پالکیوں میں بٹھا کر اور بہت سے راجپوتوں کو تیز رفتار گھوڑوں پر محافظ دستہ کے طور پر مامور کر کے دہلی روانہ کر دیا۔ اور یہ شہرت دی کہ رانی حسب اجازت بادشاہ دہلی اور حسب المطلب راجہ رتن سین دہلی کو جارہی ہے اسلئے راستہ میں چتوڑ سے دہلی تک ان کا کوئی بھی مزاحم نہ ہوا جب یہ مصنوعی سواری دہلی پہونچی تو راجہ مقام نظر بندی سے چند محافظوں کی نگرانی میں رانی کے استقبال کے لئے باہر نکلا لیکن جیونہی وہ مصنوعی سواری کے قریب پہونچا راجپوتوں نے ڈولوں سے نکل کر اور راجہ کو گھوڑے پر بٹھا کر چتوڑ کی طرف روانہ کر دیا اور اس طرح یہ پارٹی بطریق یلغار نواح چتوڑ میں ایک محفوظ مقام پر پہونچ گئی۔

سلطان علاء الدین راجپوتوں کی اس چالاکی پر حیران رہ گیا۔ اُس نے معزول راجہ کے بھانجے آرسی کو چتوڑ کی سند حکومت دیکر روانہ کیا جس نے چتوڑ پہونچ کر خضر خاں کو معزول کر کے دہلی بھیج دیا اور خود کوشش کر کے تمام راجپوتوں کو جبراً و قہراً یا مہر و محبت سے اپنی جانب مائل کر لیا۔ رتن سین اور اس کی رانی گمنامی کی تاریکی میں غائب ہو گئے اور راجہ مالدیو (آرسی) تا زیست دہلی کا فرمانبردار رہا۔ وہ بوقت ضرورت مرکزی حکومت کی ۵ ہزار سوار اور دس ہزار پیدل سپاہ سے مدد کیا کرتا تھا[1]۔

یہ اصل واقعہ تھا جس کو قصہ گویوں اور بعض یورپی مورخین نے علاء الدین اور پدمنی کے حُسن و عشق کی ایک عجیب و غریب داستان بنا دیا ہے[2]۔ برنی جو عہد علائی کے ہر

---

[1] فرشتہ صفحہ ۱۱۵ ج ۱۔ ٹاڈ صاحب کا یہ بیان کہ جب قلعہ چتوڑ کے بچانے سے ناامیدی ہوئی تو راجپوت رسم جوہر کو عمل میں لائے صحت طلب ہے۔ سبحان رائے جس نے پدماوت کے حوالے سے اس فرضی داستان کو خوب چمکایا ہے اس نے بھی رسم جوہر کا ذکر نہیں کیا۔ (ملاحظہ ہو خلاصۃ التواریخ قلمی صفحہ ۱۴۰ و صفحہ ۱۴۱)

چھوٹے بڑے واقعہ کو کھول کر بیان کرتا ہے چتوڑ کی فتح کو سرسری طور پر اس طرح لکھا ہے گویا یہ ایک معمولی واقعہ تھا حالانکہ یہ ایک اہم چیز تھی بشرطیکہ اس میں کچھ حقیقت ہوتی جو برنی کی نظروں سے اوجھل نہیں رہ سکتی تھی۔ بہر حال چتوڑ کی کل ریاست کی تسخیر ۱۳۰۵ء تک مکمل ہوگئی۔

مالوہ پر حملہ

۱۳۰۵ء میں علاء الدین نے الپ خاں المخاطب الغ خاں ثانی کو گجرات کا صوبیدار مقرر کیا اور عین الملک ملتانی کو فوجیں دیکر اُجّین، چندیری اور جالمر یا جھالر پر فوج کشی کرنے کیلئے مامور کیا۔ مالوہ کے راجہ کو کا یا ہر نند نے ایک لاکھ پیادے اور چالیس ہزار سوار لیکر عین الملک کا مقابلہ کیا۔ محاربۂ عظیم کے بعد مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی اور اُجّین، مانڈو، دھار اور چندیری وغیرہ پر قبضہ ہوگیا۔ جالر کا چوہان راجہ کنور دیو یا کانر دیو خود بخود مطیع ہوگیا اور عین الملک کے ساتھ دہلی آکر بادشاہ کے سامنے اظہار اطاعت کیا۔

۱۳۰۸ء کے آخر میں کنور دیو سے آثار سرکشی ظاہر ہوئے اُس نے ایک موقع پر یہ ڈینگ ماری تھی کہ سلطان علاء الدین اُس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ علاء الدین نے راجا کو نیچا دکھانے کے لئے اس کے مقابلہ پر اپنی ایک لونڈی "گل بہشت" نامی کو سپہ سالار بناکر جالر (جالور) بھیجا۔ گل بہشت نے راجہ کو قریباً مغلوب کرلیا تھا کہ اُس کا انتقال ہوگیا اُس کے مرنے کے بعد شاہی افواج کی کمان اُس کے بیٹے شاہین کے قبضۂ اقتدار میں آئی۔ شاہین تجربہ کار سپاہی نہ تھا اس لئے راجہ کے مقابلہ میں اُسے شکست ہوئی لیکن جب کمال الدین گرگ امدادی فوج لیکر آیا تو راجہ مغلوب ہوگیا اور مع اپنے رشتہ داروں کے مارا گیا۔ جالور کا دہلی سے الحاق کرلیا گیا۔

مہم قلعہ سیوانا

۱۳۰۸ء میں جب ملک کافور کو دکن کی مہم پر روانہ کیا گیا تو (آئینۂ اکبری کی روایت کے بموجب) ایک فوج مارواڑ کے سب سے زیادہ مشہور

و مضبوط قلعہ سوانا کی تسخیر کے لئے بھی روانہ کی گئی کیونکہ وہاں کے راجہ سیتل دیو سے آثار سرکشی ظاہر ہوئے تھے۔ محاصرہ نے جب طول پکڑا تو بادشاہ نے دہلی سے خود جاکر راجہ کی گوشمالی کی۔ راجہ نے صلح کی درخواست کی جو منظور کرلی گئی لیکن سلطان کے سامنے آنے سے گریز کیا۔ اظہار اطاعت کے لئے اپنی تمثال سونے کی بنواکر اور اُس کے گلے میں زنجیر ڈال کر بادشاہ کی خدمت میں روانہ کی لیکن بادشاہ نے اُس کی خطا اُس وقت تک معاف نہیں کی جب تک کہ وہ راجہ خود بنفس نفیس اپنے گلے میں زنجیر ڈال کر حاضر نہ ہوا۔ قلعہ راجہ کو واپس کردیا گیا لیکن قلعہ کے اندر کی ہر چیز حتی کہ چاقو اور سوئی تک ضبط کرلی گئی۔

شمالی ہند کی تسخیر در اصل ۱۳۰۵ء تک ختم ہو جاتی ہے اسلئے اب علاءالدین نے توسیع مملکت کے لئے دکن کی طرف توجہ کی لیکن قبل اس کے کہ ہم دکن میں آئیں ہمیں اتنا اور بتانا ہے کہ بادشاہ نے مغلوں کا کس طرح مقابلہ کیا۔

مغلوں کے حملے

تیسرا حملہ

چتور کی مہم سے فارغ ہوکر جب بادشاہ دہلی پہونچا تو اسے "طرغی بیگ" کا سامنا کرنا پڑا۔ مغلوں نے یہ معلوم کرکے کہ بادشاہ چتور کی مہم میں مصروف ہے اور دارالسلطنت سے دور دراز کے فاصلہ پر مقیم ہے اسلئے دہلی کو خالی سمجھ کر ان کا سپہ سالار "طرغی" جو قتلغ خواجہ کی ہمراہی میں پچھلی مرتبہ ہندوستان کو اچھی طرح دیکھ بھال گیا تھا ایک لاکھ بیس ہزار سوار لیکر نہایت تیز کوچ کرتا ہوا پایۂ تخت کے قریب آپہونچا۔ علاءالدین اُس وقت تک چتور سے واپس ہوکر دہلی پہونچ چکا تھا لیکن حالت یہ تھی کہ چتور کی مہم میں بہت کچھ سامان جنگ برباد ہوگیا تھا۔ فوج میں گھوڑوں کی کمی تھی و نیز مشرقی صوبہ جات سے جو فوجیں شاہی مدد کے لئے پہونچ سکتی تھیں وہ دیر میں

روانہ ہوسکیں کیونکہ وہ تلنگانہ کی مہم سے ابھی حال میں تھکی ہاری ماندی واپس آئیں تھیں اور ادھر مغلوں نے برن، کوئل وغیرہ کی طرف سے آنے والے تمام راستوں پر قبضہ کرلیا تھا اس لئے علاء الدین کو مجبوراً شہر سیری میں محصور ہونا پڑا۔ شہر کے لوگوں کو اس محاصرہ سے بہت پریشانی و تکلیف اُٹھانا پڑی لیکن مغلوں نے جب کبھی شہر کے کسی حصّہ میں گھسنے کا ارادہ کیا تو انھیں ناکامی ہوئی اور دہلی کی سپاہ نے کئی بار مدافعت کا حق ادا کردیا۔ لہٰذا حملہ آور جو رسد رسانی کی دقّتوں کے علاوہ بظاہر ایک غیر ملک میں عرصہ تک بیکار پڑے رہنے سے گھبرا گئے تھے اور جن کا خاص مقصد اپنی پچھلی شکست کا داغ مٹانا تھا دو مہینہ کے محاصرہ کے بعد واپس چلے گئے۔[1]

---

[1] ۔ اِس تشویشناک محاصرے کے زمانہ میں سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاؒ سے بھی دعا کی خواہش کی گئی تھی اور مغلوں کا بلا جنگ کئے پسپا ہوجانا آپ کے روحانی تصرف پر لوگوں نے محمول کیا۔ مؤلف نظامی بنسری نے اس کو ذرا تفصیل کیساتھ بیان کیا ہے کہ علاء الدین نے عالم مجبوری میں نصرت خاں اور امیر خسرو کو حضرت سلطان المشائخ کے پاس بھیجکر دعا طلب کی۔ امیر خسرو نے سلطانی مقصد کی ترجمانی کی۔ حضرت خواجہ صاحب نے سُن کر تبسم فرمایا اور کہا کہ سلطان سے دعا کہنا اطمینان رکھے مغل کل تک واپس چلے جائیں گے چنانچہ دہلی والوں نے دوسری صبح کو حیرت سے یہ دیکھا کہ مغلوں کا کہیں دور دور تک پتہ بھی نہ تھا اسی سلسلہ میں لکھا ہے کہ حضرت خواجہ صاحبؒ نے بطور تبرک کچھ چیزیں طرغی بیگ کے پاس بھیجیں اُن میں ایک رومال بھی تھا جس کو طرغی نے تعظیماً اپنے سر پر رکھا اور آنکھوں سے لگایا معاً اس کی حالت متغیر ہوگئی اُس نے دیکھا کہ اُس کے ملک پر ایک زبردست غنیم حملہ آور ہے اور ملک کو اُس کی مدد درکار ہے۔ اسلئے اپنی فوجوں کو دہلی سے واپسی کا حکم دیدیا (ملاحظہ ہو نظامی بنسری صفحہ ۵۷ تا ۶۱)۔ ہمعصر مورخ برنی نے تفصیل نہیں دی لیکن روحانی تصرف کے عقیدے کو تحریر کردیا ہی اس پر اسمتھ صاحب یہ بدگمانی کرتے ہیں کہ حکومت دہلی کی جانب سے کوئی رشوت یا نذرانہ مغلوں کو دیا گیا ہوگا جس سے مغل حملہ آور واپس چلے گئے لیکن اسمتھ صاحب اگر غور کرتے تو انھیں بلا وقت

(باقی مضمون صفحہ ۳۶۶ پر)

مغلوں کا چوتھا حملہ

مغلوں کے تیسرے حملہ نے اور مہم رن تھمبور و چتوڑ کی مشکلات نے سلطان کے سکندری ولولوں کو بہت کچھ سرد کر دیا اور اب اُسے صاف نظر آ گیا کہ جب تک فوجی تعداد اور جنگی ساز و سامان میں خاطر خواہ اضافہ نہیں کیا جائیگا دنیا کی فتح ایک طرف خود اس کو اپنے ملک میں بھی مغلوں کے خوف سے اطمینان میسر نہ آئیگا اس لئے اُس نے نہایت سرعت کے ساتھ فوج کو عمدہ و مضبوط بنانے کے لئے از سر نو تنظیم کی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۷۰۵ھ میں[1] جب مغلوں نے شہزادہ علی بیگ اور ترباک[2] خواجہ کی سرکردگی میں چالیس ہزار کی تعداد میں ہندوستان پر حملہ کیا تو انھوں نے علاؤالدین کو مقابلہ کے لئے ہر طرح سے تیار پایا۔ اس کے حسن انتظام کی وجہ سے ۴ لاکھ ۷۵ ہزار سوار ہر وقت دشمن کا سر کچلنے کے لئے تیار رہتے تھے۔ مغل کوہ ہمالیہ کے اندر ہو کر اُس راستہ سے حملہ آور ہوئے کہ جس راستے سے سلطان محمود غزنوی نے قنوج پر چھاپہ مارا تھا۔ مغلوں نے یکایک پہاڑوں سے نکل کر دامن کوہ سے لیکر امروہہ تک کے علاقے کو پامال کر ڈالا۔ سلطان غازی ملک تغلق کو جو سلطان کا امیر آخور (داروغہ اصطبل) تھا اور ملک کافور ہزار دیناری کو مقابلہ کے لئے روانہ کیا۔ انھوں نے مغلوں کو گھیر کر شکست دی اور اُن کے دونوں سرداروں کو قید کر کے مع ۹ ہزار فوج اور ۲۰ ہزار گھوڑوں کے دہلی بھیجدیا۔ بہت سے مغل میدان جنگ میں مارے گئے باقی جو بھاگ کر ادھر ادھر

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۳۶۵: اس پسپائی کے بہت سے ظاہری اسباب اور قوی قرائن بھی مل جاتے ہیں۔ برنی جو عہد علائی کی ہر کمزوری یا خرابی کو بلا مبالغہ بیان کرتا ہے وہ اس قسم کی کارروائی سے کیونکر بے خبر رہ سکتا تھا۔

[1] از روئے خزائن الفتوح حملہ کی صحیح تاریخ ۱۰ جمادی الآخر ۷۰۵ھ بروز پنجشنبہ ہے۔

یعنی کہ پنجشنبہ واز آخریں جمادی — دہ روز رفتہ بود و در سال پنج ہفتصد

[2] تاریخ فیروز شاہی میں ترباک اور ترتاک دونوں طرح سے تحریر ہے دیکھو صفحہ ۳۲۰ لیکن حضرت امیر خسرو نے خزائن الفتوح میں "ترتاق" تحریر کیا ہے۔

منتشر ہوئے ان کو چھوٹے مقامی زمینداروں اور امیروں نے اپنے علاقوں میں گھیر کر کیفر کردار کو پہونچایا۔ صرف چند مغل بمشکل تمام اپنی جانیں بچا کر تباہی کی داستان سنانے کے لئے خراسان و ترکستان پہونچ سکے۔

مغل قیدیوں کا دہلی پہونچنے پر یہ حشر ہوا کہ اُن کے دونوں سرداروں کو ہاتھی کے پیروں کے نیچے کچلوا دیا گیا اور عام قیدیوں کو قتل کر کے اُن کے سروں کو شہر سیری کی شہر پناہ میں جو اُس وقت تعمیر ہو رہی تھی چنوا دیا۔ اور غازی ملک کو ترقی دیکر صوبہ پنجاب کا گورنر بنا دیا چونکہ مغلوں کا یہ حملہ غیر متوقع اور ایک نئے راستے سے ہوا تھا۔ اس لئے سلطان علاؤالدین نے آئندہ کے لئے دارالسلطنت دہلی سے باہر جانا ترک کر دیا اور ملکی مہمات پر اپنے سرداروں کو بھیجتا رہا۔

مغلوں کا پانچواں حملہ

علی بیگ اور تریاک کا انتقام لینے کے لئے سنہ ١٣٠٦ء میں مغلوں نے "کنک"[1] نامی سردار کی ماتحتی میں براہ ملتان ہندوستان پر حملہ کیا۔ مغل دریائے انڈس کو ملتان کے پاس عبور کر کے ہمالیہ کی طرف لوٹ مار کرتے ہوئے بڑھے۔ موسم گرما کا زمانہ تھا۔ جب وہ واپسی میں مال غنیمت سے لدے ہوئے واپس آئے تو دریائے انڈس کا راستہ غازی ملک مسدود کر چکا تھا مجبوراً انھیں لڑنا پڑا اور ساٹھ ہزار میں سے صرف تین چار ہزار زندہ بچ کر اپنے وطن واپس پہونچ سکے۔ اُن کا سردار "کنک" بہت سے مغلوں کے ساتھ گرفتار ہو کر دہلی بھیجا گیا جہاں انھیں نہایت عبرت انگیز سزائیں دی گئیں۔ کنک کو ہاتھی کے پیروں سے کچلوا دیا گیا اور بقیہ مغلوں کے سروں سے مینارے بنوائے گئے جو بدایوں دروازے کے باہر میدان میں عہد اکبری تک موجود تھے۔

---

[1] حضرت امیر خسرو نے مغل سردار کا نام "کپک" تحریر کیا ہے۔ اس کو ہزیمت دینے میں ملک کافور بھی شامل تھا (خزائن الفتوح قلمی)۔

مغلوں کا چھٹا حملہ ۱۳۰۶ء میں تین چار مغل سرداروں نے تیس چالیس ہزار سواروں کو لیکر کوہ شوالک کی طرف لوٹ مار مچائی۔ علائی سرداروں نے ان کو بھی شکست دی۔ اُن کے بیوی بچوں کو گرفتار کر کے دہلی بھیجا گیا جہاں انھیں لونڈی غلاموں کے بطور فروخت کر دیا گیا اور مغل سپاہیوں کو جو قلعۂ نرانیہ میں قید کر دئے گئے تھے " ملک خاص حاجب " نے دہلی سے جا کر قتل کرا دیا۔ بادشاہ نے اس کو اسی کام کے لئے نرانیہ بھیجا تھا۔

ساتواں حملہ ۱۳۰۷ء میں مغلوں کے ایک سردار " اقبالمندہ " نامی نے ہندوستان پر حملہ کیا اُس کا امیر علی واہن سے تلنبہ کے مقام پر سامنا ہوا لشکر اسلام کو فتح حاصل ہوئی۔ مغلوں کے سردار کو ہاتھی کے پیروں سے پامال کرایا گیا اور بہت سے مغل سپاہیوں کو قتل کر دیا گیا۔ ان مسلسل فتوحات کی وجہ سے مغل ہندوستانی فوجوں سے ڈرنے لگے اور قطب الدین مبارک شاہ کے اخیر عہد تک الغفیٰ ہندوستان میں آنے کی جرأت نہیں ہوئی۔ غازی ملک جو دیبالپور و لاہور کا صوبیدار تھا ہر سال دیبالپور سے مغلوں کی سرحد تک چکر لگایا کرتا تھا اس کی ڈر کی وجہ سے مغلوں نے اپنی سرحد تک آنا چھوڑ دیا تھا۔

توسیع مملکت یعنی جنوبی ہند کی تسخیر

علاء الدین سلاطین دہلی میں پہلا بادشاہ ہے جو دکن کی تسخیر پر آمادہ ہوا۔ راستہ کی دوری کے علاوہ ملک کی قدرتی حالت اور بڑی بڑی ریاستوں کے طاقتور حکمرانوں کی فوجی مخالفت وقوت نے علاء الدین کے راستہ میں رکاوٹیں ڈالیں لیکن وہ ارادے کا مضبوط اور قوت عمل کا مالک تھا اس لئے آخر کار اُس نے دکن کو فتح کر کے دم لیا۔ اُس وقت دکن کی عام سیاسی کیفیت یہ تھی کہ:-

(۱) دیوگری میں یادو خاندان حکمراں تھا اور راجہ رام چندر یا رام دیو حکومت کر رہا تھا۔ اُس نے ۱۲۷۱ء سے ۱۳۰۹ء تک حکومت کی۔

(۲) ککاتی یا کاکتی خاندان کا حکمراں پرتاپ رُدر دیو ثانی تلنگانہ کا مالک تھا اِس کا دارالسلطنت ورنگل تھا جو آج کل حکومت آصفیہ کا مشہور شہر ہے۔

(۳) ہوئسل یا ہوشل کا علاقہ حکومت موجودہ ریاست میسور کو سمجھنا چاہیئے۔ اِن کا پائیہ تخت دوار سمدر تھا جو سرنگاپٹم کے شمال و مشرق میں ۱۰۰ میل کی دوری پر واقع تھا۔ اس وقت یہاں کا حکمراں راجہ ویر بلال سوم تھا جس کی مدد سے بعد کو ریاست وجیانگر کی بنیاد پڑی۔

(۴) پانڈیہ حکومت دکن کے دور ترین حصہ میں تھی۔ پائیہ تخت مدورا تھا جس کو مسلمان مورخ معبر لکھتے ہیں یہاں کا راجہ کل شیکھر اول (۱۲۶۸ - ۱۳۱۱ء) نہایت قابل حکمراں تھا۔

(۵) چولا خاندان اب تقریباً گوشہ گمنامی میں جا پڑا تھا اُس کی جگہ چیرا خاندان کا عروج تھا ان کا سردار "روی ورمن" تھا جس نے چولا اور پانڈیہ دونوں خاندانوں کو شکست دیکر اپنی قوت بڑھالی تھی۔ ان کے دائرہ حکومت میں دریائے کرشنا کے مدخل کا جنوبی حصہ سمجھنا چاہیئے۔

(۱) دکن کی پہلی مہم

۱۳۰۶ء میں بادشاہ نے ملک کافور کو ملک نائب کا خطاب دیکر خلعت فاخرہ اور سرخ شامیانہ جو بادشاہ کے سوا دوسرا استعمال نہیں کر سکتا تھا عطا کیا اور تمام اُمراء سے اُس کا مرتبہ بلند کر کے سپہ سالاری اور وزارت عظمیٰ کا عہدۂ جلیلہ دیکر ایک لاکھ سواروں کے ساتھ دکن کی جانب روانہ کیا۔ ساتھ میں ایک نہایت تجربہ کار و ہوشیار امیر خواجہ حاجی کو کیا۔ اس کے علاوہ اپنے سالے الپ خاں المخاطب الغ خاں ثانی حاکم گجرات اور عین الملک ملتانی حاکم مالوہ کو مزید کمک کے لئے فرمان جاری

گئے۔ دکن کی جانب اس فوج کشی کا اصل سبب یہ تھا کہ دیوگیر کے راجہ رامچندر (رام دیو) نے تین سال سے ایلچپور کے خالصۂ شاہی کا اور اپنا خراج دہلی روانہ نہیں کیا تھا[1]۔ اس کے علاوہ اُس نے گجرات کے راجہ کرن کو اپنے یہاں پناہ دی تھی۔ اس لئے راجہ کی گوشمالی ضروری سمجھی گئی۔

دہلی سے جب ملک کافور دکن کی طرف روانہ ہونے لگا تو کنولادیوی نے علاءالدین سے یہ استدعا کی کہ اس مہم میں اگر اُس کی لڑکی دیول دیوی راجہ کرن سے مل جائے تو اُس کو دہلی بھیج دیا جائے۔ راجہ کرن بگلانہ میں آکر سکونت پذیر تھا اور راجہ رامچندر کے باجگزار کی حیثیت سے زندگی گذار رہا تھا۔ دیول دیوی جس کی عمر ۱۳۰۶ء میں آٹھ برس کی تھی[2] اپنے باپ کے ساتھ رہ رہی تھی۔ دیوگیر کا ولی عہد شنکر دیو[3] اس کا طالب تھا لیکن راجہ کرن نے اس کو نسب میں اپنے سے کمتر سمجھ کر شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس جگہ یہ بتا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مغربی مورخین نے دیوگری پر حملہ کا اصلی سبب تحصیل خراج نہیں بلکہ حصول دیول دیوی قرار دیا ہے۔ کیوں؟ اس کو خود سوچئے۔ بہرحال گجرات کی کمکی افواج جب بگلانہ کی طرف ہو کر گذریں جو کہ راستہ میں پڑتا تھا تو راجہ کرن نے بگلانہ کے مضبوط ترین

---

[1] :۔ فرشتہ صـ ۱۱۶ [2] :۔ فرشتہ کی روایت یہ ہے کہ جب کنولادیوی دہلی لائی گئی تو اس کی لڑکی دیول دیوی کی عمر چار سال کی تھی (صـ ۱۱۷) لیکن حضرت امیر خسروؒ نے اپنی مشہور مثنوی "دولرانی خضرخاں" میں دیول دیوی کی عمر چھ ماہ کی بتائی ہے (ملاحظہ ہو مثنوی مذکور صـ ۸۲) اور خضرخاں سے رشتہ کے وقت خضرخاں کی عمر دس سال اور دولرانی کی عمر آٹھ سال قرار دی ہے۔

دراں دم بود خاں دہ سالہ راست — کہ ایں ہنگامہ شادیش برخاست

دولرانی بقدر ہشت سالہ — دو ہفتہ ماہ را بستہ کلالہ (مثنوی مذکور صـ ۹۳)

راقم الحروف نے حضرت امیر کی روایت کو ترجیح دی ہے۔ وجہ ظاہر ہے۔

[3] :۔ حضرت امیر نے یہ نام سنگھن دیو تحریر کیا ہے۔

قلعہ ننند بار میں دو ماہ تک سلطانی افواج کا مقابلہ کیا۔ اس اثناء میں وہ اپنی لڑکی دیول دیوی کی شادی شنکر دیو کے ساتھ کرنے پر راضی ہوگیا تھا۔ دیول دیوی کو لینے کے لئے دیوگیر سے شنکر دیو کا بھائی بھیم دیو[1] آیا اور ڈولہ دیوگری کو روانہ کر دیا گیا۔

الپ خاں کی فوجیں راجہ کرن کے متعاقب نواحِ مغاراتِ ایلورہ پہونچیں جہاں انھوں نے دو دن قیام کیا۔ ایک دن اُس کی فوج کے پانچ سو جوانوں نے ایلورہ غار کے عجائبات دیکھنے کی اجازت لی۔ یہ لوگ سیر و تفریح میں مصروف تھے کہ ان کو دشمن کا ایک فوجی دستہ ملا جو ڈولہ لئے ہوئے دیوگیر کو جا رہا تھا۔ مسلمانوں نے ڈولہ پر قبضہ کر لیا اور نہایت احترام کے ساتھ اُسے الپ خاں یا الغ خاں کے پاس لے آئے جس نے اُسے بحفاظت تمام دہلی کی جانب روانہ کر دیا۔ کنولا دیوی بیٹی کو دیکھ کر نہایت خوش ہوئی اور اس کی شادی ولی عہد سلطنت خضر خاں کے ساتھ کر دی۔

ملک کافور اور خواجہ حاجی نے رامچندر کو مغلوب کر کے گذشتہ تین سال کا خراج اور صلح کے عیوض ۷۰۰ ہاتھی راجہ سے وصول کئے اور اس کو واپسی میں اپنے ساتھ دہلی لے آئے جہاں سلطان نے اس کے ساتھ نہایت عزت و مرحمت کا برتاؤ کیا۔ اس کو رائے رایاں کا خطاب دیکر چتر سفید عطا کیا اور دیوگیر کی ریاست اُسی کو واپس کر دی۔ ساتھ ہی ساتھ صوبۂ گجرات میں علاقۂ نوساری کی جاگیر راجہ کو بطور انعام مرحمت کی۔ اس کے بعد رامچندر جب تک زندہ رہا سلطان کا وفادار اور خدمت گذار رہا۔ اس حملہ میں ملک کافور نے ایلچپور کے علاقے شاہی میں مسلم حکّام کا تقرر کر کے اس کو بجائے رامچندر کی نگرانی میں دینے کے دہلی سے ملحق کر لیا۔

(۲) دکن کی دوسری مہم — سنہ ۱۳۰۲ء میں کڑا سے ایک مہم نصرت خاں مرحوم کے جانشین اور بھتیجے چھجو کے ماتحت تلنگانہ کے لئے براہ بنگال و اڑیسہ

---

[1] حضرت امیر نے یہ نام بھیلم دیو تحریر کیا ہے۔

روانہ کی گئی تھی۔ راستہ کی صعوبتوں اور مشکلات نے فوجوں کو پست ہمت کر دیا تھا اس لئے
تلنگانہ میں انھیں شکست ہوئی اور یہ مہم ناکام واپس آئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ مغلوں کی دہشت
سے شمالی ہند کانپ رہا تھا۔ علاء الدین نے ۱۳۰۹ء میں دوبارہ تلنگانہ کی تسخیر کے لئے ملک
کافور اور خواجہ حاجی کو مامور کیا۔ اور چلتے وقت انھیں ہدایت کر دی کہ اگر راجہ اطاعت
قبول کر لے اور خراج دینے کا وعدہ کرے تو اس سے تعرض نہ کیا جائے۔ شاہی فوج جب
دیوگری پہونچی تو راجہ رامچندر نے اس کا استقبال کیا اور لشکر کو اپنا مہمان کیا۔ اور جب
راجہ ورنگل کی رعونت میں کمی نہ دیکھ کر لشکر شاہی تلنگانہ کی طرف روانہ ہوا تو راجہ رامچندر کئی
منزل تک بطریق مشایعت لشکر کے ہمراہ آیا اور ملک کافور سے اجازت لیکر واپس ہوا۔

اُس وقت ورنگل کا حکمراں راجہ پرتاب ردر دیو ثانی تھا جو کاکتیہ یا کاکتی خاندان کا
ساتواں فرمانروا تھا شہر ورنگل کے چاروں طرف دو شہر پناہیں تھیں۔ باہری شہر پناہ مٹی کی
اور اندرونی شہر پناہ جو پختہ تھی طول میں ۴ میل ۱۳۶ گز تھی[1]۔ تلنگانہ کے حدود میں داخل ہوتے
ہی لشکر اسلام نے شہروں اور قلعوں کو فتح کرنا شروع کیا۔ اِدھر گرد کے کئی راجہ اور چھوٹے
چھوٹے رئیس راجہ ورنگل کی مدد کے لئے آئے اور سب نے ورنگل کے قریب شکست کھائی راجہ
معہ رفیقوں کے قلعہ ورنگل میں محصور ہو گیا۔ آخر محاصرہ کی شدت[2] اور باہری شہر پناہ کی مفتوح

ع۱: حضرت امیر خسرو نے خزائن الفتوح میں مہم ورنگل کا حال نہایت تفصیل کے ساتھ درج کیا ہے۔ دہلی سے
روانہ ہو کر ورنگل تک پہونچنے میں ہر ہر منزل کا حال لکھا ہے۔ ورنگل کے قلعہ کا کل دور بارہ ہزار پانچ سو چھیالیس گز
تھا۔ (خزائن الفتوح قلمی)

ع۲: - اس زمانہ میں جبکہ ملک کافور ورنگل کی پہلی شہر پناہ کو فتح کرنے کی کوشش میں لگا ہوا تھا۔
علاء الدین کو ۴۰ دن تک لشکر کی خیر خبر نہیں معلوم ہو سکی ورنہ یہ التزام رکھا گیا تھا کہ ہر دوسرے یا تیسرے
روز بادشاہ کو دکن سے لشکر کی کارگذاری کی اطلاع بہم پہونچتی رہے اس کے لئے یہ انتظام کر رکھا تھا کہ
دہلی سے دکن تک ہر منزل پر ڈاک کے صبا رفتار گھوڑے تیار رکھے جاویں اور ہر نصف اور چوتھائی میل

(باقی مضمون صفحہ ۳۷۳ پر)

ہو جانے کی وجہ سے راجہ نے صلح کی درخواست کی اور اطاعت و فرماں برداری کا اقرار کر کے تین سو ہاتھی سات ہزار گھوڑے اور بہت سا سونا چاندی اور قیمتی تحائف بطور نذرانہ پیش کئے اور سال بہ سال خراج ادا کرتے رہنے کا وعدہ کیا۔[1] ملک کافور یہ سب سامان لیکر سلطان کی خدمت میں دہلی حاضر ہوگیا۔ یہ مہم ۷۱۰ھ میں جا کر ختم ہوئی۔

دکن کی تیسری مہم

دکن کی دوسری مہم سے واپس ہونے کے بعد ملک کافور نے سلطان کی توجہ بقیہ ملک دکن کی تسخیر کی طرف مبذول کی اور اِدھر پانڈیہ کا ایک شہزادہ سندر نامی سلطان کے پاس بغرض امداد مقیم تھا، بادشاہ کو بھی راجگانِ دکن کے ملکی معاملات میں مداخلت کا یہ موقع اچھا نظر آیا، اس لئے ۷۱۰ھ ۱۳۱۰ء میں ملک کافور کو خواجہ حاجی کے ساتھ کر کے تیسری بار دکن روانہ کیا۔ دیوگری کے راجہ رامچندر کا انتقال ہو چکا تھا اور اس کی جگہ اس کا لڑکا شنکر دیو حکومت کر رہا تھا۔ دیوگری سے ملک کافور نے بخط مستقیم دوار واتی پوریا دوار سمندر کا رخ کیا۔ دوار سمدر کے کھنڈرات ہلیبد کے مقام پر جو ریاست میسور کے ضلع حسن میں واقع ہے اب بھی موجود ہیں۔ کافور

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۳۷۳:۔ کے فاصلہ پر ہرکاروں کی ڈاک بٹھادی جاوے۔ اس انتظام کے باوجود جب ایک عرصہ تک بادشاہ کو ورنگل کے لشکر کی خیریت نہیں معلوم ہوئی تو وہ بڑا متفکر ہوا اور اس نے قاضی مغیث الدین بیانوی اور ملک قرابیگ کو ہدایا و تحائف کے ساتھ حضرت نظام الدین اولیاؒ کے پاس بھیجا اور استدعا کی کہ "شما راغم اسلام بیش از من است اگر بنور باطن خبرے از حال لشکر شما روشن شدہ باشد بشارتے بر من بفرستید" یعنی اگر آپ کو کشف کے ذریعہ سے لشکر اسلام کا حال معلوم ہو تو اس سے مطلع فرمائیں۔ حضرت خواجہ موصوف نے اس کو فتح و نصرت کی بشارت دینے کے ساتھ ساتھ پیامبروں کے ذریعہ یہ بھی کہلا بھیجا کہ "ایں فتح چہ باشد کہ ما فتح ہائے دیگر را امید واریم" یعنی یہ فتح کیا چیز اور فتوحات کی بھی امید ہے۔ چنانچہ اسی دن ظہر کی نماز کے وقت ورنگل کی فتح کی خوشخبری قاصدوں نے آکر سنائی۔ (برنی ص ۳۳۱)

[1] :۔ ضیائے برنی ص ۳۳۰

نے راستہ میں جالنہ کے مقام پر ایک قوی فوجی دستہ کا قیام شاہی ڈاک کی آمدورفت کی حفاظت کی خاطر ضروری سمجھا۔

دوارسمدر میں ہوسل خاندان کا دسواں راجہ ویر بلال سوم (۱۲۹۲ء تا ۱۳۴۲ء) حکمراں تھا۔ یہ مسلمانوں کی اچانک اور یکایک آمد سے گھبرا گیا۔ شہر فتح کر کے راجہ کو گرفتار کر لیا گیا کافی مال غنیمت ہاتھ لگا۔ دوارسمدر کے حملہ میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ کدور کے مقام پر راجہ کی حمایت میں مسلمان مولیوں نے شاہی فوجوں کا مقابلہ کیا تھا۔ راجہ بلال سوم کی فوجوں نے علائی فوجوں کا بمقام پٹن جو کہ گوداوری کے کنارے ہے مقابلہ کیا تھا۔

دوارسمدر سے ملک کافور دکن کے انتہائی جنوبی گوشہ یعنی دریائے کاویری کے جنوبی علاقے کی طرف متوجہ ہوا۔ یہاں پانڈیہ خاندان حکمراں تھا جن کا پایۂ تخت مدورا تھا۔ یہ بتایا جا چکا ہے کہ ۱۳۱۰ء کے شروع میں سندر نامی پانڈیہ علاءالدین کے پاس بغرض امداد دہلی میں موجود تھا۔ سندر نامی پانڈیہ نے اپنے باپ کل شیکھر دیو کو قتل کر کے تخت پر قبضہ کرنا چاہا لیکن اُس کے دوسرے بھائی ویر پانڈیہ نے اُس کو شکست دیکر بھگا دیا تھا۔ ملک کافور کی آمد پر ویر پانڈیہ مدورا کو خالی کر کے بھاگ گیا۔ شاہی لشکر کے ہاتھ اچھا مال غنیمت پڑا۔ بعض مورخین علاقہ پانڈیہ میں دو حکمراں کو بتاتے ہیں ایک ویر پانڈیہ اور دوسرا غالباً کیرالہ کا "روی ورمن" ہے۔ دونوں کو شکست ہوئی۔ کافور نے مدورا میں مسلمان گورنر مقرر کیا۔ آگے بڑھ کر سیت بندرا میشورم پہنچ اور پتھر کی ایک مسجد تعمیر کرائی جو صاحب تاریخ فرشتہ کے زمانے تک موجود تھی اور مسجد علائی کے نام سے مشہور تھی۔ راس کماری سے لشکر اسلام ساحل کارومنڈل کی طرف متوجہ ہوا اور اس طرف کے تمام راجاؤں سے خراج وصول کرتا اور اقرار اطاعت لیتا ہوا ۲۴ اپریل ۱۳۱۱ء کو دہلی کی طرف واپس لوٹا۔ اس مرتبہ مال غنیمت بے اندازہ ہاتھ لگا۔ ۳۱۲ ہاتھی بیس ہزار

گھوڑے اور دس کروڑ تنگہ قیمت کا سونا علاوہ جواہرات کے مال غنیمت میں ملا[1]۔ ۱۸ اکتوبر ۱۳۱۱ء کو یہ سب ساز و سامان کافور نے لاکر دہلی میں بادشاہ کے سامنے پیش کر دیا۔ اس مہم کے بعد ہمالیہ سے لیکر راس کماری اور بحر عرب سے لیکر بحر بنگال تک کا کل بر اعظم علاء الدین کے قبضہ میں آگیا۔

دکن کی ریاستیں مغلوب و مطیع تو ضرور کر لی گئیں لیکن علاء الدین نے انھیں اپنی براہ راست حکومت میں شامل نہیں کیا۔ اُس کا یہ طرز عمل نہایت دانشمندانہ اور پسندیدہ تھا۔ اب شاید دکن پر کسی مزید فوج کشی کی ضرورت باقی نہ تھی لیکن علاء الدین کو مجبوراً چوتھی مرتبہ پھر کافور کو دکن بھیجنا پڑا۔

(۴) دکن کی چوتھی مہم

۱۳۱۳ء میں علاء الدین نے ملک کافور کو دکن کا وائسرائے بنا کر روانہ کیا۔ دکن جانے کا خاص سبب یہ تھا کہ ملک کافور سے شاہی افراد مثلاً ولی عہد سلطنت خضر خاں اور بالخصوص اُس کی ماں سخت نفرت کرتے تھے اور اس کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اس لئے ملک کافور نے خود ہی بادشاہ سے دکن جانے کی اجازت مانگی تاکہ دار السلطنت سے دور رہے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ رامچندر کے جانشین شنکر دیو سے آثار سرکشی نمایاں ہوئے اور ساتھ ہی ساتھ تلنگانہ کے راجہ کی عرضی گذری کہ اُس کے پاس تین سال کا خراج جمع ہو گیا ہے۔ سلطان کسی سردار کو علاقۂ دکن میں ایسی موزوں جگہ پر متعین فرمادیں کہ جہاں زر خراج بھیجنے میں آسانی ہو جائے[2]۔ چنانچہ علاء الدین نے کافور کو یہ ہدایات دیکر روانہ کیا کہ تم ایلچپور پہونچ کر جو براہ راست شاہی مقبوضہ ہے قیام کرو۔ دکن کے راجاؤں سے خراج وصول

ع۱:- برنی نے مال غنیمت میں ۳۱۲ ہاتھی، بیس ہزار گھوڑے، ۹۶ ہزار من سونا علاوہ بیش قیمت جواہرات کے شمار کیا ہے (برنی ص ۳۳۳)

ع۲:- برنی ص ۳۳۴ و ص ۳۶۸

گرکے روانہ کرتے رہو اور اگر دیوگیر کا راجہ راہ راست سے منحرف ہو گیا ہو تو اس کو قتل کرکے دیوگری راج کو دہلی سلطنت میں ملالو اور اپنی طرف سے اُمراء اور صوبیدار مقرر کردو۔ خود دیوگری میں مقیم رہو۔

ملک کافور نے دکن پہونچکر سنکر دیو کو جو واقعی باغی ہو چکا تھا قتل کیا اور تمام علاقہ مرہٹ میں گلبرگہ، مدگل اور رائچور تک اپنے اہلکار اور اُمراء مقرر کر دئے۔ علاقہ میں امن وامان اور رعب شاہی بٹھانے کی خاطر اُس نے علاقہ کا دورہ کیا۔ اسی سلسلہ میں اُس نے ویر بلال سوم کی ریاست پر دوبارہ چھاپہ مارا اور مال غنیمت لیکر دیوگری واپس لوٹ آیا۔ جہاں سے اُس نے کل سامان بادشاہ کی خدمت میں دہلی بھیجدیا۔

آخری زمانہ

"ہر کمالے را زوالے" کی ضرب المثل علاءالدین کے اوپر صحیح معنی میں صادق آتی ہے۔ شمالی ہند پہلے ہی بس میں آچکا تھا۔ دکن کی تسخیر نے اس کو پورے ہندوستان کا شہنشاہ بنا دیا۔ مغلوں کا خطرہ مٹ چکا تھا گویا اس طرح ۱۳۱۲ء میں اُس کے قوت و اقتدار کا سورج نصف النہار پر تھا کہ خلاف توقع اُس پر زوال آنا شروع ہوا۔ علاءالدین کی صحت کثرت کار کی وجہ سے بگڑ چلی تھی اور وہ آئے دن بیمار رہنے لگا۔ سلطان کے مرض میں طوالت ہوئی اور بیوی بچوں نے اس حالت میں اُس کی تیمارداری اور اپنے فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی کی۔ اس حالت میں اس نے دکن سے ملک کافور اور گجرات سے الپ خاں کو بلا بھیجا۔ الپ خاں کو دہلی پہونچنے میں دیر ہوئی اور ملک کافور پہلے پہونچ گیا۔ بیماری نے اُسے نہایت بدمزاج اور پہلے سے زیادہ سخت گیر اور وہمی و شکّی بنا دیا تھا۔ بادشاہ نے کافور سے اپنے بیوی اور بچّوں کی بے اعتنائی کی سخت شکایت کی۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اس کی اولاد تھی بھی سخت نالائق۔ بہرحال کافور نے اپنی مطلب برآری و سرخروئی کے لئے اس موقع کو غنیمت سمجھ کر بادشاہ سے اس کی بیوی و اولاد کی برائیاں کرنا شروع کیں۔ بادشاہ

چونکہ جاہل اور خوشامد سے جلد متاثر ہونے والی طبیعت رکھتا تھا اس لئے اُس نے کافور کی اس بنائی ہوئی جھوٹی بات پر کہ بادشاہ کو مارنے کے لئے اُس کی بیوی خضر خاں اور الپ خاں نے سازش کی ہے یقین کرلیا۔ ہونے والی بات کہ اس موقع پر ملکہ نے بادشاہ سے اُس کے دوسرے بیٹے شادی خاں کی الپ خاں کی لڑکی کے ساتھ شادی کے لئے اجازت طلب کی۔ اس پر بادشاہ کو اور یقین ہوگیا۔ اُس نے اپنے ولی عہد خضر خاں کو دہلی سے امروہہ کی طرف جلاوطن کردیا۔ شادی خاں کو گوالیار میں قید کردیا اور اپنی بیوی کو حرم (محل سرائے) سے خارج کرکے پرانی دہلی میں مقید کردیا۔ الپ خاں کو جو اپنی قابلیت و شجاعت کی وجہ سے کافور کی آنکھوں میں خار تھا آدمی بھیج کر جبکہ وہ گجرات سے آرہا تھا راستہ ہی میں قتل کرادیا اور اُس کے بھائی نظام الدین کو جو جالور کے قلعہ کا حاکم تھا قتل کرنے کے لئے کمال الدین گرگ کو روانہ کیا۔

اس طرح ایک ہی وار میں کافور کے کئی رقیبوں کا صفایا ہوگیا۔ صرف ایک خضر خاں باقی رہ گیا تھا جو جلاوطنی کی حالت میں تھا اُس کا بھی وقت آگیا۔ بادشاہ کی بیماری میں افاقہ کی خبر سُن کر خضر خاں امروہہ سے دہلی ایک بزرگ کے مزار پر حاضری دینے کے لئے آیا۔ یہ حاضری اُس مانی ہوئی منت کے تحت میں تھی جو کہ اُس نے بادشاہ کی صحت یاب ہونے کے لئے مانی تھی۔ بادشاہ اپنے بیٹے کی اس بات سے خوش ہوا لیکن ملک کافور نے بادشاہ کو بہکایا اور بار بار یہ کہکر اُس کو یہ یقین دلایا کہ خضر خاں امروہہ سے جان بوجھ کر بادشاہ کے احکامات کی خلاف ورزی کرکے آیا ہے چنانچہ خضر خاں کو بھی گوالیار کے قلعہ میں نظر بند کرادیا۔

بادشاہ کے ان ظالمانہ کاموں سے اور خصوصاً الپ خاں جیسے جلیل القدر اور بادفا سردار کے بے گناہ قتل سے ملک میں عام بددلی اور بے چینی پھیل گئی۔ سب سے پہلے بے چینی کے اثرات گجرات میں ظاہر ہوئے۔ گجرات کی شورش کو دبانے کے لئے کمال الدین گرگ کو بھیجا گیا جسے وہاں کی پبلک نے بڑی اذیت کے ساتھ قتل کرڈالا۔ چتور گڈھ جو اب تک راجہ مالدیو کے پاس تھا اُس کو ہمیر دیو نے فتح کرلیا اور مسلمان جاگیرداروں اور افسروں کو بری طرح

قتل کیا۔ اسی طرح دیوگری کے مرحوم راجہ رامچندر کے داماد ہرپال دیو نے علم بغاوت بلند کیا اور کئی ایک قلعے مسلمانوں سے چھین کر اپنی خودمختاری کا اعلان کر دیا۔ ان متوحش خبروں نے بادشاہ کے دماغی توازن کو بگاڑ دیا۔ غصہ کی وجہ سے اُس کی حالت روز بروز گرتی گئی اور ۲؍جنوری ۱۳۱۶ء مطابق ۷؍شوال ۷۱۵ھ کو اُس کا انتقال ہو گیا[1]۔ بعض لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ ملک کافور نے زہر دیکر اُس کی زندگی کا خاتمہ کر دیا۔ بادشاہ جامع دہلی کے سامنے دفن کیا گیا۔

اصلاحِ حکومت

یہ بتایا جا چکا ہے کہ اکت خاں، عمر خاں، منگو خاں اور حاجی مولہ کی پے در پے بغاوتوں سے علاؤالدین کو فکر پیدا ہو گئی تھی اور وہ رات دن اسی فکر میں رہنے لگا کہ آئندہ کیا تدابیر اختیار کرے کہ کسی کو ملک کے امن و امان میں خلل انداز ہونے کی جرأت نہ ہو سکے۔ گو رن تھمبور کے محاصرے کی کارروائی شدت کے ساتھ جاری تھی مگر سلطان رات دن امرائے سلطنت ملک حمید الدین، ملک اعزالدین اور ملک عین الملک ملتانی سے جن کی اصابت رائے مشہور تھی اسی مسئلہ کے متعلق مشورے کرتا رہتا تھا۔ آخر بہت کچھ غور و بحث کے بعد یہ جماعت اس نتیجہ پر پہونچی کہ (۱) حکومت کی لوگوں کے ذاتی معاملات سے بے خبری (۲) شراب خواری (۳) اور باہمی قرابت اور دوستی کے ذریعہ امراء کی فرقہ بندی اور (۴) رعایا کی دولت مندی، یہی چاروں شورش اور سازش کے اصلی سبب ہیں۔ جب تک ان کو دور نہیں کیا جائے گا اس وقت تک برابر فساد بپا ہونے کا اندیشہ رہے گا۔

---

[1] حضرت امیر خسرو بادشاہ کی تاریخ وفات ۷ شوال ۷۱۵ھ تحریر کرتے ہیں۔

زشوال آمده ہفتم پیاپے | ستیزہا نصد پنجہ بر پے
کزیں دیر سپنج آں شاہ آفاق | بروں زد ہفت گنبد بر کشش طاق

(مثنوی دول رانی خضر خانی قلمی)

I علاؤالدین نے رن تھمبور کی مہم سے واپس آکر فوراً ہی مذکورۂ بالا اسباب کے تحت میں نئے نئے قوانین بنائے اور ان کا سختی کے ساتھ نفاذ کیا۔ اس نے سب سے پہلے لوگوں کی ذاتی جائداد اور ملکیت کی طرف توجہ کی جس سے دولت مند طبقہ کے بے کار افراد کو بہت تکلیف اٹھانی پڑی (۱) اوّل تو بہت سی جاگیریں اور انعامات و معافیاں وغیرہ جو زائد از ضرورت سمجھی گئیں سرکار نے ضبط کرلیں۔ (ب) دوسرے زرستانی کے بعض نئے ابواب بڑھا دئے اور ٹیکس وصول کرنے والوں کو سختی کے ساتھ ہدایت کردی کہ وہ محصول میں زیادہ تر لوگوں سے سونا وصول کریں اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بڑے بڑے امراء کے گھروں کو چھوڑ کر باقی عام پبلک کا سونا کھنچ کر بادشاہ کے خزانے میں پہونچ گیا۔ (ج) دوآب کے ہندوؤں کے لئے کچھ تو ان کی تمرد و سرکشی کی بنا پر اور کچھ ان کے غیر معمولی تمول کی وجہ سے بعض خاص قوانین بنائے جس کی وجہ سے غالباً برہمنوں اور راجپوتوں کو زیادہ نقصان پہونچا کیونکہ ملک کا زمینداره انھیں لوگوں کے پاس تھا۔ یہ لوگ اب تک صرف جزیہ دیگر مالی بار سے سبکدوش ہو جاتے تھے بدلہ میں جزیہ کی رقم سے کہیں زیادہ ان کو مالگزاری وصول کرنے کا حق وصولیابی مل جاتا تھا اور حکومت کے بعض دیگر مالی مطالبات کا بوجھ بلا واسطہ غرباء کے طبقہ پر پڑتا تھا کیونکہ یہ زمیندار حکومت کے مطالبہ کو اپنے پاس سے ادا کرنے کے بجائے اپنی ہندو رعایا کے سر ڈال دیتے تھے۔ علاؤالدین نے سرمایہ کی اس غیر مساوی تقسیم کو اڑا کر سب کو ایک سطح پر لانے کی کوشش کی۔ اس نے احکامات نافذ کئے کہ آئندہ سے سب اپنی اصلی اور صحیح آمدنی پر حصہ رسدی انکم ٹیکس ادا کریں۔ ظاہر ہے کہ اس سے ہندو حکام اور ہندو زمینداروں کی جیب سے کافی رقم نکل کر شاہی خزانہ میں

۱؎ - علاؤالدین عہد غلامان کے اقطاع سسٹم کو کلیتاً دور نہیں کرسکا۔ چودھری، مقدم اور خوط بدستور گاؤں کے عہدیدار رہے۔ انھوں نے بلبن کے بعد جو حکومت میں انتشار پھیلا اس سے پورا فائدہ اٹھایا اور ضرورت سے زیادہ مالدار ہوگئے۔ یہ بڑے شان و شوکت کے ساتھ رہتے تھے۔

(باقی مضمون صفحہ ۳۸۰ پر)

جانے لگی اور غریب رعایا کو نسبتاً مالی مشکلات سے نجات مل گئی کیونکہ اس کا بار عام رعایا پر نہیں پڑا جس کی برنی شہادت دیتا ہے کہ "از خوطہ و بلاھر و ادن خراج یک حکم پیدا آید و خراج اقویا بر ضعفا نیفتد"۔

(د) اسی ضمن میں محکمہ مالگزاری کی بھی اصلاح کی گئی بہت سے پرانے عہدے دار جو رشوتیں لیا کرتے تھے یک قلم برخاست کر دیئے گئے[1] پھر کٹھر سے دیپالپور تک اور جھاین سے لاہور تک تمام علاقہ کی پیمائش اور تشخیص کی گئی۔ نائب وزیر ممالک "شرف قائنی" نے جو اپنی قابلیت کے لحاظ سے ارسطوئے زمانہ تھا خود ایک ایک گاؤں کی جمعبندی کا ملاحظہ کیا اور کئی سال کی محنت کے بعد چرائی اور مالگزاری کی رقوم متعین کیں ہر جگہ اور ہر شخص کے لئے ایک سا اصول بنایا گیا یعنی یہ کہ کاشتکار سے معہ خوطہ و بلاھر پیداوار کا نصف[2] سرکار لے گی۔ چرائی[3] کا محصول اس کے علاوہ تھا جو دودھ دینے والی گائے اور بھینس پر لیا جاتا تھا۔

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۳۷۹ = عمدہ گھوڑے ان کی سواری میں تھے۔ اچھے ہتھیاروں سے مسلح رہتے تھے اور حکومت کے مالیہ کی ادائیگی سے گریز کرنے لگے تھے۔ علاء الدین نے سیاسی حالات کی بنا پر ان کے امتیازی حقوق سلب کر لئے اور اب وہ صرف اپنا حق المحنت پانے کے مجاز تھے۔ بادشاہ نے ان کو کسان کے مساوی کر دیا جس طرح آجکل کانگریس گورنمنٹ زمیندار کو ملک کا ایک مفید طبقہ بنانے کے لئے کسان کے مساوی کرنا چاہتی ہے۔ اس کو ظلم نہیں کہا جا سکتا کیونکہ حکومت نے کسی دشمنی کی بنا پر نہیں بلکہ سیاسی و مالی تقاضے کی بنا پر ایسا کیا تھا۔ (مؤلف)

[1]:- کم و بیش دس ہزار محرروں کو رشوت ستانی کے الزام میں برخاست کر دیا تھا (برنی ص ۲۹۶)۔

[2]:- اس سلسلے میں ڈاکٹر رام پرشاد صاحب ترپاٹھی کا کہنا یہ ہے کہ علاء الدین کو فوجی ضروریات نیز شراب وجوا وغیرہ کا ٹیکس اُٹھا دینے کی وجہ سے روپیہ کی سخت ضرورت تھی۔ اس نے روپیہ کی کمی کو لگان میں اضافہ کر کے پورا کیا لیکن اُسے یہ احساس تھا کہ اس کا بوجھ کاشتکار رعایا پر پڑے گا۔ چونکہ وہ کاشتکار کا ہمدرد تھا اس لئے ان کے بوجھ کو ہلکا کرنے کے لئے دوسری تدبیریں اختیار کیں۔ مثلاً (باقی مضمون صفحہ ۳۸۱ پر)

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ اصول سخت تھے اور اس سے جہاں تمرد و سرکشی اور عصیاں کی بیخ کنی ہوئی اس کے ساتھ ہی ساتھ "اسپ سوار شدن و سلاح بردست گرفتن و جامۂ خوب پوشیدن و تنبول خوردن از چودھریاں و خوطاں و مقدماں بکلی برفت" برنی کی یہ شہادت اگر بے کم و کاست مان لی جاوے تو بھی ظاہر ہے کہ اگر بادشاہ

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۳۸۰ ۔ (۱) اراضی کی صحیح پیمائش کرا کے کسان کو بتایا کہ اسے کتنی مالگذاری ادا کرنا ہے تاکہ حکام اُس سے زیادہ وصول نہ کر سکیں ۔ واضح رہے کہ علاءالدین پہلا بادشاہ ہے جس نے پیمائش کرائی ۔ (۲) پٹواری کو اچھی طرح شکنجے میں کسا تاکہ وہ اپنے کاغذات میں غلط اندراجات نہ کرے ۔ غلط اندراجات کی صورت میں بڑی سخت سزائیں مقرر کیں یہاں تک کہ لوگ نویسندگان کے ساتھ اپنی لڑکیوں کو منسوب کرتے ہوئے ڈرتے تھے کہ کہیں ایسا نہ ہو اُن کی لڑکی کو خاوند کے جیل جانے کی صورت میں بھوکوں مرنا پڑے ۔ اس پیشہ کو لوگ بُرا خیال کرنے لگے ۔

(۳) کسان کو اختیار دیا کہ وہ مالگذاری خواہ جنس کی صورت میں ادا کرے یا مناسب سمجھے تو نقد روپیہ دے کر مطالبہ بیباق کر دے ۔ اس سے کسان کو بڑی آسانی ہوگئی ۔

(۴) پہلے مالگذاری بہت غلط طریقے سے وصول کی جاتی تھی جس سے ایک معتد بہ رقم ہر سال بقایا میں رہ جاتی تھی جس کا ادا کرنا کسان کے لئے مشکل ہو جاتا تھا اس کے لئے علاءالدین نے ایک نیا محکمہ مستخرج کے نام سے قائم کیا ۔ (۵) حکام کم تنخواہ پانے کی وجہ سے رشوتیں لینے کے عادی تھے ۔ اس سے کسان کو بڑا نقصان اٹھانا پڑتا تھا ۔ اس خرابی کو دور کرنے کے لئے تنخواہیں زیادہ کر دیں اور راشی کے لئے عبرت ناک سزائیں مقرر کیں ۔ (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ریوینیو سسٹم حصہ دوم باب ہشتم از ڈاکٹر رام پرشاد ترپاٹھی)

ے ۳ :۔ چرائی ٹیکس اور ہاؤس ٹیکس علاءالدین نے عائد کئے ۔ چرائی ٹیکس سے دو بیل، دو بھینسیں، دو گائیں اور دس بکریاں مستثنیٰ تھیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگ کثرت کے ساتھ جانور پالتے تھے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ کاشتکاری کے قابل زمینیں بھی چراگاہ کی صورت میں تبدیل ہو گئی ہونگی ۔ اس کو روکنے کے لئے

(باقی مضمون صفحہ ۳۸۲)

نے وہ دولت زمینداروں سے چھین کر اپنے خزانے میں بھر لی تھی تو وہ ہندوستان ہی میں رہی اور زیادہ تر بیش کی شاہی عمارتوں یا فوجی ضروریات میں خرچ ہوئی۔ اور اس طرح وہ دولت امیروں و زمینداروں سے نکل کر آخر کار مزدور پیشہ طبقہ کی جیبوں میں پہونچ گئی۔

II علاؤالدین نے امراء کے اندرونی حالات سے واقفیت اور سیاسی سازشوں کے انسداد کی نئی نئی ترکیبیں نکالیں۔ اس نے بلبن کی طرح پرچہ نویسوں کا ایک نیا محکمہ قائم کر کے ملک میں جاسوسوں کا جال بچھا دیا۔ یہ پرچہ نویس اور جاسوس بادشاہ کو ملک کی بالعموم اور امراء کے گھروں کی بالخصوص ذرا ذرا سی خبریں بہم پہونچایا کرتے تھے۔ امراء پر جاسوسوں کا اتنا خوف غالب تھا کہ وہ گھروں میں بات کرتے ہوئے ڈرتے تھے کہ مبادا ان کی زبان سے کوئی ایسی بات نکل جائے جو شاہی عتاب کا باعث ہو۔ کوشک شاہی "ہزار ستون" میں اجتماع کے موقعوں پر بھی ایک دوسرے سے اشاروں سے باتیں کرتے تھے اس صورت میں ایک دوسرے سے مل کر بادشاہ کے خلاف سازش کی اسکیم بنانا ایک امر محال ہو گیا۔ یہی وجہ ہے سلطان کی بقیہ زندگی میں ہم کسی سازش کا نام بھی نہیں سنتے۔

III دوسری تجویز کے مطابق قمار بازی۔ شراب خوری نیز اور نشیلی چیزوں کا استعمال اور خرید و فروخت کو قانوناً ممنوع قرار دیا سلطان نے سب سے پہلے خود شراب خوری سے توبہ کی اور شاہی کارخانہ میں میگساری کے جس قدر ظروف تھے سب تڑوا دئے۔

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۳۸۰)

علاء الدین نے چرائی ٹیکس عائد کیا تاکہ لوگ زراعت کی طرف مائل ہوں (ریوی نیو سسٹم حصہ دوم باب ہشتم از ڈاکٹر رام پرشاد ترپاٹھی)

عا طا ۳۸۱ :- تاریخ فیروز شاہی صـ ۲۸۸ از ضیائے برنی۔

پھر شراب بیچنے اور پینے کی ایسی سخت سزائیں مقرر کیں کہ اگرچہ یہ عادت بالکل دور نہ ہو سکی تو کم سے کم مسکرات کی علانیہ خرید و فروخت ضرور موقوف ہو گئی۔ دہلی کے اطراف میں آٹھ آٹھ دس دس کوس تک کسی کی مجال نہیں تھی کہ شراب پی سکے، بنا سکے، یا بیچ سکے۔ آخر عہد میں سختیوں میں کمی کر دی تھی۔ محکمۂ احتساب کے لوگوں کو منع کر دیا تھا کہ وہ ایسے لوگوں سے نہ بولیں اور نہ تلاشی کے لئے ان کے مکانوں میں داخل ہوں جن کی بابت یہ معلوم ہو کہ وہ اپنے گھر میں شراب کشید کر کے اور دروازہ بند کر کے تنہا پیتے ہیں کسی کو شریک نہیں کرتے اور نہ فروخت کرتے ہیں۔ بہرحال مسکرات پر پابندیاں عائد کر دینے سے یہ نتیجہ نکلا کہ ان سے پیدا ہونے والی تمام خرابیاں ختم ہو گئیں۔ اور ملک فتنہ و فساد سے پاک ہو گیا۔ آج ہماری قومی حکومتیں بھی شراب خواری کی لعنت کو ملک سے دور کرنا چاہتی ہیں انہیں چاہیئے کہ علاؤ الدین کے قدم بقدم چلیں۔

۱۷ فساد کا ایک سبب امراء کا آپس میں مجتمع ہو کر مجلسیں منعقد کرنا اور شادی بیاہ کے ذریعہ اپنی قوت کو مضبوط کرنا تھا۔ علاؤ الدین نے اس قسم کے اجتماعات کی ممانعت کر دی اور ملکی معاملات پر بحث کرنے سے روک دیا۔ اس کے علاوہ امراء سلطنت کو حکم دیا کہ وہ بغیر وزیر اعظم کی اجازت حاصل کئے ہوئے آپس میں شادی اور بیاہ نہ کریں۔ مطلق العنان بادشاہی کی یہ وہ شان تھی جو آئندہ مغل سلاطین کے عہد میں بھی باقی رہی۔

(۱۱) فوجی تنظیم اور نرخ اجناس کا تعین

۱۳۰۳ء میں چتوڑ سے واپس ہونے کے ایک ماہ کے بعد علاؤ الدین کو دہلی میں محصو

عــه بھاری بھاری جرمانوں نیز کوڑوں کی سزاؤں کے علاوہ شراب خواروں کو بڑے بڑے کنوؤں میں قید کر دیا جاتا تھا جو صرف انھیں کو سزا دینے کے لئے علاء الدین نے بداؤں دروازے کے باہر میدان میں کھدوا دئے تھے۔

ہو کر مغلوں کا مقابلہ کرنا پڑا یہ وہ ذلت تھی جس کو وہ کبھی نہیں بھولا اس کو غالباً پہلی مرتبہ اس کا شدید ترین احساس ہوا کہ ملک میں جب تک ایک باقاعدہ مستقل فوج نہیں ہوگی ہندوستان کو مغلوں کے حملوں نیز ملک کے اندرونی فسادات سے چھٹکارا نصیب نہیں ہوگا۔ لیکن ایک عظیم الشان فوج کے لئے کافی سرمایہ کی ضرورت تھی اور علاء الدین اپنی رعایا پر مزید مالی بار ڈالے ہوئے کام کو انجام دینا چاہتا تھا۔ اس نے اس مشکل کو حل کرنے کی یہ ترکیب سوچی کہ سکہ کی قیمت اور اجناس میں توازن قایم کردیا جائے۔ اس زمانہ میں دکن کی دولت کھنچ کھنچ کر شمالی ہند میں آرہی تھی جس کو علاء الدین نے نہایت فراخ دلی سے لوگوں میں تقسیم کردیا تھا چنانچہ سونے چاندی کی افراط سے سکّہ کی قیمت گر گئی تھی اور اس کے مقابلہ میں ضروریات زندگی کی چیزیں گراں ہوگئیں تھیں۔ لہٰذا علاء الدین نے صلاحکاران سلطنت کے مشورے سے بازار کے انتظام کا قانون بنا کر سب چیزوں کا نرخ مقرر کردیا۔ اس طرح سپاہی قلیل تنخواہ میں اپنی تمام ضروریات زندگی کو بخوبی پورا کرسکتا تھا اور حکومت اپنے مالیات میں ایک پیسہ کا بھی مزید اضافہ کئے بغیر اس قابل ہوگئی کہ ۴ ۱/۲ لاکھ جرار سپاہ دشمن کے مقابلہ کے لئے ہر وقت کیل کانٹے سے تیار رکھ سکے۔ اس زمانہ میں معمولی سوار کو ۲۳۴ ٹنکہ سالانہ[۱] یعنی ۱۹ ۱/۲ ٹنکہ ماہانہ اور دو اسپہ سوار کو ۳۱۲ ٹنکہ سالانہ ملا کرتے تھے۔ ضروریات زندگی کا نرخنامہ سب سے آخر میں منسلک ہے جس سے اشیاء کی ارزانی کا اندازہ ہوسکے گا۔

۱:۔ مولوی سید ہاشمی صاحب فرید آبادی نے فرشتہ کی روایت کے بنا پر شرح تنخواہ ۲۳۴ ٹنکہ و ۱۹ ۱/۲ ٹنکہ ماہانہ تسلیم کی ہے (ملاحظہ ہو تاریخ ہند ج ۲ ص ۱۰۱) جو قابل تصحیح ہے۔ برنی نے کئی جگہ شرح تنخواہ وہی تحریر کی ہے جو اوپر مذکور ہوئی (ملاحظہ ہو تاریخ فیروز شاہی صفحات ۲۹۳، ۳۰۳، ۳۱۹) اسی شرح کو الیٹ وغیرہ نے بھی تسلیم کیا ہے۔ (الیٹ جلد سوم ص ۶۲۵)

(ا) غلہ کی ارزانی

ضروریات زندگی میں سب سے پہلا نمبر غلہ کا ہے اس کی ارزان یا گراں ہونے کا اثر تمام چیزوں پر پڑتا ہے اس لئے علاء الدین نے سب سے پہلے اسی کی طرف توجہ کی۔ اراکینِ سلطنت کے مشورہ سے اُس نے آٹھ قوانین یا ضابطے ایسے بنائے جن کی وجہ سے نہ صرف غلہ کا بھاؤ ارزاں ہوگیا بلکہ "در نزول باراں و امساک باراں یک دانگہ ازاں نرخ بالا نرفت" اور اس کو ہمعصر مورخ نے عجائبات روزگار میں شمار کیا ہے۔ قوانین کی مختصر کیفیت یہ ہے:-

(۱) غلہ کی مختلف جنسوں کا بھاؤ حکومت کی طرف سے متعین کر دیا گیا۔ یہ نرخ اتنا ارزاں تھا کہ اسے آج پڑھ کر مشکل سے یقین آتا ہے۔

(۲) منڈی کی دیکھ بھال کے لئے ایک نیا محکمہ قائم کیا اور اُس کا مہتمم ملک قبول الغخانی کو مقرر کیا جو "شحنۂ منڈی" یا "راشننگ آفیسر" کہلاتا تھا اس کو تاجروں کی تنبیہ و تادیب کے کامل اختیارات حاصل تھے۔ شحنۂ منڈی کے ساتھ ساتھ لیکن غالباً اس کے دائرۂ اثر سے باہر پرچہ نویسوں کا محکمہ قائم کیا جس کے افسر بازار کی کیفیت سے بادشاہ کو مطلع کرتے رہتے تھے۔

(۳) بادشاہ نے علاقہ میان دوآب و قصبات علاقہ جھاین وغیرہ میں مالگذاری غلہ کی صورت میں وصول کی۔ اور غلہ کو سرکاری گوداموں میں جمع کرایا جس کی وجہ سے غلہ کے تاجر سرکاری بھاؤ پر غلہ فروخت کرنے پر مجبور ہو گئے اور قحط وغیرہ کی صورت میں غلہ کے گراں ہونے کا خطرہ بھی جاتا رہا کیونکہ شاہی گوداموں سے اناج لاکر بازار کو پاٹ دیا جاتا تھا اور بھاؤ حسب سابق اپنی جگہ پر بدستور قائم رہتا تھا۔

(۴) غلہ کے تمام چھوٹے بڑے تاجروں کو حکم دیا گیا کہ وہ شحنۂ منڈی کے پاس جاکر اپنے ناموں کا اندراج کرائیں اور اُس کے احکامات کے مطابق عمل کریں۔

(۵) تمام مملکت میں اعلان کرا دیا کہ کوئی بقال، سوداگر یا زمیندار ایک یا آدھا من

غلّہ بھی رعایا سے حاصل کر کے خفیہ فروخت نہ کرے اور نہ کوئی غلّہ کو جمع کر کے اپنے پاس رکھے۔ علاقہ میاں دوآب کے کارکنان نائبان و متصرفان کو شاہی احکامات کا بڑی سختی و ایمانداری کے ساتھ نفاذ کرنا پڑتا تھا ورنہ محتکر[1] کے ساتھ ساتھ ان کو بھی سزا بھگتنا پڑتی تھی۔[2]

(۶) دوآبہ کے حکام کو ہدایت تھی کہ وہ خراج میں زیادہ تر غلّہ حاصل کریں اور رعایا مقررہ نرخ پر اپنا غلّہ سرکاری تاجروں کے ہاتھ فروخت کرے اس سے یہ فائدہ ہوا کہ غلّہ برابر منڈی میں پہونچتا رہا اور بکتا رہا۔

(۷) بادشاہ نے یہ انتظام کیا کہ اس کو منڈی کی کیفیت تین مختلف ذرائع سے معلوم ہو یعنی شحنۂ منڈی، برید منڈی، اور جاسوسوں کا افسر اعلیٰ روزانہ آ سے بازار کے حالات سے باخبر رکھیں۔ ان تینوں[3] کی اطلاعات میں اگر ذرا سا بھی اختلاف پایا جاتا تھا تو تحقیقات کے بعد شحنۂ منڈی کو اس کی جواب دہی کرنا پڑتی تھی۔ غرضکہ ان تینوں محکمہ جات کے افسران اعلیٰ کی کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ بازار سے ہر قسم کی بدعنوانی جاتی رہی اور غلّہ کا بھاؤ علاء الدین کی زندگی میں گرنے نہیں پایا قحط کے زمانہ میں اگر نرخ بقدر نصف جیتل کے بھی بڑھ جاتا تھا تو شحنۂ منڈی کو ۲۱ ضرب کوڑوں کی سزا دیجاتی تھی۔

(۸) آخری قاعدہ یہ مقرر کیا کہ قحط کے دوران میں کسی کو ضرورت سے ایک دانہ زیادہ نہ دیا جائے۔

(ب) دیگر ضروریات زندگی کا نرخ

ضروریات زندگی میں غلّہ کے بعد دوسری اشیاء کا نمبر ہے مثلاً کپڑا، شکر، روغن اور میوہ جات

---

[1]: گراں بیچنے کی نیت سے غلّہ خرید کر جمع کرنے والا شخص محتکر کہلاتا ہے۔ [2]: جنگ عالمگیر کے دوران میں علاء الدین کے اصولوں پر راشننگ سسٹم جاری کیا گیا لیکن حکومت نے اس ضابطہ پر صحیح طریقہ سے عمل نہیں کیا اس لئے انتظام ناقص رہا

[3]: مؤلف کے زمانہ میں جو راشننگ سسٹم جاری تھا

(باقی مضمون صفحہ ۳۸۷ پر)

وغیرہ۔ ان کی ارزانی کے لئے علاءالدین نے پانچ ضابطہ بنائے اور اُن کا سختی کے ساتھ نفاذ کیا۔ ان میں پہلا ضابطہ سرائے عدل کی تعیین کے بارے میں تھا۔ بدایوں دروازے کے اندر کوشک سبز کی طرف جو میدان خالی پڑا ہوا تھا اس کو سرائے عدل کے نام سے موسوم کیا اور حکم دیا کہ ہر قسم کا مال خواہ وہ سرکاری کارخانہ جات کا تیار شدہ ہو یا اس کو تاجر فروخت کرنے کے لئے باہر سے لائیں بجز سرائے عدل کے اور کہیں نہ اُتارا جائے اور نہ فروخت کیا جائے ورنہ بصورت دیگر بحق سرکار ضبط کرلیا جائیگا۔

(۲) اُن تمام اشیاء کا نرخ مقرر کردیا جو سرائے عدل میں صبح سے لیکر عشاء کے وقت تک خرید و فروخت کی جاتی تھیں۔

(۳) تمام ہندو و مسلمان نیز شہری و غیر شہری سوداگروں کو حکم دیا کہ وہ اپنا نام سرکاری دفتر میں درج کرائیں اور اپنے لائے ہوئے مال کی سرکاری افسر کو اطلاع دیں۔ اس کے بعد وہ سرکاری نرخ پر اپنے سامان کو فروخت کرنے کے مجاز ہیں اس طرح سرکاری کارخانہ جات کے تیار شدہ مال سے نیز غیر ولائتوں کے مال سے منڈی بھر گئی۔ اہالیاں شہر کی ضرورت سے زائد جو سامان بچ رہتا تھا وہ غالباً حکومت خرید کے جمع کرلیتی تھی یہی وجہ ہے کہ (علاءالدین کے بعد بھی) ایک عرصہ تک وہ سامان سرائے عدل میں جمع رہا اور فروخت نہیں ہو پایا۔

(۴) حکومت کی طرف سے ۲۰ لاکھ تنکہ کی رقم ملتانی سوداگروں کو جو کپڑے کے مشہور بیوپاری تھے تقسیم کی گئی اور انھیں حکم دیا گیا کہ باہر سے مال لاکر سرائے عدل میں فروخت کریں۔ اس ضابطہ کی وجہ سے جہاں تجارت کو ترقی ہوئی اُس کے ساتھ ہی ساتھ بازار میں سامان بھی بافراط آنے لگا۔

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۳۸۶ = اس میں اس قسم کا تعاون مفقود تھا جس کی نہ ہونے سے پبلک اور سوداگر دونوں تکلیف محسوس کرتے رہے۔

(۵) نفیس قسم کے ریشمی پارچہ جات کو ارزاں نرخ پر بیچنے کے لئے یہ حکم صادر فرمایا کہ ضرورت مند امراء و ملوک نیز اکابر و معارف سرکاری عہدہ دار سے پروانہ (پرمٹ) لیکر سامان خریدیں تاکہ سامان کی بازار میں کمی نہ ہونے پائے اور ہر ایک کی ضرورت بھی پوری ہو جائے۔

سرائے عدل کا انتظام ایسے افسران کے ہاتھ میں تھا جو بڑے دیانتدار اور درشت مزاج تھے جو نہ خود رشوت لیتے تھے اور نہ لینے دیتے تھے اور کسی کے ساتھ رُو رعایت کرنا تو جانتے ہی نہ تھے۔ یہی وجہ تھی کہ علاءالدین کا انتظام بہت کامیاب رہا اور ضروریات زندگی کا نرخ ہمیشہ ایک حال پر قائم رہا اور سامان کی بازار میں افراط رہی۔

(ج) گھوڑوں وغیرہ کا نرخ

حکومت کو فوج کے لئے گھوڑوں کی اشد ضرورت تھی ان کی فراہمی کے لئے بادشاہ نے چار ضابطے بنائے جن کی وجہ سے ایک ہی دو سال کے اندر گھوڑے اور دیگر چوپائے جانور اتنے ارزاں ملنے لگے کہ اتنے سستے نہ اس سے پہلے کبھی فروخت ہوئے تھے اور نہ بعد کو۔

(۱) ان قوانین میں پہلا قانون یہ نافذ کیا گیا کہ گھوڑوں کے اقسام و جنس کے لحاظ سے اُن کی قیمتیں[1] سرکاری طور پر مقرر کر دیں اور دلّالوں کو حکم دیا کہ وہ اعلیٰ، اوسط اور معمولی قسم کے گھوڑوں کو "عارضِ ممالک" اور اُس کے ماتحت افسروں کے بلا اجازت فروخت نہ ہونے دیں۔ ٹٹوؤں کی قسم ان کے علاوہ تھی جو دس سے لے کر ۲۵ ٹنکہ میں مل جاتے تھے۔

حاشیہ: اعلیٰ درجے کے گھوڑے ۱۰۰ سے لیکر ۱۲۰ ٹنکہ تک، اوسط درجے کے ۸۰ سے لیکر ۹۰ ٹنکہ تک اور تیسرے درجے کے گھوڑوں کے لئے ۶۵ ٹنکہ سے ۷۰ ٹنکہ تک قیمت مقرر تھی۔ علاءالدین کے حسن انتظام کی وجہ سے صرف شہر دہلی اور اس کے اطراف میں ۷۰ ستر ہزار فاضل گھوڑے ہر وقت تیار رہتے تھے

(باقی مضمون صفحہ ۳۸۹ پر)

(۲) گھوڑوں کی تجارت کرنے والے سوداگروں کو حکم دیا کہ وہ گھوڑوں کو بازار میں لاکر عام طور سے فروخت نہ کریں۔ اسی طرح مالدار لوگوں کو اس امر کی ممانعت تھی کہ وہ دلالوں کے ذریعہ سے بغیر سرکاری علم میں لائے ہوئے گھوڑوں کا بالا ہی بالا سودا نہ کرلیا کریں۔

(۳) احکامات کی خلاف ورزی کرنے والوں کو اور بالخصوص دلالوں کو جلاوطن کرکے دوسری ولایتوں کے قلعوں میں قید کردیا جاتا تھا۔ برنی نے دلالوں کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ طبقہ بڑا بے ایمان اور بے باک تھا اور ایک طرح سے بازار ان کے ہاتھ میں تھا۔ یہ بیچنے اور خریدنے والے دونوں سے رشوت لے کر سودا کرا دیتے تھے۔ علاء الدین نے ان کو راہ راست پر لانے کے لئے بڑی سخت اور عبرتناک سزائیں دیں۔

(۴) وہ ہر چالیسویں دن اور کبھی کبھی درمیان میں بھی دلالوں کے چودھری کو بلاکر گھوڑوں کی جنس اور قیمت کے بارے میں تفتیش کرتا رہتا تھا۔ اس ڈر کی وجہ سے دلال اپنی طرف سے نہ گھوڑوں کی قیمت مقرر کرسکتے تھے اور نہ انھیں اونے پونے گاہک کے سر منڈھ سکتے تھے۔

انھیں قوانین کا اطلاق دوسرے چوپایہ جانوروں پر بھی ہوتا تھا۔ وہ جانور جن کی قیمت کبھی تیس اور چالیس ٹنکہ فی راس تھی اب صرف ۴ اور زائد سے زائد پانچ ٹنکہ رہ گئی۔ دودھ دینے والی گائے کی قیمت ۳ ٹنکہ اور بھینس کی دس سے بارہ ٹنکہ تک تھی اور موٹی تازی بکری بازار میں دس سے بارہ اور چودہ جیتل تک میں مل جاتی تھی۔ کنیزک و غلام کی قیمت ۵ سے ۱۰۰ ٹنکہ تک تھی۔ اس طرح بادشاہ کے بنائے ہوئے ضوابط کا اطلاق ضروریات زندگی کی ہر بڑی سے بڑی اور چھوٹی سے چھوٹی چیز پر ہوتا تھا چنانچہ

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۳۸۸ ۔ (تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو برنی ص ۳۱۳ اور ایڈمنسٹریشن آف دہلی سلطنت باب ہشتم)۔

کسی کی مجال نہیں تھی کہ کلاہ سے لیکر موزہ تک اور کنگھی سے لیکر سوئی تک نیز حلیم سے لیکر شوربہ تک اور برفی سے لیکر ریوڑی تک، اسی طرح کاک وبریاں سے لیکر خمیری روٹی اور مچھلی تک اور پھول سے لیکر ہری گھاس تک نیز پان چھالی وغیرہ کوئی بھی چیز مقررہ نرخ سے زیادہ میں فروخت کر سکے۔ تینوں قسم کے بازاروں میں جاسوسوں کا اس قدر ڈر غالب رہتا تھا کہ سوداگر ہر وقت بید کی طرح کانپتے رہتے تھے اور اور برنی کے الفاظ میں بازاری قوم جو کہ "بے شرم وبیباک وتعمیہ گر ورند وسفیہ و سوزندہ وکذاب وزہ دیدہ بودند" راہِ راست پر آگئے اور اُن کے اندر جو برائیاں تھیں مثلاً جھوٹ بولنا، کم تولنا اور آمیزش کرنا ان سب باتوں کا رواج اُٹھ گیا۔[1]

کامیابی کا راز ناظرین کی دلچسپی کے لئے یہ بات یہاں پر نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ علاء الدین کو اتنی بڑی شاندار کامیابی صرف چار باتوں کی وجہ سے حاصل ہوئی اولاً یہ کہ اس کو "دیوان ریاست" کہ جس سے بازار کا تعلق تھا ایسا ہوشیار، امین اور راست کار ملا کہ جس کی دیانت وامانت نیز خرید وفروخت کے معاملات میں وسیع تجربات کی وجہ سے بازاری قوم اُسے کسی قسم کا دھوکا نہیں دے سکی۔ یہ دیوان ریاست یعقوب ناظر تھا۔

دوسرے یہ کہ یعقوب ناظر نے ہر منڈی کے لئے جن افسران کا بطور شحنۂ منڈی انتخاب کیا تھا وہ بھی نہایت کوتہ دست اور بے لوث واقع ہوئے تھے وہ رشوت نہ خود کھاتے تھے اور نہ دوسرے کو کھانے دیتے تھے اس سے یہ فائدہ ہوا کہ مرکز میں اشیاء کے نرخ کی جو فہرست مرتب ہوئی تھی اسی کی نقلوں کے مطابق وہ افسران بازار میں اشیاء کے خرید وفروخت کی دیکھ بھال کرتے تھے اور خلاف ورزی کرنے والوں

---

[1] ۔ برنی ص ۳۱۶

کو سخت و عبرت ناک سزائیں دیتے تھے۔

کامیابی کا تیسرا سبب یعقوب ناظر کی سختی و درشتی ہے جو بد معاملگی کرنے والے تاجروں کے ساتھ ظہور میں آتی تھی۔ اس کے تشدد کی برنی گواہی دیتا ہے کہ "اتفاق پیران و جوانانِ شہر بود کہ مشددی مثل یعقوب ناظر در دیوانِ ریاست در ہیچ عصرے نبودہ است[1]"۔ اس کی سخت گیری کا یہ عالم تھا کہ کم تولنے والے کے جسم سے باٹ کی کمی کی مناسبت سے دونا گوشت کاٹ لیتا تھا۔ ہر بازار میں وہ روزانہ دس بیس چکر لگاتا تھا اور جس کسی کو کم تولتے دیکھ لیتا تھا اس کی وہیں پر بیدریغ کوڑوں سے خبر لیتا تھا۔ اس پر بھی وہ لوگ اگر کم تولنے سے باز نہیں آتے تھے تو ان کے ساتھ پھر اور قسم کا برتاؤ کیا جاتا تھا۔ مثلاً بعض بیوپاری ایسے بے حیا تھے جو بظاہر پورا پورا تولتے تھے لیکن انھوں نے اپنی تول کے باٹوں کا وزن کم کر رکھا تھا اور اس طرح وہ نادان خریداروں اور بچوں کو دھوکا دیکر ناجائز نفع کماتے تھے۔ ان کو گرفت میں لانے کے لئے سلطان یہ ترکیب کرتا تھا کہ اپنے کبوتر خانہ کے محافظ خوردسال غلاموں کو دس بیس دام دیکر بازار کو بھیجتا تھا۔ وہ ہدایت کے مطابق روٹی، حلوا، ریوڑی، خربوزہ، ا لگکڑی وغیرہ مختلف چیزیں خرید کر بادشاہ کے سامنے پیش کرتے تھے۔ بادشاہ یعقوب ناظر کو بلوا کر اس کے سامنے ان چیزوں کا وزن کراتا تھا جس چیز کا وزن شاہی باٹوں سے کم ہوتا تھا اسی کو بیچنے والے کے پاس لے جاکر دوبارہ تلواتا تھا اور پھر باٹ وزن میں جتنا کم ہوتا تھا اس سے دوگنا گوشت بیچنے والے کے جسم سے فوراً کٹوا کر پھنکوا دیتا تھا۔ اس قسم کی سختی سے "بازار بکلی راست ایستاد و از کم وہی و تعمیہ و تلجیہ و سوختن مشتریانِ نادان و تعمیہ کردن باخوردگان دست برداشتند بلکہ در اشیاء و راستی سنگ چناں میدادند کہ مشتریاں را در وقت تفحص زیادت از نرخ میامد[2]"

چوتھی چیز جس نے بادشاہ کو کامیابی بخشی وہ اُس کی باخبری اور تفحُّص کی عادت ہے وہ ہر بازار کے اندر فروخت ہونے والی ہر شے کے اوپر نظر رکھتا تھا اور اُن کی جانچ پڑتال کرتا رہتا تھا۔ لوگ اُس کی باخبری پر حیرت کرتے تھے۔

۱۷ سرحدی قلعہ جات کی تعمیر

بہرحال اشیاء کے نرخ ارزاں کر دینے کے بعد علاء الدین کو فوج کی از سرِ نو تنظیم اور اضافہ کرنے میں کوئی دقت پیش نہ آئی چنانچہ اُس نے پائے تخت اور دیگر سرحدی مقامات میں بہت سے قلعے اور جنگی مورچے تعمیر کئے اور ۴ لاکھ ۷۵ ہزار سوار کی وہ جرار فوج مرتب کی جس نے مغلوں کو شکستیں دینے میں سپاہ بلبنی کی شہرت کو ماند کر دیا۔ اس نئی فوج نے دو ہی سال میں مغلوں کو ایسی شکستیں[۱] دیں کہ انھیں ایک مدت تک ہندوستان کا رخ کرنے کی جرات نہیں ہوئی اور کئی بار ان کی فوجیں کی فوجیں اس طرح معدوم ہوئیں کہ ان میں سے ایک شخص بھی زندہ پھر کر نہ گیا۔ وہی ہندوستانی فوجیں جو کبھی مغلوں کے مقابلہ میں صرف اپنی مدافعت کرنا ضروری سمجھتی تھیں علاء الدین کے حُسنِ انتظام[۲] کی وجہ سے اس قابل ہوگئیں کہ ہر سال موسم سرما میں خود پیشقدمی کر کے مغلوں کے مقبوضات پر جارحانہ کارروائیاں کرنے لگیں۔ چنانچہ ملک الغازی حاکم دیپالپور و ملتان نے مغلوں کے اوپر حملہ کرنا اپنا شعار بنا لیا تھا۔ مغلوں پر ہندوستانی فوج کا اس درجہ ہراس

۱؎ :۔ جتنے منظم حملے مغلوں نے علاء الدین کے زمانہ میں کئے اتنے وسیع پیمانہ پر انھوں نے کبھی ہندوستان پر فوج کشی نہیں کی۔ اگر علاء الدین فوجوں کو از سرِ نو ترتیب نہ دیتا تو نہ معلوم یہاں کی رعایا کو جو بالعموم ہندوؤں پر مشتمل تھی وحشی مغلوں کے ہاتھوں کتنی تکلیفیں اُٹھانا پڑتیں۔

۲؎ :۔ علاء الدین کے حُسنِ انتظام کی وجہ سے ایک معمولی سوار ۱۹½ ٹنکہ ماہانہ میں اپنے نیز اپنے اہل و عیال اور گھوڑے اور ہتھیاروں کے مصارف بخوبی پورے کر لیتا تھا۔ اسی طرح فوج کو مضبوط کرنے کے لئے اُس نے گھوڑوں کو داغنے کا طریقہ ایجاد کیا تاکہ سوار اُسے وقت پر دھوکہ نہ دے سکیں۔

طاری ہو گیا تھا کہ وہ پھر ہندوستان کی سرحد سے متصل اپنی سرحدات کی دیکھ بھال کے لئے بھی نہیں آتے تھے۔

سلطان اور قاضی مغیث الدین کی گفتگو[1]

ایک مرتبہ سلطان علاء الدین نے قاضی مغیث الدین سے جو بیانہ کے قاضی تھے بعض مسائل پر گفتگو کی چونکہ اس سے بادشاہ کے جاری کردہ قوانین کے جواز و عدم جواز نیز دوسری اہم باتوں پر روشنی پڑتی ہے اس لئے اس کو مختصراً تحریر کیا جاتا ہے۔ یہ گفتگو اُس موقع پر ہوئی جبکہ وہ اپنی زندگی کے تیسرے اور آخری دور سے گذر رہا تھا اور اُس کی مطلق العنانی شباب پر تھی۔

علاء الدین اُمّیِ محض ایک ٹھیٹ سپاہی زادہ تھا اس کی علماء کے ساتھ نشست و برخاست غالباً کبھی نہیں رہی۔ جب وہ بادشاہت کے مرتبہ پر پہونچا تو وہ اپنی عدم واقفیت کی وجہ سے اُمور سلطنت کی انجام دہی میں مشروع و نامشروع کے مابین تمیز نہیں کر پاتا تھا۔ علماء میں صرف قاضی مغیث الدین بیانوی، مولانا ظہیر لنگ اور مولانا مشید کہرامی اس کے پاس آتے جاتے تھے۔ ایک مرتبہ اُس نے قاضی مغیث الدین سے تین چار باتیں (شرعی نقطۂ نگاہ معلوم کرنے کی غرض سے) دریافت کیں۔ ان میں پہلی بات یہ تھی کہ خراج گذار کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ قاضی صاحب نے جواب دیا کہ خراج ذمی کے اوپر واجب الادا ہے وہ اس کو اس طرح ادا کرے کہ جس طرح نذرانہ پیش کیا جاتا ہے اس میں دینے والے کا ہاتھ نیچے اور لینے والے کا ہاتھ اوپر ہوتا ہے۔ اس سے مقصود یہ ہے کہ خراج گذار اپنے عجز و انکسار اور مطیع و فرمانبردار ہونے کا اقرار کرے۔ اس پر علاء الدین ہنسنے لگا اُس نے کہا کہ شرع کی رو سے تو خراج گذار کو اتنا مطیع و فرمانبردار ہونا چاہئے جتنا کہ آپ نے بتایا لیکن آج کیفیت یہ ہے کہ دیہات کے چودھری، خوط، مقدم وغیرہ اعلیٰ درجے کے

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ضیائے برنی ص ۲۸۹ تا ص ۲۹۶۔

گھوڑوں پر سوار ہوتے ہیں، نفیس و پاکیزہ لباس پہنتے ہیں اور بہترین اسلحہ جات سے مسلح ہو کر آپس میں ایک دوسرے سے جنگ کرتے ہیں، شکار کھیلتے ہیں اور خراج، جزیہ و چرائی و کری محصولات کا ایک پیسہ بھی اپنے پاس سے ادا نہیں کرتے بلکہ الٹا اور اپنے حقوق گانوں والوں سے وصول کرتے ہیں۔ مجلسیں منعقد کرتے ہیں اور شرابیں پیتے ہیں۔ ان میں سے بعض تو اتنے سرکش ہیں کہ وہ بلانے سے بھی (حساب فہمی کے لئے) دیوان ریاست کے پاس نہیں آتے۔ میں اس صورت کو کیونکر برداشت کر سکتا تھا اسلئے میں نے (شرع سے ناواقف ہونے کے باوجود) انتظاماً ان کو قوانین کے ذریعہ مطیع و فرمانبردار بنانے کی کوشش کی ہے[1] اور عمال حکومت کو ہدایات دے رکھی ہیں کہ وہ ان کے پاس ان کی ضرورت کے بقدر مال و اسباب رہنے دیں تاکہ وہ سال بسال اچھی طرح سے اپنا گذارہ کر سکیں۔

دوسری بات قاضی صاحب سے یہ دریافت کی کہ وہ کارکن جو رشوت لیتے ہیں یا قلم کے زور سے[2] سرکاری مال چراتے ہیں یا غبن کرتے ہیں کیا ایسا کرنے کی انھیں ازروے شریعت اجازت ہے؟ قاضی صاحب نے جواب دیا کہ شرع تو ان باتوں کی اس صورت

ع[1]:۔ علاء الدین کی اس تقریر سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ اُس نے زمینداروں اور چودھری و مقدم وغیرہ کو کیوں ایک عام کسان کے برابر کرنے کی کوشش کی دوسرے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ اُس نے اِس طبقہ کو اتنا کنگال و محتاج نہیں کر دیا تھا جتنا کہ عام طور سے خیال کیا جاتا ہے تیسرے اُس کی تقریر کا ماحصل یہ معلوم ہوتا ہے کہ جہانتک ایک ذمی کو مطیع و فرمانبردار بنانے کا تعلق ہے اُسے شرعی نقطۂ نظر سے اختلاف نہیں لیکن یہ دوسری بات ہے کہ اُس نے عدم واقفیت کی وجہ سے جو قوانین جاری کئے وہ شرعی اصولوں سے کچھ ہٹے ہوئے ہوں اور اِس کوتاہی کا وہ معترف ہے۔

ع[2]:۔ مثلاً سرکاری مال حساب میں جتنا جمع ہونا چاہئے اُس سے کم کا اندراج کر کے فاضل رقم یا مال کو ہضم کر لینا۔

میں بھی اجازت نہیں دیتی جبکہ اُن کی تنخواہیں ان کے گذارہ کے لئے ناکافی ہوں۔ البتہ جو شخص بیت المال سے کچھ چرائے اُس کا ہاتھ نہیں کاٹا جائیگا بلکہ اس سے نرم دوسری سزائیں حاکمِ وقت دے سکتا ہے۔ اس پر سلطان نے کہا کہ میں نے "دیوان ریاست" کے حکام کو ہدایات دے رکھی ہیں کہ کارکنوں، متصرفوں اور عاملوں کے نام جانچ پڑتال کے بعد جو رقوم نکلیں اُن کی وصولیابی کے لئے اُن پر سختیاں کریں اور مختلف قسم کی سزائیں دیں مثلاً بیدوں کی سزا دیکر یا قید و بند کی سزائیں دیکر اُن سے بقیہ رقوم کو وصول کریں لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ میں نے ان کی تنخواہیں بھی اُن کے گذارے کے بقدر کردی ہیں تاکہ وہ لوگ چوری و غبن وغیرہ سے باز آجائیں۔ چنانچہ رشوت خواری کی عادت انھوں نے قریب قریب ترک کردی ہے۔

تیسری اور چوتھی بات جو سلطان نے دریافت کی اس کی زد چونکہ خود اس پر پڑتی تھی اسلئے اَلْحَقُّ مُرٌّ کے مصداق اس کا جواب نہایت تلخ تھا پھر بھی قاضی صاحب موصوف بادشاہ کی سطوت و شوکت کا لحاظ کئے بغیر راست گوئی پر قائم رہے۔ بادشاہ نے پوچھا کہ جو مال غنیمت مجھے دیوگیر کے حملہ میں ہاتھ لگا ہے اُس کا مالک میں ہوں یا وہ بیت المال کی ملکیت ہے؟ قاضی صاحب نے جواب دیا کہ ہر وہ مال جو لشکرِ اسلام کی قوت سے حاصل کیا جائے بیت المال میں جمع ہونا چاہئیے بادشاہ اُس کا تنہا مالک نہیں ہوسکتا اس پر بادشاہ نے خفگی کا اظہار کیا لیکن قاضی صاحب کی حق گوئی کی وجہ سے جو صحیح بات تھی وہ سلطان پر واضح ہوگئی۔

چوتھا مسئلہ یہ تھا کہ بادشاہ اور اُس کے اہل و عیال کا بیت المال میں کتنا حق ہے۔ قاضی صاحب نے جواب دیا کہ خداوند عالم اگر خلفاء راشدین کی اتباع کرکے اُخروی درجات کی سربلندی چاہتے ہیں تو صرف ۲۳۴ ٹنکہ سالانہ جو ایک عام سپاہی کی تنخواہ ہے بیت المال سے برآمد کرسکتے ہیں اور اگر میانہ روی کو کام میں لائیں تو گذارے کیلئے اتنی

تنخواہ کافی ہوگی جتنی اُمرائے سلطنت کو ملتی ہے اور اگر علمائے دُنیا (یعنی مصلحت پرست علماء) کی روایت پر عمل کیا جائے تو اِس تنخواہ میں اتنا اور اضافہ کر لیجئے کہ آپ کی حیثیت اُمراء سلطنت سے ممتاز ہو جائے اِن تینوں صورتوں کے علاوہ جو لاکھوں، کروڑوں کی رقم حرم پر خرچ کی جاتی ہے اُس کی قیامت کے دن جوابدہی کرنا ہوگی۔ اس پر سلطان بڑا چین بجبیں ہوا اور اسی غصہ کے عالم میں قاضی صاحب سے مخاطب ہو کر کہا کہ کیا یہ تمام سزائیں بھی نامشروع ہیں جو میں شراب خواروں، شراب بیچنے والوں، شراب کشید کرنے والوں، زنا کرنے[1] والوں اور بغاوت[2] کرنے والوں کو دیتا ہوں قاضی صاحب نے جواب دیا کہ ہاں یہ سزائیں بھی نامشروع ہیں۔ بادشاہ یہ سُن کر طیش میں بھرا ہوا محل سرائے کے اندر چلا گیا اور قاضی صاحب ڈرتے ہوئے اپنے گھر چلے آئے۔ دوسرے دن جب وہ اپنے گھر والوں سے رخصت ہو کر سر سے کفن باندھے ہوئے دربار میں حاضر ہوئے تو انھیں یقین تھا کہ بادشاہ جاہل ہے انھیں ضرور سزائے موت کا حکم دیگا لیکن اُن کے اندازہ کے بخلاف سلطان نے انھیں اُن کی حق گوئی پر داد دی اور خلعت فاخرہ کے علاوہ ایک ہزار تنکہ انعام میں دئے اس کے بعد مخاطب کر کے اپنی صفائی پیش کی کہ

"اے مولانائے مغیث اگرچہ میں زیور علم سے بے بہرہ ہوں لیکن مسلمان ہوں اور مسلمان گھر میں پیدا ہوا ہوں۔ (میرا منشاء یہ ہرگز نہیں کہ خلافِ شرع سزائیں دوں) ملک کی مفاد کی خاطر تقاضائے وقت کی مناسبت سے جو موزوں سزائیں میرے ذہن میں آتی ہیں ان کے نافذ ہونیکا حکم دیتا ہوں (دل کا حال اللہ جاننے والا ہے)۔ مجھے نہیں معلوم کہ کل قیامت کے دن مجھ سے کس قسم کی بازپرس کی جائیگی۔[3] پھر بھی اے مولانائے مغیث اپنے خدا کو حاضر و ناظر سمجھ کر ..... زانیوں، شراب خواروں، چوروں اور غبن کرنیوالوں کیساتھ جو معاملت کرتا ہوں اور ان کو جو سزائیں دیتا ہوں ان کے اندر شریعت کی روح کارفرما ہوتی ہے (گو سزائیں بظاہر شریعت کے خلاف معلوم ہوتی ہوں) برنی کے الفاظ یہ ہیں" ور باب ایں چہار طائفہ آنچہ حکم پیغامبر است

(نفٹ نوٹ صفحہ ۳۹۸ پر)

(حاشیہ: ...شریعت کے ... بہ...)

نرخنامہ علائی

جنس	مقدار	قیمت
گیہوں	فی من	۷½ جیتل
جو	"	۴ "
دھان	"	۵ "
ماش	"	۵ "
چنا	"	۵ "
موٹھ	"	۳ "
نمک دید	"	۵ "
نمک دیگر	۲ سیر	یک جیتل
روغن ستور (گھی)	۱½ "	۱ "
روغن کنجد (تل کا تیل)	۳ سیر	" "
نبات (مصری)	یک سیر	۲½ "
شکر تری	"	۱½ "
شکر سرخ (گڑ)	" "	½ "

جنس		قیمت
خز (ریشم) دہلی	فی تھان	۱۶ ٹنکہ
خز کوتلہ	"	۶ ٹنکہ
مشروع شعری (اونی کپڑا) اعلیٰ قسم کا		۳ ٹنکہ
برد مہین یا دوال لعل		۶ جیتل
برد کمینہ (معمولی)		۳½ "
استر لعل ناگوری		۲۴ "
استر معمولی		۱۲ "
چادر		۱۰ جیتل
شیریں بافت مہین		۵ ٹنکہ
اوسط درجہ		۳ ٹنکہ
" " معمولی "		۲ "

جنس	قیمت
سلاہتی عمدہ قسم	۶ ٹنکہ
" درمیانی قسم	۴ "
" معمولی "	۲ "
کرپاس (سوتی کپڑا) باریک	۲۰ گز یک ٹنکہ
" معمولی "	۴۰ "

جنس	قیمت
دودھ دینے والی گائے	۳ یا ۴ ٹنکہ
" " بھینس	۱۰ تا ۱۲ ٹنکہ
اسپ اعلیٰ درجہ کا	۱۰۰ تا ۱۲۰ "
" اوسط "	۸۰ تا ۹۰ "
" معمولی "	۶۵ تا ۷۰ "
ٹٹو	۱۰ تا ۲۵ "
غلام و کنیزک	۵ - ۱۰۰ "
بکری فربہ	۱۰ - ۱۲ جیتل

اسی طرح اور چیزوں کا نرخ سمجھئے۔

نوٹ:- ایک جیتل قیمت میں آجکل کے ایک پیسہ سے کچھ ہی زیادہ ہوتا تھا اور ایک ٹنکہ کی قیمت روپیہ سے کچھ زیادہ ہوتی تھی۔ من کی تول ۲¼ پاؤ فی پونڈ کے حساب سے ۲۸ء۵ پونڈ یا ۳۷ سیر۔ فرشتہ کے بیان کے مطابق سیر کا وزن ۲۴ تولہ ہوتا تھا۔ جیتل کا وزن البتہ مشتبہ ہے بعض کہتے ہیں کہ ایک تولہ کا ہوتا تھا اور بعض ۱¼ تولہ کا بتاتے ہیں۔ عہد علائی میں جو خیر و برکت اور ارزانی تھی اس کا اندازہ کرنے کے لئے فٹ نوٹ ۶۳ ملاحظہ ہو جو مسالک الابصار فی ممالک الامصار کے قابل انگریزی ترجمہ نگاروں نے درج کیا ہے۔

سلطان علاء الدین خلجی کے کارنامے

علاء الدین خلجی کے عہد حکومت کو تین حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے پہلا دور وہ ہے جبکہ حکومت کی باگ ڈور علاء الدین کے اُن مشیرانِ کار و مصاحبینِ سلطنت کے ہاتھوں میں تھی جنھوں نے حقیقتاً علاء الدین کو دہلی کی سلطنت کا مالک بنایا تھا مثلاً اُلغ خاں، نصرت خاں، ظفر خاں، الپ خاں، ملک علاء الملک، فخر الدین جونا داد بک، ملک اصغر مہر دوا تدار، ملک تاج الدین وغیرہ۔ یہ سب جلال الدین کے قتل کے مشورہ میں شریک تھے اسلئے سب ایک دوسرے کے راز دار تھے اور علائی حکومت کو اپنی حکومت سمجھتے تھے۔ اس دور میں (یعنی تین چار سال کے اندر) حکومت کی بنیادیں مضبوط ہو گئیں اور آئندہ جو حوادثات رونما ہوئے وہ اس کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکے۔

دوسرا دور پہلے سے بھی زیادہ شاندار ہے اِس دور میں علاء الدین کو اُمور سلطنت میں مشورہ دینے والے ملک حمید الدین نائب وکیلدر، ملک اعز الدین دبیر ممالک، ملک اشرف قائینی نائب وزیر، خواجہ حاجی نائب عرضِ ممالک، عین الملک ملتانی دبیر الغخانی وغیرہ اُمرا تھے جن کی اصابت رائے مسلمہ تھی جن کی وجہ سے اس دور میں حکومت کے کام جس خوبی کے ساتھ انصرام پائے اُس کی

(فٹ نوٹ صفحہ ۳۹۶ ملاحظہ ہو) ۱؎ :- زانیوں کو حکومت خصی کرا دیتی تھی حالانکہ انھیں حد مارنے یا سنگسار کرنے کا از روئے شریعت حکم ہے۔ ۲؎ :- باغیوں کے اہل و عیال کو بھی حکومت عبرتناک سزائیں دیتی تھی حالانکہ وہ بے قصور ہوتے تھے۔ ۳؎ :- جو حضرات علاء الدین کی خود مختاری و مطلق العنانی پر خوش ہو کر یہ کہتے ہیں کہ وہ احکام شریعت کی پابندی سے آزاد تھا وہ اس کے اس اعتراف عجز پر غور فرمائیں حقیقتاً وہ مذہب سے اتنا بے تعلق ہرگز نہ تھا جتنا کہ ڈاکٹر ایشور ٹوپ اور ان جیسے دیگر مورخین بتاتے ہیں کہ "اس کا دماغ اسلامی تعلیمات سے یکسر خالی تھا"۔ (ملاحظہ ہو پالیٹکس اِن پری مغل ٹائمس صفحہ ۱۸۴ از ڈاکٹر ایشوری ٹوپ)

۴؎ :- تاریخ فیروز شاہی صفحہ ۲۹۶، ۲۹۵ از ضیائے برنی۔

مثال زمانہ پیش کرنے سے قاصر ہے۔ برنی کے الفاظ یہ ہیں کہ "مثل آں در قرنہا دعصر ہا نشاں نداده اند"۔[۱]

تیسرا دور جس کی مدت صرف چار پانچ سال ہے علاء الدین کے لئے بیکاری و بی فکری کا زمانہ ہے اس دور میں ملک کافور نائب سلطنت تھا اور عمدۃ الملک کا عہدہ بہاء الدین دبیر کے سپرد تھا جو برنی کے الفاظ میں "دیوان ابلہی بود" یعنی بیوقوت تھا۔ اسی طرح قضائے ممالک آخری عہد حکومت میں یہی لوگ تھے جن کی نااہلیت کی وجہ سے امور سلطنت میں خلل واقع ہوا۔ اور عرض ممالک کے علاوہ دیوان رسالت، دیوان وزارت اور دیوان انشاء وغیرہ کی رونق جاتی رہی۔ بادشاہ ضدی وخود سر ہوگیا اُس نے دورِ دُوم کے ملوک واُمرا کو یا توقتل کرا دیا یا معزول کر کے گوشہ نشینی پر مجبور کر دیا۔ اس دور میں بھی بعض پُرانے اُمرا مثلاً ملک قیران امیر شکار اور ملک قیرا بیگ معزز ومحترم تھے لیکن ان کو حکومت کے کاموں میں دخل نہ تھا۔ یہ لوگ بادشاہ کے صرف ندیم ہو کر رہ گئے تھے۔

ان تینوں دوروں پر جب ہم سرسری نظر ڈالتے ہیں تو اُس کے عہد حکومت میں ہم کو بعض ایسی خصوصیات نظر آتی ہیں (جن کو برنی نے عجائبات روزگار میں شمار کیا ہے) جن میں اُسے اوّلیت کا شرف حاصل ہے مثلاً (۱) اشیاء کی ارزانی (۲) ہندوستان کا پہلی مرتبہ ایک مرکز سے وابستہ ہونا اور فتوحات دکن (۳) مغلوں کا کلی استیصال (۴) لاؤ لشکر کی فراوانی وکثرت اور اُس کی استقامت (۵) رعایا کی اطاعت وفرمانبرداری اور مقدمان چودھریاں وغیرہ کی سرکوبی (۶) مملکت کے چہار اطراف کے راستوں کی حفاظت کا کام رہزنوں اور ڈاکوؤں سے لینا اور پھر اُن راستوں پر انتہائی امن وامان کا قائم رہنا۔ (۷) بازاریوں کو بس میں کر کے کہ جن کا بس میں کرنا خود ایک امر عظیم ہے۔ سرکاری نرخ کو ہمیشہ ایک حال پر قائم رکھنا (۸) فن تعمیر کو ترقی دینا (۹) آخری دس سالوں میں

---

[۱] برنی ص ۳۳۷۔

ملک کے اندر ہندوؤں اور مسلمانوں کا پرہیز گاری، راست گفتاری اور انصاف و دیانت کی طرف میلان (۱۰۰) بادشاہ کے بلاارادہ و اہتمام ہر قوم و ملت کے بزرگوں، ہر علم کے اُستادوں نیز ہر فن کے ماہروں کا اجتماع جنھوں نے دارالملک دہلی کو رشکِ بغداد، غیرتِ مصر، ہمسرِ قسطنطنیہ اور موازیٔ بیت المقدس بنا دیا۔

علاءالدین حقیقتاً عجیب و غریب صفات کا مالک تھا اس کی ذات میں اتنی خوبیاں جمع تھیں جو ایک شخص میں بہت کم پائی جاتی ہیں۔ وہ بہادر اور منچلا سپاہی، سخت اور مستقل مزاج حاکم، ہوشیار اور معاملہ فہم مدبر تھا۔ اُس نے تخت نشین ہونے سے پہلے ہی اپنے آپ کو ایک بہادر سپاہی اور فاتح سپہ سالار کی حیثیت سے ممتاز کر لیا تھا۔ اُس کا دیوگیر پر حملہ اس کی بہادرانہ قوتوں کا عملی مظاہرہ تھا۔ یہ حملہ ایک بڑا کارنامہ ہے جس نے اُس کے ذرائع کو مستحکم اور اُمیدوں کو حوصلہ افزا بنا دیا۔ اِس کا دورِ حکومت صرف بیس سال کا تھا مگر اس قلیل عرصہ میں اُس نے منگولوں کو شکست دی، راجپوتوں پر فتح یابی حاصل کی اور تمام دکن کو اپنی مملکت میں شامل کر لیا۔ اتنے وسیع پیمانہ پر مہاراجہ اشوک کے بعد اور اورنگ زیبؒ سے پہلے کسی بادشاہ نے ہندوستان میں اتنی فتوحات حاصل نہیں کیں اسلئے وہ اپنے آپ کو سکندرِ ثانی کہنے میں حق بجانب تھا۔

وہ محض ایک فاتح ہی نہیں تھا بلکہ نظامِ حکومت کو از سرِ نو ترتیب دینے اور اس کو مستحکم بنانے میں بھی انتہائی انہماک اور دلچسپی کا اظہار کیا اس لئے وہ اُن چند ممتاز سپاہیوں میں سے ہے جو کہ مدبرانہ خصوصیات رکھتے تھے۔ اُس پر تنقید کی جاتی ہے کہ اُس نے حکومت کو حد درجہ مرکزی بنا دیا تھا مگر ایک بادشاہ جو ہر وقت غیر معتمد درباریوں اور فتنہ پرور سرداروں سے گھرا رہتا ہو اس کے سوا اور کیا کر سکتا تھا۔ بہرحال اُس کی حکومت کتنی ہی خود مختارانہ کیوں نہ ہو اُس نے اپنے مشیروں سے صلاح و مشورہ لینے کا کوئی موقع فروگذاشت نہیں کیا اور سلطنت کے تمام بڑے بڑے اور اہم امور اُن کے

مشورے سے انجام دے۔

علاء الدین سیاست کے میدان میں حقیقت پسند تھا اور وہ حقیقتوں کا اُن کی اصلی حالت میں مقابلہ کرنے پر یقین رکھتا تھا اور اس کو ہر پہلو سے سلسلہ وار جانچتا تھا قبل اس کے کہ اس پر عمل کرے۔ اُس نے کوئی بھی کام عجلت اور بے ڈھنگے پن سے نہیں کیا۔ اور کوئی چیز تقدیر کے بھروسہ پر نہیں چھوڑی۔ وہ ہر تجویز کو بہت فکر و تامل کے بعد جاری کرتا تھا مگر جب وہ ایک دفعہ جاری ہو گئی تو پھر اُس کی تکمیل میں کسی رکاوٹ کی پرواہ نہیں کرتا تھا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ ادھورے کام خطرناک ہوتے ہیں اسکی اصلاحوں کی سب سے قابلِ تعریف بات یہ تھی کہ اُس نے عوام کو خوش کر دیا اور سرمایہ داروں اور اعلیٰ طبقہ کے لوگوں کے ظلم کو کم کر دیا۔ برنی اس کے آخری دورِ حکومت کے بارے میں لکھتا ہے کہ "اُس نے ملک کی بہتری کے لئے تمام منشّی اور ممنوع چیزوں کو اور فسق و فجور کے اسباب کو قہر و غلبہ، تعزیر و تشدّد، قید و بند سے روک دیا اور مال جو دنیا اور ملکی فساد کا ذریعہ ...... ہے سلطان علاء الدین نے ہر بہانہ سے کہ جو اس کو ملتا مالداروں اور حکّام سے سختی سے لے لیتا اور بازار والوں کو کہ جو دُنیا کی تمام قوموں میں سب سے زیادہ جھوٹ بولنے والی اور سب سے زیادہ فریب دینے والی قوم ہے، سچائی اختیار کرنے اور سچائی کے ساتھ مال بیچنے اور سچ بولنے کے لئے خون خرابہ میں رکھتا تھا"[۱]

اُس کے بعد لوگوں کے دینی شغف اور پاکبازی کے میلانات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "عہد علائی کے آخری چند سالوں میں شراب، معشوق، فسق و فجور، جوا، فحاشی وغیرہ کا نام اکثر آدمیوں کی زبان پر کبھی نہیں آنے پایا۔ بڑے بڑے گناہ لوگوں کے نزدیک کفر کے مشابہ معلوم ہونے لگے۔ مسلمان ایک دوسرے کی شرم سے سود خواری، ذخیرہ اندوزی کے کھلم کھلا مرتکب نہیں ہو سکتے تھے، بازار والوں سے جھوٹ بولنے

---

[۱] برنی ص ۳۴۲-۴۳

کم تولنے اور آمیزش وغیرہ کرنے کا رواج اٹھ گیا تھا[1]"

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ دشمنوں، باغیوں اور غداروں کو سزائیں سخت دیتا تھا[2] اور بعض اوقات اس کی سزائیں حدود شرعیہ سے تجاوز کر جاتی تھیں لیکن یہ سب کچھ کارروائیاں ملک کے مفاد کی خاطر تھیں جن کو وہ نہایت نیک نیتی کے ساتھ انجام دیتا تھا اس میں احکام شریعت کی اہانت ہرگز مقصود نہیں تھی[3] چنانچہ ایک مرتبہ جب قاضی مغیث الدین نے اس کو بتایا کہ بعض قوانین کے نفاذ میں شریعت کے اصولوں کو مدنظر نہیں رکھا گیا ہے تو وہ سخت متعجب ہوا اور اپنی لاعلمی وجہالت کا اقرار

ح ۱ :- برنی ص ۳۴۶ -

ح ۲ :- غدار جلالی امراء نیز راجہ رن تھمبور کے بیوفا سرداروں کے ساتھ اس نے جو سلوک کیا اس کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ اس نے نو مسلم مغل باغیوں کو بھی بڑی سخت سزائیں دیں۔ چونکہ یہ لوگ اس زمانہ میں نہایت غیر متمدن، ناشائستہ اور جاہل ہوتے تھے لیکن پھر بھی بڑے بڑے عہدوں کی تمنا کرتے تھے جو انھیں نہیں مل سکتے تھے یہی ان کی ناراضی وشورش کا اکثر سبب ہوتا تھا۔ علاء الدین نے ان کی شرارت سے زچ ہوکر نوکریوں سے الگ کر دیا تو انھوں نے مایوس ہوکر بادشاہ کے قتل کی سازشیں کیں جس کا اسے علم ہوگیا چنانچہ اس نے سزاءً یہ حکم دیا کہ نو مسلم مغل جہاں ملیں قتل کر دئے جائیں اور نہ صرف ان کا اثاثۃ البیت بلکہ بیوی و بچے تک قاتل کو دیدئے جائیں چنانچہ بیس تیس ہزار مغل قتل کر دئے گئے (برنی ص ۲۳۶)۔

ح ۳ :- مورخین نے علاء الدین کی تعریف کی ہے کہ اس نے امور سلطنت کو دنیوی امور سمجھ کر مذہبی قوانین کی پابندی سے آزاد کر دیا۔ اس قسم کے بیانات ہم کو دھوکہ میں ڈال سکتے ہیں جبکہ وہ ایک اسلامی حکومت کے بارے میں استعمال کئے جائیں کہ جہاں کا سلطان خواہ کتنا ہی طاقتور کیوں نہ ہو محدود طاقتیں رکھتا ہے کیونکہ وہ قانون ساز نہیں ہوسکتا اور شریعت کے قوانین کو جاری کرنے پر مجبور رہے ہے۔ عملی طور پر اگرچہ بعض خودسر حکمرانوں نے ان قوانین کو چھوڑ دیا لیکن وہ تمام نظام سے منکر ہونیکی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔

کرنے کے بعد قاضی صاحب کو اُن کی دلیری اور حق بجانب تنقید پر انعام واکرام دیا۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ ایک جاہل آدمی کی طرح مذہبی اصولوں کی پابندی کرنے میں بہت کٹر تھا اور اس کو اپنے زمانہ کے بزرگان دین سے عقیدت وارادت تھی۔ خزینۃ الاصفیاء میں ہے "جلال الدین و علاء الدین بادشاہان دہلی ہم حلقہ ارادت آنحضرت (شیخ بوعلی قلندرؒ) بگردنِ خود داشتند"۔[۱] "حضرت خواجہ نظام الدینؒ اولیاؒ کا وہ بیحد معتقد تھا اپنے دربار کے امراء محمدؒ کاشف حاجب اور ملک قیرابیگ کو جو حضرت شیخ کے مرید تھے بارہا تحائف وہدایا دیکر شیخ موصوف کی خدمت میں بھیجا۔ ان کو ہدایت دے رکھی تھی کہ محبوب الٰہیؒ کو محفل سماع میں جس شعر پر وجد آئے وہ اس کو آکر سُنایا کریں چنانچہ ایک بار محبوب الٰہیؒ کو حکیم سنائی کے ان دو شعروں پر وجد طاری ہوا ؎

بیش منما جمالِ جاں افروز	در نمودی برو سپند بسوز
آں جمالِ تو چیست ہستیٔ تو	واں سپندِ تو چیست مستیٔ تو

قیرابیگ ان اشعار کو لکھ کر سلطان علاء الدین خلجی کے پاس پہونچا۔ سلطان اشعار کو بار بار پڑھتا، آنکھوں سے لگاتا اور تعریف کرتا تھا۔ قیرابیگ نے سلطان کی یہ عقیدت دیکھ کر کہا کہ اس حُسنِ اعتقاد کے باوجود آپ نے اب تک شیخ سے ملاقات نہیں کی جو تعجب کا باعث ہے اس پر سلطان نے جواب دیا "اے قیرابیگ ترک ما پادشاہیم از سرتا پا آلودۂ دنیا، و بدیں آلودگی شرم می دارم کہ آنچناں پاکے را بہ بنیم"، لیکن اسی وقت اپنے جگر گوشوں خضر خاں و شادی خاں کو محبوب الٰہیؒ کے دامنِ ارادت سے وابستہ ہونے کے لئے دو لاکھ ٹنکے کے ساتھ بھیجا۔ چنانچہ دونوں مرید ہوکر محبوب الٰہیؒ کی صحبت سے

ع۱:۔ خزینۃ الاصفیاء جلد اوّل ص ۳۲۷ ۔ ع۲:۔ حضرت محبوب الٰہی کے فیوض وبرکات کا بڑے والہانہ انداز میں برنی نے ذکر کیا ہے۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو تاریخ فیروز شاہی از برنی ص ۳۴۱ تا ص ۳۴۶ ۔

مستفیض ہوتے رہے اور خضر خاں ہی نے خانقاہ اور مقبرہ و مسجد کی عمارت بنوائی تھی[1]
علاء الدین مذہبی علوم سے ناواقف تھا اس کو صرف الحمد، قل ہو اللہ، التحیات اور
دونوں درود شریفیں یاد تھیں اسلئے اس سے ہم ایک مذہبی آدمی کی طرح دینی شغف
کی توقع نہیں رکھ سکتے[2]۔ تاہم یہ بات فراموش کرنے کے قابل نہیں ہے کہ اُس کے
آخری عہد حکومت میں بزرگان دین کی تعلیمات سے ایک دینی ماحول پیدا ہو گیا تھا
اور خاص و عام، غریب و دولتمند، بادشاہ و فقیر، عالم و جاہل، شریف و رذیل، شہری
و دیہاتی، غازی و مجاہد اور آزاد و غلام سب کے سب مذہبی میلانات رکھتے تھے
اور برنی کے بقول "سنن و فرائض کے علاوہ کثرت نوافل اور اس کی پابندی کا معاملہ
اس بابرکت زمانہ میں اس حد تک پہونچ گیا تھا کہ خاص بادشاہ کے محل میں بہت
سے اُمراء، سلاحدار، لشکری و شاہی نوکر (جو اکثر و بیشتر حضرت محبوب الٰہیؒ کے مرید ہوتے تھے)

---

[1] ماخوذ از مونس الارواح و مرات الاسرار بحوالہ رسالہ معارف ص ۲۰۵ بابتہ اکتوبر ۱۹۲۷ء۔

[2] مولانا شمس الدین ترک محدث جو حنبلی یا غالباً شافعی المذہب تھے مصر سے احادیث شریف کی کچھ کتابیں لیکر
ہندوستان آئے اور ملتان میں آکر مقیم ہو گئے اور پھر وہیں سے واپس چلے گئے دہلی تک نہیں پہونچ پائے
انھوں نے علاء الدین کے حسن انتظام پر یہ کہکر مبارکباد دی کہ "اے بادشاہ مبارکت باد کہ بدیں چہار
عمل درمیان انبیاء جائے تست" لیکن بعض دینی کوتاہیوں پر اُسے متنبہ بھی کیا ہے اس سے معلوم
ہوتا ہے کہ اس کے اندر کچھ تساہل پیدا ہو گیا تھا۔ اس سلسلہ میں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ علاء الدین
بجائے اس کے کہ اُن تنبیہات پر ناراضی کا اظہار کرتا اُسے افسوس ہوا کہ وہ محدث موصوف کی زیارت
نہ کر سکا۔ اور یہی نہیں بلکہ اُسنے سعد منطقی سے جو اپنے زمانہ کا مشہور عالم و فلسفر تھا جب یہ معلوم ہوا
کہ محدث موصوف نے بادشاہ کی رہنمائی کے لئے ایک کتاب جس میں منتخب احادیث درج تھیں اور
ایک رسالہ بہاء الدین دبیر ممالک کے توسط سے بھیجا ہے لیکن رسالہ اسکی خدمت میں پیش نہیں کیا گیا
(اس رسالہ میں غالباً قاضی ملتان حمید اور محکمہ قضا کی بدعنوانیوں کا ذکر تھا چونکہ اس کا اثر بہاء الدین

(باقی مضمون صفحہ ۴۰۵)

چاشت اور اشراق کی نمازیں ادا کرتے تھے اور ایام بیض عشرۂ ذی الحجہ کے روزے رکھتے تھے" ایسے ماحول میں رہکر علاء الدین کیونکر طاعت وعبادات کے فرائض سے غافل رہ سکتا تھا۔

اُس نے اپنی رعایا کے مذہبی معاملات میں کبھی مداخلت نہیں کی اور نہ انھیں اپنے دین ومذہب سے پھرنے اور زبردستی مسلمان بنانے کی کوشش کی البتہ بام (وام) مارگیوں اور شاکت مت کے پیروؤں کے شرم انگیز اعمال وافعال کا ضرور تدارک کیا کیونکہ وہ بد اخلاقی وبیحیائی کا سخت دشمن تھا جو ان لوگوں کے مذہبی مراسم کا ایک لازمی جز تھے۔ ان لوگوں کو لامذہب، بودھ اور اباحتی[1] کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ ضیائے برنی نے ان کے افعال ناستودہ کا تفصیلی تذکرہ نہیں کیا ہے لیکن فرشتہ نے ان کے اعمال ناشائستہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "بسمع سلطان رسید کہ جمعے ازمردم اباحتیاں در دہلی جمع گشتہ اند ودر سالے یکشب چنانکہ داب ایشاں است مجمعے ساختہ بازن وخواہر ومادر وجمیع محارم فراہم می آیند، سلطان ..... آرہ سیاست برفرق ایشاں کشیدہ اثرے ازاں جماعت نگذاشت"[2]

سلطان علاء الدین خلجی نے عوام الناس کی اخلاقی گراوٹ کو دور کرنے کی جو انتھک کوششیں کی ہیں وہ ہر لحاظ سے مستحسن ہیں۔ خزائن الفتوح کے مطالعہ سے سلطان کی بعض اصلاحات کا پتہ لگتا ہے۔ "اس نے خون پینے والے جادوگروں (سحرۂ خون آشام)

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۴۰۴:- پر بھی پڑتا تھا اسلئے بہاء الدین نے یہ رسالہ سلطان کی خدمت میں پیش نہیں کیا اور اُسے چھپا لیا) تو وہ بہاء الدین سے بہت ناراض ہوا اور اُس کو اور اُس کے لڑکے کو برخاست کر دیا۔ (برنی صفحہ ۲۹۶) علاء الدین کو لادین سمجھنے والے اس روایت پر غور کریں (مؤلف)

[1]:- ملاحظہ ہو منسلکہ ضمیمہ [2]

[2]:- فرشتہ صفحہ ۱۲۰۔

کو بالکل ختم کر دیا۔ اس گروہ کے سب لوگوں کو گردن تک زمین میں گڑوا کر سنگسار کرا دیا"۔

"اصحاب اباحت کو نیست و نابود کرا کر دم لیا"۔ "طوائفوں کے نکاح جبراً کرا دئے"۔[ع ۱]

شراب کی لعنت کو ملک سے دور کرنے میں اس نے جو کچھ جدوجہد کی اس کا تذکرہ کیا

جا چکا ہے۔ برنی نے لکھا ہے کہ شراب کے امتناعی احکامات کی وجہ سے سلطان کو بہت

بڑا مالی نقصان برداشت کرنا پڑا یعنی "خراجہائے بے اندازہ ایشاں از دفاتر دور کردند"[ع ۲]

لیکن چونکہ یہ احکامات درستیٔ اخلاق اور استحکام سلطنت کے لئے ضروری تھے اس لئے

اس نے مالی نقصان کی قطعی پرواہ نہ کر کے احکامات کے نفاذ میں سختی سے کام لیا۔

علاءالدین کے عدل و انصاف کا جہاں تک تعلق ہے یہ طے شدہ امر ہے کہ وہ حکومت

کے باغیوں، خائنوں، فسادیوں اور اخلاق و شرافت کا خون کرنے والوں کو خواہ وہ

ہندو ہوں یا مسلمان نہایت سخت سزائیں دیتا تھا۔ برنی کی بعض عبارات کے مفہوم کو

صحیح طور پر نہ سمجھنے کی وجہ سے کچھ تاریخ نویسوں نے اس پر الزام لگایا ہے کہ وہ ہندوؤں

کے لئے سخت تھا لیکن عصر حاضر کے نامور محققین کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ یہ الزام سراسر غلط

اور بے بنیاد ہے۔ مورلینڈ نے اپنی مشہور فاضلانہ تصنیف[ع ۳] میں نہایت عالمانہ طریقہ پر

اس موضوع پر بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ برنی نے اپنی تاریخ فیروز شاہی میں جہاں لفظ

"ہندو" استعمال کیا ہے اس سے مراد خوطہ، چودھری، مقدم اور وہ دیگر طبقے ہیں جو

ملک کے اقتصادی نظام میں بڑے طاقتور ہو گئے تھے اور جن کی وجہ سے عام ہندو

رعایا دبی ہوئی تھی۔ اسلئے ان طبقوں کا کُستا جانا سیاسی حالات کے مطابق تھا۔ پروفیسر

ع ۱:۔ خزائن الفتوح مطبوعہ صہ ۱۸ تا صہ ۲۱

ع ۲:۔ تاریخ فیروز شاہی صہ ۲۸۴

ع ۳ Agrarian System during the Muslim Rule in India.

محمد حبیب صاحب نے بھی اپنے ایک فاضلانہ مقالہ[1] میں بتایا ہے کہ "یہ عام خیال کہ علاءالدین نے ہندوؤں کو گھوڑے پر چڑھنے اور عمدہ کپڑے پہننے کی ممانعت کردی تھی برنی کے مفہوم کو غلط سمجھنے سے پیدا ہوا ہے"۔ اسی طرح دولت کی فراوانی کو روکنے کے لئے جو ملک میں متواتر بغاوتوں کا سبب بنی ہوئی تھی اس نے ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے صاحبِ ثروت طبقوں کو دبایا اور ان سے دولت حاصل کرلی تو اس کا یہ اقدام بلا امتیاز مذہب وملت صرف سیاسی مصالح کی بناء پر تھا جس کو غلط طور سے مذہبی رنگ دیدیا گیا۔[2] ڈاکٹر ترپاٹھی نے صحیح لکھا ہے کہ "حصول دولت کے سلسلہ میں جب اس نے مسلمان امراء سے رعایت نہیں برتی تو پھر ہندو امراء کو کیوں چھوڑ دیتا"[3]

مختصر یہ کہ علاءالدین کا عہدِ حکومت مجموعی طور پر نہایت خیروبرکت کا زمانہ تھا۔ اس کے حسنِ انتظام کی وجہ سے راستے محفوظ، شہر آباد اور عوام خوش حال تھے، زراعت وتجارت، صنعت وحرفت اور فنِ عمارت کو اس نے خوب ترقی دی اس کے یہاں ستر ہزار کاریگر، معمار، بیلدار، گل کار وغیرہ باقاعدہ ملازم تھے وہ عالیشان عمارت کو دو تین دن میں اور قلعہ کو دو ہفتہ میں تیار کرا لیتا تھا۔ اگرچہ وہ خود پڑھا لکھا نہ تھا لیکن علماء وشعراء کی قدر کرتا تھا۔ حضرت امیر خسروؒ اس کے درباری شاعر تھے اور علاوہ انعام واکرام کے ایک ہزار روپیہ سالانہ تنخواہ پاتے تھے۔ اسی کے زیر سرپرستی حضرت امیر نے نظامی گنجوی کی پنج گنج یا خمسۂ نظامی کا جواب لکھا۔ اور پورا خمسہ[4] سلطان علاءالدین کے نام سے معنون کیا۔

---

[1]:- An Introduction to the Study of Medieval India (Aligarh Magazine).

[2]:- Politics in Pre-Mughal Times by Dr. I. Topa

[3]:- Some Aspects of Muslim Adm. by Dr. Tripathy

[4] مزید تفصیلات کیلئے ملاحظہ ہو "سلطان علاءالدین خلجی کے مذہبی رجحانات" مولفہ خلیق احمد صاحب نظامی

(باقی مضمون صفحہ ۴۰۸ پر)

اسی طرح خزائن الفتوح" میں سلطان کی فتوحات کا ذکر کیا ہے جو تاریخی اعتبار سے بڑی اہم و مستند تصنیف ہے۔ ہمعصر مورخ برنی نے عہد علائی کے علماء و مشائخ، قراء، ندماء، شعراء، مورخین، اطباء، وغیرہ کا جو بلا اہتمام دار السلطنت دہلی میں جمع ہو گئے تھے،[۲] صفحات کے اندر نہایت تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے ہم اسے بخوفِ طوالت نظر انداز کر کے عہد علائی کو ختم کرتے ہیں۔

فصل دوم۔ خلجیوں کا زوال

شخصی حکومت کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اگر تختِ حکومت پر کوئی قابل اور منتظم حکمراں نہیں رہتا تو یہ فوراً پارہ پارہ ہو جاتی ہے۔ علاء الدین کے مرنے کے بعد اس جیسا کوئی حکمراں اس کا قائم مقام نہ بن سکا اس لئے ہر طرف بدنظمی شروع ہو گئی۔ علاء الدین نے جن درباری امیروں اور فوجی سرداروں کو اپنے حسنِ انتظام سے دبا رکھا تھا وہ پھر اپنے پرانے ڈھنگ پر آجانے کی کوشش کرنے لگے۔ ہندو راجہ و زمیندار جن پر لگان بڑھا دیا گیا تھا اور حسابات کی گہری جانچ ہوتے رہنے سے سخت نقصان اٹھا رہے تھے وہ سب

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۴۰۷: ۱۔ امیر خسرو کے خمسہ میں "مطلع الانوار" نظامی کے مخزن الاسرار کا جواب ہے ۶۹۸ھ میں دو ہفتہ کے اندر تمام ہوئی۔ اس میں ۳۳۱۰ اشعار ہیں۔ تصوف کے مضامین ہیں۔ "شیریں خسرو" رجب ۶۹۸ھ میں تمام ہوئی ۴۱۲۴ شعر ہیں۔ "آئینہ سکندری" نظامی کے سکندر نامہ کا جواب ہے سال اختتام ۶۹۹ھ۔ اشعار کی تعداد ۴۴۵۰ ہے۔ "لیلیٰ مجنوں" میں ۲۶۶۰ شعر ہیں ۶۹۸ھ میں ختم ہوئی۔ "ہشت بہشت" سلسلۂ پنج گنج کی سب سے آخری مثنوی ہے نظامی کے "ہفت پیکر" کا جواب ہے۔ ۷۰۱ھ میں تمام ہوئی اس کے اندر ۳۳۸۲ شعر ہیں۔ خمسۂ نظامی میں ۲۸ ہزار اور خسرو کے پنج گنج میں ۱۸ ہزار شعر ہیں۔

۲: تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو تاریخ فیروز شاہی از برنی ص ۳۴۱ تا ص ۳۶۷

سلطنت کے زوال کے متمنی تھے۔ سلطنت کے اعلیٰ افسروں سے لیکر گانوں کے ادنےٰ پٹواریوں اور مقدموں تک کو بادشاہ کے مرنے کی بڑی خوشی ہوئی کیونکہ بادشاہ کی سخت گیر پالیسی نے اُن کی رشوت ستانی کے دروازوں کو بند کر رکھا تھا۔ سوداگر بھی اپنے من مانے منافع کی محرومی سے نجات پا گئے۔ علاءالدین کے بیٹوں میں کوئی بھی اس قابل نہ تھا جو عظیم الشان سلطنت کے بار کو برداشت کر سکے۔ اس صورت میں سلطنت کی بربادی صرف وقت کی منتظر تھی اور وہ وقت بھی بہت جلد آ گیا۔

(۳) سلطان شہاب الدین عمر بن علاءالدین خلجی

علاءالدین کے مرنے سے کچھ پیشتر اُس کے چہیتے غلام ملک کافور نے ایک دستاویز لکھا کر اُس پر سلطان کی مہر لگوائی تھی۔ اِس دستاویز کے بموجب خضر خاں کو ولیعہدی سے معزول اور شہاب الدین عمر کو اپنا جانشین مقرر کیا تھا۔ کافور کو وزارت عظمیٰ کا عہدہ پہلے ہی سے حاصل تھا اُس نے تمام درباری اُمراء کو جمع کر کے سلطان کا وصیت نامہ دکھایا اور پانچ چھ سالہ شہزادے شہاب الدین عمر کو تخت پر بٹھا کر سب سے اُس کی بیعت کرائی اور خود اُمور سلطنت کو انجام دینے لگا۔

اُس نے پہلا کام یہ کیا کہ ملک سنبل کو گوالیار بھیج کر خضر خاں کو اندھا کرا دیا اور اپنے حجام کے ذریعہ شادی خاں کی آنکھیں نکلوا لیں جو کوشک سیری میں نظر بند تھا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ ملکۂ جہاں یعنی خضر خاں کی والدہ کا تمام مال و اسباب، زر و جواہر اور نقد و جنس ضبط کر کے اس کو بھی نظر بند کر دیا۔ اور پھر اِس فکر میں ہوا کہ کسی طرح شہزادہ مبارک خاں کو (جو بعد کو سلطان قطب الدین مبارک شاہ کے نام سے مشہور ہوا) بھی اندھا کرا دے۔ اِس کام کے لئے اُس نے دو آدمی مامور کئے لیکن اُن کو شہزادہ پر رحم آ گیا۔ مبارک خاں نے ان کو بہت کچھ انعام و اکرام دیکر اُلٹا انھیں ملک کافور کے قتل پر مامور کر دیا۔ اگلے دن انھوں نے دوسرے سپاہیوں کو سازش میں شریک

کر کے کافور کو جبکہ وہ اپنے رازدار خواجہ سراؤں کے ساتھ چوسر کھیلنے میں مصروف تھا قتل کر ڈالا۔ اس طرح ۳۵ دن کی مدار المہامی کے بعد کافور کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ کافور کے بعد اُمراء نے مبارک خاں کو سلطان شہاب الدین عمر کا مدار المہام بنایا۔ اُس نے دو ماہ تک اپنے خورد سال بھائی کی وزارت و نیابت کا کام انجام دیا۔ اس اثناء میں امراء کو اپنا طرفدار بنا کر خود تاجِ شاہی اپنے سر پر رکھا، اور نابالغ بادشاہ کو گوالیار بھیجکر قید کر دیا اور پھر بعد کو آنکھوں میں سلائی پھروا دی۔

خاندانِ علائی پر یہ جو پے در پے مصیبتیں نازل ہوئیں اُس کا سبب کسی نے شیخ بشیر دیوانہ سے پوچھا جو اپنے عہد کے ایک صاحبِ کشف و کرامت بزرگ تھے انھوں نے جواب دیا کہ جو جیسا کرے گا وہ اُس کے اور اُس کی اولاد کے سامنے آئیگا۔ علاء الدین نے جلال الدین اور اُس کی اولاد کے ساتھ کیا کیا یہ اُسی کا پھل ہے۔ حکومت و دولت چلتی پھرتی چھاؤں ہے، ملک خدا کا ملک ہے اِس کا کوئی بھی مالک نہیں اسلئے جہانداری اسی کو مسلّم ہے۔

خدائے راست بزرگی و ملک بے انباز
بدیگراں کہ تو بینی بعاریت داد است

کلید فتح اقالیم در خزائنِ اوست
کسے بقوتِ بازوئے خویش نکشاد است

(۴) سلطان قطب الدین[1] مبارک شاہ خلجی

۱۶ اپریل ۱۳۱۶ء (۷۱۶ھ) تا ۸ جولائی ۱۳۲۰ء (۷۲۰ھ)

تخت نشین[2] ہونے کے بعد سلطان نے اپنے اُستاد مولانا ضیاء الدین کو صدرِ جہاں بنایا اور قاضی خاں

[1]:- برنی نے سلطان قطب الدین کو خضر خاں کا ہم سن بتایا ہے جو ناقابلِ فہم ہے کیونکہ علاء الدین نے شہزادہ خضر خاں کو جب ۱۳۰۳ء میں چتور کا گورنر اور اپنا ولیعہد نامزد کیا تو وہ جوان العمر تھا اُس وقت قطب الدین کی عمر حساب سے ۱۱ یا ۱۲ سال کی ہونا چاہیے کیونکہ تخت نشینی کے وقت ۱۳۱۶ء میں اُس کی عمر ۱۷ اٹھارہ سال سے زیادہ نہیں تھی (ملاحظہ ہو تاریخ فیروز شاہی ص ۳۷۲، ص ۳۷۷ از برنی)

(باقی مضمون صفحہ ۴۱۱ پر)

کا خطاب دیا۔ ملک دینار شحنۂ پیل کو ظفر خاں اور محمد مولانا نیاء کو شیر خاں کا خطاب بخشا اسی طرح ملک قیرا بیگ نیز دیگر اُمراء کو مختلف عہدوں پر سرفراز کیا لیکن سب سے زیادہ اختصاص "حسن" نامی ایک نومسلم برد اری بچہ سے برتا جو ایک نہایت خوبرو، خوبصورت کمسن غلام تھا اور جس کو ملک شادی نے پرورش کیا تھا اس کو عہدۂ وزارت عطا کیا اور خسرو خاں کا خطاب دیا۔

شروع شروع میں ہر دلعزیز بننے کے لئے اس نے کچھ عمدہ کام کئے۔ اپنے نہایت خورد سال تین چھوٹے بھائیوں فرید خاں، منگو خاں، اور عمر خاں کی اچھی طرح پرورش کی۔ لوگوں کو انعام واکرام سے مالا مال کر دیا۔ ضبط شدہ جاگیریں اور معافیاں لوگوں کو واپس کر دیں، جلاوطنوں کو واپس بلا لیا، اٹھارہ ہزار قیدیوں کو جو دہلی اور اُس کے نواح میں مقید تھے قید سے رہائی بخشی اور پھر ایک عام فرمان کے ذریعہ تخت نشینی کی خوشی میں ملک کے تمام قیدیوں کو رہا کر دیا اور علاء الدین کے قوانین کو جن سے ملک میں امن وامان قائم تھا نرم کر دیا۔

گجرات کی بغاوت علاء الدین کی وفات کے بعد دو تین ماہ جو بدنظمی رہی اُس کا اثر یہ ظاہر ہوا کہ الپ خاں کے قتل سے اُس کی فوجیوں کی بغاوت زور پکڑ گئی اُس کے دبانے کے لئے کمال الدین گرگ کو بھیجا گیا تھا مگر وہ مارڈالا گیا اس پر گجرات کی مہم عین الملک ملتانی کے سپرد ہوئی عین الملک نے گجرات جاکر بغاوت کو فرو کر دیا۔ اور حکومت کے انتظام کو ازسرنو بحال کیا۔ بادشاہ نے اس اثناء میں ظفر خاں کی لڑکی سے شادی کر لی تھی چنانچہ اپنے خسر ظفر خاں کو گجرات کا

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۱۳ ؎ برنی نے بادشاہ کا سنہ جلوس ۷۱۶ھ قرار دیا ہے لیکن امیر خسرو نے مثنوی "نہ سپہر" میں ۷۱۶ھ تحریر کیا ہے جو یقیناً مرجح ہے ؎

سنِ شانزدہ بعد ہفصد شدہ   کہ سلطاں بتخت زبرجد شدہ

صوبیدار بنا کر روانہ کیا۔ یہ نہایت عقلمند اور تجربہ کار امیر تھا اس نے وہاں جا کر تین چار ماہ کے اندر ایسا اچھا انتظام قائم کیا کہ لوگ الپ خاں کے عہد گورنری کو بھول گئے۔

دکن کی بغاوت

دوسرے سال بادشاہ نے دکن کی طرف توجہ کی جہاں ہرپال دیو نے دیوگری میں فتنہ و فساد مچا رکھا تھا۔ دہلی سے روانہ ہونے سے قبل بادشاہ نے ایک غلام کو جس کا نام شاہین تھا وفادار الملک کا خطاب دے کر اپنا نائب مقرر کیا اور پھر منزل بمنزل کوچ کرتا ہوا دیوگیری پہونچا جہاں اُس نے ہرپال دیو اور اُس کے معاونین کو گرفتار کر کے قلعۂ دیوگیر کے سامنے قتل کرایا اور عبرت کے لئے ہرپال دیو کی کھال میں بھس بھروا کر دروازے پر لٹکوایا۔ ۱۳۱۸ء کا موسم برسات یہیں گذارا اور اپنی یادگار میں قلعہ کے اندر ایک عالیشان مسجد تعمیر کرائی۔ دیوگیر سے واپس ہونے سے قبل اپنے منظور نظر غلام خسرو خاں کو بادشاہ نے دکن کا وائسرائے بنایا اور اس کا وزیر ملک یک لکھی کو مقرر کیا۔ بعدہٗ خسرو خاں کو خیمہ و خرگاہ اور بہترین ساز و سامان دیکر مدورا کی طرف روانہ کیا۔ اور خود دہلی چلا آیا۔

قتل کی سازش

دہلی کو واپس ہوتے وقت راستہ میں کٹھی ساگون کے مقام پر بادشاہ کے چچازاد بھائی اسد الدین نے اس کو قتل کرنے کی سازش کی لیکن راز افشا ہو گیا اور سلطان نے انتقاماً نہ صرف اسد الدین اور اُس کے معاونین کو بلکہ اپنے سوتیلے دادا یغرش خاں کی نسل کے کل افراد کو جو تعداد میں ۲۹ تھے اپنے ایک سردار "شادی کتہ" کو دہلی بھیج کر بیخبری کے عالم میں قتل کرا دیا۔ اتنوں کو قتل کرانے کے بعد بھی سلطان کے انتقام کی آگ سرد نہ ہوئی اُس نے گوالیار میں خضر خاں، شادی خاں اور شہاب الدین عمر کو بھی قتل کرا دیا کہ جو مجبوری و بیکسی کے عالم میں اپنی زندگی کے دن گذار رہے تھے۔[۱] دہلی پہونچ کر دیولدیوی کو جو خضر خاں کے نکاح میں تھی گوالیار سے بلوا کر اپنی بیوی بنا لیا۔ بادشاہ نے دہلی میں بھی بعض

(فٹ نوٹ صفحہ ۴۱۳ پر ملاحظہ ہو)

اُمراء کو جن پر بغاوت کا شبہ ہو سکتا تھا قتل کرا دیا انھیں میں شاہین بھی تھا جو رشتہ میں بادشاہ کا خُسر ہوتا تھا۔ اسی طرح اپنے دوسرے خُسر ظفر خاں کو بیجرم و بے خطا گجرات سے بلوا کر تہ تیغ کرا دیا۔

بادشاہ کی بے راہ روی دہلی پہونچ کر بادشاہ عیش و عشرت میں پڑ گیا اور سلطنت کے کاموں سے بالکل بے پرواہ ہو گیا۔ رات دن نشے میں چور رہتا، زنانی پوشاک پہن کر امیروں کے گھر جاتا، اور اُن کے سامنے ناچتا، جن عیبوں کو آدمی چھپاتا ہے وہ انھیں خوب ظاہر کرنے کی کوشش کرتا، آبرو باختہ کسبیوں و طوائفوں کو بلوا کر دربار میں اُمراء عالیجاہ کے برابر بٹھاتا اور کبھی کبھی مادر زاد ننگا ہو کر باہر نکل آتا، دربار میں عین الملک ملتانی اور قرابیگ جیسے جلیل القدر اُمراء کا بھانڈ اور زنانے مذاق اُڑاتے سلطان کو لہو ولعب میں پھنسائے رکھنے کے لئے خسرو خاں کے بھائی حسام الدین[۱] حاکم گجرات نے "توبہ" نامی ایک مسخرے کو بھیجا ضیاء برنی اس مسخرہ کے بابتہ لکھتا ہے کہ "وہ دربار میں ملوک و اُمراء کو ماں بہن کی گالیاں دیتا، ننگا ہو کر نمائش کرتا، اُمراء کے کپڑوں پر پیشاب کر دیتا اور گوز رہا کرتا[۲]" دربار کا یہ رنگ ڈھنگ دیکھ کر اُمراء نے کنارہ کشی اختیار کرنا شروع کی اور سلطنت کے کاموں میں دلچسپی لینا ترک کر دی۔

بادشاہ نے خبطی ہونے کی وجہ سے یا اپنے عیبوں پر پردہ ڈالنے کے لئے خلیفۃ اللہ کا لقب اختیار کیا جس کی جرأت ابھی تک کسی بادشاہ کو نہیں ہو سکی تھی۔ اس کے علاوہ روزہ و نماز کو یکسر ترک کر دیا۔

خضر خاں اور شادی خاں جن کو سلطان نے قتل کرا دیا تھا چونکہ حضرت

ع[۱] :۔ فرشتہ صـ ۱۲۵ ع[۲] :۔ خسرو خاں و حسام الدین کی ماں ایک تھی اور باپ دو تھے ۔ ع[۳] :۔ برنی صـ ۳۹۶

محبوب الٰہیؒ کے خاص اور عزیز مریدوں میں تھے اسلئے قطب الدین ان سے بدگمان ہوگیا اور پھر اس کی یہ بدگمانی عداوت میں تبدیل ہوگئی۔ ان کا اثر کم کرنے کے لئے وہ مصلحتاً سہروردیہ سلسلہ کے ایک بزرگ شیخ ضیاء الدین رومی کا مرید ہوگیا تاکہ پبلک حضرت محبوب الٰہیؒ کو چھوڑکر بادشاہ کے پیر کی طرف رجوع ہو جائے۔ اس وقت سلطان الاولیاؒ کے لنگر خانہ کا خرچ دو ہزار ٹنکہ یومیہ تھا اور درویشوں اور مسکینوں کو دادودہش اِس خرچ کے علاوہ تھی سلطان کا خیال تھا کہ یہ تمام اخراجات اس کے اُمراء کے نذرانے کی رقم سے پورے ہوتے ہیں اِسلئے قطب الدین نے نہ صرف اُمراء کی آمدورفت روک دی بلکہ برسرِ دربار ان کو بُرے الفاظ میں یاد کیا۔ اِس کے باوجود چونکہ لنگر خانے کے اخراجات جیوں کے تیوں جاری رہے اس لئے اس کو حضرت محبوب الٰہیؒ سے اور بھی زیادہ پرخاش ہوگئی اور اُس نے محبوب الٰہیؒ اپنے دربار میں حاضر ہونے کا حکم دیا۔ آپ نے شاہی حکم کا یہ جواب دیا کہ "قاعدہ بزرگانِ مانبود کہ بدیوال روند و مصاحب پادشاہاں شوند، دریں باب معذور دارید وبحال خود بگذارید" لیکن مغرور بادشاہ نے اِس عذر کو قبول نہیں کیا اور حکم دیا کہ ہفتہ میں دوبار دربار آیا کریں۔ اس پر محبوب الٰہیؒ نے بادشاہ کے پیر شیخ ضیاء الدین رومی کے پاس پیام کہلا بھیجا کہ وہ اپنے مرید کو سمجھائیں کہ درویشوں کو رنج پہونچانا کسی مذہب میں روا نہیں مگر اِس پیام کے پہونچنے سے پہلے شیخ رومیؒ کا انتقال ہوگیا۔ ان کے تیجے کے فاتحہ کے سلسلہ میں جب سب اکابر، اُمراء و بادشاہ وغیرہ جمع ہوئے تو بادشاہ نے دیکھا کہ لوگ کس عزّت و عظمت کے ساتھ حضرت محبوب الٰہیؒ کو سر و آنکھوں پر بٹھا رہے ہیں اِس سے بادشاہ کا حسد اور بھی بڑھ گیا اور اُس نے حضرت محبوب الٰہیؒ کے سلام کا جواب تک نہ دیا اور مجلس ختم ہونے کے بعد ایک محضر کے ذریعہ ہر قمری مہینے کی پہلی تاریخ کو حضرت نظام الدین اولیاؒ کو دربار میں حاضر ہونے کا حکم

جاری کیا لیکن مشیت ایزدی کو کچھ اور منظور تھا اس لئے چاند کی پہلی تاریخ کبھی نہ آئی۔ کیونکہ جس روز قطب الدین دربار میں حضرت شیخ موصوفؒ کی آمد کا منتظر تھا اُسی روز محل کے اندر شورش ہوئی اور وہ اپنے چہیتے غلام خسرو خاں کے ہاتھ سے مارا گیا۔

انقلاب سلطنت کے سامان ظفر خاں کو قتل کر دینے کے بعد بادشاہ نے خسرو خاں کے بھائی حسام الدین کو گجرات کا صوبیدار مقرر کیا اُس نے اپنے گرد اپنے ہم قوم برداری ہندوؤں کو اکٹھا کر کے بڑے بڑے عہدے دیئے اور اُن کی مدد سے خود مختار ہونے کی تدبیریں کرنے لگا۔ اور غالباً مرتد بھی ہو گیا تھا اِس پر گجرات کے مسلمان اُمرائے سلطانی نے بر وقت متفق ہو کر اُس کو گرفتار کر لیا اور بادشاہ کے پاس دہلی بھیج دیا۔ اِن امرار کو توقع تھی کہ سلطان اُن کی وفاداری سے خوش ہوگا لیکن اُس نے خوش ہونے کے بجائے اُلٹا انھیں ذلیل کیا اور حسام الدین کو اپنی مصاحبت میں داخل کر کے اس کی عزت بڑھائی اِس سے اُمرار کے دلوں کے اندر خوف وہراس پیدا ہو گیا اور وہ بادشاہ سے نفرت کرنے لگے۔

گجرات کے انتظام کے لئے سلطان نے وحید الدین قریشی کو بھیجا جو "از نوادر وزراء و اعجوبۂ ملوک بود و باری تعالیٰ اُورا جامع اوصاف بزرگی آفریدہ بود"۔ ع[۱] اُس نے گجرات پہونچ کر امن و امان کو از سر نو بحال کیا لیکن دیوگیری کے اندر بغاوت کے شعلے بھڑکنے لگے اور ملک یک لکھی نے خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ لیکن شاہی فوجوں نے جلد ہی باغیوں پر قابو پا لیا اور یک لکھی اور اُس کے معاونین کو گرفتار کر کے دہلی بھیج دیا جہاں سلطان نے یک لکھی کے ساتھیوں کو قتل کرا دیا مگر اس کے ناک اور کان کاٹنے کے بعد معاف کر دیا اور پھر کچھ عرصہ کے بعد سامانہ کا گورنر بنا دیا۔

ع۱ - برنی صفحہ ۳۹۷ -

سیاسی اعتبار سے حسام الدین کی عزت افزائی اور ملک یک لکھی کو دوبارہ گورنر بنانا یہ دونوں کام غلط تھے لیکن ان دونوں سے زیادہ غلط بادشاہ کا وہ طرز عمل تھا جو اُس نے خسرو خاں کے ساتھ برتا۔ اُس نے جب خسرو خاں کو مدورا کی مہم پور وانہ کیا تو اُس نے معبر پہونچکر وہاں کے ملک التجار خواجہ تقی کو لوٹ کر دولت حاصل کی۔ خواجہ تقی معبر میں صرف اس لئے ٹھہرا رہا کہ ملک میں جو فوج داخل ہو رہی ہے وہ مسلمان ہے اسلئے اس کی عزت و آبرو اور جان و مال محفوظ رہے گا۔ لیکن خسرو خاں نے اس کی مطلق پرواہ نہ کی اور خود مختار بننے کے ارادے سے زیادہ سے زیادہ دولت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اسی طرح مدورا کی مہم سے واپس ہو کر میسور[1] و تلنگانہ[2] کے راجاؤں کو بلا کسی جرم و خطا کے محض اپنی قوت بڑھانے کی غرض سے لوٹ کھسوٹ لیا بعدہٗ اِس بات کے درپے ہوا کہ شاہی سرداروں کو جو اُس کے ہمراہ تھے قتل کر کے علم استقلال بلند کرے ان حالات کا علم چندیری کے عامل ملک تیمور اور ملک گل افغان اور ملک تلبغہ حاکم کرا کو ہوا جو خسرو خاں کو کمک دینے کے لئے مامور کئے گئے تھے انھوں نے خسرو خاں کے فاسد ارادوں کی بادشاہ کو خبر کی اور خسرو کو معبر اور ملیبار کی جانب سے دیوگری واپس آنے پر مجبور کر دیا جہاں ملک یک لکھی کے بعد عین الملک ملتانی وزارت کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ بادشاہ نے خسرو خاں کو دیوگری سے دہلی بلوایا۔ امراء نے اُسے بسرعت تمام ۸ دن کے اندر دیوگری سے دہلی پہونچا دیا۔ پیچھے ملک تیمور اور ملک تلبغہ بھی دہلی پہونچے خسرو خاں نے بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہو کر امراء کی شکائتیں کیں اور کہا کہ انھوں نے محض حسد اور رشک کی وجہ سے اُسے بغاوت کے جرم میں متہم کیا ہے چونکہ بادشاہ

---

[1]:۔ میسور کے راجہ سے ۲۰ ہاتھی اور بہت سا خزانہ وصول کیا اسی طرح۔

[2]:۔ تلنگانہ کے راجہ سے ۱۰۱ ہاتھی زبردستی وصول کئے۔

اُس کی محبت میں دیوانہ ہو رہا تھا اور مستی و شہوت نے اس کو اندھا کر رکھا تھا اس لئے اُس کی پُر فریب باتوں میں آگیا اور اپنے نمک حلال سرداروں کو جنھوں نے فتنہ کو سر اُٹھانے سے پہلے ہی دبا دیا تھا یہ صلہ دیا کہ ملک تیمور کو چندیری کی حکومت سے معزول کر کے چندیری کو خسرو خاں کی جاگیر میں دیدیا اور ملک تلبغہ کو قید خانہ میں ڈال دیا۔ اِس طرزِ عمل کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہی خواہ اُمراء نے بھی بادشاہ کو اُمورِ سلطنت سے آگاہ کرنا چھوڑ دیا۔ اور اپنی حفاظت کے لئے خسرو خاں اور اُس کے بھائی کی رضاجوئی کو مقدم سمجھنے لگے۔

خسرو خاں کو اب احساس ہوا کہ دکن یا گجرات سے بڑھ کر دہلی میں رہ کر سلطنتِ اسلامیہ کے برباد کر دینے کا موقع آسانی سے میسّر آسکتا ہے۔ چنانچہ ملک کافور کے محل میں جواب خسرو خاں کی ملکیت تھا رات کے وقت لوگ جمع ہوتے اور مشورے کرتے تھے۔ خسرو خاں نے جو بحیثیت وزیر اعظم کام کر رہا تھا بڑی احتیاط اور چالاکی کے ساتھ ان تمام لوگوں کو جو اُس کے حصولِ مقصد میں سدِ راہ نظر آتے تھے ایک ایک کر کے دہلی سے جُدا کر دیا۔ کسی کو قید اور کسی کو قتل کرایا اور کسی کو دور و دراز کے صوبوں میں بھیجدیا۔ پُرانے زمانہ کے اُن اُمیروں کو جن کو کسی نہ کسی وجہ سے بادشاہ سے عناد تھا دہلی میں بلا کر عہدے سپرد کئے۔ جن پر سلطان نے ظلم کئے تھے اُن پر انعام و احسان کی بارشیں کر کے اپنا ہمدرد اور بعض کو مثلاً ملک قیمار، ملک بہاء الدین دبیر اور یوسف صوفی کو اپنا راز دار بھی بنا لیا۔ اب اُسے صرف اپنی فوجی قوت کو مضبوط کرنا تھا۔ وہ دکن میں خود مختار ہونے کی کوشش کے وقت یہ اندازہ کر چکا تھا کہ جب تک اپنے ذاتی سپاہی نہ ہوں شاہی سپاہیوں پر اعتماد کرنا بیکار رہے۔ اس لئے اُس نے بادشاہ سے یہ کہہ کر اپنے ہم قوم گجراتی برواریوں کو فوج میں بھرتی کیا کہ "میں اپنے ہم قوم لشکر کی مدد سے ہر مہم کو اچھی طرح انجام دے سکوں گا چونکہ دوسرے اُمراء مجھ سے حسد رکھتے ہیں اسلئے اُن کی امدادی فوج پر میں بھروسہ نہیں کر سکتا" بادشاہ نے اجازت دیدی۔ اس طرح خسرو خاں نے اپنے

چہار ندھول اور جاہر دیو کو گجرات بھیج کر بیس ہزار گجراتیوں کو اپنی فوج میں بھرتی کیا اور اسی قدر نواح دہلی کے ہندوؤں کو اپنی جمعیت میں شامل کر کے چالیس ہزار کا لشکر نہایت خاموشی کے ساتھ مرتب کر لیا۔

بادشاہ کا قتل

بادشاہ کی پے در پے حماقتوں کی وجہ سے اُمراء بد دل ہو گئے اور اس کو اس کے حال پر چھوڑ کر خود الگ ہو گئے۔ ان اُمراء میں صرف قاضی ضیاء الدین ایسا شخص تھا جو سلطان کا سچا ہمدرد تھا اور اُس سے آزادانہ گفتگو کر سکتا تھا۔ کوشک سلطانی یعنی قصر ہزار ستوں کے دروازوں کی حفاظت بھی اُسی کے سپرد تھی۔ اُس نے اس موقع پر جبکہ بادشاہ سرساوہ سے شکار[1] کھیل کر واپس آیا ہوا تھا شہر کی عام افواہوں سے متاثر ہو کر سلطان کی خدمت میں عرض کیا کہ بروار ی (ہندو) فوج کی کثرت خطرہ سے خالی نہیں ہے میں نے سُنا ہے کہ ہندو روزانہ خسرو خاں کے مکان میں جمع ہو کر مشورے کرتے ہیں کہ بادشاہ کو قتل کر کے خسرو خاں کو بادشاہ بنایا جائے آپ کم از کم اتنا تو کریں کہ فوج کے بعض گجراتی ہندوؤں کو بلا کر ان سے اس معاملہ کی نسبت استفسار فرمائیں ممکن ہے کہ وہ رُعب سلطانی سے پوست کندہ حالات بیان کر دیں اور اگر کوئی فتنہ برپا ہونے والا ہے تو آپ اس سے اپنی حفاظت کر سکیں۔ اگر خسرو خاں بے گناہ ہو تو پھر سلطان کو موقع حاصل ہے کہ ازراہِ قدردانی اس کی عزت و مرتبہ میں اضافہ فرمائیں۔ ابھی قاضی خاں اپنی بات ختم نہیں کر پایا تھا کہ خسرو خاں بھی حاضر ہو گیا۔ سلطان نے

---

[1]:۔ خسرو خاں کے ساتھیوں کا ارادہ تھا کہ بادشاہ کو شکار کے دوران ہی میں ختم کر دیا جائے۔ لیکن اس کے مسلمان رفقاء نے منع کیا اور کہا کہ یہ کام ہم کو قصر سلطانی میں انجام دینا چاہیے تاکہ دھلی پر قبضہ رہے اگر یہاں قتل کیا گیا تو ممکن ہے کہ دھلی پر قبضہ کرنا دشوار ہو جائے اور مسلمان سردار ہمارے تخت سلطانی تک پہونچنے سے پہلے ہی مخالفت پر اُٹھ کھڑے ہوں۔

قاضی خاں کے سامنے ہی خسرو خاں کو مخاطب کر کے کہا کہ قاضی خاں تیری بابت ایسا ایسا کہہ رہا ہے۔ کیا یہ صحیح ہے یہ سُن کر خسرو خاں نے فوراً رونا شروع کر دیا اور رو رو کر کہنے لگا کہ یہ تمام مسلمان سردار میرے دشمن ہو گئے ہیں کیونکہ حضور نے مجھ کو سب سے بلند مرتبہ عطا کر دیا ہے۔ یہ ضرور مجھ کو حضور کے ہاتھ سے قتل کرا کر رہیں گے۔ بادشاہ نے اپنے محبوب غلام کو روتے ہوئے دیکھ کر سینہ سے لگا لیا اور اس کو ہر طرح سے تسلّی و تشفّی دی[1]۔

یہ عشاء کا وقت تھا جبکہ خسرو[2] خاں سلطان کی خدمت میں حاضر ہوا اس وقت قاضی خاں نیچے پہرہ بدلوانے کے لئے موجود تھا۔ قرارداد کے موافق خسرو خاں کا چچا رندھول معہ جاہریا (جاہر دیو) قاضی خاں کے پاس آیا اور پان کا بیڑہ پیش کیا۔ قاضی خاں بیڑا لے رہا تھا کہ جاہریا نے پھرتی سے قاضی خاں کے پہلو میں خنجر بھونک کر اُسے شہید کر دیا۔ مسلح برواریوں کی ایک جماعت نے فوراً داخل ہو کر پہرہ والوں کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ سلطان نے صحن میں جب شور و غوغا کی آواز سُنی تو خسرو خاں سے پوچھا کہ یہ کیسا شور ہے وہ فوراً اُٹھ کر لبِ بام آیا اور تھوڑی دیر تامل کر کے سلطان کے پاس واپس گیا اور کہا کہ سلطانی اصطبل کے چند گھوڑے کھل گئے ہیں وہ صحن میں بھاگے بھاگے پھر رہے ہیں اسی کا شور ہے۔ بادشاہ مطمئن ہو کر پھر باتوں میں مصروف ہو گیا کہ اتنے میں برواری لوگ بالاخانہ پر چڑھنے لگے۔ زینہ کے دروازہ پر ابراہیم و اسحٰق نامی دو پہرہ دار موجود تھے وہ سدِّ راہ ہوئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں مارے گئے اور قاتلوں کی یہ جماعت اوپر چڑھ آئی ابراہیم و اسحٰق کے مزاحم ہونے اور قتل ہونے کا شور چونکہ قریب ہی تھا

ع۱:- اِس موقع پر برنی کا طرزِ تحریر کچھ شاعرانہ و مبالغہ آمیز سا ہے (ملاحظہ ہو ص۴۱۲) لکھا ہے "او را در کنار گرفت و بوسہ چند بر لب اوزد و او را فرد گرفتہ و کرد آنچہ کرد"

ع۲:- اِس جگہ برنی کی تحریر کچھ مبہم سی ہے پتہ نہیں چلتا کہ بادشاہ قاضی خاں کی شکایت کے دن مارا گیا یا دوسرے دن۔ قرین قیاس یہ ہے کہ وہ دوسرے دن قتل کیا گیا۔

اسلئے سلطان کو کچھ شک پیدا ہوا اور وہ اٹھ کر محل سرا کی طرف بھاگنے لگا خسرو خاں نے یہ سمجھا کہ اگر سلطان محلسرا کے اندر داخل ہو گیا تو پھر اس پر قابو پانا مشکل ہو جائیگا چنانچہ اس نے پیچھے سے بھاگ کر سلطان کو پکڑ لیا۔ بادشاہ نے اس کو زمین پر ٹپک دیا اور اس سے اپنی زلفیں چھڑا کر بھاگ جانے کی کوشش کی لیکن خسرو خاں نے بال نہیں چھوڑے۔ اسی حالت میں جاہر دیو اور دوسرے قاتل پہونچ گئے۔ جاہر دیو نے خنجر بھونک کر بادشاہ کو ہلاک کر دیا پھر اس کا دھڑ سر سے جدا کر کے اوپر سے صحن میں پھینک دیا تاکہ اس کے سب ساتھی دیکھ لیں۔

بادشاہ کو قتل کرنے کے بعد رندھول، حسام الدین مرتد، جاہر یا بردار اور دوسرے لوگ محلسرائے سلطانی میں داخل ہوئے اور وہاں سلطان علاء الدین کی بیوی اور دوسری بیگناہ عورتوں کو قتل کر کے فرید خاں، منگو خاں اور عمر خاں پسران سلطان علاء الدین[۱] کو قتل کیا اور خاندان علائی کے کسی متنفس کو زندہ نہ چھوڑا اور پھر اسی وقت جبکہ آدھی رات ہو چکی تھی اس نے ملک عین الملک ملتانی، ملک وحید الدین قریشی، ملک فخر الدین جونا، ملک بہاء الدین دبیر، پسرانِ ملک قرابیگ نیز دیگر امراء واکابر کو بلا بھیجا۔ یہ سب حقیقتِ حال سے ناواقف تھے جب یہ سب امراء جمع ہو گئے تو ان سب کو گرفتار و نظر بند کر لیا صبح ہونے پر خسرو خاں نے تاج شاہی سر پر رکھ کر تخت سلطنت پر جلوس کیا اور سلطان ناصر الدین اپنا خطاب رکھا۔ سلطان قطب الدین کا قتل جمادی الثانی ۷۲۰ھ کی عین چاند رات کو واقع ہوا اور

---

[۱]:- برنی کے بخلاف حضرت امیر خسروؒ نے تغلق نامہ میں علاء الدین کے پانچ لڑکوں کے قتل کا حال تفصیل سے لکھا ہے۔ ان لڑکوں کے نام فرید خاں، ابو بکر خاں، علی خاں، بہاء الدین خاں اور عثمان خاں ہیں۔ منگو خاں کا کوئی ذکر نہیں ممکن ہے کہ منگو خاں کا دوسرا نام ابو بکر خاں ہو۔

سہ زبعد آں سریر آرائے مرحوم   برادر پنج دیگر ماند مظلوم

دوسری جگہ پر دو مرتبہ لڑکوں کے نام گنائے ہیں (ملاحظہ ہو تغلق نامہ قلمی در کتب خانہ حبیب گنج)

خسرو خاں کی تخت نشینی یکم جمادی الثانی ۷۲۰ھ مطابق ۹ جولائی ۱۳۲۰ء بروز چہار شنبہ عمل میں آئی۔

(۵) سلطان ناصر الدین

سلطان ناصر الدین کی مدت حکومت صرف دو ماہ ہے۔[۱] اس قلیل عرصہ کے واقعات کو تحریر کرتے ہوئے ہمعصر مورخ برنی نے انتہائی غیظ و غضب کا اظہار کیا ہے کیونکہ واقعات اتنے افسوسناک

ع۱:- مولانا سید ہاشمی صاحب فرید آبادی نے تغلق نامہ کے نایاب نسخہ کو مجلس مخطوطاتِ فارسیہ حیدر آباد کی طرف سے شائع کرکے نہ صرف دنیائے ادب پر احسان کیا ہے بلکہ تاریخی لحاظ سے ایک بڑی خدمت انجام دی ہے۔ تغلق نامہ میں تین ہزار اشعار ہیں۔ اس مثنوی کا بڑا حصہ سلطان قطب الدین کے قتل، خاندانِ علائی کی تباہی، خسرو خاں کی چند روزہ بادشاہی اور پایۂ تخت دہلی کے مسلمانوں پر مصائب و شدائد اور پھر تغلق کی سرتابی، بعض اُمراء سے خط و کتابت، دہلی پر چڑھائی اور دو بڑی لڑائیوں کے بعد فتحیابی، خسرو خاں اور اُس کے بھائی کی گرفتاری اور قتل کئے جانے کے واقعات پر مشتمل ہے۔ مذکورہ بالا واقعات کو بقید سنین تفصیل کے ساتھ جس طرح امیر خسرو نے تحریر کیا ہے کسی دوسرے مورخ نے اس طرح وضاحت کے ساتھ بیان نہیں کیا۔ افریقی سیّاح ابن بطوطہ کا بیان بے ربط اور مجمل ہے۔ برنی نے بھی جس سے تمام مورخوں نے بالعموم استفادہ کیا ہے ان تمام واقعات کو وضاحت کے ساتھ تحریر نہیں کیا۔ اس کی تاریخ میں ان واقعات کا کوئی صحیح مہینہ بلکہ سن تک درج نہیں ہے خسرو کی بادشاہی کا زمانہ اس نے ایک جگہ "چار ماہ" اور دوسری جگہ "سہ چار ماہ" لکھدیا ہے۔ سبحان رائے نے چار ماہ چند روز تاریخ مبارک شاہی میں خسرو کی تخت نشینی کی تاریخ ۵ ربیع الاول ۷۲۰ھ ہے جس کا اعادہ فرشتہ نے کیا ہے، بدایونی نے زیادہ صحت سے کام لیکر ۷۲۰ھ متعین کی ہے لیکن تعجب ہے کہ لائق مورخ ڈاکٹر ایشوری پرشاد صاحب نے تغلق نامہ کے حوالہ سے اپنے تحقیقی مقالہ "قرونہ ترک" میں خسرو خاں کی مدت بادشاہی ۴ مہینے اور آٹھ دن مقرر کی ہے

(باقی مضمون بر صفحہ ۴۲۲)

ہیں جنھیں تحریر کرتے ہوئے دُکھ ہوتا ہے۔ خسرو خاں نے تخت نشین ہو کر قاضی خاں کا تمام مال و اسباب ضبط کر لیا لیکن اس کے بیوی و بچے ہاتھ نہیں آئے وہ سب رات ہی رات میں دہلی سے نکل کر فرار ہو گئے تھے۔ اس وقت دہلی کے اندر تین قسم کے گروہ تھے۔ ایک تو وہ جو شدت حرص و طمع اور ضعف ایمان کی وجہ سے خسرو کا ہمنوا اور طرفدار تھا

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۴۲۱ : ملاحظہ ہو قرونہ ترک مٹ) ممکن ہے کتابت کی غلطی ہو کیونکہ تغلق نامہ کی رُو سے خسرو کی مدتِ حکومت صرف ۲ ماہ ہے۔ امیر خسروؒ نے نہایت صراحت کے ساتھ لکھا ہے کہ قطب الدین کا قتل جمادی الثانی ۷۲۰ھ کی عین چاند رات کو واقع ہوا :-

چوں تاریخِ عرب شد ہفصد و بست — ثبات قطب کم شد جانب زیست

جماد دومیں راشد پدیدار — ہلال تیرہ و تاریک دیدار

مہِ باریک بود از حالتِ تلخ — بناخن کردہ خود رایش ازاں سلخ

شد آں مہ بر ہمہ گیہاں مُبارک — مگر بر طالعِ سلطاں مُبارک

اور ٹھیک دو مہینے بعد غازی ملک تغلق غاصب خسرو خاں کو شکست دیکر بادشاہ بن گیا یہ حساب سے ۷۲۰ھ کے ماہ شعبان کی پہلی تاریخ تھی :-

چو صبح غرۂ شعبانِ فرخ — نمود از تخت گاہِ آسماں رُخ

غازی ملک تغلق کی تخت نشینی شنبہ کو عمل میں آئی اس کی خسرو خاں سے آخری لڑائی ایک دن قبل ...... جمعہ کو ہوئی تھی

ہمہ شب بود خُسرو لشکر آرائے — سران و سرکشانش نیز بر پائے

چو صبحِ جمعہ تیغِ تیز برداشت — زمانہ غلغلِ خوں ریز برداشت

اس طرح خسرو خاں کا دور حکومت صرف ۲ مہینے کا ہے یعنی یکم جمادی الثانی ۷۲۰ھ مطابق ۹ جولائی ۱۳۲۰ء بروز چہار شنبہ تخت پر بیٹھا اور رجب ۷۲۰ھ کی آخری تاریخ بروز جمعہ مطابق ۵ ستمبر ۱۳۲۰ء قتل کر دیا گیا۔ (ماخوذ از معارف دسمبر ۱۹۳۲ء) نوٹ :- تغلق نامہ کے اِس نایاب نسخہ کو جو قلمی ہی راقم الحروف نے محترمی حبیب الرحمن خاں شیروانی نواب صدر یار جنگ کے ذاتی کتب خانہ واقع حبیب گنج میں جا کر دیکھا ہی اور اُس سے استفادہ حاصل کیا ہے۔ ۷ رمئی ۱۹۴۳ء۔

دوسرا وہ جو منافع بیع وشرا کی وجہ سے بظاہر برواریوں کا طرفدار لیکن بباطن غلبۂ کفر و ضعفِ اسلام کی وجہ سے مغموم وآزردہ تھا تیسرا گروہ اگرچہ قلیل تریں تھا لیکن دن رات برواریوں کی بیخ کنی کے لئے کوشاں تھا اور چاہتا تھا کہ جلد از جلد ان کا قلع قمع ہو جائے۔

خسرو خاں پہلے ہی تمام اہتمام کر چکا تھا جو صوبیدار دور و دراز کے صوبوں پر مامور تھے اُن میں سے اکثر کے اعزا و اقارب دہلی میں موجود تھے ان کی سب کی نگرانی اور دیکھ بھال کا بندوبست کیا تا کہ یہ لوگ دہلی سے فرار نہ ہو سکیں اور جن گورنروں کے اہل وعیال دہلی میں نہیں تھے اُن کے بیٹوں یا بھائیوں کو خسرو خاں نے پہلے ہی قطب الدین کے حکم سے بطور یرغمال دہلی میں بلوالیا تھا اس لئے اس کو کسی فوری بغاوت کا اندیشہ نہ تھا پھر بھی اس کو غازی ملک تغلق حاکم دیبالپور کا از حد خیال تھا جو علاء الدین کے زمانہ ہی سے مغل افگنی کے سبب بڑی شہرت اور اثر رکھتا تھا اُس کا بیٹا جونا خاں (فخر الدین) اس حادثہ کے وقت دہلی میں موجود تھا اُس کی دلدہی کی خاطر تا کہ اس کا باپ مخالفت پر آمادہ نہ ہو سکے امیر آخور کا عہدہ عطا کیا۔ دوسرے مسلمان اُمرا میں عین الملک ملتانی کو عالم خاں کا خطاب دیکر امیر الامراء مقرر کیا۔ اسی طرح وحید الدین قریشی کو تاج الملک کا خطاب دیا۔ جو مسلمان اُمراء خسرو خاں کے پہلے سے ہمنوا و طرفدار تھے ان میں سے یوسف صوفی کو صوفیخاں، بہاء الدین دبیر کو اعظم الملک اور پسر قرۃ قیمار کو شائستہ خاں کا خطاب دیا۔ جاہریا (جاہر دیو) کو جو قاضی خاں اور قطب الدین کا قاتل تھا زر و جواہر سے تلوایا۔ رندھول کو رائے رایاں اور اپنے بھائی حسام الدین کو خانخاناں بنایا۔ اور قطب الدین کی حرم دیولدیوی کو اپنی بیوی بنا لیا۔

قصر ہزار ستون اور سلطانی محل سرائے میں ہندو ہی ہندو نظر آنے لگے جن پر بظاہر سلطان کا کوئی اثر نہیں تھا کیونکہ وہ اپنی من مانی کارروائیاں کرنے لگے۔[۱]

---

[۱]:۔ دہلی کی مسجدوں کو ہندوؤں نے مسلمانوں سے چھین لیا۔ اُن کی محرابوں میں بُت رکھے۔ (باقی مضمون صفحہ ۴۲۴ پر)

یہاں پر یہ بات نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ مسلمانوں نے سو سال کے اندر ہی اندر بر اعظم ہندوستان کے پورے رقبہ پر قابض و متصرف ہو کر اپنی محکوم ہندو قوم کے افراد کو وزارت عظمیٰ اور سلطنت کی مدار المہامی کا بلند ترین عہدہ عطا کر دیا لیکن اِس اعتماد و فیاضی کے بدلہ میں جو چیز پیش کی گئی اُس کو ہر انصاف پسند و شریف ہندو و مسلمان نفرت کی نگاہ سے دیکھے گا۔ چنانچہ سجان رائے نے اپنی تاریخ میں ان برواریوں کی سفلہ مزاجی کا ذکر کرتے ہوئے یہ اشعار درج کئے ہیں[۱]؎

کسے را کہ بنود شرف در نہاد	نباشد عجب گر بود بد نہاد
سرِ ناکساں را برافراشتن	وزایشاں اُمید بہی داشتن
سرِ رشتۂ خویش گم کردنست	بجیب اندروں مار پروردنست
دگر زندگانی توقع مدار	کہ در جیب و دامن دہی جائے مار

فخر الدین جونا خاں کچھ دنوں تک تو برواریوں کی ان بے تمیزیوں کو دیکھتا رہا اس کے بعد ایک دن گھوڑوں[۲] کی ڈاک بٹھا کر ظہر کے وقت اپنے چند غلاموں کو لیکر دیبالپور

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۴۲۳۔ اذانیں موقوف ہو گئیں اور قرآن شریف کے چبوترے بنا کر دربار میں ہندو اُن پر بیٹھے۔ مسلمان عورتوں کو اپنے تصرف میں لے آئے (برنی صـ۴۱۱)۔ بہت ممکن ہے کہ اس میں کچھ مبالغہ بھی ہو لیکن یاد رکھنے کے لائق یہ بات ہے کہ اہل دہلی کے لئے اس قسم کی وحشیانہ حرکات بالکل نئی نہ تھیں۔ وہ کیقباد اور قطب الدین کے زمانہ میں اخلاقی گراوٹ کے کرشمے دیکھ چکے تھے البتہ فرق اتنا ہی کہ اس وقت بدعنوانیاں اکیلا بادشاہ کرتا تھا اور لوگ اُس کی عالی خاندانی کا کچھ نہ کچھ رعب مانتے تھے لیکن اب خسرو خاں کی برادری کا ہر فرد فرعون بے سامان بن گیا جسکی جہالت و ناشائستگی اور رذالت و کم نسبی سب پر عیاں تھی۔

؎۱:۔ خلاصۃ التواریخ قلمی صـ۱۴۶۔

؎۲:۔ صاحب مبارک شاہی نے نہ معلوم کس بناء پر یہ لکھ دیا کہ جونا خاں نے خسرو سے یہ کہکر اجازت لی۔

(باقی مضمون بر صفحہ ۴۲۵)

کی طرف روانہ ہوگیا۔ شام کو پتہ چلا کہ جونا خاں فرار ہوگیا ہے اُس کے تعاقب میں خسرو خاں
نے سوار دوڑائے لیکن وہ اس کی گرد کو بھی نہ پہونچ سکے۔ دہلی سے ۱۰۰ کوس آگے چل کر
سرستی کے قلعہ میں اس کو اپنے باپ کے متعین کردہ دو سو سوار ملے جو قلعہ پر قابض تھے
وہاں سے بہ نہایت آرام کے ساتھ جونا خاں اپنے باپ کے پاس دیبالپور پہونچ گیا۔ باپ
نے بیٹے کو صحیح وسالم پاکر سجدۂ شکر ادا کیا[ع۱] اس کے بعد ملتان، سامانہ، اُچھ، سیہوان اور
جالور (واقعہ جودھپور) کے عاملوں کو لکھا کہ وہ اپنی امدادی فوجوں سے قطب الدین
کے خونِ ناحق کا انتقام لینے میں مدد دیں۔ ملتان کے حاکم نے بزدلی کا اظہار کیا کہ ہم
جیسے چھوٹے غیر مستطیع حکام میں یہ طاقت کہاں ہے کہ دہلی کے بادشاہ سے مقابلہ کرسکیں۔
اس پر غازی ملک نے اچھ کے حاکم بہرام ایبہ کو لکھا کہ وہ ملتان کے حاکم کو معزول کرکے
خود وہاں کا چارج لے لے چنانچہ بہرام ایبہ نے حاکم ملتان کو قتل کردیا اور وہاں کی
فوجوں کو لیکر غازی ملک سے آکر مل گیا۔ سیہوان (سندھ) اور جالور سے غالباً کوئی مدد
نہیں مل سکی لہٰذا انھیں دونوں فوجوں کو لیکر غازی ملک اللہ کے بھروسہ پر دہلی کی طرف
روانہ ہوگیا۔ راستہ میں سامانہ کے حاکم ملک یک لکھی نے غازی ملک کا راستہ روکا لیکن
شکست کھائی اور پھر اپنے ہی آدمیوں کے ہاتھ سے مارا گیا۔ سرسا کے مقام پر خسرو خاں
کا بھائی حسام الدین معہ صوفی خاں کے راستہ روکے پڑا تھا ان کو بھی غازی ملک نے

بقیہ فٹ نوٹ ۴۲۵ ۔ کہ شاہی اصطبل کے گھوڑے موٹے ہوگئے ہیں انھیں باہر جاکر پھرالیا جاوے اور جب
وہ گھوڑے پھرانے باہر گیا تو اسی موقع پر بہرام ایبہ کے لڑکے کو اپنے ساتھ لیکر دیبالپور کی طرف روانہ
ہوگیا۔ برنی کا بیان صاف ہے جو اوپر مذکور ہوا (ملاحظہ ہو تاریخ فیروز شاہی صفحہ ۴۱۶) ۔ ع۱ ۔ سیرستان کا حاکم
محمد شاہ تھا اور ملتان کا مغلطی ۔ ان تمام مقامات کے حکام کے علاوہ ایک نامہ عین الملک کو بھی گیا تھا (تغلق نامہ میں ہے
دگر نامہ سوئے عالم ملک نیز — کہ عین الملک گشت ....
..... یہ حروف پڑھنے میں نہیں آئے۔ نسخہ کرم خوردہ ہے (ملاحظہ ہو تغلق نامہ در کتب خانہ حبیب گنج)

مار کر بھگا دیا اب دہلی کا راستہ صاف تھا۔

غازی ملک دہلی کے قریب پہونچ کر اندرپرست کے خرابہ میں آکر مقیم ہو گیا خسرو خاں بڑے ساز و سامان کے ساتھ سیری سے نکل کر حوض علائی کے قریب خیمہ زن ہو گیا اس کے سامنے باغات تھے اور پشت پر سیری کا قلعہ تھا اپنی حفاظت کی غرض سے اُس نے چاروں طرف خندقیں کھدوالی تھیں۔ اُس نے فوج کا دل بڑھانے کے لئے تمام شاہی خزانے کو جو سلطان قطب الدین ایبک کے زمانہ سے اب تک جمع ہوتا چلا آیا تھا تقسیم کرا دیا اور خزانہ میں جھاڑو دلوا دی اُس نے یہ کہہ کر خزانہ تقسیم کیا کہ اگر ہماری فتح ہوئی تو تم اس روپیہ کو اپنی سالہ پیشگی تنخواہ سمجھو اور اگر ہم مارے گئے تو کم از کم روپیہ تو غازی ملک کو نہیں مل سکے گا۔ اس روپیہ سے زیادہ تر اسی کے ہم قوم مستفید ہوئے تھے ویسے تھوڑا سا روپیہ دہلی کے اکابر و مشائخ کو بھی بانٹا تھا تا کہ مسلمان اُس کا لڑائی میں ساتھ دیں لیکن اس کی یہ تمام وقتی دلجوئیاں بددل مسلمان اُمراء کو خوش نہ کر سکیں چنانچہ عین الملک ملتانی لڑائی ہونے سے ایک رات قبل اپنی فوجیں لیکر اجین و مالوہ کی طرف چلا گیا۔ دوسرے دن بروز جمعہ میدان کارزار گرم ہوا اور غازی ملک کے مٹھی بھر کار آزمودہ مسلمان سپاہیوں کے مقابلہ میں خسرو خاں کی لاتعداد ہندو و برواری فوج کچھ بھی نہ کر سکی۔ بدحواسی کے عالم میں جس کا جدھر کو منہ اٹھا بھاگ نکلا خسرو خاں نے بھی تلپت کا راستہ لیا اور شام کے وقت اپنے پرانے آقا ملک شادی کے حظیرہ میں آکر پناہ لی وہیں سے پکڑا ہوا آیا اور اذیت کے ساتھ ٹھیک اسی جگہ پر قتل کیا گیا جہاں کہ قطب الدین کا خون ہوا تھا۔ برواریوں کے گروہ ادھر اُدھر سے پکڑ کر لائے گئے اور قتل کر دئے گئے۔

جمعہ کے دن غازی ملک نے اندرپرست کے خرابہ ہی میں قیام کیا دوسرے دن عمائدین شہر نے آکر قلعۂ سیری کی چابیاں اس کے سپرد کر دیں اور وہ سب کے ساتھ وہاں سے چل کر پہلے "قصر ہزار ستوں" میں بغرض تعزیت داخل ہوا محل اور محل کی مکینوں کی

بربادی وتباہی پر زار وقطار رویا اس کے بعد لوگوں سے مخاطب ہوکر کہا کہ میں تو صرف سلطان قطب الدین کے خونِ ناحق کا انتقام لینے کے لئے آیا تھا۔ اس وقت یہاں پر قطبی وعلائی تمام عمائدین واکابرین سلطنت جمع ہیں اگر شاہی افراد میں کوئی زندہ ہو تو اسے لایا جائے اور اس کو بادشاہ منتخب کرلیا جاوے۔ چونکہ خسرو خاں پہلے ہی شاہی خاندان کو تخم سوخت کرچکا تھا اس لئے سب نے بالاتفاق غازی ملک ہی کو اپنا بادشاہ منتخب کرلیا۔ اس طرح یکم شعبان ۷۲۰ھ بروز شنبہ مطابق ۶؍ ستمبر ۱۳۲۰ء کو غازی ملک غیاث الدین تغلق شاہ کے لقب سے ہندوستان کا شہنشاہ ہوا۔

(ختم شد حصّہ دوم)



اضافی نوٹ

(۱) صٓ ۱۳۳ سطر ۸ = ملتان بلخ کے شہروں سے قریب ہے۔ یہ بیان صحت طلب ہے۔ عربی سیاح نے ملتان کا بیان کرتے ہوئے جس جغرافیائی ماحول کا نقشہ پیش کیا ہے وہ ملتان کے بجائے بامیان کے لئے زیادہ موزوں اور قرین قیاس ہے۔

(۲) صٓ ۱۴۵ سطر ۱ = راجپوت :- اس کے لفظی معنی ہیں "حکومت کا بیٹا" جس کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں:- (۱) یعنی کنور یا شہزادہ (۲) یا وہ لوگ جن کی حکومت کفیل ہو اور وہ یورپ کے Knight (ِ) کی طرح اپنے فرائض انجام دیتے ہوں۔ مسلمانوں کی آمد کے وقت یہ لفظ چھتری قوم کے لئے غیر مستعمل تھا۔ اس کی بجائے رائے، رانا، راوت، ٹھاکر وغیرہ رائج تھے۔ لفظ راجپوت پوری (کشتری) جماعت کیلئے کب سے رائج ہوا تحقیق طلب ہے

(۳) صٓ ۱۴۶ سطر ۱۵ = مغول یعنی تاتاری: مغلوں کو تاتاری سمجھنا غلطی ہے کیونکہ دونوں کی نسل، وطن اور قومیت جداگانہ ہے۔ ہندوستان میں ترک و مغل تو ضرور آئے لیکن تاتاریوں کی آمد کے بارے میں کوئی بدیہی ثبوت نہیں ملتا۔

(۴) صٓ ۱۹۴ سطر ۳ = غوری خاندان: غوریوں کے نکاس کے بارے میں بیہقی کی روایت صاحب طبقات ناصری سے مختلف ہے تاریخی حیثیت کا تعین مشکل ہے۔

(۵) صٓ ۲۰۴ سطر ۱۶ = بہار کی فتح :- کیا بہار کی تسخیر ۱۱۹۳ء میں عمل میں آئی؟ یہ سنہ مشتبہ ہے قرین قیاس سنہ ۱۱۹۵ ہے کیونکہ قنوج کی ریاست پر قبضہ کرنے سے پہلے مسلمانوں کا بہار کی طرف بڑھنا تدبر کے خلاف تھا۔ قنوج ۱۱۹۴ء میں مفتوح ہوا۔

(۶) صٓ ۲۱۷ سطر ۹ = اندخود :- اندخود کے مقام پر خوارزمیوں سے نبرد آزمائی ۱۲۰۳ء کے بجائے ۱۲۰۵ء میں سمجھنا چاہئے۔

(۷) صٓ ۲۵۶ سطر ۱ = نورالدین ترک :- رضیہ کے عہد حکومت میں نورالدین ترک نے دہلی میں انقلاب پیدا کرنے کی کوشش کی تھی جو ناکامیاب رہی۔ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کا خیال نورالدین ترک کے بارے میں نہایت عمدہ ہے۔

(۸) صٓ ۳۱۳ سطر ۱۷ = بلبن کی لڑکی موسومہ "بی بی ہزیرہ" کی شادی حضرت خواجہ فریدالدین گنج شکرؒ سے اور ان سے چھ لڑکوں اور تین لڑکیوں کا ہونا سیر الاولیاء اور فوائد الفواد کو دیکھتے ہوئے افسانوی حیثیت رکھتا ہے۔

ضمیمہ ۱

حیاتِ انسانی کے اخلاقی نظرئیے

دُنیا میں انسان کی زندگی کے لئے جو نظام نامہ بھی بنایا جائے گا اس کی ابتدا لامحالہ مابعد الطبیعی یا الہیاتی مسائل سے ہوگی۔ زندگی کی کوئی اسکیم بن نہیں سکتی جب تک کہ انسان کے متعلق، اور اس کائنات کے متعلق جس میں انسان رہتا ہے ایک واضح اور متعین تصور نہ قائم کرلیا جائے۔ یہ سوال کہ انسان کا برتاؤ یہاں کیا ہونا چاہیئے اور کس طرح اُسے اس دنیا میں کام کرنا چاہیئے؛ دراصل اس سوال سے گہرا تعلق رکھتا ہے کہ انسان کیا ہے؟ اور اس کائنات کا نظام کس ڈھنگ کا ہے جس سے انسان کی زندگی کے ڈھنگ کو ہم آہنگ ہونا چاہیئے اس سوال کا جو حل بھی تجویز کیا جائے گا اس کے لحاظ سے اخلاق کا ایک نظریہ قائم ہوگا اور پھر اسی نظریۂ اخلاق کی نوعیت کے مطابق انسانی زندگی کے مختلف شعبوں کی تشکیل ہوگی۔ پھر اسی سانچے کے اندر انفرادی سیرت و کردار اور اجتماعی تعلیمات اور معاملات کے قوانین اپنی تفصیلی صورت اختیار کریں گے اور آخر کار تمدّن کی پوری عمارت انہیں بنیادوں پر تعمیر ہوگی۔

دُنیا میں اس وقت تک انسانی زندگی کے لئے جتنے مذہب و مسلک بنے ہیں ان سب کو بہرحال اپنا ایک بنیادی فلسفہ اور ایک اساسی نظریۂ اخلاق مرتب کرنا پڑا ہے۔ یہی وہ فلسفہ اور یہی وہ اخلاقی نظریہ ہے جو اُن کو ایک دوسرے کے مسلک سے ممتاز کرتا ہے ...... جزئیات و فروع سے قطع نظر اصولی حیثیت سے اگر دیکھا جائے تو انسان اور کائنات کے متعلق چار ہی مابعد الطبیعی نظرئیے قائم ہو سکتے ہیں۔ اور دنیا میں جتنے دستورِ زندگی پائے جاتے ہیں اُنہوں نے انہیں چار میں سے کسی ایک کو اختیار کیا ہے۔

(۱) ملحدانہ نظریۂ حیات

ایک نظریہ یہ ہے کہ کائنات کا یہ سارا نظام ایک اتفاقی ہنگامۂ وجود وظہور ہے جس کے پیچھے کوئی حکمت، کوئی مصلحت اور کوئی مقصد کارفرما نہیں ہے۔ یونہی بن گیا ہے یونہی چل رہا ہے۔ اور یونہی بے نتیجہ ختم ہو جائے گا۔ اس کا کوئی خدا نہیں ہے اور اگر ہے تو اس کے ہونے یا نہ ہونے کا انسان کی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ...... ہمیں اس سے بحث نہیں کہ انسان کو کس نے پیدا کیا اور کس لئے پیدا کیا ہم تو صرف اتنا جانتے ہیں کہ یہ اس زمین پر (اور دیگر اشیاء کی طرح) پایا جاتا ہے۔ کچھ خواہش رکھتا ہے جنھیں پورا کرنے کے لئے اس کی طبیعت اندر سے زور کرتی ہے۔ کچھ قوتیں اور کچھ آلات رکھتا ہے جو اُن خواہشوں کی تکمیل کا ذریعہ بن سکتی ہیں ... لہٰذا اس کی زندگی کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ اپنی طبع حیوانی کے مطالبات پورے کرے اور اس کی انسانی استعدادوں کا مصرف اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ ان مطالبات کو پورا کرنے کے لئے بہتر سے بہتر ذرائع فراہم کرے۔ انسان سے بڑھ کر اور کوئی علم کا منبع اور ہدایت کا سرچشمہ موجود نہیں ہے جہاں سے اُس کو اپنی زندگی کا قانون مل سکتا ہے۔ لہٰذا اُس کو اپنے گردوپیش کے آثار و احوال سے اور اپنی تاریخ کے تجربات سے خود ہی ایک قانونِ عمل اخذ کرنا چاہیئے۔ بظاہر کوئی ایسی حکومت نظر نہیں آتی جس کے سامنے انسان جوابدہ ہو اس لئے انسان بجائے خود ایک غیر ذمہ دار ہستی ہے۔ اور اگر یہ جوابدہ ہے بھی تو آپ اپنے سامنے ہی ہے یا اُس اقتدار کے سامنے جو خود انسانوں ہی میں سے پیدا ہو کر افراد پر مستولی ہو جائے اعمال کے نتائج جو کچھ بھی ہیں اِسی دُنیوی زندگی کی حد تک ہیں اس کے ماسوا کوئی زندگی نہیں ہے لہٰذا صحیح اور غلط، مفید اور مُضر، قابلِ اخذ اور قابلِ ترک ہونے کا فیصلہ صرف اُنہی نتائج کے لحاظ سے کیا جائے گا جو اس دُنیا میں ظاہر ہوتے ہیں۔

دُنیا پرستوں نے ہر زمانہ میں یہی نظریہ اختیار کیا ہے۔ قلیل مستثنیات کو چھوڑ کر حکمرانوں نے، امیروں نے، درباریوں نے، اور اربابِ حکومت نے، خوشحال لوگوں اور خوشحالی کے پیچھے جان دینے والوں نے عموماً اسی نظریہ کو ترجیح دی ہے۔ اس کو ہم "ملحدانہ یا جاہلانہ نظریۂ حیات" کہہ سکتے ہیں۔

زمانۂ اسلام سے پیشتر جن قوموں کی تمدنی ترقی کے گیت تاریخ میں گائے جاتے ہیں بالعموم اِن سب کے تمدن کی جڑ میں یہی نظریہ کام کرتا رہا ہے موجودہ مغربی تمدن کی بنیاد بھی یہی نظریہ ہے اگرچہ اہلِ مغرب سب کے سب خدا اور آخرت کے منکر نہیں ہیں، نہ علمی حیثیت سے سب مادہ پرستانہ اخلاق کے قائل ہیں لیکن جو روح اُن کے پورے نظامِ تہذیب و تمدن میں کام کر رہی ہے، وہ اسی انکارِ خدا و آخرت اور اسی مادہ پرستانہ اخلاق ہی کی روح ہے . . . . اُن کے علمی نظریہ کا اُنکی عملی زندگی سے بالفعل کوئی ربط قائم نہیں ہے . . . . اس نظریہ کی عین فطرت یہی ہے کہ اس کی بنیاد پر ایک خالص مادہ پرستانہ نظامِ اخلاق بنتا ہے خواہ وہ کتابوں میں مدون ہو یا صرف ذہنیتوں ہی میں مرتب ہو کر رہ جائے پھر اسی ذہنیت سے علوم و فنون اور افکار و آداب کی آبیاری ہوتی ہے اور پورے نظامِ تعلیم و تربیت میں الحاد و مادیت کی روح سرایت کر جاتی ہے۔ پھر انفرادی سیرتیں اسی سانچے میں ڈھلتی ہیں۔ انسان اور انسان کے درمیان تعلقات و معاملات کی تمام صورتیں اسی نقشہ پر بنتی ہیں۔ اور قوانین کا نشوونما اسی ڈھنگ پر ہوتا ہے پھر اس طرز کی سوسائٹی میں سطح پر وہ لوگ اُبھرتے ہیں جو سب سے زیادہ مکار، بددیانت جھوٹے، دغا باز، سنگدل اور خبیث النفس ہوتے ہیں تمام سوسائٹی کی سیادت و قیادت اور مملکت کی زمامِ کار انھیں کے ہاتھوں میں ہوتی ہے اور وہ شترِ بے مہار کی طرح ہر حساب سے بےخوف اور ہر مواخذہ سے بے پرواہ ہو کر خلقِ خدا پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ ان کی کتابِ

آئین میں زور کا نام حق اور بے زوری کا نام باطل ہوتا ہے جہاں کوئی مادّی رکاوٹ حائل نہیں ہوتی وہاں کوئی چیز ان کو ظلم سے نہیں روک سکتی۔ یہ ظلم ان کے خاص وطن میں یہ شکل اختیار کرتا ہے کہ طاقتور طبقے اپنی ہی قوم کے کمزور طبقوں کو کھاتے اور دباتے ہیں اور اپنے ملک کے باہر اس کا ظہور قوم پرستی۔ امپیریلزم اور ملک گیری و اقوام کشی کی صورت میں ہوتا ہے۔

(۲) مشرکانہ نظریۂ حیات

دوسرا مابعد الطبیعی نظریہ یہ ہے کہ کائنات کا نظام اتفاقی تو نہیں ہے اور نہ بے خداوند ہے مگر اس کا ایک خداوند نہیں بلکہ بہت سے خداوند ہیں یہ خیال چونکہ کسی علمی ثبوت پر مبنی نہیں ہے بلکہ محض خیال آرائی پر اُس کی بنا ہے اسلئے موہوم محسوس اور معقول اشیاء کی طرف خداوندی و الٰہیت کو منسوب کرنے والوں کے درمیان نہ کبھی اتفاق ہو سکتا ہے۔ نہ کبھی ہوا ہے۔ اندھیرے میں ٹٹولنے والوں کا ہاتھ جس چیز پر بھی پڑ گیا وہ خدا بنالی گئی۔ اور خداؤں کی فہرست ہمیشہ گھٹتی بڑھتی رہی۔ فرشتے۔ جن۔ ارواح۔ سیارے زندہ اور مردہ انسان۔ درخت۔ پہاڑ۔ جانور۔ دریا زمین۔ آگ۔ بادل۔ ہوا۔ اور معانی مجردہ مثلاً محبت۔ حُسن۔ بیماری۔ جنگ۔ لچھمی۔ شکتی وغیرہ اور خیالی مرکبات مثلاً شیر انسان۔ ماہی انسان۔ پرند انسان۔ چہار سر ہزار دستہ۔ خرطوم بینی وغیرہ ان لوگوں کے معبودوں میں جگہ پاتے رہے ہیں پھر ان کے گرد اوہام و خرافات کا ایک عجیب طلسم ہوشربا تیار ہوا ہے۔ جس میں ہر جاہل قوم کی قوت واہمہ نے اپنی شادابی و نادرہ کاری کے وہ دلچسپ نمونے فراہم کئے ہیں کہ دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ جن قوموں میں خداوند اعلیٰ یعنی اللہ کا تصور نمایاں پایا گیا ہے۔ وہاں تو خدائی کا انتظام کچھ اس طرز کا ہے گویا اللہ تعالیٰ بادشاہ ہے اور دوسرے خدا اُس کے وزیر۔ درباری۔ مصاحب۔ عہدہ دار اور اہلکار ہیں۔ مگر انسان بادشاہ سلامت تک راہ نہیں پا سکتا۔ اس لئے اس کے معاملات ماتحت

خداؤں ہی سے وابستہ رہتے ہیں۔ اور جن قوموں میں خداوند اعلیٰ کا تصوّر بہت دھندلا یا قریباً مفقود ہے۔ وہاں ساری خدائی ارباب متفرقین ہی میں تقسیم ہو کر رہ گئی ہے۔

اس قسم کے نظریۂ زندگی کو ہم "مشرکانہ نظریۂ حیات" کہہ سکتے ہیں۔ جاہلیت کی یہ دوسری قسم ہے جس میں انسان قدیم ترین زمانہ سے آج تک مبتلا ہوتا رہا ہے۔ یہ جاہلیت نمبر ۱ کے ساتھ ہمیشہ تعاون کرتی ہے۔ قدیم زمانہ میں بابل، مصر، ہندوستان، ایران، یونان، روم وغیرہ ممالک کے تمدن میں یہ دونوں جاہلیتیں ہم آغوش تھیں اور موجودہ زمانہ میں جاپان کے تمدّن کا یہی حال ہے۔ اس موافقت کے متعدد اسباب ہیں جن میں سے چند کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے:۔

(۱) مشرکانہ جاہلیت میں آدمی کا تعلق اپنے معبود کے ساتھ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا کہ وہ اس کو اپنے خیال میں نافع و ضار سمجھ کر مراسم عبودیت ادا کرتا ہے باقی رہا یہ امر کہ اس کو وہاں سے کسی قسم کی اخلاقی ہدایت یا زندگی کا قانون و ضابطہ ملے تو اس کا کوئی امکان ہی نہیں۔ کیونکہ وہاں درحقیقت کوئی اصلی خدا ہو تو ہدایت و قانون بھیجے۔ ایسی صورت میں مشرک انسان خود ہی ایک اخلاقی نظریہ بناتا ہے اور خود ہی اس نظریہ کی بنیاد پر ایک شریعت تصنیف کرتا ہے۔ اس طرح وہی پہلے قسم کی جاہلیت برسرِ کار آجاتی ہے۔ دونوں میں فرق صرف اتنا ہے کہ ایک جگہ جاہلیت کے ساتھ دیوتاؤں کے لئے عبادت اور عبادت گاہوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ دوسری جگہ نہیں ورنہ اخلاق و اعمال جیسے یہاں ہوتے ہیں ویسے ہی وہاں بھی ہوتے ہیں۔ بت پرست یونان و روم کے اخلاقی مزاج اور موجودہ یورپ کے اخلاقی مزاج میں جو مشابہت پائی جاتی ہے۔ اس کا یہی سبب ہے۔

(۲) ثانیاً علوم و فنون (فلسفہ و ادب اور سیاسیات معاشیات وغیرہ) کے لئے مشرکانہ نظریہ کوئی الگ مستقل بنیاد فراہم نہیں کرتا۔ بلکہ نظریہ نمبر ۱ کی ہمنوائی کرتا ہے اور اپنی سوسائٹی کا دماغی نشو و نما ۱ کے طرز پر کرتا ہے فرق صرف اتنا ہے کہ مشرکین کے افکار میں

وہم وخیال کا عُنصر غالب ہوا کرتا ہے۔ جبکہ ملاحدہ ذرا اعلیٰ قسم کے لوگ ہوتے ہیں اس لئے نرے خیالی فلسفوں سے انھیں کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ البتہ جب وہ خدا کے بغیر کائنات کے معمہ کو حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تو ان کی اِستدلالی کھینچ تان بھی اتنی ہی غیر معقول ہوتی ہے جتنی مشرکین کی میتھالوجی۔

(۳) ثالثاً مُشرک سوسائٹی ان تمام تمدنی طریقوں کو قبول کرنے کے لئے پوری طرح مستعد ہوتی ہے۔ جن کو ملحد سوسائٹی اختیار کرتی ہے اگرچہ سوسائٹی کی ترتیب وتعمیر میں شرک اور الحاد دونوں کے ڈھنگ ذرا ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ شرک کی مملکت میں بادشاہوں کو خدائی کا مقام دیا جاتا ہے۔ روحانی پیشواؤں اور مذہبی عہدہ داروں کا ایک طبقہ مخصوص اختیارات کے ساتھ پیدا ہوتا ہے شاہی خاندان اور مذہبی طبقہ مل کر ایک ملی بھگت قائم کرتے ہیں۔ خاندانوں پر خاندانوں کے اور نسلوں پر نسلوں کے تفوق کا ایک مستقل نظریہ وضع کیا جاتا ہے اور اس طرح جاہل عوام پر مذہب کا جال پھیلا کر ظالمانہ تسلّط قائم کرلیا جاتا ہے۔ بخلاف اِس کے الحاد پرست سوسائٹی میں یہ خرابیاں۔ نسل پرستی۔ قوم پرستی قومی امپیریلزم۔ ڈکٹیٹر شپ۔ سرمایہ داری اور طبقاتی نزاع کی شکل اختیار کرتی ہیں۔ لیکن جہاں تک روح اور جوہر کا تعلق ہے انسان پر انسان کی خدائی مسلط کرنے، انسان کو انسان سے پھاڑنے اور انسانیت کو تقسیم کرکے ایک ہی نوع کے افراد کو ایک دوسرے کے لئے صیّاد بنانے میں دونوں ایک سطح پر ہیں۔

(۳) راہبانہ نظریۂ حیات

تیسرا مابعد الطبیعی نظریہ یہ ہے کہ یہ دُنیا اور یہ جسمانی وجود انسان کے لئے ایک دار العذاب ہے۔ اِنسان کی رُوح اس کے جسم کے اندر ایک سزا یافتہ قیدی کی حیثیت رکھتی ہے۔ لذّات وخواہشات اور تمام وہ ضروریات جو اس جسمانی تعلق کی وجہ سے انسان کو لاحق ہوتی ہیں۔ اصل میں اس قیدخانہ کے طوق وسلاسِل ہیں۔ انسان اِس دُنیا اور اُس کی چیزوں سے جتنا تعلق

رکھے گا اتنا ہی گندگی سے آلودہ ہوگا اور اسی قدر مزید عذاب کا مستحق بن جائے گا۔
نجات کی صورت اِس کے سوا کوئی نہیں ہے۔ کہ اس زندگی کے بکھیڑوں سے قطع تعلق کیا جاوے۔ خواہشات ولذات کو مٹایا جاوے۔ اور اپنے اس دشمن یعنی نفس وجسم کو مجاہدات وریاضیات کے ذریعہ سے اتنی تکلیفیں دی جائیں کہ روح پر اس کا تسلّط قائم نہ ہوسکے۔ اس طرح روح ہلکی اور پاک صاف ہوجائیگی۔

یہ نظریہ جس کو ہم راہبانہ نظریۂ حیات کہہ سکتے ہیں بجائے خود غیر تمدنی (Anti Social) نظریہ ہے۔ مگر تمدّن پر متعدد طریقوں سے اثر انداز ہوتا ہے۔ اس کی بنیاد پر ایک خاص قسم کا نظام فلسفہ بنتا ہے جس کی مختلف شکلیں ویدانتزم اشراقیت (Neo Platonism) یوگ، تصوف، مسیحی رہبانیت اور بُدھ ازم وغیرہ ناموں سے مشہور ہیں۔

اِس فلسفہ کے ساتھ ایک ایسا نظامِ اخلاق وجود میں آتا ہے جو بہت کم ایجابی (Positive) اور بہت زیادہ بلکہ تمامتر سلبی (Negative) نوعیت کا ہے اِن دونوں کے جہاں جہاں (خواہ وہ اعمال وعقائد ہوں یا ادب وسیاست) اثرات پہنچتے ہیں وہاں افیون اور کوکین کا کام کرتے ہیں۔

ملحدانہ اور مشرکانہ جاہلیتوں کے ساتھ اِس تیسری قسم کی جاہلیت کا تعاون عموماً دو صورتوں سے ہوتا ہے۔

(۱) یہ راہبانہ جاہلیت انسانی جماعت کے نیک اور پاکباز افراد کو دُنیا کے کاروبار سے ہٹاکر گوشۂ عزلت میں لیجاتی ہے اس طرح بدترین قسم کے شریر افراد کے لئے میدان صاف ہوجاتا ہے۔

(۲) اِس جاہلیت کے اثرات سے عوام میں غلط قسم کا صبر وتحمّل پیدا ہوتا ہے جو انہیں ظالموں کے ہاتھ میں کھلونا بنادیتا ہے اسی وجہ سے ہمیشہ بادشاہ۔ امراء اور مذہبی اقتدار رکھنے والے طبقے اس راہبانہ فلسفہ واخلاق کی اِشاعت میں خاص دلچسپی لیتے

رہتے ہیں اور یہ خوب آرام سے اُسکی سرپرستی میں پھیلتا رہا ہے۔

یہ تو اس جاہلیت کا معاملہ اپنی ہم جنس بہنوں کے ساتھ ہے۔ مگر انبیاء علیہم السلام کی اُمتوں میں جب یہ گھُس آتی ہے تو کچھ اور ہی گُل کھلاتی ہے۔ خدا کے دین پر اس کی پہلی ضرب یہ ہوتی ہے کہ دُنیا کو یہ دار العمل، دار الامتحان اور مزرعۃ الآخرۃ کے بجائے دار العذاب اور مایا کے جال کی حیثیت سے پیش کرتی ہے۔ آدمی یہ حقیقت بھُول جاتا ہے کہ وہ اس دُنیا میں خلیفہ کی حیثیت سے مامور ہے۔ وہ دُنیا کی ذمہ داریوں کو قبول کرنے کے بجائے اس سے کنارہ کشی کو بہتر سمجھتا ہے۔ عبادات و اوامر و نواہی کا یہ مفہوم کہ یہ حیاتِ دُنیا کی اصلاح اور فرائضِ خلافت کی انجام دہی کے لئے تیار کرنے والی چیزیں ہیں اس کے نزدیک یہ ہو جاتا ہے کہ یہ سب اعمال گناہِ زندگی کا کفارہ ہیں۔ بس انھیں کو انہماک کے ساتھ انجام دیتے رہنا چاہیئے تاکہ آخر میں نجات حاصل ہو اس ذہنیت کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ انسان خلافتِ الٰہی کی ذمہ داریوں کو قبول کرنے کی بجائے گوشہ نشینی و عزلت گزینی کو زیادہ بہتر سمجھنے لگتا ہے۔

(۴) اِسلامی نظریۂ حیات

چوتھا نظریہ یہ ہے کہ سارا عالم ہست و بود جو ہمارے گرد و پیش پھیلا ہوا ہے اور جس کا ایک جزو ہم خود ہیں در اصل ایک بادشاہ کی سلطنت ہے اِسی نے اس کو بنایا ہے اور وہی اس کا مالک ہے۔ اور وہی اس کا واحد حاکم ہے .... انسان اس مملکت میں پیدائشی رعیت ہے یعنی رعیت ہونا یا نہ ہونا اسکی مرضی پر موقوف نہیں ہے بلکہ یہ رعیت ہی پیدا ہوا ہے اور رعیت کے سوا اور کچھ ہونا اسکے امکان میں نہیں ہے ..... جسطرح مملکت کی تمام اجزا بادشاہ کے امر کی اطاعت کر رہے ہیں اسی طرح یہ بھی کرے۔ یہ خود اپنے لئے طریق زندگی وضع کرنے اور اپنی ڈیوٹی آپ تجویز کرنیکا حق نہیں رکھتا اسکا کام صرف یہ ہے کہ مالک الملک کی طرف سے جو ہدایت آئے اُسکی پیروی کرے۔ اِس ہدایت آنے کا ذریعہ وحی ہے اور جن انسانوں کے پاس وہ آتی ہے وہ نبی ہیں

مگر انسان کی آزمائش کے لئے مالک نے یہ لطیف طریقہ اختیار کیا ہے کہ آپ بھی چھپ گیا

اور اپنی سلطنت کا وہ پورا اندرونی نظام بھی چھپا دیا جس سے وہ تدبیر امر کرتا ہے عیان و شہود میں کوئی ایسی نشانی نمایاں نہیں ہوتی کہ انسان پر فرمانروائے عالم کی حاکمیت اور اپنی محکومیت کا حال غیر مشتبہ طور پر کھل جائے یہاں تک کہ ماننے بغیر چارہ نہ رہے۔ آدمی ایک حد کے اندر اپنے آپ کو بالکل مختار پاتا ہے۔ بغاوت کرنا چاہے تو اس کی قدرت دیدی جاتی ہے۔ مالک کے سوا دوسروں کی بندگی کرنا چاہے تو اس سے بھی زبردستی اس کو روکا نہیں جاتا۔ پھر بھی اِن دونوں صورتوں (بغاوت و بندگی غیر) میں اُسے رزق برابر ملتا ہے۔ یہ سارا طرز کاروائی صرف اسلئے ہے کہ خالق نے انسان کو عقل۔ تمیز۔ استدلال۔ ارادہ اور اختیار کی جو قوتیں دی ہیں اور اپنی بے شمار مخلوقات پر اس کو ایک طرح کے حاکمانہ تصرّف کی جو قدرت بخشی ہے اس میں وہ اس کی آزمائش کرنا چاہتا ہے۔ اسی آزمائش کی تکمیل کے لئے حقیقت پر غیب کا پردہ ڈالا گیا ہے تاکہ انسان کی عقل کا امتحان ہو۔ انتخاب کی آزادی بخشی گئی ہے تاکہ اس امر کا امتحان ہو کہ آدمی حق کو جاننے کے بعد کسی مجبوری کے بغیر خود اپنی رضا و رغبت سے اس کی پیروی کرتا ہے یا خواہشات کی غلامی اختیار کر کے اس سے مُنہ موڑتا ہے اسباب زندگی کا سرمایہ اور وسائل کار دئے گئے ہیں اور عمر بھر کی مہلت دی گئی ہے کیونکہ جب تک کسی کارکن کو سرمایہ۔ وسائل اور کام کا موقع نہ دیا جائے اس کی لیاقت و عدم لیاقت کا امتحان نہیں ہو سکتا۔ یہ دنیوی زندگی چونکہ آزمائش کی مہلت ہے۔ اسلئے یہاں نہ حساب ہے نہ جزا نہ سزا یہاں جو کچھ دیا جاتا ہے وہ کسی عملِ نیک کا انعام نہیں بلکہ امتحان کا سامان ہے اور جو تکالیف و مصائب و شدائد وغیرہ پیش آتے ہیں وہ کسی عملِ بد کی سزا نہیں بلکہ زیادہ تر اس قانون طبعی کے تحت جس پر اس دُنیا کا نظام قائم کیا گیا ہے آپ سے آپ ظاہر ہونے والے نتائج ہیں۔ اعمال کے اصل حساب و کتاب جانچ پڑتال اور فیصلہ کا وقت مہلت کی یہ زندگی ختم ہونے کے بعد ہے اور اُسی کا نام آخرت ہے۔ لہٰذا دُنیا میں جو کچھ نتائج ظاہر ہوتے ہیں وہ کسی طریقہ یا کسی

عمل کے صحیح یا غلط، نیک یا بد اور قابلِ اختیار یا قابلِ ترک ہونے کا معیار نہیں بن سکتے۔ اصلی معیار آخرت کے نتائج ہیں اور یہ علم کہ آخرت میں کس طریقہ اور کس عمل کا نتیجہ اچھا اور کس کا بُرا ہوگا صرف اس وحی کے ذریعہ سے حاصل ہو سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے انبیاء پر نازل ہوئی ہے۔ جزئیات و تفصیلات سے قطع نظر، فیصلہ کُن بات جس پر آخرت کی فلاح یا خسران کا مدار ہے یہ ہے کہ اولاً انسان اپنی قوتِ نظر و استدلال کے صحیح استعمال سے اللہ تعالیٰ کے حاکمِ حقیقی ہونے اور اس کی طرف سے آئی ہوئی ہدایت کے منجانب اللہ ہونے کو پہچانتا ہے یا نہیں، ثانیاً اس حقیقت سے واقف ہونے کے بعد اور آزادیٔ انتخاب رکھنے کے باوجود اپنی رضا و رغبت سے اللہ کی حاکمیت اور اس کے امرِ شرعی کے آگے سرِ تسلیم خم کرتا ہے یا نہیں۔

یہ وہ نظریہ ہے جسے ابتداء سے انبیاء علیہم السلام پیش کرتے آئے ہیں۔۔۔۔ کسی مشاہدہ یا کسی تجربہ سے یہ نظریہ ٹوٹتا نہیں۔ یہ ایک مستقل نظامِ فلسفہ پیدا کرتا ہے۔ اِس فلسفہ کی بنیاد پر جس تہذیب کی عمارت اُٹھتی ہے اُس تہذیب کی رگ رگ اور ریشہ ریشہ میں جو روح کام کرتی ہے وہ اللہ واحد و قہار کی حاکمیت۔ آخرت کے اعتقاد اور انسان کے محکوم و ذمہ دار ہونے کی روح ہے بخلاف اس کے دیگر تہذیبوں کے پورے نظام میں انسان کی خود مختاری بے قیدی و بے مہاری اور غیر ذمہ داری کی روح سرایت کئے ہوئے ہوتی ہے۔ اسلئے انسانیت کا جو نمونہ انبیاء علیہم السلام کی قائم کی ہوئی تہذیب سے تیار ہوتا ہے اس کے خط و خال اور رنگ و روغن دوسری تہذیبوں کے بنائے ہوئے نمونہ سے ہر جز اور ہر پہلو میں جدا ہوتے ہیں اس کے بعد تمدن کی تفصیلی صورت جو اس بنیاد پر مبنی ہے اس کا سارا نقشہ دنیا کے دوسرے نقشوں سے بدلا ہوا ہوتا ہے۔ طہارت، خوراک، لباس، طرزِ زندگی، آداب و اطوار شخصی کردار، کسبِ معاش، صرفِ دولت، ازدواجی زندگی، خاندانی زندگی معاشرتی رسوم، سماجی تعلقات۔

انسان اور انسان کے تعلق کی مختلف شکلیں لین دین کے معاملات۔ دولت کی تقسیم۔ مملکت کا انتظام۔ حکومت کی تشکیل۔ امیر کی حیثیت۔ شوریٰ کا طریقہ۔ سول سروس کی تنظیم قانون کے اصول۔ تفصیلی ضوابط کا اصول سے استنباط۔ عدالت۔ پولیس۔ احتساب۔ مالگذاری۔ امورِ نافعہ Public Works صنعت وتجارت۔ خبر رسانی تعلیمات اور دوسرے محکموں کی پالیسی۔ فوج کی ترتیب وتنظیم۔ جنگ وصلح کے معاملات، بین الاقوامی تعلقات، اور خارجی سیاست۔ غرض انسانی زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے معاملات سے لیکر بڑے سے بڑے معاملات تک اس تمدن کا طور وطریق اپنی ایک مستقل شان رکھتا ہے اور ہر ہر جز میں ایک واضح خطِ امتیاز اس کو دوسرے تمدنوں سے الگ کرتا ہے۔" اس کی ہر چیز میں اوّل سے آخر تک ایک خاص نقطۂ نظر۔ ایک خاص مقصد۔ ایک خاص اخلاقی رویّہ کارفرما ہوتا ہے۔ جس کا براہ راست تعلق خدائے واحد کی حاکمیت مطلقہ۔ اور انسان کی محکومیت ومسئولیت اور دنیا کے بجائے آخرت کی مقصودیت سے جڑا ہوا ہے۔"[۱]

---

[۱]۔ ماخوذ از رسالہ الفرقان بریلی شاہ ولی اللہ نمبر ۱۹۴۱ء۔

ضمیمہ ۲

اِباحتی یا وام مارگی یا واماچاری

اِباحت کے لغوی معنی ہیں "جائز رکھنا، مباح ہونا" اِباحتی جو جائز رکھے، مباح جانے۔

اِس جماعت میں وہ تمام لوگ شامل کئے جاسکتے ہیں (خواہ وہ نام نہاد ہندو ہوں یا مسلمان) جو مخرب اخلاق ممنوعہ چیزوں کو جائز سمجھیں اور جن کے نزدیک حلال وحرام میں کوئی امتیاز نہ ہو۔ کوئی مہذب حکومت ایسے افراد یا جماعتوں کو جوا، شراب، زنا وغیرہ افعال شنیعہ وقبیحہ کو جائز سمجھیں پھلنے پھولنے کی اجازت نہیں دے سکتی کیونکہ اِس سے سوسائٹی کا اخلاق گرجائے گا اور رفتہ رفتہ وہ جسمانی، دماغی اور روحانی صلاحیتوں کو کھو بیٹھے گی جن کے بغیر اس کا وجود عالم انسانیت کی فلاح وبہبود کے لئے بیکار محض ہے۔

ایران کے اندر نوشیروان عادل کے عہد حکومت میں "مزدکی جماعت" کا پتہ چلتا ہے جس نے حلال وحرام کی تمیز اٹھاکر فسق وفجور کی آبیاری کا سامان بہم پہونچایا تھا۔ اسی طرح ہندوستان کے اندر اسلامی عہد حکومت میں بعض جماعتیں ایسی موجود تھیں جو مزدکیوں کے مماثل تھیں انھیں میں شاکت مت اور وام مارگیوں کی جماعت بھی ہے۔

وام مارگیوں کا اٹھان کیسے ہوا اِس کا تذکرہ سوامی دیانندجی سرسوتی نے ستیارتھ پرکاش کے باب یازدہم میں بڑی تفصیل کے ساتھ کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ برہمنوں نے ویدوں کی تعلیمات کو عوام الناس سے چھپایا اور تعلیم وتعلم کے خود واحد اجارہ دار بن بیٹھے لیکن رفتہ رفتہ اس کی تعلیم سے خود بھی دور ہوتے چلے گئے اس لئے سوسائٹی پر جہالت کی تاریک گھٹائیں چھاگئیں جس کی وجہ سے لوگوں کے اندر وہ تمام بُرائیاں پیدا ہوگئیں جو جہالت کا خاصّہ ہیں۔

زمانۂ وسطیٰ میں سوسائٹی کو خراب کرنے والے عناصر

اس طرح سوامی دیانندجی کے نزدیک سوسائٹی کو خراب کرنے والی سب سے پہلے برہمنوں میں کی ایک وہ خود غرض جماعت ہے جس نے یورپ کے پادریوں کی طرح جنت کو اپنے لئے مخصوص کر رکھا تھا[1] اور جن کے بغیر یوم پیدائش سے لیکر مرنے کے بعد تک کوئی رسم ادا نہیں کی جاسکتی تھی۔ انھوں نے اپنی بزرگی و برتری قائم رکھنے کے لئے عوام کو جاہل رکھنے کی کوشش اور اپنی عظمت کا نقش بٹھانے کے لئے غلط سلط روایات پر مبنی کتابیں تصنیف کیں اور پھر ہر روایت کا راوی ویدک عہد کے کسی دیوی یا دیوتا کو قرار دیکر ان (کتب) کو مستند بنانے کی کامیاب کوشش کی۔ چونکہ وہ قانون کی زد سے باہر سمجھے جاتے تھے اسلئے ان کو ہر جائز و ناجائز کام روا تھا۔ آخر کار برہمن سوسائٹی کے اندر دیوتاؤں کے قائم مقام سمجھے جانے لگے ادھر عوام الناس علم سے کورے رہجانے کی وجہ سے بھیڑوں کا ایک گلہ (ریوڑ) ہو کر رہ گئے کہ انھیں جس نے جدھر کو چاہا ہانک دیا۔ اِس جہالت سے غلط فائدہ اٹھایا گیا۔

مہاتما بودھ اور مہابیر سوامی نے عوام کے جاہل طبقے کو برہمن پنڈوں کی خودساختہ جاہلانہ رسموں کے چکر سے نکال کر صحیح راستہ پر ڈالنے کی انتھک کوششیں کیں۔ انھیں قدیم آریوں کی مساوات کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا اور مذہبی معتقدات کو (سنسکرت[2] کے بجائے) انھیں کی زبان میں سمجھا کر نروان کی طرف رہنمائی کی۔ ان دونوں بزرگوں کی تعلیمات کا ملک پر گہرا اثر پڑا اور برہمنی مت اگر مٹ نہ سکا تو ایک عرصہ کے لئے دب ضرور گیا۔

---

[1] : ستیارتھ پرکاش (انگلش ترجمہ) صفحہ ۳۸۲ تا صفحہ ۳۸۵

[2] : سنسکرت چونکہ عوام الناس کی زبان نہیں تھی اسلئے ویدک قوانین کو جاننا اور اُن کی تشریح برہمنوں سے مختص ہوکر رہ گئی۔

مذکورۂ بالا تینوں مذہبوں میں بہت دنوں تک کشمکش جاری رہی۔ بالآخر مہاراج شنکر آچاریہ[۱] کی تعلیم نے برہمنی مت کو پھر ابھرنے کا موقع دیا لیکن ملک میں چونکہ بُت پرستی[۲] کا نہایت زور تھا اسلئے "شنکر اچاریہ جی کے پیرو بھی اس رَو میں بہہ گئے اور ان کو شیوجی کا اوتار مان کر پوجنے لگے[۲]" اور آخر کار شیویوں میں ضم ہو کر رہ گئے۔ کچھ عرصہ کے بعد وام مارگیوں اور شیویوں کی جماعتیں اعمال کے لحاظ سے

ع ۱:- مہاراج شنکر اچاریہ جنوبی دکن کے ایک معزز برہمنی خاندان کے چشم و چراغ تھے اس وقت وہاں جینیوں کا غلبہ تھا اور عرب مسلمانوں کی بسلسلۂ تجارت سواحلی علاقوں میں آمد و رفت جاری تھی۔ گمان غالب ہے کہ جینیوں اور مسلمانوں میں مذہبی مسائل پر گفتگو رہتی ہوگی۔ جینیوں کی بُت پرستی کے جواب میں مسلمانوں کے پاس ذات باری تعالٰی کی وحدانیت کا ایک موثر حربہ تھا۔ ممکن ہے کہ شنکر اچاریہ جی نے ویدانتی تعلیم میں مسلمانوں کے دلائل سے کچھ نہ کچھ فائدہ اٹھایا ہو جس کو ہم تاریخی شواہد کی کمی کی بنا پر یقینی طور پر نہیں کہہ سکتے۔ بہر حال شنکر اچاریہ جی نے ویدانتی تعلیم کی تلقین کے لئے ملک میں تبلیغی دورے شروع کئے اور اجین کے راجہ سُدھنوا اور دوسرے راجاؤں کی مدد سے جنھوں نے جینی عقائد سے توبہ کر کے اِس نئے برہمنی مت کو قبول کر لیا تھا جینیوں کو عاجز کر دیا کہتے ہیں کہ "دس سال تک مہاراج شنکر اچاریہ نے تبلیغی دورے کر کے جینیوں، شیویوں اور وام مارگیوں کے خلاف وعظ کہے۔ آجکل جو ٹوٹے پھوٹے بت دکھائی دیتے ہیں وہ اُسی زمانہ کی ہیں اور جو سالم بُت جابجا زمین سے برآمد ہوتے ہیں یہ وہ بُت ہیں جن کو جینیوں نے اس خوف سے زمین میں دبا دیا تھا کہ کہیں ان کو بھی نہ توڑ ڈالا جائے" (ملاحظہ ہو ستیارتھ پرکاش مترجمہ صہ ۲۹۶) معلوم ایسا ہوتا ہے شنکر اچاریہ جی کی کوششوں کے باوجود ملک سے بُت پرستی دور نہ ہو سکی اور اُس کا زور بدستور قائم رہا۔

ع ۲:- ہندوستان میں بُت پرستی کی بنیاد ڈالنے والے سوامی دیانند سرسوتی کے نزدیک جینی ہیں۔ (ملاحظہ ہو ستیارتھ پرکاش مترجمہ صہ ۲۲۳)

(باقی مضمون برصفحہ ۴۴۳)

ایک ہوگئیں اور انھوں نے بھگ (جلدھاری) اور لنگ کی پرستش کو اپنا شعار بنالیا[1] یہی وہ زمانہ ہے جبکہ شمال کی طرف سے مسلمان ہندوستان پر حملہ آور ہوئے[2]

مہاراج شنکر اچاریہ کی خالص وحدانیت کی تعلیم کو رامانج کے پیرو وشنویوں نے پراکرتی، روح اور مادہ کو ازلی وابدی مان کر بدنما کردیا۔ "تثلیث ویدوں کی تعلیم

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۴۴۲ ملاحظہ ہو)

مولف کو اس نظریہ سے تھوڑا سا اختلاف ہے۔ اس کے نزدیک ہندوستان میں بت پرستی وبت سازی کے بانی باختر سے آئے ہوئے یونانی ہیں۔ یونانیوں کے رگ وریشہ میں بت پرستی کے جراثیم سرایت کئے ہوئے تھے جبکہ ہندوستان والے بت پرستی سے قریب قریب ناآشنا تھے —— مہاتما بودھ کے زمانہ تک آریوں میں یگیہ، ہون وغیرہ کا رواج تھا۔ دیوتاؤں کے نام پر منتروں کا جپ ہوتا تھا نہ اس وقت تک مندر بنے تھے اور نہ ان میں دیوتاؤں کی مورتیاں رکھی جاتی تھیں۔ موریہ عہد میں بھی بت پرستی کا پتہ نہیں چلتا۔ شنگ اور کنو عہد میں (۱۸۴ ق م تا ۲۷ ق م) جبکہ مہاراجہ اشوک کی عظیم الشان سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہوچکی تھی باختر کے یونانی ہندوستان میں آئے۔ ان کے دو مشہور راجہ ہوئے ہیں ایک ڈیمیٹرلیس (۱۸۳ ق م) اور دوسرا مناندر (۱۵۰ ق م) یونانی اثرات کے تحت ہندوستان میں پہلی مرتبہ "ٹیکسلا، متھرا اور سارناتھ وغیرہ بت سازی کے مرکز قرار پائے" (تاریخ ہند از اودھ بہاری پانڈے ص۴۶)۔ اس طرح یقین ہوتا ہے کہ ہندوستان میں بت پرستی کی ابتدا یونانیوں سے ہوئی۔ جینیوں نے اس کو فروغ دیا ہو تو یہ دوسری بات ہے گپتوں کے عہد حکومت میں (۳۲۰ ء تا ۴۹۵ ء) کثرت کے ساتھ مندر بنے اور ان میں شیو، وشنو اور سورج دیوتا وغیرہ مورتیاں رکھ کر پوجی جانے لگیں۔ مہاتما بودھ کو برہمنوں نے وشنو دیوتا کا اوتار مان لیا اور اس طرح اُن کی مورتیاں بھی بننے لگیں (تاریخ ہند از اودھ بہاری پانڈے ص۷۹)

[1]:- ستیارتھ پرکاش انگریزی ترجمہ ص۴۱۲

[2]:- " " " ص۴۱۳

کے سراسر منافی ہے[۱]"۔ وشنویوں نے بھی جینیوں کی طرح مورتیاں بنانا شروع کردیں تاکہ عوام الناس کا جاہل طبقہ جینیوں کی طرف مائل ہونے سے رک جائے اور اُن کے مندروں میں نہ جائے تاکہ ویشنو پنڈتوں کی روزی میں خلل نہ پڑنے پائے۔ انھوں نے اپنی مورتیوں کو جینیوں کے بخلاف زیادہ بہتر، خوبصورت اور دلکش بنایا اور یہی نہیں بلکہ دیوتا جی کے ساتھ ساتھ دیوی جی کی بھی مورتی نصب کی وہ اس کو کچھ اس طرح ننگا کرکے رکھتے تھے کہ دیکھنے والوں کے نفسانی جذبات میں ہیجان پیدا ہو[۲]۔

بت پرستی اور بت سازی کے یہ مقابلے روز بروز بڑھتے ہی گئے یہاں تک کہ بتوں کے حصول کے لئے آپس میں باقاعدہ لڑائیاں ہونے لگیں چنانچہ کالنجر کے راجہ یشو ورمن (۹۳۰ء تا ۹۵۰ء) نے جب کھجوراہو کا مشہور مندر تعمیر کرایا تو اس میں جو مورتی لاکر رکھی گئی وہ وشنو دیوتا کی تھی اور جس کو قنوج کے راجہ دیوپال سے بزور شمشیر حاصل کیا گیا تھا[۳]۔ اسی طرح لکشمن نامی ایک کلچری راجہ نے اُڑیسہ پر حملہ کرکے سومناتھ میں نصب کرنے کے لئے ایک بت لڑ بھڑ کر حاصل کیا تھا[۴]۔

بتوں سے روزی کمانے کے پنڈتوں نے عجیب عجیب طریقے ایجاد کئے مثلاً یہ کہ کسی پتھر کے بت کو پہلے سے بنوا کر کسی پہاڑ کے غار میں جنگل میں یا کہیں اور پوشیدہ جگہ میں چھپا دیتے اور پھر اپنے معتقدوں میں یہ مشہور کرتے کہ ہم نے رات کو مہادیو جی یا پاربتی جی یا کسی اور دیوتا کو خواب میں دیکھا ہے اور انھوں نے ہمیں اپنا پتہ بتایا ہے کہ ہم فلاں جگہ موجود ہیں۔ چنانچہ ان کے معتقدین جن کے پاس عقل سے زیادہ روپیہ ہوتا تھا پنڈت کی معیت میں اس جگہ سے جہاں کہ وہ بت پہلے سے رکھا ہوا ہوتا تھا جاکر لے آتے تھے اور اس کے لئے

۱و۲: ستیارتھ پرکاش انگریزی ترجمہ ص ۴۲۳

۳: کرسینٹ اِن انڈیا از شرما ص ۱۰ و دہلی سلطنت از سید معین الحق ص ۲۰

۴: دہلی سلطنت از سید معین الحق ص ۲۱

ایک مندر بنوا کر اس میں اُسے نصب کر دیتے تھے اور یہ پنڈت جی اس کے مہتمم بن بیٹھے تھے[1]"

ان تمام فرقوں نے اپنے اپنے دیوتاؤں کی تعریف اور دوسروں کی تحقیر کے لئے کتابیں تصنیف کیں۔ جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔ یہ سب جہالت کے کرشمے تھے جس کا ایک نمونہ سطور ذیل میں ملے گا۔

چیلہ بنانے کا طریقہ وام مارگی کسی کو اپنا چیلہ بناتے وقت کچھ منتروں کے پڑھنے کی تلقین کرتے تھے منتروں کو یاد کراتے وقت چیلہ کی امیری و غریبی کو ملحوظ رکھا جاتا تھا۔ چیلہ اگر غریب ہوتا تھا تو صرف "دم دُرگائے نمہ"[2] "بھم بھیروائے نمہ"[3] "ایں، ہریم، کلیم، چامنڈائے وِچے" وغیرہ منتروں کی تلقین کی جاتی تھی۔ بنگال میں صرف ایک لفظ کی تلقین کرتے تھے جو "ہریم، شریم، کلیم" وغیرہ پر مشتمل ہیں۔ اگر چیلا مالدار ہوتا تھا تو اس کو سب منتروں کے پڑھنے کی اجازت تھی۔

منتروں کا استعمال عورتوں کے اغوا کرنے، زوجین کے درمیان نفرت پیدا کرنے یا مطلوب کو اپنانے کے لئے منتر پڑھے جاتے تھے بعض اوقات کالی دیوی کو بھینٹ دینے کے لئے کسی آدمی کی قربانی کی جاتی تھی اس موقع پر بھی منتر پڑھے جاتے تھے اِس قربانی کا گوشت بھی استعمال کیا جاتا تھا۔ دشمنوں کو مغلوب کرنے کے لئے جو منتر پڑھے جاتے تھے وہ کچھ اِس قسم کے تھے۔

"مارے ۲، اُچاٹے ۲، وِدّوشے ۲، چھیندھیے ۲، بھیدھے ۲، وُشی کرو ۲، کھادے ۲، بھکشے ۲، تروٹے ۲، ناشے ۲، مم شتروں وشی کرو ۲، ہم پھٹ سُواہا"[4]

---

[1]: ستیارتھ پرکاش انگریزی ترجمہ ص ۴۲۴ ۔ [2]: اس منتر کے معنی ہیں "ہم درگا (دیوی) کو نمسکار کرتے ہیں"

[3]: اس منتر کے معنی ہیں "ہم بھیرو (مہادیو یا شیو) کو نمسکار کرتے ہیں" ۔ [4]: دو کا ہندسہ اسلئے بنا دیا گیا ہے کہ ہر حرف کو دو مرتبہ پڑھا جائے مثلاً "مارے مارے" وغیرہ

(باقی مضمون صفحہ ۴۹۶ پر)

اعمال و عقائد

وام مارگیوں کا عقیدہ تھا کہ م[1] سے شروع ہونے والی پانچ اشیاء یعنی شراب، گوشت، مچھلی، روٹی اور زنا کا کثرتِ استعمال نجات کا سبب ہیں۔ یہ بھی خیال تھا کہ جو شراب کا ضرورت سے زیادہ استعمال کرتا ہے یعنی پیتا ہے اور خوب پیتا ہے یہاں تک کہ پیتے پیتے زمین پر مدہوش ہو کر گر پڑتا ہے پھر اٹھتا ہے اور پھر پیتا ہے اس طریق عمل سے وہ بار بار جنم لینے کے چکر سے نجات پا جاتا ہے[2]۔

یہ یقین رکھتے ہوئے کہ تمام آدمی انسان کے روپ میں شیوجی کا اوتار ہیں اور عورتیں پاربتی کا اسلئے اُن کے نزدیک اس میں کوئی ہرج نہیں کہ آپسمیں (خواہ وہ کسی وزن یا قبیلہ کے ہوں) زنا کا ارتکاب کریں[2]۔ اس لئے کو انھوں نے اتنا بڑھایا کہ "حائضہ کے ساتھ عمل زوجیت کرنا پشکر کے پوِتّر (پاک) تالاب میں نہانے کے برابر قرار دیا۔ نیچ ذات کی عورت سے ملوث ہونا بنارس کی یاترا کے برابر ٹھہرایا۔ چمارن کے ساتھ منہ کالا کرنے کو الہ آباد میں گنگا نہان کے برابر جانا، دھوبن کے ساتھ ناجائز تعلقات کو متھرا کی یاترا کے برابر اور ایک طوائف کے ساتھ اخلاق و شرافت کا خون کرنے کو اجودھیا کی یاترا (زیارت) کے برابر سمجھا[3]۔"

بقیہ فٹ نوٹ ۴۴۵ ۔ مطلب یہ ہے قتل کر قتل کر (طالب مطلوب کے درمیان) نفرت پیدا کر، بدنام کر بدنام کر، قطع کر قطع کر، پھاڑ پھاڑ، مغلوب کر مغلوب کر، کھا کھا، نگل نگل، توڑ توڑ، فنا کر فنا کر، میرے دشمنوں کو مغلوب کر وغیرہ (کام رتن تنتر منتر ۵ بحوالہ ستیارتھ پرکاش مترجمہ ص ۱۹۵) ۔

[1] मद्यं मांसं च मीनं च मुद्रा मैथुन मेव च । एते पञ्च मकाराः स्युर्मोक्षदा हि युगे युगे (کالی تنتر، ستیارتھ پرکاش مترجمہ ص ۳۸۵)

[2] ۔ مہانروان تنتر بحوالہ ستیارتھ پرکاش مترجمہ ص ۳۸٦ — पीत्वा पीत्वा पुनः पीत्वा यावत्पतति भूतले । पुनरुत्थाय वै पीत्वा पुनर्जन्म न विद्यते ॥

[2] ۔ ، ، ، ، ص ۳۸٦ — अहं भैरव स्त्वं भैरवी ह्यावयोरस्तु सङ्गमः ॥

[3] ۔ रजस्वला पुष्करं तीर्थं, चाण्डाली तु स्वयं काशी, चर्मकारी प्रयाग.

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ وام مارگیوں کا ضمیر اُن کے بیہودہ افعال پر ملامت کرتا ہے۔ اسلئے وہ مَا (میم) سے شروع ہونے والی پانچوں اشیاء کو عمدہ الفاظ کا خوبصورت جامہ پہنا کر پیش کرتے ہیں چنانچہ شراب کا نام انھوں نے یا ترار کھا، گوشت کا صفائی اور مچھلی کا نام پھول رکھا وغیرہ وغیرہ۔[1]

اُن کا کہنا یہ ہے کہ سوشل اجتماع کی موقع پر سب لوگ خواہ وہ برہمن ہوں یا نیچ ذات کے اچھوت سب کے سب اُوچ (اعلیٰ ذات) ہوجاتے ہیں لیکن تقریب ختم ہونے کے بعد سب اپنی اپنی سابقہ حیثیتوں پر واپس ہوجاتے ہیں یعنی برہمن برہمن ہوجاتا ہے اور اچھوت اچھوت بن جاتا ہے۔ ایک خاص تقریب میں جس میں سب وام مارگی اکٹھا ہوتے ہیں ایک نشان مثلث یا مربع یا دائرہ کی شکل کا زمین یا تختہ پر بنا کر اس پر شراب سے بھرا ہوا گھڑا رکھتے ہیں اور اس کی پوجا کرتے وقت یہ منتر پڑھتے ہیں "اے شراب تو برہما کے عتاب یا بددعا سے بری ہے یعنی تجھ پر عتاب نہیں ہے[2]"۔ اس کے بعد ایک پیالہ میں شراب بھرتے ہیں اور ایک رکابی میں گوشت اور مٹھائیاں رکھتے ہیں ان کا مہنت اس پیالہ کی شراب کو یہ کہکر کہ میں بھیروں یعنی شیو ہوں پی لیتا ہے پھر اسی پیالہ سے یکے بعد دیگرے سب حاضرین شراب بھر بھر کر پیتے ہیں اور ایک عورت کو مادرزاد ننگا کر کے اور اس کے ہاتھ میں تلوار دیکر دیوی (درگا) کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور اس کی پوجا کرتے ہیں۔ اسی طرح عورتیں ایک مرد کو مادر زاد ننگا کر کے اور اس کی ہاتھ میں تلوار دیکر مہادیو کے نام سے اس کے لنگ کی پرستش کرتی ہیں۔ (اس دوران میں

---

[1]:۔ ستیارتھ پرکاش مترجمہ صفحہ ۳۸۷ [2]:۔ ستیارتھ پرکاش مترجمہ صفحہ ۳۸۷

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۴۴۶)

स्याद्रजकी मधुरा मता प्रवोध्या पुक्कसी प्रोक्ता ॥ रुद्रयामल तन्त्र

غالباً) شراب کا دور جاری رہتا ہے یہاں تک کہ اُن پر مدہوشی کا عالم طاری ہوجاتا ہے
اور اسی عالم میں پھر جو ہونا ہوتا ہے وہ ہوتا ہے۔ اِس موقع پر ماں، بہن، بہو، بیٹی
وغیرہ سب مباح ہیں[1]

اِس مجمع میں کثرتِ شراب نوشی کی وجہ سے اگر کسی کو قے ہوجائے تو ان میں
کامل ترین انسان جس کو "اگھوری" کہتے ہیں اس کو بطیب خاطر کھالیتا ہے۔ کامل
انسان ہونے کا معیار بھی ملاحظہ ہو "جو شخص شراب خانہ میں بوتل پر بوتل خالی کرے
اور رات طوائفوں کے یہاں بدچلنی میں گذارے یا اسی طرح کے اور بُرے کام بلا شرم و
لحاظ کرے وہ انسان وام مارگیوں کے نزدیک پورے عالم کا شہنشاہ ہے[2]"۔ ان کے
نزدیک عرفان حاصل کرنے کی دس منزلیں ہیں ان میں سے ایک کا نام "ماتنگی" ہے
یہ وہ منزل ہے جس میں انسان ماں کو بھی اپنے لئے حلال سمجھتا ہے۔ نعوذ باللہ من شرورھم

وام مارگیوں میں کئی فرقے ہیں۔ اگھوریوں کے نزدیک مردہ لاش کا گوشت کھانا
ایک امر مستحسن ہے جبکہ ان کے اَجاری اور بَجاری طبقے بول و براز کے استعمال سے بھی
گریز نہیں کرتے۔ اعمال کے لحاظ سے ان میں دو جماعتیں ہیں ایک کو "چولی مارگی"
کہتے ہیں اور دوسری کا نام "بیجا" یا "بیج مارگی" ہے۔ چولی مارگی اُس خاص تقریب کے
موقع پر جس کا ذکر کیا جاچکا ہے تمام عورتوں کی چولیاں اُتروا کر ایک برتن میں خلط ملط کر دیتے ہیں

---

[1]:۔ ستیارتھ پرکاش انگریزی ترجمہ ص ۳۸۷

[2]:۔ " " " " ص ۳۸۸، گیان سنکلنی تنترا شلوک ۴۳۔

हालां पिवाते दीक्षितस्य मन्दिरे सुप्तो निशायां गणिका गृहेषु ।
विराजते कौलवचक्रवर्ती ॥

पाशबद्धो भवेज्जीवः पाशमुक्तः सदा शिवः ॥

پھر مدہوشی کے عالم میں جس کی چولی جس کے ہاتھ میں آجائے وہ عورت اس کے لئے مباح ہوجاتی ہے۔ نیچ مارگی گروہ اُس خاص تقریب کے موقعے جبکہ حرارت عزیزی کا اخراج کا وقت ہوتا ہے اپنی حرارت عزیزی کو پانی میں گرادیتے ہیں اور اس کو حل کر کے پی جاتے ہیں اُن کے خیال میں یہ طریقہ نجات کا واحد ذریعہ ہے۔[1]

وام مارگیوں کی سرکوبی اِس قسم کے بیہودہ افراد یا جماعتوں کی گندگی سے سوسائٹی کو محفوظ رکھنے کے لئے سلاطین دہلی نے بہت کچھ احتیاطی تدابیر اختیار کی ہونگی اور ظاہر ہے کہ محکمۂ احتساب کی بازپرس اور کڑی نگرانی نے اِس جماعت کے بڑھنے اور سرسبز ہونے کی قوت کو ختم کردیا ہوگا۔ ہندوستان کی سوسائٹی پر سلاطین ہند کا یہ وہ احسان ہے جس کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

گمان غالب یہ ہے کہ مذکورۂ بالا طرز کے اباحتیوں کی ذہنی وعملی برائیوں اور گندگیوں کے دور کرنے میں قریب قریب ہر سلطان نے حصّہ لیا ہے کیونکہ محکمۂ احتساب بعض سلاطین کی بے عنوانیوں کے باوجود برابر قائم رہا۔[2] اور اپنا کام کرتا رہا لیکن تاریخی شواہد کی رُو سے اولیت کا شرف[3] سلطان علاء الدین خلجی[4] کو حاصل ہے اور اس کے بعد سلطان فیروز تغلق[5]

ع[1]:۔ ستیارتھ پرکاش انگریزی ترجمہ ص ۹۵-۹۶

ع[2]:۔ ملاحظہ ہو ایڈمنسٹریشن آف دہلی سلطنت از قریشی ص ۱۴۹ تا ص ۱۶۵

ع[3]:۔ اِس کے یہ معنی نہیں کہ اِس ضمن میں سلطان التمش، ناصر الدین محمود اور بلبن جیسے نیک و دریاکبانہ سلاطین نے کچھ نہیں کیا۔ ان کی سیرتیں خود اِس امر کی شاہد ہیں کہ انھوں نے سوسائٹی کے اخلاقی معیار کو بلند کرنے میں کتنا بڑا حصّہ لیا ہے۔

ع[4]:۔ فرشتہ ص ۱۲۰

ع[5]:۔ سیرت فیروز شاہی ص ۱۴۶، فتوحات فیروز شاہی انگریزی ترجمہ ص ۱۸

کو یہ سعادت نصیب ہوئی کہ وہ سوسائٹی کو ان وام مارگیوں کی بیہودگیوں اور لغویتوں سے پاک وصاف کرے۔

اس سوال پر کہ جن اباحتیوں کا فیروز تغلق نے استیصال کیا آیا وہ وام مارگی تھے[1] یا اسمٰعیلیہ بڑا اختلاف ہے۔ مورخین کی ایک جماعت کا خیال ہے کہ وہ اسمٰعیلی تھے۔ وہ اپنے خیال کی تائید میں کتاب الفصل فی الملل حصہ چہارم ص ۱۸۵ مصری نسخہ مطبوعہ ۱۳۲۱ھ اور فتوحات فیروز شاہی[2] کی ایک عبارت پیش کرتے ہیں۔ جہاں تک اسمٰعیلیوں کے خفیہ افعال وکردار کا تعلق ہے بلاشبہ ان میں اور وام اچاریوں میں بہت کچھ مماثلت پائی جاتی ہے[3]۔ لیکن ان کا دائرۂ عمل دہلی اور اس کے اطراف کے بجائے زیادہ تر بلوچستان، سندھ، ملتان اور گجرات کے بعض اقطاع پر محدود تھا۔ افغانستان میں بھی ایک گروہ کا پتہ چلتا ہے جو اپنے کو "جمگنی"[4] کے نام سے موسوم کرتے ہیں ان کو چراغ کش بھی کہتے ہیں کیونکہ ان کا پیر اس خاص تقریب میں چراغ گل کر دیتا تھا اس کے بعد وہ تمام لغویتیں ہوتی تھیں جن کا تذکرہ کیا جا چکا ہے۔

مورخین کی دوسری جماعت[5] ان لوگوں کو وام مارگی سمجھتی ہے کیونکہ ان اباحتیوں کے تمام رسم ورواج وام مارگیوں کی طرح تھے لیکن وام مارگیوں کی جو بعض خصوصیتیں[6] بیان کی گئی ہیں مثلاً بت پرستوں کی طرح زمین کو گوبر سے لیپنا، چاول اور پھول چڑھانا

---

(۱): فٹ نوٹ خزائن الفتوح از پروفیسر محمد حبیب انگلش ترجمہ ص ۱۲ ۔ (۲): فتوحات فیروز شاہی کے صرف ایک نسخہ میں اباحتیوں کو شیعہ لکھا ہے ورنہ یہ عبارت کسی اور نسخہ میں نہیں ملتی۔

(۳): پریچنگ آف اسلام از ٹی، ڈبلیو آرنلڈ ترجمہ محمد عنایت اللہ ص ۲۲۵ و ص ۲۹۰

(۴) The Races of Afghanistan by H. W. Bellew Calcutta 1880

(۵): ایڈمنسٹریشن آف دہلی سلطنت از قریشی ص ۱۶۵-۱۶۹ باب ہشتم

(۶): سیرت فیروز شاہی ص ۱۴۷

یہ باتیں اسمٰعیلیوں سے ممکن نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ اسمٰعیلی تمام شویتوں کے مرتکب ہوسکتے ہیں لیکن وہ بُت پرست نہیں ہوسکتے۔ اسلئے فیروزشاہ نے جن اباحیتوں کا استیصال کیا وہ یقیناً وام مارگی ہی تھے۔ دہلی کے علاوہ اس نے جگناتھ پوری[1] میں بھی ان لوگوں کی خبر لی ہے لیکن سندھ وغیرہ میں جہاں قرامطہ و اسمٰعیلیہ کا ایک عرصہ تک زور رہا اس قسم کی کوئی تاریخی مثال ہمارے سامنے نہیں کہ اس نے ان لوگوں کی مفروضہ بیہودگیوں کا سدباب کیا ہو۔

---

[1] :۔ سوامی دیانند سرسوتی نے جگناتھ پوری میں وام مارگیوں کا ہونا تسلیم کیا ہے۔ ملاحظہ ہو ستیارتھ پرکاش باب یازدہم ص ۴۲۳



صحت نامہ

تاریخ ہندی قرونِ وسطیٰ جلد دوم

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱	۹	سبھتیا	سبّھتیا	۴۸	۶	غلطی	غلط
۳	۱۱	سنہ ۴۸ء	سنہ ۴۷ء	۵۷	۱۰	عقیل	تحصّل
۳	۱۴	سالوں	مسالوں	۵۸	۳	۶۵۹۵	۶۹۹۵
۱۰	۱۵	پیڑرو	پیرو	〃	۶	عقیدالدولہ	عضدالدولہ
۱۱	۱۵	ٹھکر	ہٹ کر	۶۲	۱۱	فراری	فزاری
〃	۱۹	تھٹی	تلہٹی	۷۸	۲۰	مشہور ہے	مشہور رہے
〃	۲۰	لینڈاؤن	لینسڈاؤن	۸۱	۱۸	بجارا میں کثرت رائے سے	بجارا میں امراء کی کثرت رائے سے
۱۳	۷	دردودھک	وِڑوڈھک	۸۷	۱۰	سوتا ہے	سونا ہے
۲۵	۱۴	ردکدینے	روک دینے	۸۹	۱۳	جب امیرلے	جب امیر نے
۳۲	۱۲	الکبیر	الکبیر	〃	۱۹	سرے	پر ہمارے
۳۹	۷	ونیز	نیز	۱۵۴	۵	تیسادھ چرت	نیسادھ چرت
۴۴	۶	اموئی	اموی	۱۶۵	۲۱	مجتمع کردیا	مجتمع کرایا
〃	۹	قسطاط	فسطاط	۱۶۶	۱	پرتھوی	پرتھوی راج
۴۵	۱۲	ہمں	میں	۲۰۲	۱۹	ضمیرہ	حمزہ

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۲۰۴	۸	گہرام	گھرام
۲۰۹	۴	خوارذمی	خوارزمی
۲۱۶	۱۱	سید تعلی	سید تعلی تھے
۲۳۱	۶	خضر	خزر
۲۵۰	۴	سلطانہ	سلطان
۲۵۲	۶	〃	〃
۲۵۵	۷	〃	〃
۳۰۵	۱۹	فرخ لقا	فرخ لِقا
۳۰۸	۹	ملک باریک	ملک باربک
۳۲۴	۱	جھابن	جھاین
۳۳۵	۲۱	ع۳	ع۲
۳۶۶	۱۲	سلطان	سلطان نے
۳۷۱	۱۹	ہم	مہم
۳۷۸	۱۰	مرحوم	متوفی
۳۹۷	۲۲	چیتل	جیتل
۳۹۷	۱۴	فریۃ	فریہ
۳۹۹	۵	بیوقوت	بیوقوف

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۴۰۱	۱۲	علاء الدین نے	علاء الدین
۴۰۲	۱۸	اُسنے	اُسے
۴۰۷	۱۷	علی گڑھ میگزین	علیگڑھ ہسٹاریکل جرنل
۴۰۸	۱۳	ع۱	ع۴
〃	۲۰	ع۲	ع۱
۴۱۳	۲۰	ع۲	ع۱
〃	۲۱	ع۳	ع۲
۴۴۳	۱۳	ڈیمیٹریس	ڈیمیٹریس
〃	۱۸	وغیرہ	وغیرہ کی
۴۴۵	۱۸	تترّون	شترّون
۴۴۶	۷	وزن	وُزن
〃	۸	ع۲	ع۳
〃	۱۲	ع۳	ع۴
〃	۱۵	ع۵	ع۱
〃	۱۸	ع۱	ع۲
۴۴۹	۲	موقعے	موقع پر

the Quraishis and the Ansaries—are still about a third of the total city population.

Why the surviving Hindu governing classes, both within the Empire and outside it, did not change their outlook in spite of their bitter lessons it is hard to explain. Great Hindu thinkers arose in the middle ages insisting like Alberuni on all that was good in ancient Hinduism. But we hear of no reforming Raja. Things changed after the advent of Akbar the Great. But during the Sultanate period every independent Rai felt it is his duty to tread, regardless of experience, in the tragic footsteps of Dahir, Prithvi Raj and Jaichand At the political level no reformation of Hinduism seemed possible And throughout the middle ages Hindu government implied that subjection of the working classes which to the author of the Code of Manu was the first principle of the Aryan social order.

If we remember that the governing classes of the Empire of Delhi lived on the surplus value of the labour of the workers and peasants, and that governments, which exploit the city workers, can at the same time be only established with their support, **Shri Bashir Uddin Pandit's careful narration of the events of the middle ages will be found highly instructive It is based on a careful study of the great classics of medieval India to which ample references have been made in the course of the work.**

It is to be earnestly hoped that Shri Bashir Uddin Pandit will complete both in Urdu and Hindi the work he has so well begun.

MOHAMMAD HABIB.

Dated 21st July, 1949.

the quality of manufactured goods, artists and artisans of all types flocked to the great cities; and they were welcomed and encouraged. Workers could now flock to the cities without restriction and show what they were worth. The weaver, the greatest of all producers after the peasant, had been kept very low under the old regime, he now attained to a position of honour among the working classes. The safety of the roads led to brisk business on the part of the merchants and the state was not slow to realise that transport creates value. The governing class of the Delhi Sultanate changed repeatedly, but every class that came to power stuck to the principle of free contract and mobile labour.

Islam as a religion did not make much progress in the land. Apart from East Bengal, Sind and West Panjab, it made scant progress in the country side. Though a Muslim governing class was in the country for five centuries. Muslims are now only about 14% in the Indian Union Their proportion in the rural areas of the Union as a whole would hardly be 3% This shows that there was either no Muslim missionary effort in the country side or else that it found no response owing to the resistance of the present groups. Among the working classes of North Indian cities, on the other hand, Islam made a fairly rapid progress. A careful examination of all available evidence shows that a substantial proportion of the working class had adopted the new path by the time of Alauddin Khilji. Judging from the size of the Suroeding, Id mosques, of the towns, the strength of the imperial armies, the constant revolts in which the working class took part and the decisive, though transient influence it exercised in times of crises, the Muslim working class could hardly have been less than half the total population of the cities of Northern India. During the British period the proportion has changed, but Muslim workers of purely Indian blood,—

than slave labour. And the class that makes a tran ition from one form of exploitation to the other well roll in enormous profits The governing classes of the Delhi Sultanate certainly did so.

I do not suggest that the Ghorian invaders brought about the great revolution consciously. They had not, frankly, the brains to plan anything so great and merely enforced the system with which they were acquainted. But the Medina of the Prophet was an egalitarian working-class republic. Tribal pretences apart, it knew nothing of kings or aristocracies or caste or status. As Islam spread into foreign lands, the regime of free contract was automatically enlarged. But one Arab statesman at least knew what he was doing. In his instructions to Mohammad bin Qasim the great Hajjah repeatedly gives orders that three classes—peasants, artisans and traders be offered unconditional protection and promise of assistance. They are the classes that create surplus value, and the greater the contractual freedom allowed to them, the greater would be the profit of the governing class that controlled the state. And after this had been done and the former government of Sind was in the process of dissolution, Mohammad bin Qasim was ordered to win over the Brahmans by granting them their old hereditary posts along with 3% of the state revenues for the maintenance of their temples. Well organised exploitation always proceeds through a series of intermediaries, drawn from the exploited group.

Viewed in the context of world-history—and this is the only perspective in which it can be properly viewed—the Ghorian Turks succeeded because in the place of caste economy and the caste-ideology they substituted a regime of free and mobile labour. The working classes of the Indian cities could not have freed themselves by their own efforts; the Turks did it for them and reaped the reward. There was an immediate improvement in

It should not be understood to mean that the exploitation of the workers and the peasants disappeared. Nothing of the sort. The middle ages were full of labour troubles. Unemployment was often acute. The low-wages which our bourgeois historians approve and the low-prices of manufactured goods which they welcome must have been a veritable curse to the working classes. The Kotwal was ordered to keep an eye on labour discontent. The state was often driven to find work for the unemployed and undertook to put up useless public structures, like the Alai Minar and the arches of the Qutb Mosque, which it had no intention of completing. It is a sad comment upon the labour conditions of the day that any number of people on immediate payment of wages could be found to risk their necks in the most hazardous and hopeless of political enterprises. The peasantry was often in a sulky mood. It sometimes revolted because it was oppressed; at other times, finding the imperial administration weak, it extinguished it for a time. An organised and effective labour protest was, unfortunately, not under the conditions of the time possible. Among the Hindu and Muslim mystics of the middle ages there was a definite dream of a classless society, But outside the doors of Khanqah and the mat it had to remain a dream.

Though all societies hitherto have been based on exploitation, this exploitation may be on different levels and with different result. The old exploitation was on the caste-level—the same level as the helotage of classical Greece and the slavery of Egypt and Crete. The new exploitation was based on free wages and mobile labour, which are the basis of the medieval shariat. "The well-pleased labourer does more work" says a well-known Persian (verse). Or to put it in Marxian terminology, when the processes of production have reached a certain stage, free wage labour produces greater surplus value

survival of the restrictions on the working classes which the Code of Manu prescribes and which Alberuni found in full operation.

The Turkish conquest has often been represented as a foreign conquest Thus it, no doubt, was. For about a century the slave officers of Shahabuddin and their descendents held an exclusive sway over the land and the Rais, Ranas and Rawats were either liquidated or took a position subordinate to the Khans and Maliks of the Empire But the change was none-the less a revolt of the Indian city worker against their former governing class, ne power of which was completely eliminated from all cities of northern India. Only a few Rais were left in charge of their second-rate towns.

For side by side with the Turkish ruler came the Qazi and his Shariat. The Shariat of the Mussalmans had no public law; it knows of nothing of political rights and is only concerned with private or personal rights. It left the religious law and social customs of non-Muslims untouched. There are a few provisions of the Shariat e g. that the evidence of one Muslim is equal to that of two non-Muslims which have always troubled the conscience of the Musalmans and the self-respect of the non-Muslims But such discriminatory laws are hardly a dozen in number. All the other provisions of the sharlat, called muamilat, which deal with the relations of man and man—the law of crimes, contracts of service, sales and so forth—are based on the doctrine of absolute legal equality. **There can be no question of status in the sharlat of the Mussalmans; it is the very reverse of caste ideology.** Ordeal as a means of deciding civil suits and proving the innocence or guilt of the accused was swept aside and replaced by rules of evidence. In the punishment of crimes as well as in all civil suits no difference was tolerated on the ground of caste or status. The caste-system remained but only as a private affair of the Hindu community.

doctrine of **chut**. The Turks would never have succeeded had they not found an oppressed class of peasants and city workers not only indiferent to their rulers but inclined to welcome the change

The same causes which led to the rapidity of the Turkish conquest also conduced to its permanence Shri Bashiruddin Pandit refers to the fact that during the five or six centuries that Muslim kings ruled the land there wes no national revolt though the movements for Hindu religious revival were continuous. The city workers on the whole, preferred a Muslim ruler for his position guaranteed them against Caste-oppressor. Of the at tempts of the Hindu religious leaders to reform the evils of the caste-system it is unnecessary to speak in detail. But one of these revivalist movements had a country-wide success. Organised Hinduism struck to the caste system, and so long as it did so, there was really no alternative to a Muslim, and, later on, to a Muslim cum Rajput governing class.

The Turkish rulers of the thirteenth century did not concern themselves with the religion and the social customs of the people. In their Turkish hamelands the Mongols ruled supreme and city after city of Central Asia, Persia and Iraq had been sacked and devastated. They could not afford to go home ; there was no home to which they could go. They had to live in the country under the conditions their social environment prescribed. Consequently they had to win over the city workers. Wherever the Ghorian rule was established, all caste-restrictions which had been enforced by the state automatically disappeared Residence in the city was now possible for all Caste-privileges with reference to public law were swept off as an immediate and inevitable result of the conquest. Detailed records of the conditions of the towns of northern India during the Sultanate period have survived. We find no reference anywhere to any

in the battles that heralded the Turkish conquest, we find heroic feats of valour alternating with battles in which elephants, horsemen, footmen and campfollowers fled almost immediately after the fighting began. We hear of enormous armies, apparently swelled by riff raff and camp followers but they achieved nothing. Had the Indian peasantry made up its mind to support the governing class of India, the Turkish conquest would never have been attempted But at no stage do we find the peasantry loyal to the governors, though before the thirteenth century had drawn to its close, the Indian footman (**palk**) had become one of the great buttresses of the military ane administrative machine of the Empire of Delhi.

If afraid of an open battle, the Rai and his high caste followers withdrew into their fort, their doom was sealed, provided the besiegers were persistent enough. The fort as a means of defence was almost always futile. The working classes for caste reasons could not be taken inside the walled city or the fort. Had they any alternative but to obey the conqueror and support him. "You have taken refuge in a high fort", the citizens of Sivistan wrote to Bijhra, a cousin of Raja Dahir of Sind when they found themselves helplessly at the mercy of Mohammad bin Qasim, "and we are afraid that these people will come, and as they consider us to be your followers, they will destroy us and deprive us of our lives and properties". Many working class groups in the twelfth and the thirteenth century must have felt the same when they found that their ruler had left them outside the fort to be harrassed and plundered by the Turks. Never in the recorded history of mankind has a country so great and so prosperous been lost with such egregious folly.

Though there were other contributing causes, the rapidity of the Indian collapse was due to one fundamental fact—the caste system and its theological basis, the

stable-officer to the king's inspector "The king's horses are in the register, no doubt, but they are not in the stables".

The Ghorian conquest, occurring at such a time, should be interpreted not as Turkish achievement but as an Indian Collapse. The Indian working classes had been reduced to such a condition that they refused to fight for their rulers and in fact fought against them.

Mohammad bin Qasim had two distinct advantages over his enemies. He had a large stock of naphtha or Greek fire and he had brought manjaniqs with him to India for the first time. The Turks of the twelfth century had no such advantages The Indians had learnt the art of making manjaniqs, and we find them used extensively by both sides. Naphtha was not available to either party. In fighting capacity the two parties should have been at par. But the working classes, the legal and social position of which we have examined definitely, turned the scale.

The critical student of history will do well to get a correct image of the conditions of India at the time. All cities were fortified and, as a protection against malaria, most of them were on an elevation The members of the four castes lived within the cities, and at night the gates were locked. The workers—peasants, weavers, butchers, fuller, sweepers etc. on whom the city depended for the continuation of its daily life lived outside; they entered in the morning and were locked out at night. While doing their duties in the city – duties without which the citizens would be paralysed – the workers were treated as submen.

Now what would be the position of the Indian warriors in an open battle. If they died fighting, it would be all right. They shared the fate of heroes. But one fights in order to win and not in order to die. The art of war is not a method of suicide ; it is an effort for victory. But here the Indian warrior was at a loss. He could not afford to be captured. And so

adhered to and the laws effectively enforced. In the struggle of nations it is only these operative principles that count.

No student of history will give a high place to Shahabuddin and his officers for their military skill They were capable administrators and they had a bull dog tenacity of purpose. But no spark of military genius is visible in their plans They marched and fought like everybody else blindly following the traditional principles. Nevertheless very seldom has a country so large been conquered so quickly. In 1191 A D. Shahabuddin Ghori was defeated by Rai Pithaura at the battle of Tarain. In 1205 A. D Bakhtiyar Khilji was knocking at the frontiers of Tibet

The conquest was rapid; it was also permanent. Both phenomena need explanation.

All Muslim historians are agreed that the morale of Muslim Asian society was its worst during the Ghorian period. In 1205 Shahabuddin Ghori, the conqueror of northern India, was signally defeated by the Khwarazmians and the Kara-Khitais at Andkhud. The Ghorian Empire could never recover from the blow and Ghor along with other territories (now known as Afghanistan) became provinces of the Khwarazmian Empire. In 1218 A D. Chengiz began his remarkable invasion of Muslim Asia and no substantial resistance could be offered to the Mongols by any Muslim city, province or kingdom during the next thirty years. It was only after Baghdad had been sacked and the princes of Russia had been reduced to subjection that the Mongol conquest came to a halt. Allauddin Ata Malik Jawaqni very rightly attributes the complete subjection of the Turks and the Persians to the decline of their morals, specially in the military and political sphere. If the Khwarazmian Emperor summoned a handred officers to the muster, only ten cared to appear. And he quotes as typical the explanation of a

addressed their prayers—*viz.* the idol—they will proceed to worship those whom they address, because they have not learned to know Him, whilst He, by admitting this kind of intermediation, carries their affairs to the desired end. But that which is obtained by desires and intermediation is not lasting, since it is only as much as is deserved for any particular merit. Only that is lasting which is obtained from God alone, when people are disgusted with old age, death, and birth (and desire to be delivered therefrom by Moksha).

"This is what Vasudeva says. When the ignorant crowd get a piece of good luck by accident or something at which they had aimed, and when with this some of the preconcerted tricks of the priests are brought into connection, the darkness in which they live increases vastly, not their intelligence. They will rush to those figures of idols, maltreating their own figures before them by shedding their own blood and mutilating their own bodies.

"Veda means knowledge of that which was before unknown. It is a religious system which, according to the Hindus, comes from God, and was promulgated by the mouth of Brahman. The Brahmans recite the Veda without understanding its meaning, and in the same way they learn it by heart, the one receiving it from the other. Only few of them learn its explanation, and still less is the number of those who master the contents of the Veda and their interpretation to such a degree as to be able to hold a theological disputation."

Such quotations could be multiplied both from Alberuni and the sacred texts. But what matter in a nation's existence are not the great tenets of the sacred texts piously ignored or explained away or the character, however noble of small and ineffective, magestic groups, but the operative principles of national life—the customs actually

these castes is capable of attaining to liberation; for, according to some, only the Brahmana and Kshatriya are capable of it, since the others cannot learn the Veda, whilst according to the Hindu philosophers, liberation is common to all castes and to the whole human race, if their intention of obtaining it is perfect. This view is based on the saying of Vyasa: "Learn to know the twenty-five things thoroughly. Then you may follow whatever religion you like; you will no doubt be liberated." This view is also based on the fact that Vasudeva was a descendant of a Sudra family, and also on the following saying of his, which he addressed to Arjuna, "God distributes recompense without injustice and without partiality. He reckons the good as bad if people in doing good forget Him ; He reckons the bad as good if people in doing bad remember Him and do not forget Him, whether those people be Vaisya or Sudra or women. How much more will this be the case when they are Brahmana or Kshatriya."

"We shall now mention their ludicrous views; but we declare at once that they are held only by the common uneducated people. For those who march on the path to liberation, or those who study philosophy and theology, and who desire abstract truth which they call *sara*, are entirely free from worshipping anything but God alone and would never dream of worshipping an image manufactured to re-present him."

In the same book Vasudeva speaks to Arjuna : "Do you not see that most of those who wish for something address themselves in offering and worshipping to the several classes of spiritual beings, and to the sun, moon, and celestial bodies? If now God does not disappoint their hopes, though he in no way stands in need of their worship, if he even gives them more than they asked for, and if he gives them their wishes in such a way as though they were receiving them from that to which they had

"53. A man who fulfils to religious duty, shall not seek intercourse with them; their transactions (shall be) among themselves and their marriages with their equals.

"54. Their food shall be given to them by others (than an Aryan giver) in a borken dish; at night they shall not walk about in villages and in towns.

"55. By day they may go about for the purpose of their work, distinguished by marks at the king's command, and they shall carry out the corpses (of persons) who have no relatives; that is a settled rule.

"62 Dying, without the expectation of a reward for the sake of Brahmans and of cows, or in the défence of women and children, secures beatitude to those excluded (from the Aryan community, vahya).

"64. If (a female of the caste), sprung from a Brahmana and a Sudra female, bear (children) to one of the highest caste, the inferior (tribe) attains the highest caste within the seventh gereration.

"65. (Thus) a Sudra attains the rank of a Brahmana, and (in a similar manner) a Brahmana sinks to the level of a Sudra; but know that it is the same with the offspring of a Kshatriya or of a Vaishya.

"66. If (a doubt) should arise, with whom the pre-eminence (is, whether) with him whom an Aryan by chance begot on a non-Aryan female, or (with the son) of a Brahmana woman by a non-Aryan.

"67. The decision is as follows: "He who was begotten by an Aryan on a non-Aryan female, may become (like to) an Aryan by his virtues; he whom an Aryan (mother) bore to a non-Aryan father (is and remains) unlike to an Aryan.

"73. Haviug considered (the case of) a non-Aryan who acts like an Aryan, and (that) of an Aryan who acts like a non-Aryan, the creator declared, "Those two are neither equal nor unequal".

There was, of course, all the time a higher Hinduism which believed in the one and the unseen God, which condemned idolatory and considered all men equal. Most of Alberuni's work is devoted to the study of this Hinduism and some of his remarks are worth quoting —

"The Hindus differ among themselves as to which of

equal to himself) on a female of his own race, even so is the order in the case of the excluded (races, vabya).

"29. Those (six mentioned above) also beget, the one on the females of the other, a great many (kinds of) despicable (sons), even more sinful than their (fathers), and excluded (from the Aryan community, vahya).

"30. Just as a Sndra begets on a Brahman female a being excluded (from the Aryan community), even so (a person himself) excluded procreates with (females of) the four (sons) more (worthy of being) excluded (than he himself).

31. But men excluded (by the Aryans, vahya), who approach females of higher rank, beget races (varna) still more worthy to bo excluded, low men (Hina) still lower races, even fifteen (in number).

"40. These races, (which originate) in a confusion (of the castes and) have been described according to their fathers and mothers, may be known by their occupations, whether they conceal or openly show themselves.

"41. Six sons, begotten (by Aryans) on women of equal and the next lower castes (Anantara), have the duties of twice-born men; hut all those born in consequence of a violation (of the law) are, as regards their duties, equal to Sudras.

"43. But in consequence of the omission of the sacred rites, and of their not consulting Brahmanas, the following tribes of Kshatriyas have gradually sunk in this world to the condition of Sudras:

"44 (Viz.) the Paundrakas, the Kodas, the Dravidas, the Kambogas, the Yavanas, the Sakas, the Peradas, the Pahlavas, the Kinas, the Kiratas, and the Daradas.

"45. All those tribes in this world, which are excluded from (the community of) those born from the mouth, the arms, the thighs, and the feet (of Brahman), are called Dasyus whether they speak the language of the Mekkhas (barbarians) or that of the Aryans.

"51. But the dwellings of Chandalas and Shawapachas shall be outside the village, they must be made Apapatras, and their wealth (shall be) dogs and donkeys.

"52. Their dress (shall be) the garments of the dead, (they shall eat) their food from broken dishes, black iron (shall be) their ornaments and they must always wander from place to place.

one which has become subject to heretics, nor in one swarming with men of the lowest castes.

79. Let him not stay together with outcasts, nor with Chanalas, nor with Pukkasas, nor with fools, nor with over bearing men, nor with low-caste men, nor with antyavasayins".

CHAPTER X.

1. Let the three twice-born castes (varna) discharging their (prescribed) duties study (the Veda), but among them the Brahmana (alone) shall teach it, not the other two; that is an established rule.

"3. On account of his pre-eminence, on account of the superiority of his origin, on account of his observance of (particular) restrictive rules, and on account of his particular sanctification, the Brahmana is the lord of (all castes (varna).

"4. The Brahmana, the Kshattriya, and the Vaishya castes (varna) are the twice-born ones, but the fourth, the Sudra, has one birth only; there is no fifth (caste).

"5. In all castes (varna) those (children) only which are begotten in the direct order on weded wives, equal in caste and married as) virgins, are tp be considered as belonging to the same caste (as their fathers).

"6. Sons, begotten by twice-born men on wives of the next lower castes they declare to be similar (to their fathers, but) blamed on account of the fault (inherent) in their mothers.

"7. Such is the eternal law concerning (children born of wives one degree lower (than their husbands); know (that) the following rule (is applicable) to those born of women two or three degrees lower.

"25. I will (now) fully enumerate those (sons) of mixed origin who are born of Anulomas and of Pratilomas, and (thus) are mutually connected.

"26. The Suta, the Vaidehaka, the Chandala, that lowest of mortals, the Magadha, he of the Kshattri caste (gati) and the Ayogava.

"27. These six (Pratilomas) beget similar races varna on women of their own (caste), they (also)] produce (the like) with females of their mothsr's caste (gati), and with females (of) higher ones.

"28. As a (Brahmana) begets on (females of) two out of the three (twice-born castes a son similar to) himself (but inferior), on account of the lower degree (of the mother), and one

able achievements of civilisation in early Mesopotamia, Crete, Egypt and in the classical period of Greecian history. Without some form of ruthless involuntary servitude—the exploitation of man in the same way as animals—the foundations of early civilisation could not have been laid. But in the thirteenth century, in view of the great advance in the methods of production, such a social order was not only unnecessary but ruinous.

The Code of Manu, the composition of which I am inclined to attribute to the third century A.D. is not like Alberuni's India an objective description of social institutions. It is a book of law and possibly the writer postulates as law what was more the objective of his class rather than rules actually engorged. Still the statements of the Manu Code on the caste-system are significant The Brahman class claim supreme pre-eminence for itself and the ruthless subjection of the lower orders :—

CHAPTER I.

"93. As the Brahmana Sprang from (Brahman's) mouth, as he was the first-born, and as he possesses the Veda, he is by right the lord of this whole creation.

"95. What created being can surpass him, through whose mouth the gods continually consume the sacrificial viands and the manes the offerings to the dead ?

"99. A Brahman, coming into existence, is born as the highest on carth, the lord of all created beings, for the protection of the treasury of the law.

"100. Whatever exists in the world is the property of the Brahman; on account of the excellence of his origin the Brahmana is, is, indeed, entitled to it ali.

"101. The Brahmana eats but his own food, wears but his own apparel, bestows but his own in alms ; other mortals subsist through the benevolence of the Brahmans.

"105. He sanctifies any company (which he may enter), seven ancestors and seven descendants, and he alone deserves (to possess) this whole earth.

CHAPTER III.

"61. Let him not dwell in a country where the rulers are Sudras, nor in one which is surrounded by unrighteous men, nor in

children would disown him ; his closest friends would acknowledge him no longer. The courage that inspired him to fight till surrounded and captured by the enemy would bring him no reward but civil death and the hostility of the society for which he had been prepared to sacrifice everything. He would be an outlaw or a Chandala.

In later days bathing in the Ganges and other sacrifices were deemed sufficient to remove this contamination. But in the period of the Turkish invasion no such theological remedy was possible. Those who had lost their caste could never be rehabilitated or restored.

Alberuni's remarks on the matter are significant. "Everything which falls into a state of impurity strives, and quite successfully, to regain its original condition, which was that of purity .. ....But the Hindus never desire that a thing that has been polluted should be purified and thus recovered.

"I had been told that when Hindu slaves (*i.e* prisoners of war in Muslim countries, escape and return to their country and religion, the Hindus order that they should fast by way of expiation, then they bury them in the dung, stale and milk of cows for a certain number of days till they get into a state of fermentation. Then they drag them out of the dirt, give them similar dirt to eat, and more of the like. I have asked the Brahmans if this is true, but they deny it and maintain that there is no expiation possible for such an individual and that he is never allowed to return into those conditions of life in which he was before he was carried off as a prisoner. And how should that be possible ? If a Brahman eats in the house of a Sudra for sundry days, he is expelled from his caste and can never regain it."

Early civilisation, as has often been remarked, was built upon the basis of slave-labour or its equivalent. Slave labour or helotage alone made possible the remark-

or guild. They are occupied with dirty work, like the cleansing of villages and other services. They are considered one sole class, and distinguished only by their occupations. In fact they are considered like illegitimate children ; for according to general opinion they descend from a Sudra father and a Brahmani mother as the children of fornication, therefore they are degraded outcastes. Of the classes beneath the castes, the Hadi are the best spoken of, because they keep themselves free from everything unclean. Next follow the Doma, who play the lute and sing. The still lower classes practice as a trade killing and the inflicting of judicial punishments. The worst of all are the Badhatan, who not only devour the flesh of dead animals, but even of dogs and other beasts." (Vol. I, p. 101—102).

Elsewhere he states : "Every action which is considered to be the privilege of a Brahman, such as saying prayers, the recitation of the Vedas and offering sacrifices to the fire, is forbidden to him to such a degree that when, *e.g.* a Sudra or a Vaishya is proved to have recited the Veda, he is accused by the Brahmans before the ruler, and the latter will order his tongue to be cut off".

The theological basis of the caste-system was the terrible doctrine of chut or theological contamination—the fear driven deep into the mind of the Indian governing classes that if they violated any of the caste-rules, in particular if they touched the fire or the water of the classes below them, they would be eternally damned. If a Mussalman was captured by the Hindus, his relatives could ransom him and he was restored to his family and property. But nothing, like this was possible for a Hindu captive in Muslim hands. If he returned to his homeland after a space of captivity which was hardly possible without his drinking their water or eating their food, he would find himself an utter out-caste. His property would have been inherited by his heirs. His wife and

Pending the discovery of proper material for these four centuries the only possible method for the genuine historian is to co-relate as best as he can the social system postulated by Manusmrite and Yajnavalkya with the life and customs of India as described by Alberuni. It will be seen that the India of Alberuni is a development of the India of the Smrites, though not, at least in one respect, on the lines a modern Indian patriot would desire. In the India of the Manusmrite the caste-system is very definitely postulated but it may be hoped that the actual working of the system was not so vicious as desired by this text-book of law. In Alberuni we find the system in all its wonderful hideosity.

"Among the Hindus," Alberuni says, "institutions of this kind (*i.e.* like the five castes of Persia) abound. We, Muslims, of course, stand entirely on the other side of the question, considering all men equal, except in piety, and this is the greatest obstacle which prevents any understanding between Hindus and Muslims." Then after a brief reference to the four well known Hindu varnas, Alberuni proceeds :—

> "After the Sudra follow the people called Antaja who render various kinds of services, who are not reckoned amongst any caste, but only as members of certain craft or profession. There are eight classes of them, who freely intermarry with each other, except the fuller, shoe maker and weaver, for no others would consent to have anything to do with them. These eight guilds are the fuller, shoe-maker, juggler, basket and shield maker, the sailor, the fishermen, the hunter of wild animals and birds, and the weaver. The four castes do not live with them in one and the same place. These guilds live near the villages and towns of the four castes, but outside them'.

"The people called Hadi, Doma (Damba), Chandala and Badhatan (Sic) are not reckoned among any caste

devoted to these topics, without a proper apprehension of which political history remains an unsolved riddle.

The first volume of Pandit Bashiruddin Sahib's work, which will be published next, covers the period from the Arab Conquest of Sind to the Ghaznavides. The third volume brings the narrative to the death of Ibrahim Lodi. It is the author's intention to add a fourth volume on topics, such as Medieval warfare, the position of working class during the middle ages and Muslim religious ideas etc., for which it has not been possible to find a place in the first three volumes.

The style of the work is clear and simple. In consonance with the traditions of our great medieval historians, the author has avoided figures of speech and the literary tricks which were affected by the official historians of the past in order to convey their real meaning in an indirect manner. History, according to our best oriental traditions is a subject which the common man is entitled to know and it should be written in a manner intelligible to him.

Pandit Bashirddin Sahib is **the first writer on Indian History who has given a comprehensive account of Hindu ideas and institutions along with Islamic thought and culture based on a study of the Arabic, Persian, and Sanskrit originals. Great credit is due to him for this pioneer work.** Unfortunately the Sanskrit authorities on the period are not so abundant as one would wish. A great darkness still covers the social and political institutions of India during the four centuries that lie between the death of Harshavardhana and the advent of Alberuni. Alberuni looking at the past achievements of Indian thought, and the meagre accomplishment of the ages immediately preceding him, declared that the Indians were unprogressive, and he longed for an Indian Socrates who would courageously and at the cost of his life, separate the true postulates of Hindu classical thought from "sciences that prey on the ignorance of the multitude".

Introduction

BY

Prof. MOHD. HABIB

B.A. (HON.) (OXON) BAR-AT-LAW.

Head of the Deptt of Political Science, M. U., Aligarh.

AFTER many years of prolonged study and research Pandit Bashiruddin Sahib, M A. (Alig.) of Gandhi Faiz-i-Am College Shahjahanpur, has prepared a History of Medieval India that does real justice to the subject.

The author has unique qualifications for the task. He is equally at home in the Persian, Hindi and Sanskrit originals and is intimately acquainted with modern English literature on the subject. He brings to his work a mind free from communal, social and class prepossessions and has adhered carefully to the universally accepted canons of historical evidence. And he is not afraid.

Owing to the importance of the period with which it deals Shahabuddin Ghori to the death of Qutubuddin Khilji —Pandit Bashiruddin Sahib has decided to publish Vol. II of his History before Vol. I. But Vol. I and III are both ready in manuscript and it is hoped that the learned author will be able to publish them before long. He has also acceded to my request and is preparing a Hindi edition of the work in a language that is simple, lucid and intelligible to non-Pandits.

The history of the middle ages is mostly written as if there was nothing in it but royal dynasties and their wars. This is not a charge that can be brought against Pandit Bashiruddin Sahib's work. In an historical treatises kings and their wars cannot be ignored, and Pandit Bashiruddin Sahib has carefully collected together all efacts that can be gathered from the Persian originals. But an equally great emphasis has been laid on social and cultural history and the development of ideas. About half of this volume is

of the book is the convincing, unprejudiced and dispassionate presentation of facts. The conclusions arrived at by the writer are balanced and even where one may differ from him there is no bitterness which a partisan or particularist's study generally engenders.

There is a cool reasonableness and potent sincerity about all that he says for he knows his subject and has the authority of the contemporary documents behind him.

"People all read history" says Trevelyan, "if it fascinates them It is therefore our duty to make it as fascinating as possible, or at any rate not to conceal its fascination under the heap of learning which ought to underlie but not overwhelm written history". Mr Bashiruddin's book comes up to the standard. It is both instructive and interesting. It shows considerable painstaking industry, great erudition and deep insight. At the same time the language is simple and presentation straightforward and effective.

The publication of this work has come at a very opportune moment. For the last 200 years streams of falsehood have flown from the pens of European writers who perverted the narrative of the Muslim rule in India for political purposes. No misrepresentation is harder to refute than a consecutive story cunningly made up in statements for which there is no foundation or which represent a partial truth. The Muslim conquest of India was not an unmixed evil. The darker side of the life of kings and noblemen has been magnified while the activities of the Muslim saints, scholars, poets, craftsmen, who have enriched Indian culture, have been lightly passed over in the past.

Mr Bashiruddin has tried to present the history of the period in proper perspective and his book is a calm, careful, intelligent and instructive survey of Med. History.

There are a few minor mistakes of facts such as mentioned in "Izafi Note" on Page 428 and the usual misprints but the same will be corrected when second edition is published.

Dated 21st August, 1949. Sh. ABDUR RASHID.

FOREWORD

BY
Sh. ABDUR RASHID,
M.A. LL.B.,
Reader and Chairman, Department of History.
Muslim University, Aligarh.

A History of Muslim Rule in India has yet to be written. Mr Bashiruddin Pandit has attempted this task in a 3 volume History of the Delhi Sultanate in Urdu. The second volume of this series is being presented to the public. Mr. Bashiruddin is eminently fitted for this difficult task by virtue of his academic qualifications and particularly by his knowledge of Persian, Arabic, Sanskrit and Hindi, the four main languages which contain the principal sources of information for this most vital period of medieval Indian History.

The book is a useful corrective to the existing books on the subject and a key to the understanding of the nature and significance to the Muslim invasions of India beginning with Mohammad Bin Qasim's conquest of the valley of Sindh and the establishment of Muslim Rule in Northern India 500 years after. The basic defect of all histories of India has been that we have not considered our country in parallels and in relation to world history and its laws. Our reading of the history of our country has been isolationist, narrowly nationalist and criminally communalistic. Mr. Bashiruddin has tried to escape this tendency. He has presented a most lucid and entertaining picture of the social, political and cultural background of Medieval Musulmans and the Indian social milieu in which the work of conquest and consolidation was carried on by Muslim conquistadors.

The book is well documented and enriched by quotations ingenously collected from contemporary authorities. Whereas the predigested food of the ordinary text-books spoils the readers' appetite for the healthier and richer nourishments of the historical classics, this new history of Medieval India stimulates the desire to get acquainted with the original authorities. The great charm

(۶) قاری صاحب موصوف ایم۔ اے اور ہندی و سنسکرت کے عالم ہیں۔ انھوں نے اپنے موضوع پر انگریزی،
فارسی، اردو، ہندی و سنسکرت کے متعلقہ مواد سے پورا فائدہ اٹھایا ہے اور پراچین بھارت کے متعلق
ایک عامی کی طرح نہیں بلکہ ماہر فن کی حیثیت سے بحث کی ہے۔ کتاب واقعات کی کھتونی نہیں بلکہ منطقی نتائج
پر مدلل بحث ہے۔ واقعات کے استقصاء، اسباب و علل کی تحقیق اور نتائج کی ترتیب میں نہایت محنت،
جانفشانی اور دیانت داری سے کام لیا ہے۔

(پروفیسر) ضیاء احمد بدایونی

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ اگست ۱۹۶۱ء

(۷) صحیح اور غیر متعصبانہ معلومات فراہم کرنے کے لئے اس تاریخ کی نہ صرف اردو بلکہ ہندوستان کی دیگر
زبانوں میں زیادہ سے زیادہ اشاعت ہونا چاہئے۔

(پروفیسر) سید مقصود علی۔ صدر شعبہ تاریخ و سیاسیات

گاندھی فیض عام کالج شاہجہانپور۔ مئی ۱۹۶۸ء



باہتمام سید اعجاز علی منیجر

مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ

۱۹۴۹ء

ملنے کا پتہ

(۱) مولوی عبد الهادی خاں تاجر کتب
بازار بہادر گنج۔ شاہجہانپور

(۲) مولوی محمد ابراہیم جنرل مرچنٹ
بازار کٹرہ سوروں۔ ضلع ایٹہ

(محمد شمس الرحمن خاں عفی عنہ)



"This book was taken from the Library on the date last stamped. A fine of ½ anna will be charged for each day the book is kept over due."